[illegible] مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تاریخ

مسلمانانِ پاکستان و بھارت (ہند)

جلدِ اوّل: "عہدِ کشور کشائی"

(محمد ابن قاسم سے اورنگ زیب عالمگیر تک)

معہ مقدّمہ: زمانہ قبلِ اسلام

تالیف

سیّد ہاشمی فرید آبادی

شائع کردہ:- انجمن ترقّی اردو پاکستان، ہسپتال روڈ کراچی

(نشان سلسلہ مطبوعات ۲۵۲)

قیمت مجلّد سات روپیہ آٹھ آنے
(عـہ/۸)

شکریہ

اس کتاب کی طباعت کے لئے جناب محمد یوسف صاحب مالک نارتھ ویسٹرن ہوٹل، کراچی نے انجمن ترقی اُردو، پاکستان کو مبلغ دو ہزار روپے کا فیاضانہ عطیہ دیا ہی کہ اُن کے مرحوم و مبرور برادر بزرگ کرنل عبد الرحمٰن پیشاوری کی نیک یادگار رہے۔ مرحوم جنگ بلقان ۱۹۱۲ء میں اپنا خاندان اور وطن چھوڑکر ترکان عثمانی کی مدد کے لئے ترکی چلے گئے تھے۔ سالہا سال تک جہاد میں حصہ لیا اور وہیں ۱۹۲۶ء میں شہادت پائی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ برحمۃٍ واسعۃ ومغفرۃٍ کاملۃ۔ انجمن مرحوم کے حق میں خیر و مغفرت کی دُعا اور اُن کے صاحب جود و اخلاص بھائی کا سپاس ادا کرتی ہی۔

(ادبی پریس رولیسن روڈ کراچی)

۱۹۳۱۵

فہرست مضامین

---

* کتاب میں اس باب کا نشان غلطی سے دہم لکھ دیا گیا ہے اور پھر یہ غلطی آگے باب ہجدہم تک چلی گئی ہے۔ لہذا وہاں تک اگلے ہر باب کا صحیح نشان دو عدد بڑھا کر لکھا جانا چاہئے۔ ناظرین براہ کرم تصحیح فرما لیں ؎

باب یازدہم: (صحیح "سیزدہم") ... ... صفحہ ۳۸۹ تا ۴۰۹

مغلوں کا ابتدائی تسلط ہند پر

باب دوازدہم: (صحیح چہاردہم) صفحہ ۴۱۰ تا ۴۳۲

سوری خاندان اور مغلوں کا دوبارہ غلبہ

ختم جلد اوّل تاریخ مسلمانان
پاکستان و بھارت (ہند)

مقدمہ

زمانۂ قبل از اسلام

مسلمانوں کے آنے سے پہلے ممالکِ ہند کی کوئی تاریخ موجود نہیں ۔ اور جغرافیے میں اگرچہ طبیعی تغیّر نہ ہوسکتا تھا مگر سیاسی اور اصطلاحی تحریفیں ضرور کی گئیں ۔ انگریزوں نے مُلکِ برما کو بھی اپنی "سلطنتِ ہند" میں بیندھ لیا تھا ۔ بارے چند سال ہُوے اُسے جُدا کر دیا اور اب وہ ایک آزاد مملکت اور ہمارے موضوع سے خارج ہی ۔ لیکن ارضِ دکن جس کے نشیب و فراز ، شمال کے ہموار میدانوں سے کوئی یکسانی نہیں رکھتے ، زورِ حکومت سے ہندستان کا جُز بنا لی گئی ۔ یہ پُورا علاقہ خطِ سرطان کے نیچے ، منطقۂ حارّہ میں داخل ہی ۔ اس کی آب و ہوا ، زمین کی ساخت اور پیداوار ، باشندوں کی نسل و نژاد، شکل صوُرت زبانیں ، سب مختلف ہیں جن کا شمالی نسلوں اور زبانوں سے کوئی رشتہ نہیں ہے

سنہ ۱۹۴۷ء میں انگریز ہند کی سلطنت سے دست بردار

ہوے اور ایک نئی تقسیمِ مُلک تسلیم کی : یعنی شمالی ہند کے دونوں سِرے جہاں مسلمان آبادی کا غلبہ تھا ، ایک جُداگانہ مملکت میں شامل کیے گئے اور وہ پاکستان کے نئے نام سے موسوم ہوئی اُس کے مغربی حصّے میں صوبۂ سندھ ، سرحد ، پنجاب ، بلوچستان ، قبائلی اضلاع اور کئی ریاستیں ہیں ۔ ان سب کا رقبہ تین لاکھ مربع میل سے زیادہ اور آبادی کا تخمینہ تین کرور کیا جاتا ہی ۔ دُوسری طرف مشرقی پاکستان ، جسے مشرقی بنگال اور سلہٹ کو جوڑ کر بنایا ہی ، رقبے میں ساٹھ ہزار مربع میل سے بھی کم ، لیکن آبادی میں مغربی پاکستان سے سَوایا ہی ۔ اس طرح ہماری نئی مملکت کا مجموعی رقبہ پَونے چار لاکھ مربع میل کے قریب اور کُل آبادی کا اندازہ ساڑھے سات کرور سے زیادہ کیا جاتا ہی ۔ اس کے جُدا ہوجانے سے باقی ممالکِ ہند (یا بھارت) کا رقبہ ساڑھے بارہ لاکھ مربع میل رہ گیا جس کی آبادی سابقہ مردم شماری کی بنیاد پر بتیس کرور ساٹھ لاکھ نفوس کے قریب نِکلتی ہی ؛

اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے ہم ان مُلکوں کی نسلوں پر ایک نظر ڈالیں گے اور اسلامی دور تک اُن کی تاریخ کا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کریں گے ؛

نسلیں

یہ وسیع سرزمین جو اب پاکستان و بھارت کا مجموعہ ہی ، ہرچند کہ شمال میں بلند پہاڑوں سے اور جنوب میں گہرے سمندروں

سے گھری ہوئی ہی، قدیم ترین زمانے میں بھی بیرونی اقوام سے رشتہ رکھتی تھی۔ اِس کے سب سے پُرانے باشندے، جہاں تک پتہ چل سکا، نیم حبشی نسل کے پست قامت انسان تھے جو اپنے استخوان اور کاسۂ سر کی ساخت میں لنکا، جزایرِ شرقِ الہند بلکہ اوس ترے لیہ تک کی بعض قدیم اقوام کے ہم نسب پائے گئے ہیں۔ اگرچہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ ممالکِ ہند سے اُدھر گئے یا اُنھی اطراف سے آکر ہندستان و دکن میں آباد ہوئے تھے۔ بعد کی قوموں نے جو پاکستان و ہند میں داخل ہوئیں، اِن پُرانے دیسیوں کو قریب قریب ختم کر دیا۔ کم از کم پاکستان کے علاقے میں اُن کے کسی مستقل گروہ یا آبادی کا ثبوت نہیں مِلتا۔ البتّہ وسطِ ہند اور انتہائے جنوب کے پہاڑوں اور جنگلوں میں سنتال، بھیل، پانیاں، کادر، کرومبا وغیرہ قبائل اِنھی کی ذُریات اور اپنی نسلی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک باقی ہیں۔ ممکن ہی کہ یہ لوگ ہمیشہ سے خانہ بدوش، جنگلی رہے ہوں، اور اِنھیں بسنا بسانا کبھی نہ آیا ہو۔ اِن کے بعض برتن اور پتّھر کے اوزار جنھیں جدید تحقیقات کی کُدالوں نے زمین کی گہرائیوں سے کھود نکالا، گواہی دیتے ہیں کہ وُہ دھاتوں سے کام لینا نہ جانتے تھے۔ مگر اِن کے بعد جو قومیں عراق عرب کی طرف سے آئیں اور پہلے بلوچستان و سندھ اور پھر تمام ممالکِ ہند میں پھیل گئیں، وہ ابتدا

ہی سے ایک تمدن ساتھ لائیں جو اُس تاریک زمانے میں سب سے درخشاں نظر آتا ہی۔ ہم اِس ماقبلِ تاریخ کی قدیم ترین تہذیب پر اگلی فصل میں بحث کریں گے۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہی کہ یہ نو وارد جنھیں دراودی نسل سے منسوب کرتے ہیں، پُرانے باشندوں سے بہتر خد و خال رکھتے تھے۔ اُن کے سر لمبوترے اور قد ذرا کشیدہ تھا۔ پاکستان میں اِس نسل کی یادگار بلوچستان کی براہوی قوم مانی گئی ہی۔ ممالکِ ہند کے اکثر اقطاع میں یہ لوگ پہلی اور بعد کی نسلوں سے مخلوط ہو گئے لیکن جنوبی ہند میں اِن کا نمونہ محفوظ رہا اور ابھی تک دراودی نام سے یہ آریائی قوموں سے علاحدہ وجود رکھتے ہیں ؎

دراودی نسل کے ہند و پاکستان میں آنے کا زمانہ سات آٹھ ہزار برس قبلِ مسیح قرار دیا گیا ہی۔ غالبًا اِسی کے قریب چینی یا منگولی نسل کے لوگ مشرق کی طرف سے ممالکِ ہند میں جوق در جوق آئے اور کوہستانِ ہمالیہ کے دامن میں کشمیر تک بڑھتے چلے گئے۔ نیپال، بھوٹان میں اس نسل کے لوگ اب تک آباد ہیں اور مشرقی پاکستان میں انھی سے مخلوط آبادی کی کثرت ہی جِسے علمی اصطلاح میں منگولو دراودی کہتے ہیں اس قوم کا سر چوڑا، قد میانہ، رنگ سانولا اور ناک ذرا پھیلی ہوئی ہوتی ہی ؎

تیسری اور دوسری ہزاری قبلِ مسیح سے پھر بیرونی قومیں

بڑے بڑے جتھوں میں کابل کی طرف سے آئیں اور مغربی پاکستان سے رَو کی طرح آگے پھیلتی چلی گئیں ۔ اِن آنے والوں میں زیادہ تعداد قدیم آریا اور سیتھی یا تاتاری اقوام کی تھی ۔ پھر تاریخی زمانے میں عرب اور ترک فاتحین کے گروہ آئے اور پاکستان اور شمالی ہند میں جگہ جگہ اُن کی اولاد آباد ہو گئی ۔ مغربی پاکستان میں بڑی تعداد اسی نسل کی ہے جسے ترکو ایرانی کہتے ہیں ۔ اِس نسل کے افراد کا رنگ گورا ، لمبی سُتواں ناک ، پتلے ہونٹ ، آنکھ کی پُتلی ہلکی سیاہ یا نیل گوں اور پیشانی کشادہ ہوتی ہے ۔ اِن کے علاوہ سندھ اور پنجاب کے جنوب مغربی اضلاع میں بہت سے خاندان آباد ہیں جن کے گندمی رنگ ، چھرے چھرے ، خال و خط میں نژادِ عرب کی تحریر ہے ۔

پاکستان کے جنوب و مشرق میں راجپوتانے اور وادیٔ گنگ جمن کے باشندے زیادہ تر دراوڑی اور آریا قوموں کی مخلوط نسل ہیں ، جنھیں علمائے نسلیات آریو دراوڑی کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ اِن کا رنگ سانولا ، قد متوسط اور سر لمبوترا ہوتا ہے ۔ نربدا کے پار وسطی اور مغربی ہند کی آبادی میں تاتاری قوموں کی اتنی آمیزش ہو گئی کہ اُسے سیتھی دراوڑی کہنے لگے ہیں اِن میں کثیر تعداد مرہٹوں کی ہے ، جن کا رنگ سانولا ، قد ذرا چھوٹا اور ناک اوپر کو اُٹھی ہوتی ہے ۔

جنوبی سواحل پر جا بجا عربوں کی مخلوط اولاد کی آبادیاں ہیں اور کہیں کہیں پرتگیزوں اور حبشیوں کا میل ہو گیا ہے جنھیں

بحری تجارت یا قزاقی نے اِسی دوسری ہزارئی عیسوی میں پہنچایا اور قلیل تعداد میں یہاں لا بسایا تھا +

وادیٔ سندھ کا قدیم تمدّن

ماقبل تاریخ زمانے کے حالات کو مُرتّب و مربوط کرنا چیتھڑے گونتھ کر گُدڑی سینا ہے جو تیار ہونے کے بعد بھی جگہ جگہ سے مَسک جاتی ہے۔ پاکستان و ہند کے آثارِ قدیمہ اور بعد کی مذہبی کتابوں یا پُرانے گیت اور قصّے کہانیوں کی بڑی دیدہ ریزی سے چھان بین کی گئی۔ کہیں کہیں جو کتبے سکّے یا غیر مُلکی سیّاحوں کے اقوال ملے، ڈھونڈھ کر جمع کیے گئے اور اہلِ تحقیق اِس نتیجے تک پہنچے کہ مُمالکِ ہند میں تمدّن کا آغاز آریا قوم کے یہاں آنے کے بعد ہُوا۔ مدّتوں تک اسی بنیاد پہ ابتدائی تاریخ کی عمارت چُنی جاتی رہی۔ لیکن اسی صدی میں صوبۂ سندھ و سرحد، بلوچستان اور مغربی پنجاب میں بعض مقامات پر کُھدائی کی گئی تو زمین کے نیچے سے ہزاروں سال کے پُرانے اوزار و ظروف برآمد ہوئے جو آریائی عہد کی مصنوعات سے بہتر تھے۔ پھر خاصے بڑے شہر اور بستیوں کے آثار نکل آئے اور ان کی دریافت نے عِلمی دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اِن کو دیکھنے اور جانچنے سے ثابت ہوگیا کہ آریوں کے پاکستان و ہند میں آنے سے سیکڑوں برس پہلے، کم سے کم وادیٔ سندھ میں ایک قدیم تمدّن موجود اور اُس وقت کے لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ تھا۔ آریوں کی آمد کا زمانہ دو ڈھائی ہزار برس قبلِ مسیح سے آگے نہیں

جاتا۔ لیکن ہڑپا (ضلع مونٹ گمری) اور موہن جوداڑو (ضلع لاڑکانہ) کے تازہ اِکتشافات نے قطعی طور پر آشکار کر دیا کہ تیسری ہزاری قبلِ مسیح میں وادئ سندھ میں بسنے والے آریوں سے زیادہ وسیع اور بہتر تمدن کے مالک تھے۔

یہ لوگ خانہ بدوشی کی بجائے شہری زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ باقاعدہ زراعت کرنی جانتے تھے اور گیہوں، جَو وغیرہ غلوں کے علاوہ کم سے کم کھجور کی کاشت کرتے تھے۔ گائے، بھینس، بیل، بکری، بھیڑ، اونٹ اور ہاتھی تک کو پالتے تھے مگر گھوڑا اور بلّی ان کے اہلی جانوروں میں شامل نہ تھے۔ باربرداری کے لیے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں جیسی آج کل ریہڑی ہوتی ہے، استعمال میں تھیں۔ اور ان میں لکڑی کے پہیّے اُسی قسم کے لگائے جاتے تھے جیسے ابھی تک بنجارے اپنی بیل گاڑیوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی تجارت کا دائرہ دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا اور وہ سونا، چاندی، تانبے اور سیسے کی دھاتوں سے کام لیتے اور پیتل بھی بنا لیتے تھے۔ اِن دھاتوں کے بہت سے ظروف اور زیور، اُن کی کاری گری کے گواہ ہیں۔ وہ رُوئی کاتنے اور کپڑا بُننے کے فن سے واقف تھے۔ اُن کے ہتیاروں میں بلم، تیر کمان، گُرز اور خنجر کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن لمبی اور خمیدہ تلوار بنانے کا ہُنر انھیں نہ آتا تھا اور نہ ان کی یادگاروں میں زرہ بکتر یا ڈھال کا پتا چلتا ہے۔ عام اوزاروں میں ہتوڑا، درانتی، چھینی اور تانبے یا پیتل کے بنے ہوئے



قدیم روغنی ظروف کے نمونے
جو موہن جودرو کی کھدائی میں
برآمد ہوئے۔



موہن جودڑو کی باتصویر لوحیں
جن پر حروف یا لفظ تحریر ہیں

اُسترے ملے ہیں مگر چھُرے اور چاقو کبھی دھات کے اور کبھی پتھر کے بنائے جاتے تھے ۔ غلّہ پیسنے کے لیے گول چکّی اُن کے پاس نہ تھی مگر سِل بٹّے اور کوٹنے کی کُنڈالی موجود ہے ۔ گھریلو برتن عموماً مٹّی کے ہوتے تھے اور اِنھیں روغنی بنانے کا فن بہ خوبی ترقّی کر گیا تھا ۔ بعض برتن تانبے، پیتل یا چاندی کے بھی دست یاب ہُوئے ہیں ؛

لیکن سب سے حیرت و تعریف کی بات یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کے یہ قدیم باشندے لکھنا پڑھنا اچھی طرح جانتے تھے ۔ اور اِس باب میں اُنھیں جُملہ اہلِ ہند پر فضیلت اور صدیوں کا تقدم حاصل ہے ۔ موہن جو درو میں صدہا گول اور چوکور مُہریں یا لَوحیں ملی ہیں جیسی آج کل " نادِ علی " وغیرہ کی تختیاں گلے میں ڈال لیتے ہیں اور ان پر تصاویر کے علاوہ مختصر عبارتیں کندہ ہیں ۔ افسوس ہے کہ اِس قدیم پاکستانی تحریر کو ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا کیوں کہ اِس میں کوئی بڑا کتابہ یا مسلسل عبارت دست یاب نہیں ہوئی ۔ لیکن اتنا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مصریوں کے تصویری خط سے بعد کی ایجاد ہے اور عراق عرب کے سُمیری رسم خط کی طرح صوتی اصول پر لکھا جانے لگا تھا یعنی ہر علامت ایک آواز یا حرف کا کام دیتی تھی ۔ یہ علامتیں سُمیری حروف سے مُشابہ ہیں لیکن اِن کی آوازیں وُہ نہیں پائی گئیں اور زبان بھی ضرور مختلف ہو گئی ہے ۔ علامتیں خاصی طرح صاف اور واضح بنی ہوئی ہیں اور لکھنے کا رُخ سُمیری یا آج کل کے عربی

فارسی رسم الخط کی طرح دائیں سے بائیں ہاتھ کی طرف ہے۔ لیکن اصل عبارتوں کی نسبت ابھی تک صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ غالباً یہ دُعائیہ کلمات ہیں یا اُنھی دیوی دیوتاؤں کے نام اور القاب ہوں گے جن کی تصویریں تختیوں پر نقش کی گئی ہیں۔

مذہبی عقائد

اِن منقوش مُہروں یا لَوحوں سے ممکن ہے گنڈے تعویذ کا کام لیا جاتا ہو۔ بہرحال اِن کی تصاویر سے لوگوں کے عقائد کا کچھ پتا چلتا ہے۔ بہت سی مُورتیاں، چھوٹے چھوٹے بُت دبے ہُوئے نکلے اور قیاس قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یورپ کے اہلِ تحقیق اِنھی شواہد سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مصرِ قدیم کی دھرتی ماتا یا مائی کی پُوجا کا رواج وادیٔ سندھ تک پہنچ گیا تھا۔ اور غالباً اِس دیوی پر آدمی کی قربانی بھی کی جاتی تھی۔ یہ وہی دیوی ہے جس کی آج تک ممالکِ ہند کے اکثر مقامات پر ہندو پُوجا کرتے ہیں۔ معلوم ہُوا کہ یہ آریا نسل کے ہند میں آنے سے صدیوں پہلے کا پُرانا عقیدہ ہے۔ اسی طرح تصویروں اور مُورتوں سے شِیو جی اور سانڈ کی پُوجا کا صاف صاف سُراغ ملتا ہے۔ حال آں کہ اسے برہمن اپنے ہندو مذہب کی تعلیم سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔ البتّہ دکن کے علاقوں میں لنگایت فرقے کے لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کا مذہب وید یا آریائی عقائد سے اسبق ہے۔ وادیٔ سندھ کی حفریات اِس دعوے کو قوت پہنچاتی اور لنگایتوں کے بعض بنیادی عقائد کے آثار پیش کرتی ہیں۔ ایک

اور یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اُن دِنوں وادیٔ سندھ میں ہاتھی، شیر، سانڈ وغیرہ حیوانات کے علاوہ بعض درختوں کی پُوجا ہوتی تھی۔ اِن میں اکثر درخت ایران و عراق کے پیڑوں سے ملتے جُلتے ہیں لیکن بعض تصویروں میں پیپل کی پُوجا کا سماں دکھایا ہے اور یہ درخت اب بھی ہندوؤں میں بہت مقدس مانا جاتا ہے۔

مکانات

اِن حفریات میں دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اور مُورتیاں تو ہر جگہ ملیں مگر کسی بڑے مندر یا عبادت گاہ کا پتا نہیں چلا۔ ماقبلِ تاریخ دَور میں مصر و عراق کے لوگ مذہبی عمارتیں بنانے میں خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندوں کو مندر یا معبد بنانے سے زیادہ رہنے کے مکانات بنانے کا شوق تھا۔ موہن جودرو کی کھدائیوں میں اُن کا پُورا شہر برآمد ہو گیا اور اس کے مکانات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے پاکستان کے قدیم باشندے ایسے اچھے اور پُختہ مکانات میں رہتے سہتے تھے کہ آج بھی ہمارے اکثر دیہات میں ایسے خشتی مکانات کم ملیں گے۔ عمارتوں میں پتھر لگانے کا رواج نہیں تھا مگر وہ لوگ اینٹ پکانے کے فن سے خُوب واقف تھے اور اتنی بڑی اینٹیں تیار کر لیتے تھے جو آج کل کی "گُمّاں" اینٹ سے کم نہ ہوتی تھیں۔ چُونے کا استعمال نہ تھا لیکن

گچ اور گارے سے وہ ان اینٹوں کی بڑی بڑی عمارتیں بنا لیتے تھے ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہی کہ بعض عمارتیں کئی منزل کی اور چھتیں لداؤ کی بنائی جاتی تھیں ۔ شہر کے محلوں سے الگ ، موہن جودرو میں ایک بالا حصار تھا جس کے دس گز چوڑے دُھس کے اوپر اینٹ کی فصیل اُٹھائی تھی اور اندر صحن میں بہت اونچی کُرسی دے کر وسیع عمارتیں بنائی تھیں ۔ یہ ضرور سرکاری اغراض کے لیے ہوں گی اور اِن میں بادشاہ یا اُمرا کے دربار لگتے ہوں گے ؛ شہر کے عام مکانات میں بعض وسیع حویلیوں کے آثار موجود ہیں ۔ جن میں رہنے سہنے کھانا پکانے اور نہانے کے حجرے الگ الگ ہوتے تھے ۔ ہر بڑے مکان میں پُختہ کُواں بنایا جاتا اور حمام کے اندر چھچھلے حوضوں میں پانی گرم کرنے اور موری سے باہر نِکالنے کا انتظام ہوتا تھا ۔ مکان ایک دوسرے سے مِلا کر سیدھی قطار میں بنائے جاتے اور آج بھی خاصے باقاعدہ اور نہایت کُشادہ گلی کوچوں کا پتا چل سکتا ہی ۔ شہر کے بڑے بازاروں کی چوڑائی دس گیارہ گز ناپی گئی ہی ۔ اور ان کے کنارے بدر روئیں دیکھ کر عبرت ہوتی ہی کہ بعد کے حملہ آوروں نے جہاں اِس قوم کو تباہ و برباد کیا وہاں اس کی تہذیب کو بھی مِٹا دیا اور اُن سے صفائی تک کا سبق حاصل نہ کیا ؛

لباس زیورات وغیرہ

تصویروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پُرانے پاکستانی زیادہ تر بے سِلی چادریں اور تہمد یا لنگوٹ استعمال کرتے تھے۔ مارشل کی رائے میں وُہ روئی کاتنا اور کپڑا بُننا جانتے تھے مگر انھیں خیاطی نہیں آتی تھی اگرچہ دو چار تصویروں میں مرد کوٹ یا قبا پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ وہ طرح طرح کے زیور خوب بنانے لگے تھے۔ سونے چاندی، جست اور تانبے کی اُن کے پاس کمی نہ تھی اور بعض ادنیٰ درجے کے جواہرات بھی بہم پہنچا لیتے تھے۔ سر جون مارشل نے زیوروں کی تصویریں اپنی کتاب میں چھاپی ہیں۔ ان میں کئی قِسمیں ابھی تک ممالکِ ہند میں مروّج ہیں اور اپنی ساخت یا کاری گری میں اُن پانچ ہزار برس کے قدیم زیوروں سے زیادہ خوش نما ہونے کا دعوا نہیں کرسکتیں۔ اِسی طرح بہت سے برتن جو موہن جو درو یا ہڑپا کی کھُدائی میں نکلے، ترقی یافتہ صنعت کا ثبوت ہیں۔ خصوصًا روغنی اور چینی کے مُنقّش ظروف ایسے خوب صورت اور پائے دار پائے گئے کہ شاید آج بھی ہمارے کمہار اُن سے بہتر نہ بنا سکیں گے۔

وادیِ سندھ کے اس قدیم تمدّن پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں، لیکن اِس فصل کو ختم کرنے سے پہلے یہ دُہرانا بے محل نہ ہوگا کہ وہ مصر و عراق عرب کے تمدّن سے نہایت مُشابہ تھا۔ اور موہن جو دڑو کی

قبروں سے جو ڈھانچے برآمد ہوئے اُن کی بوسیدہ ہڈیوں نے گواہی دی کہ وہ غالبًا مخلوط عراقی یا دراوڑی نسل کے لوگ تھے جن کا بعد کی آریا قوم سے کوئی قریبی رشتہ نہ تھا۔ یوں بھی جب آریا اِن علاقوں میں آئے تو اُن کا تمدن بہت سادہ تھا اور وہ بڑے شہر بلکہ پختہ مکان تک بنانا نہ جانتے تھے۔ وادیٔ سندھ کے تمدن کا زمانہ قرار دینے میں ایک اور سُراغ یہ مِلا کہ اِن آثار و باقیات میں لوہے کی کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ حال آں کہ آریا جب دریائے سندھ کے پار آکر بسے تو وہ لوہے کے ہتیار استعمال کرتے تھے۔ لوہے کو تپانے، پگھلانے اور کام میں لانے کی صنعت سب دھاتوں کے بعد آدمی نے سیکھی ہے اور دو ہزار برس قبلِ مسیح سے پیش تر اِس کا کہیں نشان نہیں مِلتا انھی سب وجوہ سے یقین ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کا قدیم تمدن عصرِ جدید سے بہت پہلے کا تمدن تھا۔ اور وُہ پاکستان میں تقریبًا تین ہزار برس قبلِ مسیح میں پھیلا ہُوا تھا[1]

آریوں کی آمد

ماقبل تاریخ زمانے کا دُوسرا دَور وہ ہے جب کہ آریا قوم ایران و افغانستان ہوتی ہوئی مغربی پاکستان میں آئی اور پھر ستلج اُتر کر وادیٔ گنگا میں پہنچ گئی۔ اُس کا شمالی ہند کے علاقوں میں پھیلنا اور بس جانا، نہ صرف وہاں کی پُرانی آبادی

---

[1] مذکورہ بالا معلومات سر جون مارشل کی مشہور کتاب "موہن جودڑو" اور "کیمبرج ہسٹری اوف انڈیا" اور بعد کے چند مضامین سے ماخوذ ہیں۔

میں بلکہ خود آریوں میں ایک نمایاں انقلاب کا باعث ہُوا ۔ وہ قدیم باشندوں سے خلط ملط ہو کر اپنی امتیازی صفات کھو بیٹھے اور پنجاب سے آگے جانے کے بعد، ایک فرنگی مبصر کے الفاظ میں، "آریا سے ہندو بن گئے!"

واضح رہے کہ آریا کسی جُداگانہ نسلِ انسانی کا نام نہیں بلکہ آریا (بہ معنی شریف) سیّد و میرزا کی طرح ایک اعزازی لقب تھا ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کسی زمانے میں یہ برادری بڑھتے بڑھتے ایک کثیرالتعداد قوم بن گئی اور گو اُس کا اصلی وطن متعیّن نہیں ہوسکا، تاہم ایک طرف وادئ والگا اور گرجستان (یعنی جورجیہ) اور دوسری طرف مجارستان (ہنگری) تک اس کے آثار پائے گئے ہیں ۔ ممکن ہے وہ اُسی طرف سے پلٹ کر ایشیائے کوچک آئی ہو اور پھر اُس کے گروہ ایران ہو کر کابل و پاکستان میں پہنچے ہوں ۔ اُن کی آمد کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں مگر اس بات کے معقول شواہد موجود ہیں کہ تخمیناً سنہ ۱۵۰۰ ق م تک پاکستان کے نووارد آریا اور ان کے ہم قوم ایرانی ایک ہی زبان بولتے تھے اور ان کی زبانیں چند صدی بعد ایک دوسرے سے مختلف ہوئیں ۔ لہٰذا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری ہزاری قبلِ مسیح میں افغانستان کے پہاڑوں کے پار آئے ۔ اور اُن کی سب سے قدیم مذہبی کتاب 'رِگ وید' بھی اِسی قیاس کی تائید کرتی ہے[1]۔

---

[1] کیمبرج ہسٹری اوف انڈیا' جلد اوّل ص۱۹ و مابعد۔

مذہبی کتابیں

آریوں کی سب سے قدیم اور ضخیم مذہبی کتاب 'رِگ وید' جس کے دس منڈل (یا پارے) اور ایک ہزار سے زیادہ بھجن ہیں، اِس تاریک دوَر میں تارا منڈل کا کام دیتی اور ہماری کچھ نہ کچھ رہ نمائی کرتی ہی۔ اس کے بعض بھجن بہت پُرانے ہیں اور بعض بعد میں داخل کیے گئے۔ اِن کی زبان چُغلی کھاتی ہی کہ قیدِ تحریر میں آنے تک اِن میں کافی تحریف و ترمیم ہوتی رہی۔ پھر قلمی نسخوں میں غفلت و سہو یا حک و اصلاح کی کوشش نے فساد ڈالا، اور یہ کتاب مختلف بلکہ متضاد عقائد کا مجموعہ بن گئی۔ تاہم اہلِ تفحّص نے بڑی دیدہ ریزی کے بعد سب سے قدیم اقوال و اشعار کی نشان دہی کی جن سے ظاہر ہوتا ہی کہ وہ ایک نوخیز اور جواں ہمّت قوم کے گیت ہیں جو مناظرِ فطرت دیکھ کر جھومنے لگتی تھی۔ مجسّم دیوی دیوتاؤں کا دخل نہیں ہونے پایا تھا اور صرف وہ قوّتیں جو نور و حرارت یا برق و باراں کو پیدا کرتی ہیں، اس قوم کی معبود تھیں۔ مردانِ جنگی کا محبوب دیوتا اِندر نیلے عفریت یعنی آسمان پر بجلی کے کوڑے مار کر پانی کو قید سے چھڑاتا اور زمین کے کِشت و خیاباں پر اُسے برساتا ہی۔ لڑائی کے وقت پُجاری اُسی کو پُکارتے ہیں کہ دُشمنوں پر غلبہ دِلائے —— یہی وہ اِندر ہی جو چند صدی کے بعد صرف پریوں کا اکھاڑا جماتا اور دن رات ناچ رنگ دیکھنے میں محو بتایا جاتا ہی!

بعد کے بھجن اور اتھروویَد سے پتا چلتا ہی کہ آریا لوگ جادو

منتر کے قائل تھے اور پنچ ذات کے پجاریوں کا کام ہی عملیات اور شعبدہ بازی تھا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے کہیں زیادہ کارآمد بات یہ منکشف ہوتی ہے کہ اِن بھجنوں کے کہنے والے کابُل ندی سے لے کر سرستی تک کے علاقے سے بخوبی واقف تھے اور ہرچند اِن کی زیادہ تعداد سندھ و ستلج کے درمیان آباد تھی لیکن وہ آہستہ آہستہ مشرق کی طرف منتقل ہو رہے تھے جس کا ایک بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ تازہ دم آریوں کا ایک اور ٹِڈی دل چترال و صوات کے راستے وادیٔ سندھ میں داخل ہو رہا اور پہلے بسنے والوں کو جمنا گنگا کے علاقوں میں دھکیل رہا تھا۔

اِس عہد کے متعلق جو ہمیں پہلی ہزاری قبلِ مسیح تک لے آتا ہے، اہلِ تحقیق ویدوں کے علاوہ اُن کی شرحوں سے مدد لیتے ہیں۔ یہ کتب برہمنا کے نام سے موسوم ہیں اور ان میں کہیں کہیں ایسی تمثیلات مِل جاتی ہیں جو مورّخ کے لیے بہت قیمتی ہیں۔ ان کا رِگ وید سے مقابلہ کیا جائے تو بعض دلچسپ فرق ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً رِگ وید میں شیر ببر کا ذکر آتا ہے لیکن بلا ایال شیر کا نام نہیں مِلتا جس کے معنی یہ ہیں کہ رِگ وید کے بھجن لکھنے والے موجودہ پاکستان سے آگے وادیٔ گنگا میں نہیں پہنچے تھے جہاں آج تک شیروں کی کثرت ہے۔ ایک برہمنا میں یہ افسانہ بھی محفوظ رہ گیا ہے کہ وِدی ہا کا راجا ناکھو اور اس کا پروہت سرستی ندی کے کنارے مقیم تھے کہ اگنی کا شعلہ چمکتا اور آگے بڑھتا نظر آیا۔ راجا اور پروہت اس کے

پیچھے پیچھے گنڈک کے پار اُتر گئے " چنانچہ اب گنڈک پار بہت سے برہمن آباد ہیں اور کھیتی ہونے لگی ہے " اس کہانی کو پڑھ کر آریوں کے مشرق میں پھیلنے کی ایک دُھندلی تصویر خیال میں آجاتی ہے کہ اِن کے گروہ پنجاب کے میدانوں سے اُٹھ اُٹھ کر وادیٔ گنگا میں بڑھ رہے ہیں۔ اور جہاں راجا کا قدم جاتا ہے وہیں پروہت ساتھ ساتھ جاتے اور پوُجا پاٹ کا نقشہ جماتے ہیں۔ اِنکی مذہبی کتابوں سے ہم آریوں کے قدیم تمدّن کا بھی ایک حد تک پتا چلا سکتے ہیں کہ سُتلج کے پار جانے سے پہلے ہی اُن میں بہت سے قبیلے اور برادریاں الگ الگ تھیں لیکن زبان اور مذہبی رسوم وعقائد میں فرق نہ تھا اور جات پات کی کوئی تفریق پیدا نہ ہوئی تھی، اگرچہ آبادی کے مختلف طبقے ضرور تھے جن میں سب سے اوّل امیروں کا طبقہ " راجینا " تھا اور دُوسرے درجے پر وہ لوگ اور پروہت جو نذر نیاز اور قربانی کی رسمیں ادا کرتے اور دیوتاؤں کے بھجن گاتے تھے۔ باقی لوگ جن کا پیشہ زراعت یا گلّہ بانی تھا " ویش " کہلاتے تھے۔ تاجروں یا صنعت گروں کے الگ کِسی فرقے کا اِس ابتدائی تمدّن میں ذِکر نہیں آتا۔ حال آں کہ ان کی عورتوں کے زیورات اور مردانہ زرہ بکتر وغیرہ قدیم اسلحہ نہ صِرف کتابوں میں مذکور ہیں بلکہ کہیں کہیں کھدائیوں میں دست یاب ہوئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ دست کاریاں خوب جانتے تھے۔ ساتھ ہی ضرورت کے وقت قوم کا ہر مرد سپاہی کے فرائض انجام دیتا تھا اور اُن میں آئے دِن آپس میں کُشت و خون کے معرکے ہوتے رہتے تھے

اور یہ نہیں تو قومی دُشمنوں سے لڑائیاں ٹھنی رہتیں جن کی زمینیں آریوں نے چھین لی تھیں ۔ یہ کالے رنگ کے دراوڑی تھے، جنھیں نو وارد آریا ازرہِ حقارت "داس یوس" کہتے اور لڑائی میں گرفتار کر کے اپنا غلام بنا لیتے تھے ۔ یوں بھی اُن کی جان کچھ قیمت نہ رکھتی تھی، اور ان کے زن و مرد کا قتلِ عام کرنا معمولی سی بات تھی ۔

گھوڑوں کی بہت قدر کی جاتی تھی ۔ اور لڑائی میں یا دوڑ کے وقت وہ تانگوں یا جگمگاتی رتھوں میں جوتے جاتے تھے۔ لیکن ان قدیم آریوں کی اصلی دھن دولت گائے بھینس اور دودھ مکھن ان کی مرغوب غذا تھی ۔ وہ گوشت کھاتے تھے خاص کر تیر تہوار کی قربانیوں میں بجار کا گوشت بہت پسند کیا جاتا تھا۔ ان کا تمدن ابھی تک سادہ اور دیہاتی تھا ۔ گاؤں کی حفاظت کے لیے لکڑیاں گاڑ کر مضبوط باڑ بنا لی جاتی تھی ۔ مکانات لکڑی اور شہتیر کے بنے ہوتے تھے مگر اینٹ پتھر کی عمارتوں کا پتا نہیں چلتا ۔ ہر گروہ یا برادری کئی کئی بستیوں میں پھیل گئی تھی ۔ ہر کُنبے کا بزرگِ خان دان اپنے گھرانے کا حاکم ہوتا لیکن پوری برادری پر ایک سردار یا راجا کی حکومت ہوتی اور غالباً اُسے برادری والے منتخب کیا کرتے تھے ۔ اُن کے ہاں شادی اکثر دولھا دُلھن کی مرضی سے ہوتی اور بیوی کی عزت کی جاتی تھی۔ جبریہ بیوگی اور بچپن کی شادی کا قدیم آریوں میں کوئی رواج نہ تھا ۔

آزاد ریاستیں اور تمدنی انقلاب

آریوں کے آخری دور میں مہا بھارت کی مثنوی اہلِ تاریخ کی قیاس آزمائی کے لیے وسیع میدان پیش کرتی ہے۔ عجب نہیں کہ وہ لڑائی جس کی یادگار میں یہ نظم لکھی گئی، پہلی ہزاری قبلِ مسیح کے آغاز کا واقعہ ہو، لیکن بعد کے شعرا اور جگہ جگہ کے بھاٹ اپنی سرکاروں کی تعریف کے گیت گاتے اور برابر اس داستان کے پاٹ بڑھاتے رہے۔ البتہ رامائن کی نسبت یہ تسلیم کرنا ممکن ہے کہ اسے ایک ہی شاعر والمیک نے نظم کیا ہوگا۔ بہرحال، یہ دونوں سنسکرت کی مثنویاں ماقبلِ تاریخ زمانے کا مفید ماخذ ہیں۔ اِسی طرح منو کا "دھرم شاستر" اگرچہ تخمیناً پہلی صدی عیسوی میں مُدوّن ہُوا، تاہم اس تاریک زمانے کے تمدن پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرے اسی پہلی ہزاری قبلِ مسیح کے وسط میں شمال مشرقی ہند میں دو بڑی مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں اور ان کی قدیم تعلیم و روایات سے مورخ کو مدد ملتی ہے۔ اِن سب ذرائع سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں اور چھٹی صدی قبلِ مسیح میں پاکستان اور (شمالی) ہند کے علاقے میں کئی بڑی بڑی ریاستیں بن گئی تھیں۔ پاکستان میں صرف ایک بڑی مملکت گندھارا کا نام ملتا ہے، جس کا دارالحکومت ٹیکسیلا تھا۔ (راول پنڈی کے قریب) اس کے کھنڈر تحقیقِ مزید کی دعوت دیتے ہیں۔ غربی پنجاب موجودہ صوبۂ سرحد اور آزاد قبائل کے اضلاع اسی حکومت میں داخل تھے۔ وادیٔ جمنا میں کورو کا راج تھا اور ان کی راج دھانی اندرپرست شہر دہلی کے قریب بستی تھی۔

آگے دوآب میں تکس اور پنچال ریاستوں کے نام آتے ہیں اور ان کے شمال مشرق میں کوسل کی حکومت گورکھ پور سے نیپال تک وسیع تھی۔ ملکِ بہار میں گنگا کے اوپر لچھوی قوم کی آزاد ریاست تھی۔ اور گنگا کے نیچے مگدھ کا راج تھا۔ شمالی مالوے کی اون تی ریاست کا دارالحکومت اس وقت ہی اُجین (یا وجینی) کہلانے لگا تھا۔

سلطنت مگدھ

مشرقی علاقوں میں آریا قوم کی آبادی کم تھی اور قیاس چاہتا ہے کہ پوری طرح سیاسی تسلط بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اُن کی قدیم کتابوں میں مگدھ دیس کے بڑے بڑے راجاؤں کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ جین مت اور بودھ مت کے بانی انھی علاقوں میں پیدا ہوئے اور ان کے بانیوں نے برہمنی مذہب سے بغاوت کی تعلیم دی، برہمن مصنفوں کی ناراضی کا سبب بھی کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ لیکن تقدیر کا فیصلہ انسانی ارادوں کے تابع نہیں ہوتا: اس قبلِ تاریخ دور میں اگر کسی ملک کے حالات اور فروغ و عظمت کے آثار سب سے زیادہ صحت کے ساتھ محفوظ رہے تو وہ یہی ملکِ مگدھ اور وہاں کے بادشاہوں کے خاندان ہیں۔

ان میں پہلے خاندانِ شاہی کا بانی سیس ناگ راجا بتایا گیا ہے۔ جس کی اولاد میں بیم بسر اور اجاتستر بڑے اقبال مند راجا ہوئے۔ انھوں نے شمال میں لچھویوں کا علاقہ اور مغرب میں کوسل کی ریاست کو فتح کیا اور سون و گنگا کے سنگم پر وہ پہاڑی قلعہ "راج گہہ" یا "راج گری ہہ" تعمیر کیا جس کا دور چار میل سے

زیادہ تھا اور جس کی فصیل و بُرُوج کے نشان ابھی تک باقی ہیں۔ اسی قلعے کے گرد مدّت کے بعد قدیم ہند کا سب سے مشہور شہر پاٹلی پترا آباد ہُوا۔ اس کے حالات آیندہ ہماری نظر سے گزریں گے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ وادیٔ سندھ کے قدیم شہروں کے بعد اگر ممالکِ ہند میں کسی پُختہ عمارت کے نشانات اب تک مِل سکے تو وہ چھٹی صدی قبلِ مسیح کے اسی قلعہ راج گِرِہ کے شکستہ آثار ہیں؛

سیس ناگوں کے بعد مگدھ میں نند خاندان کے راجا حاکم ہوئے جنھیں پُرانوں میں "نیچ ذات کے شودر" بتایا گیا ہو۔ آریا برہمنوں کو اُن سے اتنی نفرت تھی کہ بعد میں انھوں نے اپنے سمت یا سَن میں سے وہ نوّے برس ہی خارج کردیئے جن میں یہ خاندان برسرِ حکومت رہا[1] لیکن اِس تعصّب و عناد سے نندوں کا کچھ نہیں بگڑا اور معلوم ہوتا ہو کہ چوتھی صدی قبلِ مسیح تک وہی بڑے کرّ و فر کے ساتھ حکومت کرتے رہے اور ان کی سلطنت شاید جمنا کے کناروں تک وسیع ہوگئی۔ راجا چندرگپت جس سے موریا خاندان کا آغاز ہوتا ہو، انھی نندوں کا رشتے دار تھا؛

مذہبی عقائد

بودھ مت کی قدیم کتاب "دیگھ" میں گوتم بودھ کی مدح و ثنا کا ایک قصیدہ درج ہو۔ اس میں شاعرِ ہند کے اُن دیوی

---

[1] دیکھو، اوکس فورڈ ہسٹری اوف انڈیا، صفحہ ۵، اس "ناقص" سمت کو بعد میں "اننَد" (یعنی نند کے بغیر) سن کہنے لگے تھے؛

دیوتاؤں کو گنواتا ہے جو اس کے ممدوح کے سامنے سرِ عقیدت خم کرنے حاضر ہوئے : سب سے پہلے دھرتی ماتا اور پہاڑوں کی چار دیویاں آتی ہیں ۔ پھر چار سمتوں کے حاکم اور گندھرو یعنی آسمانی مغنّی آداب بجاتے ہیں ۔ پھر ناگ دیوتا جن کی بہت سی قسمیں تھیں ۔ گرول دیوتا یعنی انسان چہرہ پرندے جو ناگوں کے دشمن تھے ۔ عفریت جن کی پوجا کی جاتی تھی ۔ پھر چاند ، سورج ، آندھی ، بادل ، روشنی ، گرمی کی دیویاں اور آخر میں بڑے بڑے دیوتا جو کئی کئی صفات سے متصف تھے جیسے برہما پرمست وغیرہ ۔

یہ فہرست خاصی طویل ہے مگر اس میں رگھ دیوتاؤں کا نام نہیں آیا ۔ حال آں کہ چھٹی صدی قبلِ مسیح تک ان کی پوجا ہونے کی شہادتیں موجود ہیں ۔ اِس فروگزاشت سے قطع نظر، رِگ وید کے سب سے دیرینہ اور بزرگ دیوتا ، یعنی اگنی ، اندر، وایو اور ورن مذکور نہیں ۔ برخلاف اس کے بعض ایسے معبودوں کا نام ملتا ہے جن کا ویدوں میں کہیں پتا نہیں ملتا "بدھسٹ انڈیا" کے فاضل مؤلف نے اِن قرائن سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ممالکِ ہند میں اس وقت تک بہت سے لوگ آریوں کے خاص خاص دیوتاؤں کو نہیں مانتے تھے بلکہ صدہا ایسے معبودوں کی پوجا کرتے تھے جن کا آریوں نے نام بھی نہیں سُنا تھا ۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ اس دور میں اہلِ ہند ہزاروں خدا مانتے تھے مگر پرستش کے لیے مندروں کا رواج

نہ ہوتا تھا اور کسی جگہ بھی کھیت یا میدان میں، پروہت دیوتاؤں
کے نام پر بھینٹ چڑھاتا اور پوجا پاٹ کی رسوم ادا کر دیتا تھا
لیکن اوّل تو پروہت کے مطالبات اور قربانی کے اخراجات
رفتہ رفتہ بہت بڑھ گئے دُوسرے مگدھ اور مشرقی اضلاع میں
ایسے گروہ پیدا ہو گئے جو آریا پروہتوں کی تعلیم و تلقین کو غلط
سمجھتے اور ان سے مناظرے کرتے تھے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کی
بعض روایتوں میں اس قسم کی بحث و جدال کا ثبوت ملتا ہے اور
"اُپنشد" یعنی برہمنوں کے علمِ کلام کا آغاز بھی اسی زمانے
میں قرار دیا گیا ہے۔ پھر یہی صدی تھی جس میں برہمنی عقائد کے
خلاف دو مستقل مذہبوں کی بِنا پڑی: ایک جین مت جو سخت
رہبانیت اور اہمسا (یعنی بے آزاری) کو آدمی کی نجات کا ذریعہ
بتاتا ہے اور دُوسرے بودھ مت جس نے اخلاق کی دُرستی،
درویشانہ زندگی اور مختلف مراقبات سے عرفان حاصل کرنے
کی تعلیم دی ہے۔ وہ رُوح کا قائل نہیں اور یورپی تحقیقات
کی رُو سے توحید باریٔ تعالیٰ کا بھی اُس میں کہیں ذکر نہیں
آتا۔ حال آں کہ اُپنشدوں میں آتماں، پرماتماں اور تناسخ یا
آواگون کے دقیق مباحث موجود ہیں۔ برہمنی تعلیمات میں انھی
دنوں اونچی نیچی ذات کی تفریق بھی مذہبی عقائد کا جُز بنتی جاتی تھی
جسے جینی اور بودھ مت والے بالکل تسلیم نہیں کرتے۔

سکندرِ اعظم کی فوج کشی

چھٹی صدی ق م میں مغربی پاکستان کی ہمسایہ سلطنت ایران

کو بڑا فروغ ہُوا۔ فارس کی چھوٹی سی مملکت نے پہلے مدیہ اور پھر بابل کی اشور سلطنت کو تہ و بالا کر دیا۔ شمال میں بحرِ خزر اور دریائے سیحوں تک اس کی حدود وسیع ہوئیں۔ مشرق میں خراسان، ہرات و کافرستان تک ایرانی نسل کے لوگ پھیل گئے۔ ان اقطاع کے ساتھ وادیٔ ہلمند یعنی موجودہ قندھار اور کابل کا علاقہ بھی اسی ہخامنشی (یعنی کیانی) سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ شاہ نامے میں اسفندیار کے ہفت خوانی کارناموں کا ذکر آیا ہو مگر یہ بہادر شہزادہ تختِ شاہی تک پہنچنے سے پہلے رستم زابلی کے دو شاخہ تیر کا نشان بنا دیا گیا ہو۔ کاش کہ فلک پیما فردوسی کی رسائی "ایران زمین" کے اُن کتبات و تماثیل تک ہوتی جو اِصطخر کے قصرِ بےستون میں آج بھی سلامت ہیں اور ان میں یہی اسفندیار، داریوش اوّل (سنہ ۵۲۱ تا سنہ ۴۸۵ ق م) کے لقب سے اپنی فتوحات اور مقبوضات کی کیفیت شاہانہ طمطراق کے ساتھ دُنیا کو سُنا گیا اور اسے یادگار تصویروں سے منقش و منبّت کر گیا ہو۔ بےشبہ وہ اپنے اقبال مند خاندان میں سب سے ممتاز بادشاہ تھا۔ قرینہ کہتا ہو کہ مُلک گیری کے علاوہ زرتشت کے نئے دین کی تبلیغ کا جوش بھی اُسے مہمیز کر رہا تھا۔ غرض اسی نے کوہ سلیمان کی بلندیوں کو عبور کیا اور غالبًا کابل ندی کے ساتھ ساتھ موجودہ صوبۂ سرحد میں داخل ہُوا۔ دریائے سندھ کی دُور تک مساحت کرائی اور کشمیر سے تا ساحلِ بحر اور مغرب میں تقریبًا ستلج اور بیاس تک

پُورا علاقہ جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے، اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اسی کو وہ اپنے کتبے میں "ولایتِ ہند" کے نام سے یاد کرتا ہے اور یہی جغرافی اصطلاح آیندہ بڑھتے بڑھتے تمام ممالکِ ہند پر حاوی ہو گئی۔

اِسی ایرانی فاتح کی جانشینی کا دعوا اگلی صدی میں سکندرِ یُونانی کو "ہند" پر فوج کشی کرنے کا محرک ہُوا۔ حال آں کہ اُس وقت (یعنی سنہ ۳۲۶ ق م میں) یہ علاقے دولتِ ایران سے الگ ہو چکے تھے اور یہاں خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ انھی ریاستوں کی باہمی رقابت یُونانی کشور کُشا کی حلیف بن گئی تکسیلا کے سفیروں نے حدودِ کابل ہی میں اپنے راجا کے تحائف اور اقرارِ اطاعت کی عرضی گزرانی۔ یونانی ہراول کو کشتیوں کا پُل باندھنے میں راجا نے مدد دی اور اسی جگہ (جو آج کل اوہند کہلاتا ہے) بڑھ کر سکندر کا استقبال کیا۔ فروری یا مارچ سنہ ۳۲۶ ق م میں یہ پہلا فرنگی بادشاہ سندھ اُتر کر پنجاب کے علاقے میں داخل ہُوا۔

تکسیلا میں کئی ہزار بچھڑے تیّار کیے گئے تھے اور کئی ہفتے یُونانیوں کی ضیافت اور خاطر مدارات ہوتی رہی۔ معلوم ہُوا کہ اِن علاقوں میں گاؤکشی سے لوگوں کو اُن دنوں کوئی پرہیز نہ تھا اور یُونانی روایات کے بموجب یہاں تعدّد ازدواج اور ستی کی رسم بھی جاری تھی۔ مُردوں کو کُھلی جگہ ڈال دیتے تھے کہ گِدھ کھا جائیں۔ آتش پرستی اور بعض اور مراسم سے اندازہ ہوتا ہے

کہ ایرانی سیادت ختم ہونے کے بعد بھی ایرانی عقائد کا اثر باقی تھا؛
جہلم کے پار ایک اور آزاد ریاست تھی ۔ اس کے راجا کو یونانیوں نے پورس لکھا ہے اور ظاہرا اسی کو بعد کے مسلمان مصنفوں نے فور ہندی کی صورت میں معرّب کر لیا ۔ لیکن کسی سنسکرت یا ہندی کتاب میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا ۔ یونانیوں کے بہ قول وہ بہت بڑی فوج اور کئی سو جنگی ہاتھی مقابلے میں لایا تھا مگر ہاتھیوں نے زخمی ہو کر اپنی فوج کو زیادہ نقصان پہنچایا اور پیادوں کے بھدّے اسلحہ یونانی تیر اندازوں کے سامنے کام نہ دے سکے ۔ پورس زخمی ہو کر میدان سے نکل جانا چاہتا تھا، مگر سکندر نے سوار دوڑا کر اُسے پکڑوا بُلایا اور بہت مہربانی سے پیش آیا ۔ اس کا علاقہ واگزاشت کیا اور اسے اپنا وفادار حلیف بنا لیا ۔ یہ لڑائی جون یا جولائی سنہ ۳۲۶ ق م میں کشمیر کے سرحدی پہاڑوں کے نیچے اس میدان میں ہوئی جو اب کری کا میدان کہلاتا ہے ۔ سکندر نے فتح کی یادگار میں یہاں ایک قصبہ نکایا بسایا تھا مگر وہ بالکل بے نشان ہو گیا ۔ البتہ اپنے عزیز گھوڑے کے نام پر جو یہیں مرا ایک اور بستی بوکفالیہ بسائی تھی ۔ اس کے کھنڈر شہر جہلم کے قریب دریافت ہوئے ہیں۔ سکندر کا ایک سکہ بھی ملا جس کے ایک طرف مقدونی سوار بھاگتے ہاتھی کا پیچھا کر رہا ہے اور دوسرے رُخ سکندر کی برق بہ دست شبیہ بنائی ہے ۔ بعض اہلِ نظر خیال کرتے ہیں۔ کہ یہ بھی جنگ پورس کی یادگار میں کندہ کرایا گیا ہوگا ۔ جہلم

کے آگے دو ایک معرکے ہوئے۔ ایک قلعہ سر کرنے میں بڑی زحمت پیش آئی لیکن عجب نہیں کہ مقدونی سپاہ کو سب سے زیادہ پنجاب کی برساتی گرمی نے بے حواس اور بد دل کر دیا ہو کہ بیاس سے آگے جانے سے اُس نے انکار کر دیا اور سکندؔر کو مجبوراً پورس کے علاقے میں واپس آنا پڑا۔ پھر کئی سو کشتیوں کا بیڑا جمع کر کے وہ جہلم کے راستے ساحل کی طرف روانہ ہُوا۔ راستے میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ راوی اور جہلم کے سنگم پہ ایک قلعہ لینے میں خود سکندر نے سخت زخم کھایا۔ یونانیوں نے اہلِ قلعہ کو مالوی موسوم کیا ہے۔ اور مہابھارت کا مالو نام ان کی تصحیح و تصدیق کرتا ہے۔

آگے سندھ میں کئی آزاد ریاستیں ملیں اور سکندر سات مہینے تک یہاں تیغ زنی بلکہ قتلِ عام کراتا رہا۔ چناں چہ یونانی روایات کے بہ موجب صرف جنوبی سندھ میں کم و بیش اسی ہزار باشندے قتل ہوئے اور بے شمار مرد و عورت غلام بنا کے بیچ دیے گئے[1]۔

واپسی اور اثرات

خُدا خُدا کر کے یہ طغیانی جس کا اُتار چڑھاؤ سے زیادہ خوف ناک تھا، یہاں سے دفع ہوئی (اکتوبر سنہ ۳۲۵ ق م) پٹالا بندر سے جو دریائے سندھ کے مثلثی دہانے کے نقطۂ راس پہ واقع تھا، سکندر نے واپس کوچ کا حکم دیا اور ایک بحری سردار کو بیڑے کے ساتھ روانہ کیا کہ ساحل کے قریب

---

[1] ارلی ہسٹری اوف انڈیا، ص۱۰۱

قریب چل کر خلیج فارس سے فرات کے دہانے تک پہنچ جائے۔ اور بحری سفر کی مفصّل رُوداد پیش کرے۔ خود سکندر بلوچستان کے راستے ایران چلا تھا، لیکن بھٹک کر مکران کے ریگستان میں جا پھنسا۔ چند روز لشکر نے بڑی مصیبت جھیلی۔ چنانچہ سفر میں اتنے آدمی ضائع ہوئے کہ وادئ سندھ کے سارے معرکوں میں اتنے نہیں مارے گئے تھے۔ لوٹ کا جس قدر مال ہاتھ لگا تھا۔ وہ سب اسی ریگستان کی بھینٹ چڑھا اور بڑی مشکل سے یونانی لشکر کرمان کے قدیم صدر مقام پورا (موجودہ بام پور) تک پہنچ سکا۔ بھوک پیاس کے مارے سپاہیوں لے کئی ہفتے یہاں آرام لیا۔ پھر ہلکی ہلکی منزلیں طے کرتے ہوئے مئی سنہ ۳۲۴ ق م میں ایران کے پایۂ تخت اصطخر میں پہنچ گئے۔[1]

سکندر کو پاکستان سے پیٹھ پھیرتے دیر نہ ہوئی تھی کہ اس کے نئے مقبوضات میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ دریائے سندھ کے مشرق میں اس نے کسی علاقے کا الحاق نہیں کیا تھا لیکن موجودہ صوبۂ سرحد اور سندھ میں دو صوبے بنا کے یونانی والی مقرر کر دیے تھے۔ اس کی ہندی پاکستانی مہم میں تقریباً تین برس صرف ہوئے مگر یہاں سے رُخصت ہوئے تین ماہ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ شمالی صوبے کے اجیر سپاہیوں

---

[1] بیوری: تاریخِ یونان، جس کے آخری باب میں اس سفر کے مصائب اور نقصانات کو یونانی تاریخوں سے بتفصیل نقل کیا ہے۔

نے سازش کی اور یونانی حاکم کو مار ڈالا ۔ پھر، ان بعید علاقوں پر قبضہ رکھنے کی جو تدبیریں زیرِ غور تھیں، ان پر عمل کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ اگلے سال دُنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے والا ہی موت کی نیند سو گیا (جون سنہ ۳۲۳ ق م) اور مقبوضات ایک طرف، اُن یونانیوں تک کا جنھیں سکندر نے اپنے نوآباد پاکستانی شہروں میں بسایا تھا، نام و نشان باقی نہ رہا۔

یورپ کے بعض مصنف سکندر کے اس حملے کو عجیب و غریب کارنامہ بتاتے اور اس کی تعریف میں مضحکہ انگیز مبالغے کرتے ہیں ۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے مگر اتنا یقینی ہے کہ سکندر کے حملے کا ممالکِ ہند کے تمدن و معاشرت یا نظامِ سیاست، حتیٰ کہ فنِ جنگ اور اسلحہ پر بھی کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا ۔ تاہم وہ اِس غیر تاریخی دَور کا پہلا واقعہ ہے جس کی صحیح تاریخ ہمیں معلوم ہوئی ۔ دُوسرے اہلِ مغرب کو پہلی دفعہ پاکستان و ہند کے تین برّی اور ایک بحری راستے کا عِلم ہُوا جن سے وہ تجارت یا سیاحت کرتے یہاں آ سکتے تھے ۔ سکندر کے بعد باختر (یعنی بلخ) میں جو نیم یونانی سلطنت قائم ہوئی وہاں کے بادشاہ انھی سکندری فتوحات کی بِنا پر مغربی پاکستان کی وراثت کا دعوا کرتے تھے ۔ اِس طرح ان مُلکوں کا بیرونی دُنیا سے رابطہ ضرور پیدا ہوگیا اور آئندہ اوراق میں ہم ایک یونانی سفارت کا حال پڑھیں گے جس کے ذریعے مگدھ کے پائے تخت کے متعلق بہت سی معلومات حاصل

ہوئیں ۔

موریا خاندان

کچھ مدت ہوئی ریاست میسور کے سرکاری کتب خانے سے کتاب "ارتھ شاستر" کا قلمی نسخہ برآمد ہوا ۔ یہ سنسکرت زبان کا "سیاست نامہ" یعنی اصولِ حکم رانی پر بہت دل چسپ رسالہ ہے ۔ اِس کی تصنیف کو راجا چندر گپت کے وزیر کوتلیا (چانک) سے منسوب کرتے ہیں ۔ اس شخص کی نسبت بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ وہ جس قدر بدسرشت تھا، اسی قدر بد صورت تھا ۔ وہ حکومت کے لیے ہر قسم کے مکر و فریب اور جبر و تعدی کو جائز قرار دیتا ہے اور شاید اسی وجہ سے چندر گپت کی بد اعمالیاں اسی کے نامۂ اعمال میں لکھ دی گئی ہیں[1] اتنی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ چندرگپت نے جو نند خاندان کی کسی ادنا عورت کے بطن سے تھا سازش اور چالاکی سے تختِ شاہی پر قبضہ کیا اور حملۂ سکندری کے بعد ہی مگدھ میں بڑی وسیع سلطنت قائم کرلی (سنہ ۳۲۱ ق م) سکندر کی سلطنت کو یونانی سرداروں نے آپس میں لڑ جھگڑ کر بانٹ لیا تھا ۔ عراق ، ایران اور باختر ، سل یوکوس کے حصے میں آئے اور اس نے ولایت "ہند" پر فوج کشی کی لیکن چندرگپت نے اسے شکست دی ۔ سل یوکوس کو دب کر صلح کرنی پڑی اور اس نے یہ علاقے چندرگپت کے حوالے کر دیے ۔ دوستانہ تعلقات

---

[1] "اوکس فورڈ ہسٹری" صفحہ ۷۵ وغیرہ

جوڑنے کے لیے شاید اپنی ایک بیٹی سے راجا کا پیوند کر دیا۔ پھر مگاس تھنیز کو سفیر بنا کے پاٹلی پترا بھیجا جس نے "ہند" کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ وہ ناپید ہو گئی البتہ اس کے اقتباسات دُوسری یُونانی کتابوں کی وساطت سے ہم تک پہنچے اور اس عہد کے متعلق بہت قیمتی ماخذ مانے جاتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مگدھ کے علاوہ اُن دنوں مشرق میں کلنگا اور جنوب میں تل کٹا اور آندھرا کی طاقت ور حکومتیں قائم تھیں مگر افسوس ہے پاٹلی پترا کے سوا، شمالی ہند یا پاکستان کے اور شہروں کا کچھ حال یُونانی کتابوں میں درج نہیں۔ صرف چندر گپت اور اس کے پائے تخت کی خاصی تفصیلی کیفیت مگاس تھنیز سے منقول ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ راجا محل کے اندر اپنی خواصوں میں گھِرا رہتا تھا مگر دن میں ایک دفعہ ضرور باہر آتا اور مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ اسے شکار اور ہاتھی گینڈے، سانڈ اور مینڈھے کی لڑائی دیکھنے کا بہت شوق تھا اور کبھی کبھی اس کے سامنے پہلوانوں کی کُشتیاں ہُوا کرتی تھیں ؛

شاہی محلات ایرانی طرز کے بنے ہُوئے لیکن آرائش میں ایرانی محلوں سے بڑھے چڑھے تھے۔ شہر کی آبادی عرضاً کم مگر طوُلاً دُور تک پھیلی ہُوئی تھی۔ اس کے گرد پتّھر کے بجائے شہتیروں کی مضبُوط شہر پناہ بنائی گئی تھی۔ ۶۴ دروازے اور کئی سو بُرج تھے۔ سامنے بہت گہری اور چوڑی خندق سون کے پانی سے بھری رہتی تھی۔ شہری انتظام کے لیے کئی مجلسیں قائم تھیں۔ اہلِ شہر کی

ولادت و اموات تک کے اعداد جمع کیے جاتے تھے۔ ملک میں جرائم کم لیکن سزائیں بہت سخت تھیں۔ اصولاً آنکھ کے بدلے آنکھ کان کے بدلے کان، کا قانون رائج تھا اور معمولی قصور پر اعضا کی قطع و برید جائز سمجھی جاتی تھی۔ ایک عجیب سزا یہ تھی کہ خاطی کا سر مونڈ دیا جائے! لیکن ارتھ شاستر کی تعزیرات کا سب سے خوف ناک حصّہ وہ ہے جس میں اقبالِ جُرم کرانے کے لیے ملزم کو اذیت دینے کی اٹھارہ شکلیں بیان کی گئی ہیں!

مگاس تھنیز کے بعض اقوال مشکوک ہیں۔ تاہم مگدھ کے وسیع اور باضابطہ سلطنت ہونے میں کوئی شک نہیں اور اس کا بانی تاریخِ ہند کا پہلا مسلّم الثّبوت بادشاہ ہے اگرچہ قرینہ کہتا ہے کہ نہ نسلاً وہ آریا تھا نہ مذہباً برہمنی مت کا معتقد۔ جینی اسے اپنے مذہب کا پیرو بتاتے ہیں اور انھی کی روایت ہے کہ اس نے چوبیس برس حکومت کرنے کے بعد دُنیا ترک کر دی۔ کسی گُرو کے ساتھ دکن کے جنگلوں میں نکل گیا اور وہیں فاقہ کشی کر کے اپنی جان دی! (سنہ ۲۹۸ ق م)

چندرگپت کے بعد اس کا بیٹا بندوسر تخت نشین ہُوا۔ اُس کے نام اور سنین میں بھی اختلاف ہے لیکن بہ ظاہر حکومت میں کوئی ضعف نہیں آیا اور جب وہ مرا تو اس کا فرزند اسوکا یا اشوک ایک وسیع اور طاقت ور سلطنت کا وارث ہُوا۔ (سنہ ۲۷۲ ق م)

وہ قدیم ہند کا سب سے مشہور فرماں روا گزرا ہے۔ اس کے بہت سے حالات ہمیں اُن عجیب کتبات سے معلوم ہوئے، جنھیں

چٹانوں یا پتّھر کی لاٹھوں پر اس نے کندہ کرایا تھا۔ ان میں اس کے احکام اور اخلاقی تعلیم درج ہی۔ اور ان کا دُور دُور پھیلا ہونا ظاہر کرتا ہی کہ غالبًا کشمیر سے میسُور اور گجرات سے آسام تک اسی کی عمل داری تھی۔ بعض اہلِ تحقیق موجُودہ افغانستان اور پاکستان کو سلطنت اشوک میں شامل سمجھتے ہیں اگرچہ مغربی پنجاب کے آگے کوئی اشوکی کتبہ دریافت نہیں ہُوا۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ جہاں سے ایسا کتبہ نکلے وہ علاقہ مگدھ کی سلطنت میں ضرُور داخل ہو۔

لیکن اشوک کی نام وری کا سبب مُلکی اقتدار نہ تھا بلکہ اس کی نیکی اور نیک نیّتی کہ بودھ مت کا پُرجوش پَیرو بن جانے کے بعد اُس نے اپنی زندگی کا مقصد "دھرم" یعنی حق شناسی کی اشاعت قرار دیا اور ایسے الفاظ میں جن سے صداقت ٹپکتی ہی، یہ اعلان کیا کہ:

> "رعایا کی خدمت میرا فرض ہی۔ میری زندگی کام کے لیے ہی...... مجھ سے پہلے بھی اکثر بادشاہوں نے رعایا کو آرام پہنچایا لیکن میری کوشش کی غایت یہ ہی کہ لوگ پرہیزگاری کے قانون پر عمل کریں"۔

اس حق شناسی کے قانون کی کتبات میں جگہ جگہ صراحت کی گئی ہی جس کے بنیادی عقیدے تین تھے:-

(۱) اہنسا۔ یعنی کسی جان دار کو تکلیف نہ دینا۔

(۲) والدین، اُستاد اور بزرگوں کی اطاعت۔

(۳) راست بازی :

مذہبی قوانین پر عمل کرانے کی غرض سے ایک محکمۂ احتساب قائم تھا اور سرکاری عہدہ داروں کا فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہر جگہ جلسے کر کے لوگوں کو دھرم کی تعلیم دیں۔ اسی مذہبی جوش کا اقتضا تھا کہ اشوک نے بیرونی مُلکوں میں بودھ مت کے داعی بھیجے اور کچھ شک نہیں کہ اسی بادشاہ کی کوشش سے کم از کم ایشیا کے کئی مُلکوں میں یہ مذہب شائع ہوا اور اپنے وطن سے گم ہو جانے کے باوجود ابھی تک لنکا، برما، تبت، ممالکِ چین و جاپان وغیرہ میں اس کے کروڑوں ماننے والے موجود ہیں۔

چٹانوں کے کتبات چھوڑ کر، وہ مینار یا لاٹھیں جن پر کتبے کندہ کرائے گئے، ہند کی قدیم سنگ تراشی کا لاجواب نمونہ ہیں۔ ان میں سے بعض ۱۶، ۱۷ گز تک لمبی ہیں اور گول پتّھر کو تراش کر بہت گہری نصب کی گئی تھیں۔ انھی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ اشوک میں پتّھر سے عمارتی کام لینے کا رواج خوب ترقّی کر گیا تھا ورنہ پہلے محلّاتِ شاہی تک میں زیادہ تر لکڑی استعمال کرتے تھے۔

اشوک کے سنِ وفات کا ٹھیک پتا نہیں چلتا نہ اس کے وارثوں کا صحیح حال معلوم ہے۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہ دین دار تاج دار سنہ ۲۳۶ ق م میں فوت ہُوا اور اس کے انتقال کے بعد ہی موریا خاندان کو زوال آگیا۔ تقریباً دو سو برس تک یہاں سنگا اور کانوا خاندان کے راجا حکومت کرتے رہے۔

اور اس کے بعد دکن کے آندھرا خاندان نے بڑی قوت حاصل کی اور غالباً مگدھ کو بھی اپنا باج گزار بنا لیا ۔

آندھرا حکومت کا مجمل ذکر مگاس تھنیز یونانی کی تحریروں میں آیا ہے جو وسطِ ہند اور شمالی دکن میں کافی وسیع اور قوی تھی ۔ اس کا پایۂ تخت پرانشٹان دریائے گوداوری کے کنارے واقع تھا اور آج کل پٹن کے نام سے ضلع اورنگ آباد کا ایک ویران قصبہ رہ گیا ہے ۔ جنوبی ہند میں پانڈیا ، چیرا ، چولا کی آزاد ریاستیں قائم تھیں ۔ ان کی بحری تجارت اور دولت‌مندی کی شہادتیں ملتی ہیں لیکن تاریخی حالات مفقود ہیں ۔

نیم یونانی بادشاہ

جس زمانے میں اشوک دنیا کو اہمسا اور بے آزاری کا وعظ سنا رہا تھا ، اس کے مغربی ہم‌سایہ ممالک میں خوں‌ریزی ہو رہی تھی ۔ سلیوکس یونانی کا پوتا انتیوکس جو شام و عراق ، ایران و باختر میں دادا کا وارث ہوا ، اپنے آپ کو " خداوند " کہلواتا اور سجدہ کراتا تھا ، حال آں کہ بیرونی حریف ایک طرف ، اندرونی سرکشوں ہی کو قابو میں رکھنے کی قابلیت نہ تھی ۔ باختر کا والی اور پارتھیہ (یعنی خراسان) کی رعایا اس سے منحرف ہو گئی ۔ باختر اُن دنوں بدخشاں اور شمال مشرقی افغانستان پر مشتمل تھا ۔ یہاں ایک نیم یونانی سلطنت قائم ہوئی ۔ پارتھیہ کے جنگ جو اشکان کی قیادت میں یونانی تسلط سے آزاد ہوئے اور اسی نے دولتِ اشکانیہ کی بنیاد ڈالی ۔ " شاہ نامے " کی ایرانی

روایتوں میں ان بادشاہوں کی حکومت اور مدت کو بہت کم بتایا گیا ہے لیکن درحقیقت یہ پارتھی (یا پہلوی) خاندان پان سو برس تک بڑی شان کے ساتھ ایران میں بادشاہی کرتا رہا۔ ان دونوں نئی حکومتوں میں پہلے باختر کے یونانیوں نے کابل و قندھار پر اور پھر اقطاعِ پاکستان پر قبضہ جمایا اور تقریباً دو سو برس تک وادیٔ سندھ میں جولانیاں دکھاتے رہے۔ کبھی کبھی وہ جمنا بلکہ دوآب کے علاقوں میں چھاپے مارتے تھے۔ اور بعض شواہد سے نربدا تک ان کے پہنچنے کا سُراغ ملتا ہے۔ ان میں سب سے مشہور بادشاہ مناندر گزرا ہے جس نے کابل کو مستقر بنا کر تقریباً سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ (تخمیناً سنہ ۱۵۰ ق م) پاکستانی علاقوں سے جو سکے دستیاب ہوئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں دوسری اور پہلی صدی قبلِ مسیح میں کئی نیم یونانی ریاستیں بنیں جو اپنی اپنی جگہ خودمختاری کا دعوا کرتی تھیں۔ بودھ اور ہندو مت کی قدیم کتابوں میں ان حملہ آوروں کا "یَوَن" (یا یونا) کے نام سے تذکرہ آیا ہے اور گو ان کی تحریری تاریخ محفوظ نہیں رہی تاہم فنونِ عمارت و سنگ تراشی اور دوسری صنعتوں میں ان کے اثرات باقی رہ گئے۔ بعض باختری سکوں میں مقامی زبان کے الفاظ یونانی حروف میں تحریر ہیں۔ ممکن ہے یہ اسی قسم کی کوشش ہو جیسی قریب زمانے میں انگریز اُردو کو رومن تحریر میں رواج دینے کے لیے کرتے رہے۔ بعض سکوں میں مقامی زبان برہمی رسم الخط میں ملتی ہے جس کے بعد کی صورت موجودہ دیوناگری

ہو۔[1]

تاتاری اقوام اور کشان بادشاہ

انھی نیم یونانی ملوکِ طوائف کے زمانے میں ایران کے اشکانی بادشاہوں نے قندھار و بلوچستان بلکہ موجودہ صوبہ سرحد پر قبضہ کر لیا اور ان کا ایک صوبہ دار ٹک سیلا میں مقرر ہوا۔ لیکن پہلی صدی ق م میں یوچی اور سکا قوموں کا ٹڈی دل وسطِ ایشیا سے آیا اور بلخ و بدخشاں کے علاقوں میں پھیل گیا۔ ترکستان و باختر سے یونانیوں کو یوچیوں نے نابود کیا اور مشرقی ایران و مکران پر سکا قوم کے لوگ قابض ہو گئے۔ سکستان (سجستان اور آخر میں سیستان) اسی قوم کی نقلِ مکانی کی یادگار ہے۔ معلوم ہوتا ہے سندھ کے راستے سے یہ لوگ گجرات اور مالوہ میں پہنچ گئے، جہاں صدیوں تک ان کے والیوں اور حاکموں کا تسلط پایا جاتا ہے لیکن شمال میں یوچیوں کی شاخ "کشان" کو غلبہ حاصل ہو گیا اور انھوں نے پہلی صدی عیسوی میں ایک زبردست سلطنت قائم کی جس کا پائے تخت پرش پور یعنی ہمارا پشاور تھا اور ترکستان، افغانستان، مغربی پاکستان کے علاوہ شمالی ہند کے اقطاع شہر بنارس کے آگے تک زیرِ نگیں ہو گئے تھے۔ ان میں کنشک اور اس کا فرزند ہوشک بڑے طاقت ور بادشاہ گزرے ہیں لیکن زیادہ شہرت کنشک یا کنش کا کو نصیب ہوئی جو علم و فن کا مربی اور بودھ مت کا سرپرست تھا۔ وہ چالیس

---

[1] اوکسفورڈ ہسٹری، صنعا وغیرہ۔

برس کے قریب بادشاہی کر کے سنہ ۱۶۲ ء کے قریب فوت یا اپنے سرداروں کے ہاتھ سے ہلاک ہُوا اور اس کے بیٹے کے بعد خاندانِ کُشان کی قوت میں زوال آگیا۔ سلطنت کئی آزاد ریاستوں میں بٹ گئی۔ پنجاب و کابل میں چوتھی صدی عیسوی تک کشان یا "شاہی" خاندان کے فرماں روا حکومت کرتے رہے، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ وہ ایران کے ساسانی بادشاہوں کے خراج گزار بن گئے تھے۔ یہ ساسانی پارتھیوں کے جانشین ہوئے تھے اور ان کے اولوالعزم بادشاہوں نے عہدِ کیانی کی یاد تازہ کر دی تھی۔ تیسری صدی عیسوی میں بہرام گور ساسانی کے مغربی پاکستان و ہند پر حملوں کا پتا چلتا ہے مگر تفصیل نہیں ملتی۔ ایک اور شہادت رومی تاریخوں میں رہ گئی ہے کہ جب شاپور ثانی نے ۳۶۰ء میں قلعۂ دیار بکر پر رومیوں کو شکست دی تو ہند کے ہاتھی اور کُشان خاندان کا راجا ایرانی لشکر کے ساتھ تھے۔

کُشانیوں کی تاریخ صحت و تفصیل سے محفوظ نہ رہنے کا اِس لیے اور بھی افسوس ہوتا ہے کہ ایک اعتبار سے یہ پاکستانی سلطنت تھی۔ دُوسرے نسل و نژاد اور مزاج کی اُفتاد میں یہ لوگ کسی قدر تیموری بادشاہوں سے مشابہ ہیں اور کئی باتوں میں کنشک اکبر بادشاہ کا نقشِ اوّل نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ وہ کئی یونانی اور زرتشتی دیوتاؤں کا پرستار تھا اور اسی مخلوط گروہ میں ہندی دیوی دیوتا شریک کر لینے میں اسے کچھ تکلّف نہ تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے اس کی عنایت و عقیدت کا اصلی مورد بودھ مت رہا اور اس

مذہب کے علما کی ایک بڑی مجلس بھی اُس نے کشمیر میں منعقد کرائی جیسی کئی سو برس پہلے اشوک کے ایما سے پاٹلی پتر میں ہوئی تھی۔ مجلسِ مذکور کے مباحث کا مجموعہ چینی زبان میں محفوظ ہے۔ اسے سیاسیات سے تعلق نہ تھا اور اس کے مشاورات نے مناظرات کی صورت اختیار کرلی تھی مگر ان کے مطالعے سے اُس انقلاب کا پتا چلتا ہے جو بودھ مت کے عقائد میں پیدا ہو گیا تھا۔ ضمناً لوگوں کے دماغی اور اخلاقی حالات روشنی میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ اوّل تو ایک بڑا تغیّر یہ واقع ہُوا کہ بودھ مت کے پیرو اب اپنے مذہب کے بانی کو خُدائی صفات سے متصف جاننے اور اس کا باقاعدہ بُت بنا کے پُوجا کرنے لگے تھے۔ دوُسرے اُن کے علما میں بہت سے اندرونی اختلافات اور ملحدانہ فرقے پیدا ہو گئے جو ایک دوُسرے پر سبّ و شتم کرتے رہتے تھے۔

بودھ مت کے تین مشہور شارح کنشک کے عہد میں گزُرے ہیں۔ اور ہندی طب کا نامی مصنّف چرک بھی اسی سرکار کا ملازم تھا۔ بعض اہلِ تحقیق کا گمان ہے کہ اس نے حکیم بقراط کی طبّی تصانیف سے استفادہ کیا ہوگا کیوں کہ پاکستان و باختر میں اُن دِنوں یوُنانی اور نیم یوُنانی صاحبانِ علم و فن موجود تھے۔ پشاور و ٹکسیلا کے کھنڈروں سے جو بُت برآمد ہوئے وُہ مُنہ سے بولتے ہیں کہ اِس فن پر یوُنانی سنگ تراشی کا بڑا اثر پڑا تھا۔ گوتم بودھ کے بعض مجسّمے یوُنانیوں کے اپالو دیوتا کا مثنّیٰ

ہیں ۔ اور کشانی سکّوں پر خود یونانی دیوتاؤں کی تصویریں کندہ ہیں ۔ طرفہ تر یہ کہ گو کشان بادشاہوں کی زبان پہلوی سے قریبی تعلّق رکھتی تھی لیکن سکّوں پر وہ اپنے نام یا الفاظ یونانی حروف میں کندہ کراتے تھے ۔ اور کنشک نے شاید رومی بادشاہوں کا لقب "قیصر" بھی اختیار کر لیا تھا ؛

مغربی افکار و اثرات کے نفوذ کا ایک اور قوی سبب بیرونی تجارت کو سمجھنا چاہیئے کہ مُلکِ شام کا قدیم شہر پامیرا (= تدمُر) ان دنوں مشرق و مغرب کی تجارت کا مرکز بن گیا تھا اور وہاں سے کئی راستے ایران ہو کر مغربی پاکستان تک آتے تھے بلکہ چین کا تجارتی مال انھی راستوں سے گزر کر شام و مصر اور جنوبی یورپ میں پہنچتا تھا ۔ اِن برّی راستوں کے علاوہ یہی زمانہ ہے جب کہ بحری تجارت نے فروغ پایا اور موسمی ہَوا یا "مون سون" کے سہارے بادبانی کشتیوں کو سواحلِ ہند تک لانے کا فن عرب ملّاحوں نے سیکھ لیا ۔ سلطنتِ رُوما کے تاجر بھی اُن کے ذریعے اپنا مال بھیجتے اور جنوبی ہند سے گرم مسالے ، موتی اور جواہرات منگواتے تھے ۔ حالیہ کھُدائیوں میں رُومی قیصروں کی بہت سی پُرانی اشرفیاں ساحلِ ملیبار کی قدیم بندرگاہوں سے دست یاب ہوئیں اور لاطینی تصانیف میں کورو منڈل کی بندرگاہوں کا تذکرہ بلا گو کہ سمندر کے پیچھے ہٹ جانے کی وجہ سے ادھر کے ساحلی مقام خشکی میں رہ گئے اور اب ویران کھنڈر ہو گئے ہیں ؛

گپتا خاندان

چوتھی صدی عیسوی میں مگدھ نے دوبارہ عروج حاصل کیا۔ موریا خاندان کے بانی کی طرح نئے خاندانِ شاہی کے بانی کا نام بھی چندرگپت تھا۔ یہ خاندانِ "گپتا" پہلے سے موجود تھا مگر حکومت بالکل محدود تھی۔ سلطنت کا مرتبہ چندرگپتا کے عہد میں نصیب ہوا جس نے پٹنہ سے الہ آباد تک اپنا علاقہ بڑھایا اور اپنے نام کا سمت الگ جاری کیا۔ یہ فروری سنہ ۳۲۰ ء سے شروع ہوتا ہی اور کئی صدی تک شمالی ہندوستان میں رائج رہا۔ مگر چندرا سے بھی زیادہ شہرت اُس کے بیٹے سمدرا نے پائی جس کا نام اور حالات قریب زمانے میں ایک اشوکی لاٹھ پر کندہ ملے ہیں۔ ہندوؤں یا بودھ مت وغیرہ کی کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا مگر الہ آباد میں راجا اشوک کے قدیم کتبے کے دوسری طرف سمدرا گپتا کے درباری بھاٹ ہریشن کا ایک قصیدہ کھودا گیا تھا جسے بہت دنوں تک لوگ اشوک ہی کے متعلق سمجھتے رہے۔ ہریشن اپنے ممدوح کو سَو لڑائیوں کا سورما بتاتا ہی اور لکھتا ہی کہ اِس کے جسم پر تیر و تبر کے اتنے ہی زخموں نے گل کاری کی تھی۔ پھر اس کی فتوحات کی فہرست دی ہی جسے صحیح مانا جائے تو سمدرا کا راج نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن کے علاقوں تک پھیل گیا تھا۔ فتوحات کی یادگار میں اس نے "اشو میدھ" یعنی اسپ قرباں کا جشن منایا۔ لنکا اور جمنا پار پاکستان کے کشانی بادشاہوں سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ دور

دُور سے اہلِ علم و فن اس کے دربار میں پہنچے کیوں کہ وہ نہ صرف قدردان و مربّی بلکہ بہ قول ہریشن ، اعلا درجے کا شاعر تھا اور "گانے کے فن میں اندر دیوتا کا اُستاد اس کے آگے کان پکڑتا تھا" اس قول کی تصدیق میں بعض سکّے حال میں سمدرا سے منسوب کیے گئے ہیں جن میں راجا پاؤں لٹکائے دو تارا لیے بیٹھا ہی۔

مگر علم و ادب کی قدردانی میں سمدرا کا جانشین بیٹا بکرماجیت باپ سے بڑھ گیا کہ اس کے دَور میں معیاری سنسکرت رتبۂ کمال کو پہنچی ۔ پُرانوں کا پہلا مجموعہ مرتّب ہُوا ۔ ہیأت و ہندسہ پر آریا بھٹ نے اعلا درجے کی کتابیں لکھیں اور ہند کے زندۂ جاوید شاعر کالی داس نے قریب قریب اسی زمانے میں اپنی لاجواب تمثیلات تصنیف کیں ۔ بلکہ بعض روایتوں میں اسے بکرماجیت کے "نورتن" کا ایک ہیرا بتایا گیا ہی۔

افسوس ہی کہ اِن راجاؤں کے واقعاتِ زندگی اور سنین بلکہ ناموں تک کا ٹھیک پتا نہیں چلتا لیکن مجموعی طور پر یہی تیسری چوتھی صدی عیسوی کا زمانہ ہندوؤں کا "عہدِ زرّیں" کہا جاتا ہی جس میں برہمنی مت نے دوبارہ عرُوج حاصل کیا ۔ فنونِ لطیفہ اور صناعات نے بڑی ترقّی پائی ۔ نقّاشی میں اجنتا کے مندروں کی بعض تصاویر اور الورہ کے چند کوہ تراش دیول اسی عہد کی یادگار ہیں مگر چند بہت پہلے اور چند مُدّت کے بعد تیار ہُوئے تھے۔

عہد گپتا کا سب سے مشہور سنگی مندر دیوگڑھ ضلع جھانسی

میں سلامت ہے اور اس کی دیواروں پر سنگ تراشی کے نفیس نمونے پائے جاتے ہیں - ایک وسیع ترخشتی عمارت بھیتر گاؤں ضلع کان پور کا مندر ہے جو غالباً بکرماجیت (چندر گپتا ثانی) کے عہد میں بنا تھا۔ پتھر کے کاموں کی طرح دوسری دھاتوں کی صنعتوں میں جو ترقی ہوئی اس کا ایک نمونہ دِلّی کی لوہے کی لاٹھ ہے کہ سمدرا گپتا کے زمانے میں ڈھالی گئی تھی - گوتم بودھ کی تانبے کی ایک بہت بڑی مورت بھی سلطان گنج کے مندر سے نکلی اور برنگھم کے عجائب خانے میں رکھی ہے - یہ بکرماجیت کے عہد میں تیار کی گئی تھی ؛

فاہیان چینی کے مشاہدات

گپتا کا درخشاں دور بھی تاریخ کی نظر میں تاریک ہے - بارے ایک چینی سیّاح کی ہم عصر شہادت راستہ دکھاتی ہے - یہ فاہیان کا سفر نامہ ہے جو بودھ مت کے مقدّس مقامات کی زیارت اور کتابوں کی تلاش میں دیوارِ چین کے پار سے چلا اور کوہ و صحرا طے کرتا ہُوا افغانستان پہنچا جہاں اُن دِنوں بودھ مت کا دَور دَورہ تھا - پھر وادئ سندھ سے گزر کر سنہ ۴۰۲ ء کے قریب ہند میں داخل ہُوا اور دس برس اپنے مذہب کی اسی " مرکزی اقلیم" میں مختلف مقامات کی زیارت و سیاحت کرتا رہا - لنکا میں بودھ مت کی کئی کتابوں کی نقل حاصل کی - وہاں سے جہاز میں جاوا ہوتا ہُوا واپس وطن پہنچ گیا اور ہمارے لیے اپنا سفرنامہ یادگار چھوڑ گیا۔ ایک فرنگی مستشرق کے الفاظ میں " اس کتاب سے ہر جگہ اس کے مذہبی شغف اور علم و فراست کا اندازہ ہوتا ہے اور ہر چند

کہیں کہیں خوش اعتقادی نے اسے اعتدال سے ہٹا دیا ہو لیکن جو کچھ اس نے لکھا وہ نہایت صحت و احتیاط کے ساتھ لکھا اور اس کے اکثر مقاماتِ سفر کا بہ آسانی پتا چل جاتا ہے"۔

فاہیان دُنیاوی یا سیاسی مسائل کی طرف توجّہ نہیں کرتا اور اس نے ہند کے فرماں رواؤں تک کے نام نہیں لکھے۔ تاہم اس کے سفرنامے سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان و ہند کے اکثر حِصّوں میں عام آسودگی پائی جاتی تھی۔ عمّال کو رعایا کے ستانے کا موقع دینے والے قوانین و ضوابط کم تھے۔ معمولی جرائم کی سزائیں ہلکی تھیں اور عمُوماً جرمانے پر اکتفا کی جاتی۔ رہزنی کی سزا میں عدالت مجرم کا دستِ راست قطع کرا سکتی تھی مگر اس انتہائی تعزیر کی نوبت کم آتی تھی۔ مُلک میں جرائم کی کمی تھی۔ راستے خاصی طرح محفوظ تھے۔ کم از کم فاہیان پر لُٹ جانے کی مصیبت نہیں پڑی جیسی تین صدی بعد اس کے ہم وطن ہوانگ چوانگ (= ہوئین تسانگ) کو بار بار پیش آئی۔ اگرچہ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فاہیان درویش آدمی تھا اس کے پاس ایسا اثاثہ ہی نہ ہوگا کہ کوئی لوٹنے کی کوشش کرتا۔

بودھ مت کے متعلق یہ سیّاح بیان کرتا ہے کہ اس کے قوانین ہر جگہ جاری ہیں۔ جان داروں کو مارنا، ستانا حتیٰ کہ لڑائی کے مُرغ پالنا بھی مذموم سمجھا جاتا ہے۔ بودھ مت کے درویشوں کی لوگ تعظیم تکریم کرتے ہیں اور مذہبی اوقاف کی آمدنی کے علاوہ انھیں ہر دولت مند آدمی خیرات دینا موجبِ ثواب جانتا ہے"۔

فاہیان نے شمالی ہند سے بھی زیادہ مغربی پاکستان میں بودھ مت کی خانقاہوں کو بارونق پایا جن میں ہزاروں بھکشو اس مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے؛

واضح رہے کہ ان مشاہدات میں ایک مذہبی عقیدت مند کے حُسنِ ظن کو کافی دخل ہی ورنہ فاہیان جب ہند میں آیا تو بودھ مت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ خانقاہوں کی رونق نمایشی چیز تھی ورنہ اہلِ تحقیق کے نزدیک اس کی قوت تیسری صدی عیسوی سے گھٹنے لگی تھی اور حریفِ قدیم یعنی برہمنی مت اور بُت پرستی کا زور بڑھ رہا تھا؛

"ہُون" قوموں کی یورش

گپتا خاندان کے آخری راجاؤں کو نیم وحشی اقوام کے ایک نئے ٹڈی دل سے مقابلہ کرنا پڑا جو پانچویں صدی میں مغربی پاکستان اور ممالکِ ہند پر اُمنڈ پڑی تھیں۔ یہ خوف ناک حملہ آور دو ہزار برس پہلے کے آریوں کی طرح ایران کی طرف سے آئے۔ ان کے اصلی وطن کی نسبت اختلاف ہی کیوں کہ ان کا درحقیقت کوئی وطن ہی نہ تھا۔ بعض انگریز تاریخ نویسوں نے انھیں وسطِ ایشیا کی منگولی نسل سے منسوب کر دیا ہی۔ لیکن یہ درست نہیں یورش کے وقت یہ بحرِ خزر کے مغربی سواحل سے آئے اور گرجستان (= جورجیہ) کی خانہ بدوش قومیں ان میں شامل تھیں۔ اسلامی مؤرخ انھیں "ہی تان" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہند میں انھیں "گورے ہون" (ہونڑ یا ہونا) کہتے تھے، اس لیے کہ ان کا رنگ گورا

تھا ۔ ایران میں ان وحشیوں نے بڑا ہنگامہ مچایا مگر بالآخر بڑی تعداد میں دریائے جیحوں کے پار اُتر گئے اور ترک قوموں سے شکست کھا کر خراسان کی طرف ہٹنے پر مجبور ہوئے اور بامیان میں اپنا مرکز قائم کیا ۔ پھر افغانستان اور مغربی پاکستان میں سیلاب کی طرح پھیلتے ہوئے وادیٔ گنگا میں پہنچے اور بہار تک سارا دوآب گپتا راجاؤں سے چھین لیا ۔ وہ راج پوتانہ ، مالوہ اور گجرات پر بھی چھا گئے تھے ۔ لیکن مالوہ میں یشودھرمن راجا نے اُن کے قدم نہ جمنے دیئے اور نرسمہ گپت کی مدد سے شکست دے کر نکال دیا ؛

ہونوں کے بارے میں بھی ہماری معلومات بہت ناقص اور متضاد روایات پر مبنی ہیں ۔ بہ حالیکہ وہ اتنی بڑی تعداد میں پچاس ساٹھ برس تک برابر آتے رہے کہ مغربی پاکستان اور مغربی ہند کی پوری آبادی کا رنگ بدل دیا ۔ صوبۂ سرحد اور کشمیر میں اُن کی ایک عرصے تک حکومت رہی ۔ پنجاب میں سیال کوٹ ان کا مرکز بنا رہا ۔ ضلع گجرات ، گجراں والہ اسی طرح جزیرہ نمائے گجرات انھی کے حلیف "گورجروں" کے نام سے موسوم ہیں اور یہ قوم آج بھی وادیٔ گنگا کے مغربی اضلاع تک اسی نام سے بستی ہے ۔ راج پوتانے کے چھتیس حاکم خاندانوں میں سے ایک کا نام ہونڑ ہے ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے بیرونی آمد کے رُکنے اور خود مستقل طور پر بس جانے کے بعد ہون مقامی آبادیوں میں گھل مل کے اپنا نسلی امتیاز کھو بیٹھے ۔ تاریخ میں اِن کے صِرف دو بادشاہوں کا

نام باقی رہ گیا ہو : پہلا ترمان کہ پانچویں صدی کے آخر میں مالوہ کا فرماں روا تھا اور شمال و مغرب میں دُور دُور تک اس کی عمل داری تھی ۔ اس نے ہندی مذہب نہیں تو "مہاراج" کا ہندی لقب ضرور اختیار کر لیا تھا ۔ دُوسرے اس کا بیٹا مہرگلا جو شِو دیوتا کا پرستار اور بودھ مت کا دُشمن ہو گیا تھا ۔ وہ مالوے سے شکست کھا کر کشمیر چلا آیا اور چالیس برس تک مغربی پاکستان کے شمالی حِصّوں میں حکومت کرتا رہا۔ غالباً سنہ ۵۴۲ ء میں وفات پائی ۔ چینی سیّاح ہوانگ چوانگ نے اس کے ظلم و سفّاکی کی روایتیں نقل کی ہیں ۔ اور لکھا ہو کہ اس نے بودھ مت کے درویشوں پر بڑی سختیاں کیں اور ان کی بہت سی خانقاہیں تُڑوا کر جو کچھ نقد و جنس بھرا تھا ، سب لُوٹ لیا ہو۔

راجا ہرش اور ہوانگ چوانگ چینی

جس طرح موریا عہد کی تنظیم کو تاتاری (سیتھی) اقوام کے سیلاب نے خاک میں مِلایا تھا ، گپتا خاندان کی سلطنت کو ہونوں کی یورش نے تہ و بالا کیا ۔ اور جب اِن وحشیوں کی آمد بند اور ممالکِ ہند میں کسی قدر امن و سکون ہُوا تو راجا ہرش کو اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع میسّر آیا لیکن چوں کہ اب اختلاطِ نسل و خون ، ذات پات اور مذہبی فرقہ بندیوں کے باعث سخت اختلاف پیدا ہو گئے تھے ۔ لہٰذا یہ سیاسی نظام زیادہ عرصے قائم نہ رہا اور ہرش کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا ۔

اس راجا کے حالات ہمیں دو ہم عصر کتابوں سے ملے ہیں : ایک "ہرش چرت" جس میں درباری شاعر بانڑ نے راجا کے واقعاتِ زندگی شاعرانہ مبالغے کے ساتھ نظم میں لکھے تھے ۔ دُوسرے چینی فاضل ہوانگ چوانگ (یا تسانگ) کا سفرنامہ ، جو ہرش کے زمانے میں ہندستان آیا اور دس گیارہ برس تک ممالکِ[1] ہند و دکن کی سیاحت کر کے سنہ ۶۴۴ء میں چین واپس گیا ۔ یہ راجا ("ہرشاوردھن") اصل میں تھانیسر کے راجا پربھاکر کا چھوٹا بیٹا تھا اور لڑکپن سے اپنے جنگ جُو باپ کی لڑائیوں میں شریک رہا ۔ لڑائیاں زیادہ تر پنجاب کے ہون لشکروں سے ہوتی تھیں ۔ اگرچہ ممکن ہے کہ خود پربھاکر اسی نووارد قوم کا ہم نسل ہو ۔ جب وہ فوت اور اس کا بڑا بیٹا دشمن کے فریب کا شکار ہُوا تو تھانیسر کے درباریوں نے "تامّل و تذبذب کے بعد" نوجوان ہرش کو گدّی پر بٹھایا (سنہ ۶۰۶ء) اور اُس نے رفتہ رفتہ ایک بڑی فوج مرتّب کی جس میں بیس ہزار سوار اور پانچ ہزار جنگی ہاتھی تھے ۔ پھر وہ ۶ سال تک شمالی ہند میں لڑتا اور فتوحات حاصل کرتا رہا ۔ صِرف شمالی دکن کے راجا پُل کیسن ثانی کے ہاتھ سے شکست کھائی ۔ ورنہ گجرات سے لے کر بنگالے تک اور وادیٔ جمنا سے نربدا تک تمام علاقے اُس کے زیرِنگیں آگئے

---

[1] یہ فاضل چینی اقلیمِ ہند کو "پانچ ہندستانوں" پرمشتمل بتاتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ، خلاصہ سفرنامہ . . . تاریخ ہند از اِلفنسٹن طبع نہم صفحہ ۲۳ ۔

شہر قنوج کو اس نے اپنا پائے تخت قرار دیا اور تقریباً پچاس برس کی عمر میں تلوار ہاتھ سے رکھ دی اور اپنا وقت زیادہ تر گیان دھیان میں بسر کرنے لگا۔ ایک صرف نحو اور چند نظموں کی تصنیف اِس راجا سے منسوب کی جاتی ہے اور ایک کتبے میں اس کی خوش خطی کا نمونہ یعنی غالباً اپنی قلم کے دستخط باقی رہ گئے ہیں [1] ہوانگ چوانگ کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم دوست اور مذہبی مباحث کا شوقین تھا۔ اکتالیس برس کے قریب بادشاہی کر کے چھپّن برس کی عمر میں فوت ہُوا اور اِس اعتبار سے کہ پھر ممالکِ ہند میں اتنی بڑی سلطنت یہاں کے کسی راجا سے نہیں بنائی جا سکی، تاریخِ ہند میں ممتاز درجہ رکھتا ہے؛

یہی زمانہ ہے جس میں کئی چینی سیّاح پاکستان و ہند آئے مگر ان کے اکثر سفرنامے ضائع ہو گئے۔ البتہ ہوانگ چوانگ (یا ہوئیں تسانگ) نے یہاں کے مشاہدات بادشاہِ چین کی فرمائش سے قلم بند کیے تھے، وہ محفوظ رہے۔ یہ کتاب معلومات کا خزانہ ہونے کے علاوہ ادبی لحاظ سے چینی انشا پردازی کا اعلا نمونہ مانی جاتی ہے اور علم و فضل کے باعث بھی یہ سیّاح "مرشد" یا اُستادِ شریعت کے لقب سے مشہور ہے۔ وہ ترکستان و کابل کے راستے سنہ ۶۳۰ء میں پرش پوُر پہنچا تھا اور دو برس وادئ سندھ و کشمیر کی بودھ خانقاہوں میں زیارات اور تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پھر تھانیسر اور متھرا ہوتا ہُوا قنوج آیا

---

[1] ، اوکس فورڈ ہسٹری، صفحہ ۱۶۵

جیسے ہرش نے پائے تخت بنا کے نئی نئی عمارات اور خوش نما باغوں سے مزیّن کر دیا تھا۔ اجدھیا، کپل دستو، گیا، پٹنہ، نالندا وغیرہ جملہ مقامات کی جہاں بودھ مت کی مقدس یادگاریں تھیں زیارت کی۔ شمالی دکن اور مالوے میں گھومتا پھرا، اور دوبارہ بہار آیا تھا جب کہ سنہ ۶۴۳ء کے آغاز میں اس کی ملاقات راجا ہرش سے ہوئی جو اسی مشرقی صوبے کا دورہ کر رہا تھا۔ چوانگ کی عالمانہ تقریر نے راجا کو گرویدہ بنا لیا اور اس نے کئی مرتبہ علمائے ہند کے ساتھ اس کے مناظرے کرائے۔ اِن بحثوں میں راجا علانیہ اپنے چینی مہمان کی طرف داری کرتا تھا جس نے چوانگ کو ایسا محسود بنا دیا کہ مخالف مذہب کے لوگ اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ راجا کو یہ اطلاع ملی تو ایک عتاب آمیز اعلان شائع کیا کہ اگر "استاد" کو کسی نے ضرر پہنچایا تو قتل کی سزا پائے گا اور اس کی شان میں کوئی بُرا لفظ مُنہ سے نکالا تو زبان کٹوا دی جائے گی۔

پھر ہرش نے قنوج میں ایک بڑی مجلس منعقد کی کہ اس چینی فاضل کے وعظ سے اور لوگ بھی مستفید ہوں۔ راجا کے پنج سالہ جشن کا زمانہ قریب تھا اس لیے بہت سے راجا مہاراجا بُلائے گئے۔ گوتم بودھ کی بہت بڑی طلائی مورت کا جلوس نکالا گیا، جس کا چھتر خود راجا اُٹھائے ہوئے تھا۔ اور گوتم اور اس کی شریعت کے نام پر زر و جواہر نچھاور کرتا جاتا تھا۔ بودھ مت کا یہ اعزاز اور طمطراق دیکھ کر برہمنوں کے دِل میں حسد کی آگ

بھڑکنے لگی اور بودھ مت کی خانقاہ میں انھوں نے آگ لگوادی۔ خود راجا پر ایک شخص نے قاتلانہ حملہ کیا اور گرفتار ہو کر پان سو برہمنوں کے نام بتلائے جو ان سازشوں میں شریک تھے۔ ان میں سے چند کو موت کی سزا ملی اور باقی جلا وطن کر دیے گئے ؛

ہوانگ چوانگ نے اپنے سفرنامے میں عام نظم و نسق کی تعریف کی اور عوام کی حالت بھی خاصی مطمئن بتائی ہے لیکن راستے مندوش تھے اور اُسے کئی جگہ رہزنوں نے لوٹا۔ بایں ہمہ سنگین جرائم کی کمی تھی اور تحقیقات کا یہ پُرانا طریقہ بھی رائج تھا کہ ملزم کو آگ میں ڈال دیتے یا زہر کھلا دیتے تھے اور اگر وہ زندہ بچ جائے تو اس کی بے گناہی ثابت ہو جاتی تھی ۔ علوم و فنون کی حالت زوال پذیر نظر آتی ہے ۔ ہونوں کی غارت گری سے ضرور مدارس اور خانقاہوں کو نقصان پہنچا ہوگا ۔ البتہ صنعت بُت تراشی کو اسی چھٹی اور ساتویں صدی میں نہایت فروغ ہوا کیوں کہ بُت پرستی زوروں پر تھی ۔ راجا سے پرجا تک ہر طبقے کے لوگ مورتی پوجا کے دل دادہ ہو گئے تھے ۔ بودھ اور جین مت والوں کو بھی اسے اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہا تھا ؛

خود راجا ہرش آخر زمانے میں بودھ مت کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے ۔ خزانۂ شاہی کا بہت سا رُپیہ اسی مذہب کی خانقاہیں اور گنبد (= ستوپے) بنانے میں صرف ہونے لگا تھا۔ ان میں بودھ مت کے ہزاروں بھکشو پرورش پاتے تھے ۔ چناں چہ

ہوانگ چوانگ نے ایسے نقرا کی تعداد دو لاکھ کے قریب بتائی ہی ۔

طوائف الملوکی

راجا ہرش کے لاولد فوت ہونے کے بعد ملک پر اس کے وزیر راجن نے قبضہ کیا لیکن کہا جاتا ہی کہ اسے تبّت کے راجا نے فوج بھیج کر قید کر دیا اور اس کے بعد تاریخ میں زمانۂ دراز تک قنوج کا نام نہیں آتا ۔ آٹھویں صدی میں ہم اس علاقے پر کبھی کشمیر کبھی بنگالے کے راجاؤں کو فوج کشی کرتے سُنتے ہیں ۔ مگر وہاں کے ایک راجا یشودھرمن کی شہرت کا سبب یہ ہی کہ اسی کے زمانے میں بھوبھوتی شاعر گزرا ہی جس کے تین ناٹک بہت مقبول ہوئے حتّٰی کہ بعض نقّاد اسے کالی داس کی ٹکّر کا شاعر سمجھتے ہیں ۔ ایک اور ہم عصر شاعر واک پتی تھا ۔ اس کی نام وری کی خاص وجہ یہ ہی کہ سنسکرت کی بجائے پراکرت میں ایک تاریخی نظم اپنی یادگار چھوڑ گیا ہی ۔

نویں صدی عیسوی کے آغاز میں راجا ناگ بھٹ نے قنوج کے ساتھ پورے دوآب پر قبضہ جما لیا ۔ یہ راجا گورجروں کی پریہار شاخ سے تھا ۔ اور گورجروں کے ہونوں کے ساتھ پاکستان و ہند میں پھیلنے کا حال ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ مگر اب یہ گورجر ہندی ہو گئے تھے ۔ راج پوتانہ اور مالوہ ، خاندیس میں ان کی ریاستیں قائم تھیں اور انھی کی ایک شاخ نے قنوج کو پائے تخت بنا کے بڑی قوّت حاصل کی ۔ راجا مہیر جو بھوج کے لقب سے

مشہور ہے اِسی خاندان کا اقبال مند راجا تھا اور اس کی سلطنت غالباً گجرات مالوہ اور دوسری طرف مگدھ دیس تک پھیل گئی تھی لیکن بھوج نے پچاس برس کی طویل حکومت کے بعد وفات پائی تو اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے اکثر علاقے نکل گئے۔ پھر بھی سلطان محمود غزنوی کے زمانے تک اسی خاندان کے راجا قنوج میں حکومت کرتے تھے۔ ان کا خاتمہ چندیلوں نے کیا، اور چندیلوں کی ایک برادری (گہرواڑ) کے راجا مسلمانوں کی فتح تک یہاں راج کرتے رہے۔

سندھ

ون سنٹ اسمتھ جیسا "ہند پرست" بھی مجبور ہوا کہ ایک طرف سندھ و کشمیر اور دوسری طرف نیپال و کام روپ (= آسام) کو ہندستان یا شمالی ہند سے بے تعلق قرار دے۔ حقیقت میں مسلمانوں کی آمد اور منظم سلطنت قائم ہونے سے پہلے یہ خودمختار، جُداگانہ ملک تھے اور نسل و معاشرت کے لحاظ سے انھیں وادیٔ گنگا کے باشندوں سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ساتویں صدی میں جب ہوانگ چوانگ چینی سیاحت کے لیے آیا تو سندھ کی وسیع اور آزاد ریاست میں بلوچستان اور غالباً شمالی راج پوتانہ اور کچھ کے اضلاع شامل تھے۔ راجا شودر قوم سے تھا لیکن اکثر باشندے بودھ مت کے پیرو تھے، اور ہوانگ چوانگ (یا تسانگ) نے اس مذہب کے مقامی درویش علما کی تعداد دس ہزار تخمین کی تھی۔ لیکن یہ چینی سیاح ان کے اخلاق کی مذمت کرتا ہے کہ وہ عام طور پر نکمّے اور عیش دوست

تھے ؎

سندھ میں راجا ہرش کا ہم عصر سیہرس رائے تھا۔ بعض انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ اوّل اوّل یہی راجا مسلمانوں سے لڑ کر مارا گیا اور اس کے بیٹے ساہسی کا بھی یہی حشر ہُوا لیکن چچ نامہ پہلی لڑائی کو نیم روز (سیستان) کے حملہ آوروں کے خلاف بتاتا ہے اور سنین کے اعتبار سے راجا ساہسی کا عہد شیوعِ اسلام سے ماقبل قرار دیتا ہے۔[1] اسی ساہسی کا وزیر چچ نامی برہمن تھا جو رانی کی سازش سے ساہسی کا جانشین ہُوا۔ الیٹ کے نزدیک یہ سنہ ۱۰ ہجری کا واقعہ تھا۔ لیکن چچ نامے کی رُو سے چچ چالیس برس اور اس کا بھائی اور بھتیجا سات آٹھ برس راج کرتے رہے۔ ان کے بعد چچ کا بیٹا داہر گدّی پر بیٹھا۔ یہ وہ راجا ہے جو سنہ ۹۳ ہجری (= ۷۱۲ ء) میں مسلمانوں کے ہاتھ سے شکست کھا کر مارا گیا۔ ان سنین کا مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ داہر ہلاک ہونے کے وقت بہت بوڑھا ہو چکا ہوگا۔ لہٰذا چچ کے سال جلوس کی صحت پر یقین کرنا دُشواری سے خالی نہیں ؎

کشمیر

سنسکرت زبان کی جتنی کتابیں اب تک دست یاب ہوئیں اُن میں صرف "راج ترن گنی" ایسی کتاب ہے جسے تاریخ کہنا جائز ہوگا۔ یہ شاہانِ کشمیر کے حالات ہیں جو بارھویں صدی

---

[1] چچ نامہ صـ۱۱

عیسوی کے وسط میں کلہن نامی مصنف نے تحریر کیے۔ پھر یہاں کے اسلامی بادشاہوں کے عہد میں کتاب کی تکمیل ہوئی۔ اکبر بادشاہ نے اس کا فارسی ترجمہ کرایا اور حال میں اسے اسٹین کے ترجمے نے یورپ میں روشناس کرا دیا ہے۔ اسی فاضل مترجم کا خیال ہے کہ ہونوں کی حکومت میں زوال آیا تو یہ ملک غالباً آٹھویں صدی میں سلطنتِ چین کا باج گزار ہو گیا تھا۔ اسی دور کے راجاؤں میں للتا دِتیا خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے شمالی سندھ و پنجاب کے بعض آزاد قبائل کو مغلوب کیا اور ۷۴۰ء میں قنوج کے راجا کو شکست دی "مارتنڈ" کا مندر جو اب تک اسلام آباد میں سلامت ہے اسی راجا نے بنایا اور کشمیر کے فنِ تعمیر کی امتیازی خصوصیات دکھاتا ہے۔

اس راجا کے پوتے وِن یا دِتیا کی وسیع فتوحات کے ساتھ ظلم و تشدد کا بھی راج ترن گنی میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ان مظالم کا سبب دولت کی طمع تھی اور کلہن لکھتا ہے کہ جب بادشاہ کو روپے کی اور مچھلی کو گدلے پانی کی پیاس ہو جائے تو موت سے پہلے کسی طرح نہیں بجھتی" اسی خاندان کے ایک راجا پارتھ سے لوگ نالاں تھے کہ رعایا کو کوڑوں سے پٹواتا ہے، لیکن جب اس کے بیٹے نے بچھوؤں سے کٹوانا شروع کیا تو روتے تھے کہ اس سے پارتھ ہی ہزار درجہ رحم دل اور اچھا راجا تھا!

گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیر کے راجا سُلطان محمود کے خراج گزار ہو گئے مگر ان کی اندرونی خود مختاری اور مردم آزاری میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ آخر چودھویں صدی میں یہاں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم ہوئی اور لوگوں کو فی الجملہ اطمینان میسّر ہُوا ؛

دُوسری آزاد ریاستیں

ہرش کے بعد پنجاب کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں۔ کبھی کبھی ہم ستلج پار ایک بڑی ریاست کا ذِکر سُنتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں شمالی پنجاب اور صوبہ سرحد میں ایک قوی حکومت قائم ہوئی جس کی سلاطینِ غزنی سے آویزش اور شکست کا حال آیندہ ہماری نظر سے گزرے گا۔ جنوب میں جمنا کے دونوں کناروں پر کئی آزاد ریاستوں کا پتہ چلتا ہے مگر ان میں دلّی کے تمیر راجا رفتہ رفتہ زیادہ قوّت پکڑ گئے تھے۔ ان کی بعض عمارتوں کے کھنڈر ابھی تک مہرولی کی نواح میں موجود ہیں۔ پرتھی راج اسی خاندان کا نواسہ اور جانشین تھا۔جس کی شکست اور خاتمے کے بعد یہاں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی ؛

ان سے پہلے یعنی نویں اور دسویں صدی میں بندھیل کھنڈ میں ایک اور بڑی ریاست بن گئی تھی۔ اس کے چندیل حکمران گونڈ قوم کے تھے اگرچہ انھیں بھی برہمنوں نے "راج پوت" بنا لیا۔[1] مہوبا اور کالنجر اس ریاست کے مشہور قلعے تھے اور دُوسرے

---

[1] اوکس فورڈ ہسٹری، صفحہ ۱۸۶

مقامات پر بھی ان کی بہت سی عمارتیں، مندر، تالاب وغیرہ ابھی تک بنانے والوں کے شوقِ تعمیر کی گواہی دیتے ہیں۔ راج پوتانہ، مالوہ اور وسطِ ہند میں بیسیوں ریاستیں قائم تھیں جو اپنی اپنی جگہ آزادی کا دم بھرتی اور کسی مرکز کی اطاعت قبول نہ کرتی تھیں۔ ان کے حکمراں خاندان ہندوؤں میں شامل ہوکر چھتری نسل کی شاخیں بن گئے اگرچہ ان میں تاتاری، آریا، دراوڑی سبھی نسل کے لوگوں کی آمیزش ہے۔

مشرقی ممالک میں دو بڑی ریاستوں کا حال ملتا ہے: ایک پال خاندان جو بہت دن تک بنگال و بہار دونوں پر حکومت کرتا رہا، بلکہ نویں صدی کے آغاز میں اس کا دخل قنوج تک ہوگیا تھا۔ یہ پال راجا بودھ مت کے پیرو تھے اور انھوں نے اس مذہب کے بہت سے معبد اور خانقاہیں تعمیر کی تھیں ان میں دیوپال سب سے نامی اور طاقت ور راجا گزرا ہے۔ اس نے آسام اور اڑیسہ فتح کیا اور تقریباً پچاس برس بڑی شان سے حکومت کرتا رہا۔ وہ بدھ مت کا پرجوش حامی تھا، اور اشوکا کی طرح اسے بھی "دھرم کا ڈنکہ بجانے" کی آرزو تھی۔ ٹھیک تاریخیں معلوم نہیں مگر اندازہ یہی ہے کہ اس کی حکومت دسویں صدی کے وسط تک رہی اور اس کے بعد پہلے مشرق کے پہاڑی قبیلے جو "کم بوج" موسوم تھے، ملک پر چڑھ آئے پھر جنوبی ہند کے چولا راجا نے سنہ ۱۰۲۳ء میں شمال پر فوج کشی کی اور پال خاندان کو اتنا کمزور کر دیا کہ اکثر صوبے آزاد

ہو گئے ۔ اُڑیسہ کے ایک برہمن نے بنگالہ کا بہت سا حِصّہ دبا لیا اور بارھویں صدی کے وسط میں سین خاندان کی خودمختار حکومت قائم کی اگرچہ اس کا چند ہی سال بعد مسلماں کشورستانوں نے خاتمہ کر دیا ۔ سین خاندان کی شہرت کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ برہمنوں کے حامی اور بودھ مت کے سخت دُشمن تھے ۔ انھی کی کوشش سے بنگال کے مشرقی اضلاع اور آسام ، ارکان وغیرہ علاقوں میں بودھ مت زائل ہُوا اور ہندوؤں کی "جات پات" کے اصوُل پر گروہ بندی عمل میں آئی ؛

ممالکِ دکن کی ریاستیں

ملکِ دکن (تا دریائے کرشنا) اور اقصائے جنوب کی دراوڑی اقوام و السنہ شمالی ہند والوں سے بالکل مختلف تھیں دکن کی قدیم آندھرا سلطنت کا مجمل ذِکر آ چکا ہے کہ مگدھ میں موریا خاندان کے زوال کے بعد غالبًا یہ ممالکِ ہند میں سب سے طاقت ور ہوگئی تھی ۔ لیکن یہاں کی تاریخ شمال سے بھی بڑھ کر نامربوط و کم معلوم ہے ۔ ایک راجا ہالا کا نام بعض تصانیف کی بہ دولت اور دلی دیاکورا کی فتوحات ، دو کتبوں کی وجہ سے باقی رہ گئیں ۔ یہ دوُسری صدی کا راجا تھا جس نے سکا قوم کے سپہ سالار نہاپان کو شکست دی اور چھنے ہوئے علاقے واپس لیے ۔ مگر غالبًا اسی عہد میں سلطنت دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی اور پھر تیسری صدی عیسوی سے آندھرا کا نام کہیں سُننے میں نہیں آتا ؛

ہونوں کی یورش کے بعد شمالی دکن میں بھی اُن کے حلیف گورجروں کی ایک شاخ[1] حاکم ہوگئی تھی ۔ یہ چالوکیہ خاندان کے راجا کہلاتے ہیں ۔ اور ساتویں آٹھویں صدی عیسوی میں بادامی (ضلع بیجا پور) میں ، پھر گیارھویں بارھویں صدی میں کلیانی (قریب ناسک) میں ان کی راج دھانی رہی ۔ ان میں سب سے مشہور پل کیسن ثانی گزرا ہی ۔ جس نے ہرش راجا کو شکست دی اور نربدا سے کرشنا تک بڑی شان شوکت سے بادشاہی کرتا رہا ۔ چینی سیّاح ہوانگ چوانگ اس کے دربار میں آیا تھا اور پل کیسن کے اوصاف و اخلاق کی تعریف کرتا ہی حال آں کہ یہ راجا برہمنوں کا معتقد تھا ۔ اہلِ تحقیق کے نزدیک اجنتا کے غاروں کی تصویریں اسی کے عہد میں مکمل ہوئیں ۔ ان میں سے بعض پل کیسن کے دربار میں ایرانی سفارت کے آنے کا نقشہ دکھاتی ہیں ۔ اس نے چونتیس برس راج کیا اور سنہ ۶۴۲ء میں وفات پائی ۔ پل کیسن کے بعد اس خاندان میں ضعف آگیا اور کچھ مدت کے لیے راشٹرکوٹ خاندان کے راجا شمالی دکن پر مسلّط ہو گئے ۔ ان کے راجا اموگھ ورش کے عہد میں (سنہ ۸۱۵ تا ۸۷۷ ؟) عرب تاجر سلیمان ادھر آیا تھا اور اسے دنیا کے چار طاقت ور بادشاہوں میں شمار کرتا ہی ؎

راشٹرکوٹوں سے چالوکیوں نے دوبارہ حکومت چھین لی مگر پھر جنوبی ہم سایوں کی دست درازی کا شکار ہو گئے ۔ صحیح اور

---

[1] اوکس فورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۰۰

لسل تاریخ میسّر نہیں آتی مگر اتنا اندازہ ہوسکتا ہے کہ شمالی ہند
، طرح دکن اور جنوب میں بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تین
ر صدیاں اسی قسم کی جنگ و جدال میں گزریں۔ چھوٹے بڑے
دہا خاندان جگہ جگہ آزاد حکومت بناتے اور اسے بچانے یا بڑھانے
بنے میں ہمسایوں سے دست و گریباں رہتے۔ ان خانہ جنگیوں
ں مذہبی فرقہ پرستی نے اور زیادہ تلخی پیدا کر دی تھی۔ کیوں کہ دکن
ں بودھ مت سے بڑھ کر جین مت نے برہمنوں کا مقابلہ اور
ویر شیوا" یعنی لنگایت مذہب والوں نے شدید مخالفت کی ؛
بارھویں صدی کے اخیر میں شمالی دکن پر یادو خاندان کے
جا قابض ہو گئے تھے۔ اور وسط دکن میں ہوئے سلا خاندان
راج تھا جس کے زمانے میں فنِ عمارت اور سنگ تراشی نے
ی ترقی کی۔ ہل بیٹریا دوار سمدر کا قصر نما مندر ان راجاؤں
، دولت مندی اور سلیقۂ تعمیر کی بہت اچھی شہادت ہے۔ اسی
لاقے کے جنوب (یعنی میسور کے علاقے) میں گنگ خاندان والوں
نے گوماٹا اوتار کا ایک اٹھارہ گز اونچا بُت سنگ سماق کو
اش کر بنایا جس کی ہندستان میں نظیر نہیں ملتی ؛
میسور کے جنوب مشرق میں ہم ایک اور قوی حکومت کا ذکر
سنتے ہیں جس کا صدر مرکز بہت دِنوں تک کنجی ورم تھا۔ یہ پالوا
اندان کے راجا تھے۔ ان کی نسل کو بعض اہلِ تحقیق ایران کے
دیم پہلویوں سے ملاتے ہیں۔ ہوانگ چوانگ لکھتا ہے کہ یہ حکومت
یک ہزار میل کے دَور میں پھیلی ہوئی ہے اور یہاں چینی قوم اور

بودھ مت کے پیرو کثرت سے آباد ہیں ۔ مدراس کے قریب "ہفت منادر" اسی خاندان کی یادگار ہیں اور ایک چھوٹی سی ریاست کا راجا اپنے آپ کو ابھی تک "پالوا" موسوم کرتا ہی۔

انتہائے جنوب میں دو قدیم ریاستیں چولا اور پانڈیا کے نام سے قائم تھیں ۔ ان میں دو تین چولا راجا بڑے بہادر اور کشورکشا گزرے ہیں اور دسویں صدی میں ایک طرف جزیرہ لنکا پر اور دوسری طرف بندھیاچل تک سارے دکن پر انھی کے فرماں روا راجا راجا (تا سنہ ۱۰۱۲ء) کا ڈنکا بج گیا تھا ۔ یہ راجہ اکثر لنگایت فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے زمانے میں غریب جین مت والوں پر بڑے بڑے ظلم ہوئے جن کی کیفیت بعض جینی مندروں کے کتبوں میں درج ہی۔

اِس دور کی خصوصیات

راجا ہرش اور پل کیسن ثانی کے بعد تقریبًا پانچ صدی کا زمانہ جس پر ہم نے اجمالی تبصرہ کیا، صحیح معنی میں "ہندوؤں کا دور" کہلا سکتا ہی ۔ وہ عقائد و رسوم جو اب ہندو دھرم کی خصوصیات ہیں، اسی زمانے میں مرتب اور مروّج ہوئے ۔ عجیب بات یہ ہی کہ ان ہندو اثرات سے اس وقت بھی اگر بچے رہے تو وہ جدید پاکستان ہی کے علاقے تھے جہاں ایک طرف سندھ و کشمیر اور دوسری طرف بنگال کے فرماں روا مسلمانوں کی آمد کے قریب تک بودھ مت کے پیرو نظر آتے ہیں ۔ پھر یہی تین ملک ہیں جہاں اِس دور میں بڑی بڑی حکومتیں قائم رہیں ورنہ ممالکِ ہند میں ہر طرف بہت سی

ریاستیں، اُن کے کئی کئی ٹکڑے اور ہر ٹکڑے کے کئی کئی وارث پیدا ہو رہے تھے۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ تھا کہ ان دعوے داروں میں آئے دِن لڑائیاں ہوتیں اور امنِ عامہ درہم برہم ہو جاتا تھا ان پیہم خوں ریزیوں کا کوئی مفید نتیجہ نہ نِکلا اور اس تمام طولانی مدت میں کوئی ایسا بیدار مغز و اقبال مند سردار نہ پیدا ہُوا کہ ممالکِ ہند و دکن کے کسی بڑے حصّے میں پائے دار سلطنت کی تنظیم کر لیتا۔ یہی سبب ہُوا کہ مسلمان حملہ آور تعداد میں قلیل ہونے کے باوجود رُو کی طرح قطعاتِ ہند پر پھیلتے چلے گئے اور ان جتھوں کے روکے بھی نہ رُکے جو کبھی کبھی ان کے مقابلے کے لیے فراہم ہو جاتے تھے کیوں کہ یہ اتّحاد چند روزہ ہوتا تھا ورنہ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندوؤں میں کسی جامع سیاسی نظام کو بنانے اور چلانے کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی ؛

آبادی میں پیوستگی اور یک سانی نہ ہونے کا ایک قوی اور صریح سبب یہ تھا کہ پاکستان و ہند میں باہر سے بار بار نئی قومیں آئیں اور نسلی اختلاف میں اضافہ کرتی رہیں۔ تاریخ میں اس قِسم کا آخری سیلاب ہونوں اور گورجروں کی آمد کو بتایا گیا ہے لیکن یہ سلسلہ بعد میں بھی یقیناً جاری رہا اور گروہ کے گروہ مغرب و مشرق سے پاکستان و ہند میں داخل ہوتے رہے جس سے پُرانی آبادی کا توازن بار بار بگڑتا اور نئے نئے رنگ بدلتا تھا۔ بیرونی اقوام کی طغیانیوں کو اہلِ ہند اپنے سیاسی اختلال اور جنگی کم زوری کے باعث نہ روک سکے اور اندر آنے کے بعد

انھیں پوری طرح جذب نہ کرسکے ۔ کیوں کہ خود ہند میں مذہبی، تمدنی اور لسانی وحدت مفقود تھی ۔ بے شبہ برہمنوں کی کوشش سے اسی دور میں بودھ مت کا زور ٹوٹ گیا اور اہمسا کا عقیدہ اپنی یادگار چھوڑ کر یہ مذہب ممالکِ ہند سے غائب ہو گیا لیکن خود برہمنوں نے جو مذہبی نظام مرتب کیا اس میں عقائد و عبادات کسی چیز کی یکسانی نہ تھی ۔ یہ "پرانوں کا ہندو مت" کہلاتا ہے ۔ جس میں ہر مقام کے دیوی دیوتا اور ان کے افسانے اور اوہام شامل کر لیے گئے تھے ۔ ندی، نالے، درخت، پہاڑ سبھی کی پوجا جائز تھی۔ ہر برادری یا گروہ کو ہندو جاتی میں ملانے اور اسی کے ساتھ ان کی تمیز قائم رکھنے کی غرض سے انھیں ایک "جات" یا فرقہ قرار دے دیا تھا ۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ غیر آریا نسل کے بعض مذہبی پیشوا بھی برہمنوں میں محسوب کر لیے گئے تھے اور تاتاری، ہون، گورجر، دراودی بلکہ قدیم تر نسل کے رئیسوں کو چھتریوں میں شامل کر لینا بخوبی ثابت ہے ۔

دینی تحریکات کا مرکز گپتا خاندان کے زمانے میں مالوہ اور وسطِ ہند رہا اور اس کے بعد دکن ہو گیا کیوں کہ یہاں بیرونی اقوام کی یورشیں آئے دن لوگوں کے امن و اطمینان میں خلل نہیں ڈالتی تھیں ۔ دوسرے یہاں کے باشندوں میں شمال والوں کی سی جنگ جوئی اور چستی و توانائی نہ تھی بلکہ گیان دھیان کا مادہ زیادہ تھا ۔ اسی لیے زیرِ نظر عہد میں غالباً جنوبی جزیرہ نما میں ان پیچیدہ عقائد و رسوم کی تشکیل و تکمیل ہوئی جو آج ہندو دھرم کی

خصوصیات ہیں ۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مذہبی نظام چند سال میں ، یا بغیر شدید مزاحمت کے رائج نہیں ہُوا بلکہ اس کے لیے صدیوں سخت مناظرے اور مجادلے ہوتے رہے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مذہبی معرکوں کا مردِ میدان کمارل بھٹا گزرا ہے جو بہار میں پیدا ہُوا اور ہند کے اکثر مُلکوں میں دورہ لگاتا پھرا کہ برہمنوں کے مخالفین کو اپنی دلائل سے مغلوب و سرنگوں کرے ۔ اسی کے چیلے شنکراچارج تھے جو علم و فضل میں اپنے گرد سے بڑھ گئے ۔ یہ سنہ ۷۸۸ء میں ملیبار میں پیدا ہوئے اور صرف ۳۲ برس کی عمر میں دُنیا چھوڑ کر ہمالیہ کے پہاڑوں میں گوشہ نشینی اختیار کرلی ۔ لیکن جوانی ہی میں وید کی وہ شہرۂ آفاق شرح لکھی جس میں ذاتِ باریٔ تعالیٰ کے متعلق ایسے دقیق اور بلند خیالات قلمبند کیے کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک کسی ہندو صاحبِ فکر کا ذہن وہاں تک نہ پہنچا تھا ۔

جنوبی ممالک میں بعض اور نامور علما اور ان کی مذہبی تصنیفات نے شہرت حاصل کی مگر حقیقت یہ ہے کہ جاہل عوام ، اوہام کا شکار تھے اور انھیں شکار کرنے کے لیے برہمنوں نے خود مذہب کو ڈھکوسلا بنا دیا تھا ۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت ہند کے شہروں اور بسنے والوں میں شدت سے بُت پرستی اور شرک پھیلا ہُوا تھا اور سچی خُدا پرستی کرنے والوں کو شاید سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ جنگلوں اور پہاڑوں میں خُدا سے

لو لگائیں اور اپنے آپ کو اِس طرح چھپائیں کہ دُنیاداروں کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے ؛

برہمنوں نے ایک غضب یہ کیا کہ عِلم و عرفان کا دروازہ عوام کے لیے بند کر دیا ۔ روایت مشہور ہی کہ کسی شودر نے وید کے پاٹ سُن لیے تھے ۔ راجا رام چندر جی نے اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر بھروا دیا ! برہمنی قانون کے خلاف چلنے کی یہ خوف ناک تعزیر تھی جو ایک نیک نفس بزرگ راجا نے صادر فرمائی ۔ انھیں ہندو بھگوان کا سب سے محبوب اوتار مانتے ہیں اور خدا کا سب سے مقبول نام ہی "رام" ہوگیا ہی ؛

اسی دَور میں ہندو قوانین کی تدوین اور عملی نفاذ کی تکمیل ہوئی ۔ جاتی کے چار "برن"، مختلف اونچی نیچی "جاتیاں" (= ذاتیں) اور صدہا گوتیں بنیں ۔ آواگون اور کرما کا عقیدہ، اس فرقہ بندی اور ظالمانہ تقسیم کی بنیاد قرار پایا ۔ مطلب یہ کہ پچھلے جنم میں جیسے کرم کیے ہوں گے اِس کے مطابق آدمی اعلا یا ادنا گھرانے میں پیدا ہوگا ۔ کسی کا برہمن، چھتری، ویش یا شودر ہونا اس کے پچھلے کرموں کا پھل ہی جو کسی طرح بدل نہیں سکتا ۔ ان چار برنوں کے درجے اور کام معیّن تھے ۔ سب سے اونچا درجہ برہمن کا اور سب سے ادنا شودر ٹھیرایا گیا جس کی تقدیر میں ذلیل ترین کام اور خدمت گزاری لکھی تھی اور وہ اس قدر نجس تھا کہ اس کا چھو جانا اونچی

جات والوں کو پلید کر دیتا تھا۔ تجارت، زراعت، حرفت وغیرہ پیشے ویش سے مخصوص کیے گئے یہ فرقہ شودر جیسا ذلیل اور نجس نہ تھا مگر برہمنی علوم حاصل کرنے کی اسے بھی ممانعت تھی۔

یہی نوع، بلکہ خود اپنی ہندو قوم کے اس تشتت و تفرقِ کی تاویل میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک معاشی تقسیم تھی اور ہر گروہ کے لیے کام کی تخصیص کرنے سے لوگوں کو اپنے پیشے میں مہارت و کمال پیدا کرنے کا موقع ملتا تھا۔ بے شبہ دُنیا کی دُوسری قدیم اقوام میں بھی امیر، غریب اور شریف و رذیل کی تفریقیں پائی جاتی ہیں مگر اتنی مفصّل و مکمّل فرقہ بندی کسی مُلک میں نہیں ہوئی جس قدر ہندُستان میں۔ دُوسرے یہاں مذہبی تعلیم نے اس تقسیم پر قضا و قدر کی مُہریں لگا دی تھیں۔ کمینہ سے کمینہ شودر اپنی جگہ راضی بہ رضائے الٰہی اور بھوکے سے بھوکا کسان اپنے حال پر قانع تھا۔ ہر موقع پر وہ اپنی ذلّت اور شبانہ روز اپنے ساتھ ناانصافی ہوتے دیکھتا اور خاموش رہتا تھا۔ ایک ہی تصور پر عدالت اس کو زیادہ اور دُوسرے طبقے کے افراد کو خفیف سزا دیتی تھی مگر وہ ان سب مظالم کو سہتا اور اپنے پچھلے کرم کا پھل سمجھتا تھا۔ اس کے عقیدے میں برہمن و شودر کے یہ سب فرق مِن جانب اللہ تھے۔

برہمن، مذہب کے پیشوا، اخلاق کے رہنما، علم و فضل

کے وارث بنائے گئے تھے ۔ حکومت کو ان کے مشورے پر چلنا لازم تھا ۔ راجا سے پرجا تک سب کا فرض تھا کہ ان کی تعظیم تکریم کریں ۔ اور زر و مال سے ان کا گھر بھریں قانون کی سختیاں ان کے حق میں نرم تھیں اور عام عدالت انھیں بڑے سے بڑے اخلاقی جُرم کی بھی پوری سزا نہ دے سکتی تھی ؛

بادشاہی اور سپہ گری کے سارے کام صرف چھتری انجام دیتے تھے اگرچہ جا بہ جا ہم ایسی مثالیں سُنتے ہیں کہ برہمن وزیر نے راج پاٹ پر قبضہ کر لیا ۔ مگر عوام کو مُلکی معاملات سے کچھ سروکار نہیں رہا تھا نہ وہ قومی دفاع میں کوئی حصّہ لے سکتے تھے ۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام شہریوں کے ذہن میں قومی حکومت کا تصوّر ہی پیدا نہ ہُوا اور کبھی ہُوا ہو تو زیرِ نظر عہد میں بالکل زائل ہوگیا تھا ؛

ہندو مت کی اس شدید گروہ بندی اور جات پات نے چھوت چھات کو اتنی ترقّی دی کہ ایک ہی گروہ کی جماعتوں میں مِل کر کھانا پینا موقوف ہو گیا ۔ شادی بیاہ کی اپنی "جات" کے باہر اجازت نہ تھی ۔ عورتوں کے متعلّق جو قوانین بنے ان میں یہ اوہام ظلم کے درجے تک سخت ہیں ۔ عورتوں کو اکثر غیر مسلم قوموں نے وراثت سے محروم رکھا تھا لیکن ہندوؤں میں بچپن کی شادی ، عقد بیوگان کی ممانعت ، ستی وغیرہ کی رسموں نے گویا انھیں زندہ رکھ کر

مُردہ بنانے کی ایسی تدبیر کی جس کی اور کسی مُلک میں مثال نہیں ملے گی؟

ایک صاحب نظر انگریز نے ہندو نظامِ تمدّن کی نسبت نکتے کی بات یہ لکھی ہے کہ اس کی وجہ سے خود برادریوں میں اونچ نیچ کی تفریق پیدا ہوگئی۔ جس کا ثبوت دیہات کی آبادیاں ہیں۔ یہ بہ جائے خود ایک چھوٹی سی خود کفی دُنیا ہوتے تھے اور اپنی ضروریات اور انتظام بڑی حد تک خود پُوری کر لیتے تھے۔ ان میں بڑھئی، لوہار، دھوبی، حجّام وغیرہ پیشہ وروں کے دو چار گھر موجود ہوتے اور انھیں کمین یا نیچ ذات میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ لیکن یہ حقیقت کہ ہر گاؤں میں بہت سی زمین غیر منقسم اور "شاملات" یعنی پُورے گاؤں کی ملکیت مانی جاتی رہی، شہادت دیتی ہے کہ یہ ساری آبادی ایک ہی برادری تھی، جس میں پہلے الگ الگ پیشے بنے اور پھر برہمنوں کی فرقہ بندی نے اُن کو اونچی نیچی "جاتیوں" میں ایک دُوسرے سے مستقل طور پر کاٹ دیا۔ نسلی اعتبار سے بھی دیہات بلکہ علاقے کے علاقے ایسے باشندوں سے آباد ملتے ہیں جن کے خال و خد اور کاسۂ سر میں کوئی فرق نہیں۔ موجودہ حیثیت، تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے دیکھیے تو پنجاب کے مسکین چوہڑے اور کسی مقطّع پنڈت یا مغرور راج پوت میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ لیکن جسم کی ساخت برابر غمازی کر رہی ہے کہ وہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی نسل کے افراد

ہیں۔[1]

تمدنی، قومی اور اخلاقی خرابیوں سے قطع نظر، جب یہ فرقہ بندی ہندو مذہب کا بنیادی عقیدہ بن گئی تو اس نے لوگوں میں عجیب قسم کی قدامت پرستی اور ذہنی جمود پیدا کیا، جو انسان کے فطری ارتقا کے حق میں بڑی رکاوٹ ہی۔ مگر اس پہلو پر کتاب کی دوسری جلد میں ہمیں ذرا زیادہ وضاحت سے بحث و غور کرنے کے موقعے نکل آئیں گے۔

---

[1] دیکھو "امپیریل گزیٹیر آف انڈیا" جلد اول صفحہ ۲۹۳۔

باب اوّل

فتوحاتِ سندھ

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں مکّہ والوں نے دینِ اسلام کو اپنے شہر سے نکال دیا تھا۔ مگر صدی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ وہ دُنیائے معلومہ کے مشرق و مغرب میں چھا گیا۔ مراکش سے ترکستان و سیستان تک اور بحرِ عرب سے ماوراءُالنہر تک مسلمانوں کی اتنی بڑی سلطنت قائم ہوئی کہ انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں بنی تھی۔ اس کا رقبہ کم و بیش ڈیڑھ کروڑ مربع میل اور مرکز شہرِ دمشق تھا۔ کرۂ ارض کے اکثر آباد و زرخیز ترین ملک اُس کے زیرِ نگیں ہو گئے تھے۔ عرب مجاہدین کو پھر بھی سیری نہ ہوتی تھی۔ اور جس زمانے سے ہماری تاریخ کا تعلق ہے، اُن کے تین لشکر ایک طرف اندلس، اور دُوسرے سرے پر چینی ترکستان اور مکران و سندھ کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے: مغرب میں امیر موسیٰ ابن نصیر کا نائب سپہ سالار طارق شہابِ ثاقب کی طرح اسپین پر گرا اور وہاں کے مسیحی

بادشاہ کی حکومت و شوکت خاک میں ملا دی (سنہ ۹۰ھ م سنہ ۷۱۰ء) مشرق کے لشکر، عراق کے جلاد امیر (یعنی گورنر جنرل) حجاج ابن یوسف کے زیرِ ہدایت ایران سے بڑھے اور سپہ سالار قُتیبہ ابن مُسلم نے وادیٔ جیحوں میں جنگ جُو ترکوں کو اتنی شکستیں دیں کہ شمار کرنا مشکل ہو گیا۔ سنہ ۹۲ھ مطابق سنہ ۷۱۲ء میں یہ بلند حوصلہ فاتح کاشغر کے راستے سلطنتِ چین پر فوج کشی کے منصوبے باندھ رہا تھا جب کہ ایک اور عربی لشکر شیراز سے مملکتِ سندھ پر حملہ کرنے روانہ ہُوا اور وہاں کے سرحدی شہر (ارمبیل یا) ارمابیل، موجودہ لس بیلہ' پر معمولی سی آویزش کے بعد قابض ہو گیا؛

واضح رہے کہ ایران کے جنوب مشرقی صوبے سیستان پر مسلمانوں کا پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا۔ مکران، قندھار، کابل اسی صوبے کے اقطاع تھے۔ یہ جس طرح ایرانی شہنشاہی کے زمانے میں اکثر آزاد ہو جاتے، اسی طرح خلافتِ اسلامی کے عہد میں ان کی بار بار تسخیر و تادیب کی ضرورت پیش آتی تھی۔ خود سیستان، جسے قصّے کہانی کی کتابوں میں "مُلکِ نیم روز" کے شاعرانہ نام سے یاد کرتے ہیں؛ امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں پوری طرح مسخر ہُوا اور صحابیٔ رسولؐ حضرت عبدالرحمانؓ ابن سمرہ کی جدّ و جہد سے اسلامی سلطنت کا مستقل جُز بنا تھا۔ انھی بزرگ کا مشہور فوجی سردار مہلّب گُزرا ہے جس نے کابل فتح کر کے وادیٔ سندھ و پنجاب پر تاخت کی اور سب سے

پہلی مرتبہ سرزمینِ پاکستان کو تکبیر کی آواز سُنائی (سنہ ۴۴ ھ مطابق سنہ ۶۶۴ ء)۔ انھی مشرقی مہمات کو عربی تاریخوں میں ممالکِ ہند سے منسوب کر دیا ہے اور ہم عصر شاعر (ابن مفرغ) کا یہ قطعہ اکثر نقل کیا جاتا ہے کہ ؎

کم بالجروم وارض الھند من قدم ومن سرابیل قتلی لاھم قبروا
بقندھارٍ ومن یکتب منیتہٗ بقندھارٍ یرجم دونہ الخبرُ

(یعنی ممالکِ گرم اور سرزمینِ ہند میں (ہم) کتنی ہی دفعہ پہنچے اور نہ جانے کتنے بہادر سپاہی مارے گئے جن کی قبر تک نہیں بنی۔ قندھار میں ــــ اور جس کی موت قندھار میں لکھی تھی، اُسے پتھروں سے پاٹ دیا اور پھر اُس کی کبھی خبر نہ آئی۔)

یہ بھی ثابت ہے کہ اُن دنوں مکران اور موجودہ بلوچستان کے مشرقی اضلاع مملکتِ سندھ میں شامل تھے اور یہ راجا داہر کی غفلت یا کمزوری سمجھئے کہ اپنی سرحد پر اسمٰعیل جیسے تجارتی، قلعہ بند شہر کو کُمک نہ پہنچا سکا۔ اسلامی لشکر یہاں سے ساحل ساحل آگے بڑھا اور سندھ کی خاص بندرگاہ دیبل کے سامنے خیمہ زن ہُوا۔ (محرّم سنہ ۹۳ ھ مطابق سنہ ۷۱۲ ء)

سندھ ایک آزاد اور دُور دراز مُلک تھا۔ راستے دُشوار و غیر آباد، فوج کشی کافی خرچ طلب تھی۔ کام یابی میں کچھ بہت مالِ غنیمت یا معقول خراج ملنے کی توقّع نہ تھی۔ اِن حدود کی نسبت سب سے پہلی سرکاری اطّلاع خلافتِ فاروقی میں جن الفاظ

میں پیش ہوئی وہ لوگوں کو اشعار کی طرح یاد رہ گئے تھے:

"ماءُھا وشلٌ وَ ثمرھا دقلٌ و لصّھا بطل -

ان قلّ الجیش فیھا ضاعوا و ان کثروا، جاعوا"

(ترجمہ: وہاں پانی اُتھلا، پھل بدمزہ اور چور دلیر ہیں۔ اگر فوج کم ہو تو ضائع ہو جائے اور زیادہ ہو تو بھوکی رہ جائے)

حضرت عمرؓ نے یہ سُن کر خبر دینے والے سے فرمایا کہ تم حال بیان کرتے ہو یا قافیہ پیمائی؟ [1]

بعد میں جو لوگ اُدھر آئے یا فوجی تاختیں ہوئیں، اُن سے بھی مذکورۂ بالا قول کچھ غلط نہیں نکلا۔ دُوسرے سیستان ہی کو سنبھالنے اور پُوری طرح نظم قائم رکھنے میں بہت محنت اور مدّت درکار ہوئی۔ ابن مفرّغ کا قطعہ انھی پُرصعوبت مساعی کی یادگار ہے اور حکومت جمنے کے بعد، مکران جانے کے بارے میں اعشیٰ ہمدانی اپنی بد دلی یوں قلم بند کر گیا ہے ؎

و انت تسیر الیٰ مکران؟ فقد شحط الورود المصدر

ولم تکُ حاجتی مکران وَلا الغزو فیھا وَلا المتجر

وحُدِثت عنھا وَ لم آتھا فما زلت عن ذکرھا اوخر

بان الکثیر بھا جائع و ان القلیل بھا السعور

(ترجمہ:- ارے تو اتنی دُور، مکران کہاں جائے گا؟ وہاں

---

[1] یہ طبری کی روایت ہے۔ بلاذری نے یہ تعتہ عہد عثمانی سے منسوب کیا ہے: ص۲۲۲

کیا لکھا ہی؟ نہ جنگ کا مزا نہ تجارت کا ۔ مَیں نے اُس کا حال
تو سُنا مگر خود نہیں آیا اور اس کے ذِکر سے بھاگتا تھا ۔ کیوں کہ
وہاں بہت سے (لوگ) بھوکے اور تھوڑے سے (مقام) بڑے
خطرناک ہیں ۔)

مگر چند واقعات ایسے پیش آئے کہ حجّاج نے سندھ کو فتح کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا: اوّل تو علاّفی قبیلے کے چند سردار مقامی حکّام سے لڑے اور مکران کے دو والیوں کو قتل کرکے سندھ بھاگ آئے ۔ پھر ایک ہاشمی سردار نے خلافتِ اموی کے خوف سے اسی ہم سائے کی پناہ لی اور سندھ کے راجا داہر نے غالبًا ان پناہ گیروں کو واپس دینے سے انکار کر دِیا ۔ دُوسرے اُنھی دنوں عراق آنے والی کشتیوں پر دیبل کے بحری قزّاقوں نے چھاپہ مارا اور مال و اسباب کے ساتھ عرب مسافروں کو بھی پکڑ لے گئے ۔ کہتے ہیں انھی میں ایک عرب لڑکی نے حجّاج کی دُہائی دی کہ اِغثنی یا حجّاج! اور بچ کر نکل جانے والوں نے یہ روایت کچھ ایسے دردناک پیرائے میں آکر سُنائی کہ حجّاج کو جُھرجُھری آ گئی اور بے اختیار پُکارا: لبّیک، لبّیک (یعنی حاضر ہوں، مَیں حاضر ہوں!) پھر خلیفہ کی خدمت میں دوبارہ عرضی بھیجی ۔ خرچ سے دوگنا رُپیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا اور سندھ پر فوج کشی کی اجازت حاصل کر لی ۔ دُوسری طرف راجا داہر سے مطالبہ کیا کہ ہمارے قیدی واپس اور نقصان کی تلافی کی جائے ۔ راجا نے جواب دیا کہ یہ دیبل کے بحری

قزّاقوں کا کام تھا، ہمارا اُن پر زور نہیں چلتا۔ تب حجّاج نے ایک مختصر فوج دیبل والوں کی سرکوبی اور عرب قیدیوں کو چھڑانے کے لیے روانہ کی مگر عرب سردار عُبیداللہ ابن بنہان یہاں کے معرکوں میں شہید ہوگیا۔ کراچی کے ساحل پر "عبداللہ شاہ" کا ایک مقبرہ مشہور ہے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ کی رائے میں دراصل یہ اسی عبیداللہ کی قبر ہے[1]۔

دوسرا لشکر بُدیل والیٔ عمان کی سرکردگی میں سندھ بھیجا گیا تھا لیکن اس مُہم کے خلاف خود راجا داہر کا بیٹا بڑی بھاری فوج لے کر لڑنے آیا اور شہر نیرون کے قریب یہ عرب سردار بھی مارا گیا۔ حجّاج کو اس خبر نے بےقرار کردیا۔ 'چچ نامہ' میں لکھا ہے کہ ایک شخص جو لڑائی میں شریک تھا، حجّاج کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُسے سُنایا کہ مَیں نے بچشم خود بُدیل کی بہادری دیکھی۔ جب دُشمن کا اُس پر نرغہ ہُوا، تو اُس نے گھوڑے کی آنکھوں پر پٹّی بندھوا دی اور شیروں کی طرح سندھیوں کے دل بادل مجمع پر جا پڑا، یہاں تک کہ صدہا تلواروں کے زخم کھا کر مارا گیا۔ بدمزاج حجّاج نے کہا اگر تو مرد ہوتا تو اسی کے ساتھ لڑ کر جان دیتا اور زندہ بچ کر نہ آتا۔" پھر حُکم دیا کہ اُس (راوی) کی گردن اُڑا دی جائے!

حجّاج نے قسم کھا لی تھی کہ بُدیل کا انتقام لیے بغیر نہ

---

[1] 'توضیحات تاریخ معصومی' صفحہ ۲۶۲

رہوں گا۔ ابھی تک وہ صرف دیبل یا جنوبی سندھ کو قابو میں لانے کی فکر میں تھا لیکن اب معلوم ہُوا کہ سندھ کی مرکزی حکومت سے لڑے بغیر چارہ نہیں۔ لہٰذا پورے مُلک پر حملہ کرنے کی ٹھان لی اور بڑے پیمانے پر فوج کشی کی تیاریاں کیں۔ مہم کی قیادت کے لیے اپنے داماد عمادالدّین محمّد ابن قاسم کو نامزد کر دیا؛

سندھ کی کیفیت، حملۂ محمّدی کے وقت

محمّد ابن قاسم کی داستانِ کشور کُشائی سُنانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم اس مملکت کا ایک ذہنی خاکہ کھینچنے کی کوشش کریں جہاں پاکستان کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اقالیمِ ہند میں سے پہلا مُلک رقبۂ اسلام میں داخل ہُوا؛

آج کل سندھ محض ایک چھوٹا صوبہ رہ گیا ہی۔ پہلی صدی ہجری (یا آٹھویں صدی عیسوی) کے آغاز میں یہ وسیع اور خودمختار ملک تھا۔ اگرچہ اس کی حدود کا تعیّن کرنا ممکن نہیں مگر موجودہ بلوچستان اور مکران کے مشرقی اضلاع یقیناً سندھ میں شامل تھے شمال میں اس کی سرحد جہلم و چناب کے سنگم تک پھیلی ہوئی تھی جس کے آگے کشمیر اپنی عملداری کا دعوا کرتا تھا۔ مشرق میں ملتان سندھ کا اہم سرحدی مرکز تھا اور جنوب میں جیسلمیر، مارواڑ اور کچھ کے بعض علاقوں کا اس طرح ذِکر آتا ہی گویا وہ مملکتِ سندھ کا حصّہ تھے۔ کاٹھیاواڑ، شمالی گجرات یا اُن کے آگے جو اقطاعِ سندھ سے ملحق کیے گئے، یہ مسلمانوں کے

اضافے تھے اور انھیں سندھ کے مسلّمہ اجزا نہیں سمجھا جاسکتا۔
اِن سب پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر مُلکِ سندھ کا رقبہ (سابقہ) ایک لاکھ مربّع میل سے زیادہ، یعنی موجودہ صُوبے سے کم سے کم دوگنا تخمین ہوتا ہے۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے فاصلوں اور شہروں کی نسبت جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بھی اس قیاس کی تائید کرتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ راجا داہر کی مرکزی حکومت کا دُور کے علاقوں سے رابطہ کم زور تھا۔ ساحلوں پر اُس کا زور نہ چلتا تھا۔ سندھ کی بڑی بندرگاہ (دیبل) بحری قزّاقوں کا مامن بن گئی تھی اور تجارت ایک طرف، بحری راستے بھی مخدوش تھے۔ مشرقی سرحد کے مرکزی قلعے ارمابیل کو راجا نے کوئی کمک نہیں پہنچائی اور وہاں کے قلعہ دار نے عرب حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب یہ واقعہ مذکور ہے کہ شہر نیرون کے حاکم نے بُدیل کے قتل کے بعد انتقام کے خوف سے بالا ہی بالا حجّاج سے نامہ و پیام کیے اور محمد ابن قاسم کے حملے سے پہلے خراج گزاری کے وعدے پر امان حاصل کرلی[1]۔ شمال اور وسطِ سندھ میں بھی ہم کئی مقامات پر نیم متمدّن اقوام و قبائل کا حال پڑھتے ہیں جن پر راجا کی حکومت برائے نام تھی۔ انھی میں جاٹ (جٹ یا زط) قوم کا ذِکر آتا ہے جو جنوبی افغانستان یا زابل سے ممالکِ ہند میں داخل ہوئے اور سندھ و پنجاب میں جگہ جگہ ان کی برادریاں

---

[1] چچ نامہ، صـ۹۳

آباد ہوگئی تھیں۔ چینی سیّاح ہوانگ چوانگ (یا تسانگ) نے مشرقی سندھ میں صرف دو تین شہروں، اور بعض خوف انگیز صحرائی راستوں کا ذکر کیا ہے جس سے ملک میں ہم آبادی کی کمی اور نظم و نسق کی ابتری کا اندازہ کر سکتے ہیں[1]ہمارا ایک اور ماخذ 'چچ نامہ'[2] ہے۔ جس میں محمد ابن قاسم کی فتوحات سے

---

[1] الفنسٹن کی 'تاریخ ہند' طبع سنہ ۱۹۱۱۔ جس کے ضمیمہ ع۹ میں چوانگ کے سفرنامے کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۲۸۱ و مابعد

[2] چچ نامہ۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی۔ اس کا قلمی نسخہ علی بن حامد کوفی نے بکھر میں قاضی اسماعیل سے جو مولّفِ کتاب کی اولاد میں تھے، لیا اور سنہ ۶۱۳ھ مطابق سنہ ۱۲۱۶ء میں فارسی ترجمہ کیا۔ یہ "منہاج الدّین والملک" اور "فتح نامہ" وغیرہ کئی ناموں سے موسوم تھا۔ لیکن "چچ نامہ" ہی مشہور ہُوا اور اسی نام سے ڈاکٹر داؤد پوتہ کی تصحیح اور حواشی کے ساتھ حیدرآباد دکن سے شائع ہُوا ہے۔ اصل کتاب جو مفقود ہوگئی، ضرور فتح سندھ کے قریب زمانے میں لکھی گئی تھی۔ اُس میں اکثر واقعات دو تین واسطوں سے روایت کئے گئے ہیں۔ اور حجاج اور محمدابن قاسم کے بہت سے مراسلات درج ہیں کہ اتنے اور ایسے مفصّل کسی عربی تاریخ میں نہیں ملتے۔ لیکن فارسی مترجم نے آزاد ترجمہ کیا اور کہیں کہیں اپنے آپ کو "مصنّف" کا لقب دیا ہے۔ آخری حصّے میں بہت سے فارسی اشعار صریحاً اُسی کا اضافہ ہیں اور ممکن ہے خلیفہ ولید کے حکم سے محمّد ابن قاسم کو چرمِ گاؤ میں سی کر مارنے کی احمقانہ روایت بھی مترجم کی تصنیف ہو۔ احمقانہ اس لیے کہ ولید کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا! مگر بڑا ظلم کوفی نے یہ کیا کہ اصل عرب مصنّف کا صاف صاف نام تک نہیں لکھا۔ متن کتاب میں ایک جگہ (ص۱۵) اتنا تحریر ہے کہ "مصنّفِ داستان خواجہ امام ابراہیم چنیں روایت کرد ...." اور اسی سے ڈاکٹر داؤد پوتہ قیاس کرتے ہیں کہ شاید اصل مصنّف کا نام یہی ہوگا — بہرحال، کتاب کی اکثر جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف یا اُس کے قریبی بزرگ خود محمد ابن قاسم کے ہمراہ سندھ آئے اور اونچے مرتبے کے لوگ تھے۔ درایتاً، کتاب کی وہ روایتیں جن کی عربی تاریخوں سے اجمالاً تصدیق ہوتی ہے، یقیناً قابلِ قبول اور بہت سی تفصیلات بہم پہنچاتی ہیں۔

کچھ پہلے کے بھی حالات جمع کیے ہیں ۔ یہی کتاب ہمیں راجا داہر اور اس کے باپ چچ سے متعارف کرتی اور بتاتی ہو کہ کس طرح یہ برہمن راجا سیہ رس بن ساہ سی کا وزیر بنا ۔ پھر پہلے رانی کے دِل پر اور اس کے بعد پورے مُلک پر قابض ہوگیا؛

ہوانگ چوانگ جو اپنی واپسی کے وقت راج پوتانے سے سندھ آیا ، یہاں کے راجا کو "شودر" بتاتا ہو[1] وہ سنہ ۶۴۳ یعنی سنہ ۲۳ھ میں سندھ پہنچا تھا ۔ "سیہ رس" اور "ساہ سی" ہندوؤں کی کسی نیچ قوم والوں کے نام ہو سکتے ہیں لہٰذا ممکن ہو کہ چینی سیّاح سیہ رس کے زمانے میں یہاں آیا ہو اور اس کے تھوڑی مدّت بعد ہی ، حسب روایت "چچ نامہ" ، انقلابِ حکومت نے چچ کو مسندِ شاہی پر پہنچایا ہو؛[2]

تاریخ کا سب سے کم سِن فاتح

لین پول نے محمّد ابن قاسم ابن محمّد کی کہانی کو تاریخ کی ایک "رومانس" بتایا ہو ۔[3] اِس رنگین داستان کا آغاز چچ نامہ کی منقولہ روایت سے ہونا چاہیئے ؛ وہ یہ کہ ایک دن حجّاج نے محمّد ابن قاسم سے جو رشتے میں اُس کا بھائی ہوتا تھا، کہا کہ ای ابنِ عم ، مَیں تجھے بڑھانا چاہتا ہوں ۔ تیری جو خواہش

---

[1] ال فنس ٹن ۔ ص ۲۸۹

[2] 'چچ نامہ' میں لکھا ہو کہ عثمان ابن ابی العاص نے دیبل پر سنہ ۱۵ھ میں بحری تاخت کی تو راجا چچ ۳۵ سال سے سندھ کا راجا تھا۔ (ص ۷۲) غالبًا یہ سہو ہو ورنہ اس کے بیٹے داہر کا چند سال بعد راجا ہونا اور سنہ ۹۳ھ تک سلامت رہنا، عقل میں نہیں آتا ؛

[3] میڈی ویل اِن ڈیا، ص ۲

ہو بیان کر ۔" محمد نے کہا "مجھ سے اپنی لڑکی بیاہ دے"۔
حجاج کے ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی تھی ۔ وہ نو عمر عزیز کے سر پر ماری کہ عمامہ کھل گیا ۔ پھر پوچھا "کہ کیا چاہتا ہے؟" لڑکے نے پھر وہی بات کہی اور دوبارہ چھڑی کھائی ۔ حجاج نے تیسری دفعہ پھر سوال کیا "بتا کیا چاہتا ہے؟" محمد ابن قاسم نے سہ بارہ وہی درخواست کی! آخر سخت دل حجاج پسیج گیا ۔ بولا "اچھا، شرط یہ ہے کہ تو نئے ملک فتح کرے اور انھیں ایسا ضبط میں لائے کہ پھر ہاتھ سے نہ جائیں"۔[1]

محمد ابن قاسم نے کم سنی کے باوجود اس شرط کو جس خوبی سے پورا کیا وہ اُس عہدِ جنگ و کشورکشائی میں بھی شہ کار کا مرتبہ رکھتا ہے : سولہ سترہ برس کی عمر تھی جب وہ سپہ سالاری کا پروانہ لے کر ایران سے مکران چلا اور شروع سال ۹۳ ہجری (م سنہ ۷۱۲ ء) میں بندرگاہ دیبل کو آ کر گھیر لیا ۔

اِس مہم میں حجاج نے ضروری ساز و سامان کی فراہمی میں بڑا اہتمام کیا، اور سوئی تاگا تک فوج کے ساتھ کر دیا تھا کہ ضرورت ہو تو دشواری نہ پیش آئے ۔ پانچ منجنیقیں جہاز پر لاد کر بصرہ سے روانہ کی تھیں کہ دیبل کی قلعہ شکنی میں کام دیں ۔ اِن میں سب سے بڑی "عروس" کہلاتی تھی اور اس کے وزنی پتھر کو کھینچ کر چلانے کے لیے پانسو آدمی مقرر تھے ۔ فوج کی تعداد چھ ہزار تھی ۔ مگر سب چیدہ اور آزمودہ سپاہی تھے ۔

---

[1] چچ نامہ، صفہ ۱۹۰

باربرداری اور رسد رسانی کے واسطے تین ہزار "دو کوہانی" اونٹ ایران سے لائے گئے تھے ؎

بہ ایں ہمہ دیبل کا فتح کرنا کچھ کھیل نہ تھا۔ سندھ کے ساحل پر یہ بہت مستحکم اور بڑا شہر تھا۔ سامانِ خورد نوش اور مُدافعین کی شہر میں کمی نہ تھی۔ اپنے مورچوں پر انھیں پُورا بھروسہ تھا اور یقین رکھتے تھے کہ کچھ عرصے میں محاصرین تنگ آ کر چلے جائیں گے۔ مگر نوجوان محمد خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہ آیا تھا اور خود حجّاج اگرچہ صدہا میل دوُر تھا۔ آنکھیں دیبل پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر تیسرے دن داماد کو خط لکھتا۔ مفصّل اطّلاعات طلب کرتا اور جُزئی ہدایات بھیجتا تھا۔ ڈاک کا انتظام ایسا اچھّا کیا تھا کہ ساتویں دن دیبل کا خط بصرہ پہنچ جاتا تھا۔

محاصرے نے قریب چھ مہینے طول کھینچا۔ عربوں کی سنگ باری سے مورچے ٹوٹے یا نہ ٹوٹے، دِل ضرور چھوٹتے جاتے تھے۔ بعض شہری چھُپ چھُپ کے محاصرین کے پاس آتے اور امان کا وعدہ لے جاتے تھے۔ کہتے ہیں یہ صلاح بھی ایک برہمن چُپکے سے دے گیا تھا کہ جب تک شہر کا بڑا مندر نہیں گرے گا، دیبل فتح نہ ہوگا۔ عربی تاریخوں میں مندر کی شان شوکت تحریر ہی۔ یہ بہت بلندی پر واقع تھا اور ظاہرا اسی کے نام سے شہر "دیبل" (= دیول = مندر) کہلاتا تھا۔ محمد ابن قاسم نے حجّاج سے اجازت منگائی۔ اُستاد جعوبہ منجنیقی نے حکم لگایا کہ بچھلا پایہ دو درع کاٹ کر پتھر چلایا جائے

ن مندر کی چوٹی پر پڑے گا ۔ چنانچہ پایہ کاٹا گیا اور پان سو
شوں نے نعرۂ تکبیر کے ساتھ پتّھر کھینچ کر مارا تو دو نشانوں
مندر کی بلند چھت دھڑام سے نیچے گری ۔ اسی وقت فوج
شہر پناہ پر یورش کی اور کمندیں ڈال ڈال کر اوپر چڑھ
۔ پہلا سپاہی جس نے فصیل پر اسلامی جھنڈا لہرایا ۔ صعدی
خزیمہ کوفی تھا ؎

تین دن کے کشت و خون کے بعد عرب سپاہیوں نے تلوار
ن میں کی ۔ شہر کو امان دی ۔ مقامی حاکم بچ کر نکل گیا مگر
ری جوان بے تعداد مارے گئے ۔ ہزاروں قید ہوئے ۔ بڑے
رہی کی مُرلیاں سات سو تھیں جو بُتوں کی پرستاری سے
کر مسلمانوں کی کنیزی میں داخل ہوئیں ۔ بعض برہمن مسلمان
گئے ۔ اور سرکاری عہدوں پر بحال رہے ۔ شہر کا حاکم اعلیٰ
ابن زرّاع نجدی مقرر کیا گیا اور چار ہزار عرب دیبل میں
ئے گئے ۔ عرب قیدی نہ صرف آزاد بلکہ اسی شہر میں بڑی عزّت
ست سے آباد ہوئے ۔ انھی میں وہ لڑکی تھی جس نے حجّاج
دُہائی دی تھی ؎

محمّد ابن قاسم کے ان انتظامات نے دیبل کو بالکل بدل دیا ۔
ی قزّاقوں کی تادیب ایک انقلابی دور کا سرآغاز بن گئی ۔ محلِّ
رع کے اعتبار سے دیبل موجودہ پاکستان کے دارالحکومت کا پیش رو
یا نہ ہو ، اس مُلک میں مسلمانوں کی سب سے پہلی نوآبادی ضرور تھا ؎ لے

• کئی فرنگی تاریخ نویس موجودہ کراچی کو اسی جگہ آباد بتاتے ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

راجا داہر کا خاتمہ

دیبل ماہِ رجب سنہ ۹۳ھ (م سنہ ۷۱۲ء) میں فتح ہُوا۔ سندھ کے جنوبی صوبے کا مرکزی شہر نیرون پہلے ہی ہمت ہار چکا تھا۔ اسے اکثر تاریخوں میں موجودہ حیدرآباد سندھ کا پیش رو بتایا گیا ہے۔[1] دریا کے مغرب میں شمالی صوبہ سیوستان یا سیہوان، موسوم اور موجودہ بلوچستان کے شہر سیوی (یا سیویس) تک وسیع تھا مگر آبادی کم اور نیم آزاد تھی۔ اس کی بڑی بستیوں پر محمد ابن قاسم کا تھوڑی مدت ہی میں قبضہ ہوگیا۔ داہر نے انھیں بچانے کی نیم دلی سے کوششیں کیں بھی تو وہ کارگر نہ ہوئیں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) جہاں جزیرۂ منوڑا پر پہلے دیبل واقع تھا۔ (دیکھو الیٹ، جلد اوّل صفحہ ۴۲۹۔ امپی ریئل گزیٹیر، جلد ۲۲ صفحہ ۳۱۵) لیکن سندھ کے دریا اور سمندر کا تلوّن مشہور ہے۔ بارہ سو برس میں خدا جانے کیا سے کیا تغیر ہو چکے ہیں۔ بعض اہلِ تحقیق کا قیاس ہے کہ دیبل کی جگہ لاہوری بندر نے لے لی تھی جو کراچی سے کئی میل مشرق کی طرف بس گیا تھا۔ (راورٹی: مہران اوف سِند۔ صفحہ ۳۱۷، ڈاکٹر داؤد پوتہ حواشی تاریخ معصومی صفحہ ۲۶۷)

[1] عربی فارسی تاریخیں اور جغرافیے اس کی تائید کرتے ہیں لیکن الیٹ کو ضد سی ہوگئی ہے کہ یہ قول غلط ثابت کیا جائے۔ وہ نیرون کو موجودہ موضع جھرک کی جگہ تشخیص کرتے ہیں (جلد اوّل صفحہ ۴۰۰) اور ڈاکٹر داؤد پوتہ بھی اُن کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ (حواشی چچ نامہ صفحہ ۲۵۶) حالانکہ حیدرآباد کا قلعہ ابھی تک "نیرون کی ٹھیک" کہلاتا ہے۔ اگرچہ اسلامی فتح کے وقت دریا اس شہر کے مشرق میں بہتا تھا اور اب قریب ہی مغرب میں آگیا ہے۔

مغربی سندھ کے بہت سے رئیس نہ صرف عرب فاتح کے باج گزار بلکہ محمد کے حُسنِ سلوک سے اتنے گرویدہ و وفادار ہو گئے کہ جوق در جوق اُس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اس کی مروّت اور نرمی پر حجاج نے کئی مرتبہ تنبیہ بھی کی لیکن محمد کا طرزِ عمل ویسا ہی فیاضانہ رہا اور اہلِ سندھ کو یقین ہوگیا کہ راج کا بدلنا خُدا کی مہربانی تھی، قہر نہ تھا۔

اِس عرصے میں عراق سے دو ہزار تازہ فوج اور دریا پار کرنے کا حُکم آ گیا۔ داہر نے چاہا تھا کہ مسلمانوں کو گھاٹوں سے اُترنے نہ دے لیکن عرب سپاہ تختوں کا پُل بنا کے پار ہو گئی[1] اور حوالیٔ راور میں داہر سے مقابلہ ہُوا بعض تاریخوں میں اسے پایۂ تخت اَرور لکھ دیا ہے لیکن چچ نامہ بہت صراحت سے راور کو دریا کے قریب ایک مضبوط قلعہ اور جُداگانہ شہر بتاتا ہے اور ڈاکٹر پوتہ کے خیال میں وہ موجودہ حیدر آباد سندھ کی جگہ واقع تھا۔[2] بہرتقدیر کئی دِن کی آویزشوں کے بعد ماہِ رمضان میں وہ خوں ریز جنگ ہوئی جس نے راجا اور سندھ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا

---

[1] مقام کا ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ ڈاکٹر پوتہ کا قیاس ہے کہ مسلمانوں نے جھم پیر کے قریب دریا پار کیا ہوگا۔
(حواشی چچ نامہ ص۲۶۳)

[2] حواشی چچ نامہ ص۲۵۸۔

محمد ابن قاسم سے سفارتی گفتگو اور کئی بار نامہ و پیام ہوئے تھے۔ ان کی کیفیت تفصیل سے 'چچ نامہ' میں لکھی ہی۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہی کہ راجا اپنے ملک و مال اور کثرت فوج پر بہت مغرور تھا۔ اور آٹھ دس ہزار عرب جنھیں سترہ سال کا لڑکا لڑانے آیا، اس کی نظر میں کچھ نہ جچتے تھے۔ زبردست لشکر اور ساز و سامان کے علاوہ خود وہ فنونِ سپہ گری میں کمال رکھتا تھا اور اس کی سخت کمان کسی سے نہ کھنچتی تھی۔ داہر کا ایک اور ہتھیار یہ بیان کیا گیا ہی کہ کمند میں آہنی چکّر لگا تھا جس کی دھار چاقو سے زیادہ تیز تھی۔ جب راجا کمند پھینک کر کھینچتا، حریف کی گردن اُڑا دیتا تھا۔ لڑنے کے لیے نِکلا تو حسبِ معمول جنگی ہاتھی آگے آگے تھے۔ ان کے بعد دس ہزار زرہ پوش سوار پھر تیس ہزار پیادے بہترین ہتیاروں سے مسلّح۔ قلبِ لشکر میں چیدہ سرداروں، جاں نثاروں کا گروہ راجا کے کوہ پیکر سفید ہاتھی کو گھیرے ہوئے، ہاتھی پر داہر قیمتی زرہ بکتر پہنے، ہتیار سجے بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ پان کھلانے اور تیر دینے کے لیے دو کنیزیں خواصی میں ساتھ تھیں ؛

اُدھر صبح کی نماز اور دعائے فتح و نصرت کے بعد مجاہدینِ عرب اُٹھ اُٹھ کر پھرتی سے پانچ حصّوں میں صف بند ہوئے۔ محمد ابن قاسم نے ایک پُرجوش تقریر کی اور دو نیزہ‌باز رسالے آگے بھیجے کہ چکّر کاٹ کر دُشمن کے بازوؤں پر جا گریں۔

نو سو نفط انداز تین ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیے اور جنگی ہاتھیوں کو بھگانے میں یہ آتشی حربہ بہت مفید ثابت ہُوا - ہراول کے دو سو سوار ابو فِضّہ قشیری کے ماتحت بڑھے - راجا کے لشکر کے دہ من چلے سوار جو گھوڑے دوڑاتے چلے آتے تھے پہلے انھی ہراول والوں سے ٹکرائے اور نقصان اُٹھا کے پیچھے ہٹے - شجاع نامے حبشی نے محمد ابن قاسم کے سامنے قسم کھائی تھی کہ خاص داہر پر حملہ کروں گا : یا اُس کا سر لاؤں گا یا اپنا سر کٹوا دوں گا - وُہ سرپٹ گھوڑا اُڑاتا ہُوا چلا اور صفوں کو چیرتا ہُوا راجا کے ہاتھی تک پہنچ گیا تھا کہ عمامے کے پیچ کھُل کر آنکھوں پر آ رہے - تلوار ہاتھی کی سونڈ پر پڑی - اتنے میں راجا نے ایک دو شاخہ تیر ایسا مارا کہ گردن میں پیوست ہوگیا۔

اب دونوں فوجیں ایک دوسری سے بھِڑ گئیں اور میدان کے ہر حصّے میں آتشِ قتال بھڑکنے لگی - راجا کے ساتھیوں میں کچھ لوگ مایوس و بد دِل تھے لیکن گروہِ کثیر نے جاں نثاری دِکھانے میں کمی نہ کی - ہتیار چلنے سے رہ گئے تو کبھی کبھی سپاہی ایک دوسرے سے گتھ گئے - محمّد ابن قاسم اور عرب سپاہی جان توڑ کر لڑ رہے تھے - جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بالآخر غالب آیا - دِن ڈھلتے ڈھلتے سندھی فوج کی صفیں ٹوٹ گئیں - ہاتھی دوڑتے دوڑتے شل ہو گئے - عرب نفط اندازوں نے اِن پر انگارے برسا دیے اور معلوم ہوتا ہو سندھی لشکر کا یہ خوف انگیز بازو اِس لڑائی میں کچھ کام نہ آیا - پھر، میدان ذرا چھٹا تھا کہ

نفط اندازوں نے راجا کے فیلِ سفید کو نشانے پر رکھ لیا۔ ہاتھی کے چھکے لگے اور وہ بھاگ کر قریب کی کسی ندی یا جھیل میں جا گھسا۔ لیکن قضا کے ہرکارے ہر طرف دوڑ چکے تھے۔ اسی پانی کے کنارے راجا داہر مارا گیا۔ برہمنوں نے لاش دل دل میں چھپا دی تھی مگر دن چھپنے سے پہلے وہ نکل آئی اور پہچان لی گئی۔ منادی کرنے والوں کی پکار کے ساتھ ہر گوشے میں اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ محمدؐ کو یہ بزرگ فتح ۱۰۔ رمضان المبارک سنہ ۹۳ ھ کے دن حاصل ہوئی۔ بہت سے مجاہدین فتح کی شکر گزاری میں رات بھر جاگتے اور خدا کی حمد و ثنا کرتے رہے ؁

فتح سندھ کی تکمیل

داہر کے خاندانی وارث موجود تھے۔ دارالحکومت الرور (یا ارور) اور ملتان وغیرہ مشرقی شہروں کو ابھی گزند نہ پہنچا تھا۔ مال و زر، اسلحہ اور قابلِ جنگ افراد کی کمی نہ تھی۔ مگر حکمراں طبقے کی ہمتوں ہی نے جواب دے دیا۔ محمد ابن قاسم کے جگہ جگہ عرب عامل مقرر کرنے سے سندھی اکابر کو یقین ہوگیا کہ وہ تاخت و تاراج کے لیے نہیں بلکہ مستقل قبضہ کرنے کے لیے آیا ہو مغربی سندھ کے صدہا سپاہی پہلے ہی عرب فوج میں بھرتی ہو چکے تھے۔ داہر کے مارے جانے سے مشرق کے امیر و وزیر بھی ایک ایک کر کے آنے اور اطاعت کا حلف اٹھانے لگے۔ محمد نے راوڑ سے بڑھ کر "برہمن آباد" کا محاصرہ

گیا جہاں داہر کی رانی اور خدم و حشم پناہ گیر تھے۔ لیکن وہیں کے ایک گروہ نے مسلمانوں سے ساز کر کے قلعے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور شہر پر محمدؔ کا قبضہ ہو گیا (ذی الحجہ سنہ ۹۳ھ م سنہ ۷۱۳ء)۔ یہ شہر جسے "بہمن وا" یا "بانبھرا" کہتے تھے موجودہ شہداد پور کے مشرق میں آباد تھا اور بعد میں اسی کے کھنڈروں سے منصورہ کی تعمیر ہوئی۔

قدیم سندھ کے دارالحکومت "ال رور" کے کھنڈر موجودہ روہڑی کے جنوب میں ملتے ہیں۔ اور شمالی ہند کا بڑا شہر "اس کلندہ" پنج ند کے قریب وہاں واقع تھا، جہاں اُچھ (قدیم) آباد ہوا۔ بعض فرنگی اہلِ تحقیق اسے اسکندر یونانی کے زمانے سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی کے جنوب میں موجودہ بہاول پور کے آس پاس بھاٹیہ قوم کا بڑا قلعہ اسی نام سے موسوم تھا۔ اور شمال مشرق کی طرف شہر ملتان اُن دنوں بھی مُلکِ سندھ کا جنگی مرکز مانا جاتا تھا بلکہ اپنے بُت خانے کی وجہ سے ہندوستان بھر میں اس کی شہرت تھی۔ یہ سب مقام تھوڑے دن کے محاصرے اور معمولی چپقلش کے بعد سال ڈیڑھ سال میں تسخیر ہو گئے۔ اور پوری "ولایتِ سندھ" یعنی ایک نیا اور وسیع ملک اموی سلطنت کا جُز بنا لیا گیا۔ صرف ملتان کے بُت خانے سے جو زر و جواہر عرب حملہ آوروں کے ہاتھ آیا، اس کی قیمت ۱۲ کرور درہم (یعنی ہمارے پانچ چھ کرور رُپے کے قریب) بتائی گئی ہے۔ خزانۂ خلافت سے سندھ کی مُہم کے واسطے تین کرور درہم لیے گئے تھے۔ لہٰذا

جب ملتان کا مالِ غنیمت حجّاج کے پاس پہنچا تو خوشی سے پھولا نہ سمایا اور پکار اُٹھا کہ "اب میرا دل ٹھنڈا ہُوا۔ اب میرے سر سے بوجھ اُترا۔ ۶ کرور درہم اور داہر کا سر ہمیں نفع میں ملا!"[1]

لیکن دولت و مال سے کہیں بڑھ کر، محمّد ابن قاسم کی قابلیّت اور کامیابی کی دلیل یہ ہی کہ پُورے ملک پر ایسا تسلّط قائم کیا کہ ہر جگہ امن و عدالت نے فراغ و ترقّی کے راستے کھول دیے۔ اور مقامی بھرتیوں سے پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر مرتّب ہوگیا۔ اُسے ان پر اتنا اعتماد تھا کہ دربارِ خلافت سے ممالکِ ہند پر فوج کشی کی اجازت طلب کی اور خلیفۂ وقت کو یا تو مکران و سندھ پر اقدام کرنے میں تردّد تھا، اور یا اب ایسی عظیم تر مہم کی منظوری دینے میں تامّل نہ ہُوا۔ محمّد ابن قاسم نے ملتان کو جنگی مرکز قرار دیا۔ قنوج کے راجا کے پاس سفارت بھیجی کہ خلافتِ اسلامی کی اطاعت قبول کرے اور مسلمانوں کو چین تک جانے کا راستہ دے ورنہ جبرًا راستہ نکالا جائے گا۔ دیکھ بھال کے عرب دستے شمالی راج پوتانہ اور پنجاب میں گشت لگانے لگے۔ ایک زبردست لشکرکشی کی تیاریاں قریب قریب مکمّل ہوگئیں ؏

---

[1] دیکھو بلاذری، صفحہ ۴۴۰۔ حجّاج نے سندھ کی مہم کے خرچ سے دُگنی رقم ادا کرنے کا اقرار کیا تھا۔ اس لیے ۶ کرور درہم دمشق بھیجے گئے ہوں گے۔ جیسا کہ 'چچ نامہ' کے بیان سے مترشح ہوتا ہی۔ مگر ممکن ہی کہ یہ ۱۲ کرور درہم ملکِ سندھ کے جملہ مالِ غنیمت کی قیمت ہو ؏

مقبولی اور معزولی

لیکن ارادوں کی تکمیل میں قضا و قدر کا بھی دخل ہے۔ یکایک حجّاج کی بیماری اور وفات کی خبر آئی (شوال سنہ ۹۵ ھ م سنہ ۷۱۴ء) محمّد ابنِ قاسم ابھی اسی فکر و تشویش میں تھا کہ دیکھیے مشرقی ولایات کا امیر، حجّاج کی جگہ کون مقرر ہوتا ہے کہ چند ہی مہینے میں خود خلیفہ ولید راہیٔ عدم، اور اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک وارثِ خلافت ہُوا (سنہ ۹۶ ھ)۔ حجّاج، سلیمان کی ولی عہدی کا مخالف رہا تھا اور یہ شہزادہ حجّاج کا سخت دُشمن ہوگیا تھا۔ مگر حجّاج تو مرگیا اور نئے خلیفہ کی دست رس کے باہر ہوگیا البتّہ اس کے کُنبے قبیلے کے لوگ موجود تھے۔ خلیفہ نے انھی سے اپنا بدلہ لے کر دِل ٹھنڈا کیا۔ یعنی مشرقی ولایات کی امارت اُن لوگوں کے حوالے کی جو پہلے حجّاج کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے۔ انھوں نے "آلِ ابی عقیل" (یعنی حجّاج کے سارے خاندان اور طرف داروں) سے خوف ناک انتقام لیا اور اسی چکّی میں سندھ کا نوجوان فاتح بھی پِس گیا۔

محمّد کی اتنی چھوٹی عمر میں ایسی بڑی فتوحات نے قدرتاً اسے اسلامی تاریخ میں ایک سُورما بنا دیا ہے۔ تعریف میں کئی قصیدے اور قطعے 'چچ نامہ' نے نقل کیے ہیں۔ خصوصاً یہ شعر عام و خاص کی زبان پر چڑھ گیا تھا کہ ؎

ساس الرّجال لسبع عشرۃ حجّۃ — ولداتہ عن ذاک فی اشغالِ

("اس نے سترہ برس کی عمر میں مردانِ جنگ پر سرداری کی۔ ساتھ کے لڑکے کھیلنے ہی میں مشغول رہے!")

زمانۂ حال کے بعض مبصروں نے اُس کی فتوحات کا سکندرِ اعظم کی ہندی مہم سے مقابلہ کیا اور محمد کو قابلِ ترجیح قرار دیا ہے لیکن جنگی کامیابیوں سے بھی زیادہ تعجب انگیز نوجوان فاتح کا نظم و ضبط ہے جس نے ایک دُشمن مُلک میں اجنبی اقوام کو صرف تین سال کے اندر ملّتِ اسلامی میں شیر و شکر کر دیا۔ حجّاج نے اسے مشورہ دینے کے لیے اپنے چند منتخب ندیم سندھ بھیجے تھے اور خود بھی برابر نصیحت و ہدایت لکھتا رہتا تھا۔ مگر کوئی شبہ نہیں کہ محمد ابنِ قاسم کی کامیابی کا اصلی سبب اس کی طبعی شرافت اور ذاتی فراست تھی۔ اُس نے اہلِ سندھ کے ساتھ نہایت نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کیا۔ اُن کے رسم و رواج میں کوئی ایسی جبری تبدیلی نہ کی جو انھیں ناگوار ہوتی۔ باشندوں کے سابقہ حقوق کی حتی الامکان حفاظت کی، اور جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے، انھیں کامل مذہبی آزادی عطا کی۔ مُلک بھر میں امن قائم، رفاہ کے آئین جاری ہوئے اور ذاتی طور پہ یہ نوجوان عرب سندھ کے لوگوں میں ایسا محبوب و محترم ہوگیا کہ وہ اس کی معزولی اور گرفتاری پر اشک بار ہوئے۔ ایک مقام پر عقیدت مندوں نے اس کی مورت بھی بنالی۔[1]

محمد کے کردار کا دوسرا لائقِ ستایش پہلو یہ تھا کہ جب یزید سکسکی معزولی کا پروانہ اور قید کا حکم لے کر پہنچا، تو سندھ کے

---

[1] "فتوح البلدان" بلاذری صفحہ ۴۴۰

فاتح سپہ سالار نے خاموشی سے گردن جھکا دی اور اس اطاعت گزاری میں اصول کی پابندی، بےنفسی اور سچی بہادری کا وہ نقش یادگار چھوڑ گیا جو اہلِ بصیرت کے نزدیک جنگ جوئی سے زیادہ پائےدار ہی۔
عالمِ قید کے پُراثر اشعار میں جو عربی تاریخوں میں اس سے منقول ہیں ایک جگہ لکھتا ہی :

لو کُنتُ اجمعت القرار لُوطئت
اناثٌ اعدّت للوغا و ذکورُ

("اگر میں (لڑنے کے لیے) استادہ ہو جاتا تو بہت سے تیاری کرنے والے مرد و عورت مارے جاتے") [1]

بلاذری کا بیاں ہی کہ اسے ٹاٹ کے کپڑے پہنائے اور ہتکڑی بیڑی ڈال کر واسط بھیجا گیا تھا [2] یہ بستی حجاج نے عراق عجم میں بسائی

---

[1] قُتیبہ فاتح ترکستان سے حجاج کی رفاقت کے جرم میں مواخذہ کیا گیا تھا۔ اُس نے دربارِ خلافت سے مصالحت کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہُوا تو مقابلہ کیا اور لڑ کر مارا گیا۔ (تاریخ سندھ از مولانا ندوی جلد اول صفحہ ۲۲۹ بہ حوالہ ابن خلدون)

[2] غالباً یہی تشدد بعد میں یہ مبالغہ آمیز افسانہ بنا کہ وہ چرمِ گاؤ میں سِلوا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ عربی کی مستند قریب العصر تاریخیں، بلاذری، یعقوبی وغیرہ صاف صاف بتاتی ہیں۔ کہ وہ واسط کے قید خانے میں لایا گیا۔ حال میں مکرمی حسام الدین صاحب راشدی نے مرزبانی کے تذکرہ "معجم الشعرا" (تالیف قرن پنجم، طبع قاہرہ سنہ ۱۳۵۴ھ) کی جانب میری رہ نمائی کی جس میں محمد ابن قاسم کے چند اشعار جو واسط کے قید خانے میں کہے تھے نقل کیے اور ایک یہ روایت بھی لکھی ہی کہ یہ اشعار خلیفہ سلیمان عبدالملک کو پہنچے تو اس نے محمد ابن قاسم کو آزاد کر دیا (صفحہ ۴۱۲) بہ ہر تقدیر یہ قصہ کہ داہر کی بیٹیاں جو غنائم کے ساتھ خلیفہ ولید کی خدمت میں بھیجی گئی تھیں، انھوں نے محمد ابن قاسم کو تہمت لگائی اور خلیفہ نے غضب ناک ہو کر اسے چرمِ گاؤ میں سِلوا کر مروا ڈالا، محض بے سر و پا ہی۔ مولانا ندوی نے اپنی تاریخ سندھ میں (صفحہ ۲۳۹) اور ڈاکٹر داؤد پوتہ نے حواشیٔ چچ نامہ (صفحہ ۲۶۸) میں اس حکایت پر مفصل و مسکت بحث کی ہی۔

تھی ۔ حریفوں نے اُسی کو منتخب کیا کہ حجاج کے عزیز و رفیق وہاں قید میں سڑا سڑا کر ہلاک کیے جائیں ۔ صحیح تاریخ نہیں ملتی لیکن محمد ابن قاسم نے غالباً یہیں وفات پائی ۔ کوئی بیس برس بعد ہم اس کے فرزند عمرو ابن محمد کو ولایتِ سندھ پر مامور دیکھتے ہیں پھر یہ خاندان گُم نشان سا ہو گیا ۔ مگر حق یہ ہے کہ محمد ابنِ قاسم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کا پہلا سردار و کارداں سالار ہے ۔ یہ مبارک نام ان کے دِلوں سے کبھی نہیں مٹے گا اور اس کے کارنامے ملّتِ اسلامی، خصوصًا پاکستان کی تاریخ میں قیامت تک یادگار اور احترام و احسان مندی کے سزاوار رہیں گے ؂

باب دوم

عربی حکومت سندھ میں

محمدؐ ابنِ قاسم نے مغربی پاکستان میں جس حکومت کی بنا ڈالی، وہ کچھ کم دو سو برس تک اموی اور عباسی خلفا کے ماتحت رہی۔ پہلی صدی ہجری کے آخر سے تیسری صدی کے وسط تک دمشق و بغداد سے سندھ کے والی مقرر ہوتے رہے۔ عربی تاریخوں میں ان کے نام اور واقعات کا مختصر احوال تحریر ہے۔ پوری سلطنت کی تاریخ لکھنے والے ایک بعید صوبے کی جزئی اطلاعات جمع نہیں کرتے تھے۔ مقامی وقائع لکھے گئے ہوں تو اب تک سلامت نہیں رہے۔ حوادثِ روزگار کی بے مہریاں مشہور ہیں۔ سندھ میں (مہران) دریا کی وارفتگی اور طوفانِ ریگ و باد ہی ہزار گیارہ سو برس میں ملک کا نقشہ بدلنے کے لیے کافی تھے کہ عربی تلفظ اور کاتبوں کی مہربانی سے نام اور مقام سمجھنے میں مزید دقت پیدا ہوگئی۔ البتہ عربی جغرافیے اور سفرنامے اس دور کی عمومی کیفیت معلوم کرنے میں خاصی رہنمائی کرتے ہیں اور ہم سیاسی

حالات اور عربی آئینِ حکومت کا خلاصہ لکھنے کے بعد ان سے مدد لیں گے ؛

یزید سکسکی نے پروانۂ شاہی کے زور سے وہ ولایت تو چھین لی جسے محمد ابنِ قاسم نے تلوار کے زور سے حاصل کیا تھا مگر قضائے آسمانی نے زیادہ جینے کی مہلت نہ دی۔ اُس کے بعد بھی دو والی اندرونی جھگڑے چکانے میں مصروف رہے یہاں تک کہ خلیفہ ہشام کے عہد میں جُنید ابن عبدالرحمان المرّی اس عہدے پر مامور ہُوا (سنہ ۱۰۵ ھ م سنہ ۷۲۴ ء) اور اس کی فتوحات نے محمد کی کشور کشائی کی یاد تازہ کر دی۔ جُنید نے پنجاب کی بجائے جنوب کا رُخ کیا۔ کچھ، جھالاواڑ، مرد یعنی مارواڑ سے بڑھ کر، جزیرہ نمائے گجرات (جذر) پر یورش کی۔ بھروچ پر عربوں نے عہدِ فاروقی میں بحری چھاپے مارے تھے۔ جُنید نے برّی راستے سے حملہ کر کے اسے تسخیر کیا۔ اسی کے ایک سردار جبیب ابن مرّہ نے جنوبی راج پوتانہ اور مالوہ پر تاخت کی اور کئی ریاستیں پامال کر ڈالیں ؛

یہ فتوحات دیرپا قبضے کی نوعیت نہ رکھتی تھیں لیکن ان سے مغربی ہند میں ہل چل پڑ گئی۔ اس کی تائید عربی تاریخوں سے زیادہ خود راج پوتوں کے گیتوں اور قصّے کہانیوں سے ہوتی ہے۔ ان کی تاریخی وقعت زیادہ نہیں مگر سب ایک ہی راگ گاتی اور ایک ہی نتیجے پر لے جاتی ہیں جسے راج پوتوں ہی کے فرنگی

بجائے کرنل ٹاڈ کی زبان سے سننا مناسب ہوگا :-

"اس تمام زمانے میں (یعنی سنہ ۶۹۴ تا سنہ ۷۲۴ء م سنہ ۱۰۵ھ) ہندو اقوام میں بڑی اضطرابی کیفیت نظر آتی ہے۔ کوئی نامعلوم حملہ آور ان کی حکومتوں کو جگہ جگہ پامال کئے ڈالتا ہے۔ اُس کی آمد کبھی تو سندھ کی طرف سے بیان کی جاتی ہے اور کبھی سمندر سے۔ کہیں کہیں اسے دیو یا جادوگر کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بہرحال وہ ملیچھ یعنی غیر قوم سے تھا۔ یادو، گہلوٹ اور چوہان راجپوتوں کے "وقائع" سب اسی تلاطم اور مصائب کی گواہی دیتے ہیں .... ٹھیک یہی زمانہ ہے جب کہ خراسان میں خلیفۂ اسلام کا نائب یزید تھا اور خلیفۂ ولید کی فوجیں دریائے گنگا تک ممالکِ ہند میں سیلاب کی طرح پھیلتی چلی جاتی تھیں۔ غرض کوئی شبہ نہیں کہ راجپوت خاندانوں میں اِس تمام ہل چل کا باعث یزید تھا یا قاسم۔ چتوڑ اور موری کو بچانے کے لیے جو راجا جمع ہوئے ان کی ناموں کی فہرست بھی اسی عام اضطراب اور پریشانی کا اظہار کرتی ہے"[1]

سر ہنری اِلیٹ نے چینی تاریخوں سے بھی ہند میں ان عرب مہمات اور فتوحات کی شہادت فراہم کی ہے[2] مگر ان

---

[1] "اینلز اوف راجستان" جلد اوّل صفحہ ۲۶۰۔ منقولہ عبارت میں عربی حکّام کے کئی نام غلط ہیں۔ مگر ٹاڈ جیسے مصنّف سے صحت کا لحاظ رکھنے کی توقع عبث ہے۔

[2] اِلیٹ۔ جلد اوّل صفحہ ۴۴۲

ماخذوں سے ہم خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے ۔ بہ ہر کیف یہ ثابت ہی کہ جُنید ابن عبدالرحمان کے زمانے میں اسلامی فوجوں نے مغربی ہند میں دُور دُور تک ترک تاز کی اور یہی عربوں کی انتہائی پیش قدمی کا دَور تھا ۔ کیوں کہ جب یہ اقبال مند اور بہادر والی ترقی پا کر خراسان کا صوبے دار مقرر ہُوا تو اس کی جگہ تمیم بن یزید سندھ بھیجا گیا جو نہایت سُست اور بے پروا حاکم تھا ۔ مشہور شاعر فرزدق کی ایک منظوم سفارش پوری کر دینے کی بہ دولت اُس کا نام فیاضانِ عرب میں شمار ہوتا ہی ۔ اِسی دستِ سخا نے کئی بعید علاقے جنھیں جُنید نے فتح کیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے دیے ۔ [1]

تمیم کے بعد حکم اور پھر فاتح سندھ کا فرزند عمرو ابنِ محمد سندھ کے والی ہوئے ۔ ان کے عہد میں بعض مقبوضات جو

---

[1] فتوح البلدان، ص ۴۴۴ ۔ یہی تمیم ہی جسے اِلفنسٹن نے اپنی تاریخ ہند میں محمد ابنِ قاسم کا جانشین بتایا اور لکھا ہی کہ چھتیس برس تک سندھ کی حکومت اسی تمیم کی اولاد میں رہی ۔" پھر ایک بغاوت میں جس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں، سومرہ قوم کے راج پوتوں نے مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا اور اُن کے سب مقبوضات دوبارہ ہندووں کے پاس آ گئے جو قریب پانچ سو برس قابض رہے ۔" (ص ۳۰۷) یہ صاحب جو گورنری کے عہدے پر فائز کر دیے گئے تھے انگریزوں میں بڑے فاضل اور مستند مؤرخ سمجھے جاتے ہیں اور ان کی "تاریخِ ہند" سالہا سال تک ہندستان کے مدارس میں داخلِ نصاب اور بعد کی اکثر انگریزی تاریخوں کا ماخذ رہی ہی ۔ اور حقیقت میں ایک نمونہ ہی کہ اونچے درجے کے انگریز بھی مسلمانوں کی تاریخ سے ناواقفیت کے ساتھ اُن سے کس قدر معاندانہ تعصب میں مبتلا ہیں ۔

مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، واپس لیے گئے۔ محفوظہ اور منصورہ دو نئے شہروں کی بنیاد پڑی جن میں سے پہلا رالیٹ کے قیاس کے مطابق، موجودہ نصرپور کے قریب تھا اور دوسرا نئی فتوحات کی یادگار میں قدیم برہمن آباد کے نزدیک بسایا گیا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کی وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جس نے انجامِ کار اموی خاندان کا خاتمہ اور دولتِ عباسیہ کا آغاز کیا (سنہ ۱۳۲ ھ م سنہ ۷۵۰ ء)۔ اور ولایت سندھ میں بھی دمشق کی بجائے بغداد سے والی متقرر کیے جانے لگے۔[1] آیندہ سو سال، یعنی جب تک عباسی خلفا کی قوت عروج پر تھی، سندھ کا نظم و نسق دارالخلافت بغداد کی نگرانی میں رہا اور جب یہ خلیفہ کم زور ہوئے تو ملتان اور منصورہ میں قریشی امیروں کی دو آزاد ریاستیں قائم ہوگئیں اور ان کے دوَر میں بھی اہلِ سندھ کے امن و فلاح میں کوئی خلل نہیں آیا، جیسا کہ ہم عصرِ عربی تاریخوں اور سیاحت ناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] محمد ابن قاسم سے منصور ابن جمہور تک سندھ کے دس صوبہ دار خلفائے دمشق کے متقرر کیے ہوئے، مذکور ہیں۔ سنہ ۱۳۲ ھ م سنہ ۷۵۰ ء سے خلفائے بغداد کے والی آنے شروع ہوئے۔ ان کا شمار ۲۷ یا ۲۸ تھا۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے "تاریخ معصومی" کی توضیحات (ص ۲۶۶ تا ص ۲۶۹) میں اور ابوظفر صاحب ندوی نے خفیف اختلاف کے ساتھ اپنی تاریخ سندھ میں عربی تاریخوں سے ان سب کے نام اور سنینِ حکومت درج کیے ہیں۔ آخری والی عمر ابن عبدالعزیز ابتاری یا ابوالصمہ بتایا گیا ہے جو سنہ ۲۵۵ ھ (م سنہ ۸۸۰ ء؟) یا کچھ بعد تک خلیفۂ بغداد کی طرف سے یہ خدمت انجام دیتا رہا۔

آزاد عربی ریاستیں

اِن ریاستوں کے آزاد ہوجانے کا سبب مرکز کی کم زوری تھا۔ لیکن سیاسی روابط کے ساتھ نسلی روابط میں بھی ضرور فرق آیا۔ عربی اور عراقی خاندان سندھ میں رہتے رہتے "سندھی" بننے لگے۔ عربی مرکزوں سے تعلق کم ہوجانے کا ایک سبب یہ ہُوا ہوگا کہ جس طرح مغرب کے بعض بعید صوبوں میں فرقۂ باطنیہ کی تبلیغ کام یاب ہوئی، اسی طرح ولایتِ سندھ کے عرب خاندانوں میں اس کا اثر پھیل گیا۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں جب مقدسی نے مشرقی ممالک کا سفر کیا تو دیکھا کہ ملتان میں اسماعیلی خلفائے مصر کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا ہے [1] "بنی فاطمہ" یا فاطمیین کے نام سے یہ نئی خلافت انھی دنوں افریقہ میں قائم ہوئی تھی۔

پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں ملتان و اُچھ کے اسماعیلی امیروں کی سلطان محمود غزنوی نے بیخ کنی کی۔ لیکن محمود کے بعد سندھ پر غزنوی اقتدار کارگر طریق پر قائم نہیں رہا۔ کم سے کم منصورہ یا جنوب مغربی سندھ میں سومرہ یا سامرہ خاندان حاکم ہوگیا تھا ان کے قریشی عرب ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ افریقی سیاح ابن بطوطہ نے شیخ رکن الدین ملتانی " سے یہی روایت کی ہے کہ ان کا مورثِ اعلا ابتدائی عربی فتوحات کے زمانے ہی میں سندھ آ گیا تھا۔ [2] مولانا شرر لکھنوی کا قیاس ہے کہ یہ لوگ یہودی

---

[1] "احسن التقاسیم" ص ۴۸۱ : ۴۸۵ ۔ [2] "ابنِ بطوطہ" ج ۳، ص ۱۰۱۔

نَومسلم تھے جو عراق سے آکر سندھ میں آباد ہوئے اور اسمٰعیلی مذہب اختیار کر لیا۔[1] بہر تقدیر، یہ کئی سو برس تک سندھ میں حکومت کرتے رہے لیکن پہلے سلطان معزالدین غوری اور ناصرالدین قباچہ کے مطیع ہو گئے تھے اور پھر جب دہلی میں اسلامی سلطنت کا مرکز بنا تو وہاں کے بادشاہوں کی طوعاً و کرہاً اطاعت قبول کر لیتے تھے۔ ان کے زمانۂ حکومت کا تعیّن کرنا دُشوار ہے لیکن غالباً آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں، سَمّہ خاندان کے رئیسوں نے سومروں کی جگہ لی اور "جام" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ممکن ہے وہ بلوچی یا افغانی جٹوں کی نسل سے ہوں۔ بعض تاریخوں میں ان کا نسب عربوں سے ملا دیا ہے[2] اور ایک گروہ انھیں نَومُسلم راج پوت قرار دیتا ہے۔ مغلوں کی آمد تک انھی جاموں کا دَور چلتا رہا۔ "ملوکِ طوائف" کے بیان میں ہم پھر ان امرائے سندھ پر ایک نظر ڈالیں گے ؏

عربی نظم و نسق اور اس کے اثرات

سندھ محمد ابن قاسم ہی کے وقت سے بڑی "ولایت" بن گیا تھا جس کے تحت میں چار چھوٹے صوبے یا اقطاع تھے۔ انھیں انگریزی عہد کی قسمتوں کی مثل سمجھنا چاہیئے۔ صوبۂ مکران بھی ایک مدت تک سندھ کے ماتحت رہا اور خود یہ ولایت پہلے

---

[1] "تاریخ سندھ" ج ۲، ص ۱۳

[2] یعنی ابوجہل یا ابولہب کی اولاد بتاتے ہیں! دیکھو "تحفۃ الکرام" ج ۳ ص ۲۹ و ۴۹۔

عراق ۔ پھر خراسان کی "امارت" میں تھی ۔ لیکن والئی سندھ کی نامزدگی خاص خلیفہ کے حکم سے ہوتی ۔ اُسی کے دربار سے وہ "سات پارچے کا خلعت، دو تلواریں، طوق، پرچم اور کلاہِ ولایت" دے کر بھیجا جاتا تھا۔[۱] سرکاری محاصل غالباً براہِ راست دارالخلافت کو ادا کیے جاتے تھے ۔ اندرونی معاملات میں بڑی ولایات کے والی قریب قریب آزاد، مگر امن و انتظام کے ذمّہ دار ہوتے ۔ بلکہ سندھ جیسے دُور دست سرحدی صوبے میں صلح و جنگ کے اختیارات بھی والیوں کے تفویض کر دیے جاتے تھے لیکن اصولاً اہم معاملات میں امیر یا خود خلیفۂ وقت کی منظوری لینی ضروری ہوتی تھی ۔ محاصل اور مال گزاری کی تشخیص، ان کے انتظام کے مصارف عدالت، کوتوالی، فوجی چھاؤنیوں کی تنظیم، نئے شہروں کی تعمیر وغیرہ سب کام، عام اسلامی اصولِ حکومت کے مطابق والیوں کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیے جاتے تھے ۔ اندرونی امن اور بیرونی دُشمن سے حفاظت، والی کا مقدم فرض تھا ۔ اس غرض کے لیے مناسب مقامات پر چھاؤنیاں بنا دی جاتی تھیں ۔ مجاہدینِ عرب کا مسکن یہی چھاؤنیاں ہوتی تھیں اور یہی رفتہ رفتہ مستقل شہروں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں ۔ منصورہ، قصدار، بیضا، محفوظہ اور ملتان کے قریب جندراور، اسی قسم کے لشکری پڑاؤ تھے جہاں عربوں کے عہدِ حکومت میں نئے شہر آباد ہو گئے ۔ چھاؤنیوں میں حکومت سپاہیوں کے مکانات کے ساتھ سرکاری دفاتر،

---

[۱] "صناجۃ الطرب" ص ۱۲۴

مساجد، شفا خانہ، عدالت، رسد خانہ، اصطبل، سلح خانہ وغیرہ عمارتیں بنوا دیتی تھی۔ چھاؤنیاں جنگی مواقع دیکھ کر، عموماً خوش منظر اچھی آب و ہوا کے مقامات پر بنائی جاتی تھیں اور اور قریب ہی چراگاہوں اور گھوڑوں کی افزایش و پرورش کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کیوں کہ گھوڑا عرب سپاہی کی محبوب ترین سواری اور بعض فرنگی اہل الرّائے کے نزدیک، جنگی برتری کا اصلی سبب تھا۔ عرب فوج میں زیادہ تر تعداد سواروں ہی کی ہوتی تھی۔ البتّہ رسد اور پیام رسانی کے لیے شتر سوار اور باربرداری کے جانور ساتھ ہوتے۔ اور اُس زمانے کے قلعہ شکن آلات، یعنی منجنیق، دبابہ وغیرہ چلانے کے لیے فوج کی ایک الگ جماعت تیار رکھی جاتی تھی۔ جنگ کے لباس اور اسلحہ میں عربوں نے مفید ایجادیں کیں اور طریقِ جنگ کو بہت کچھ ترقّی دی لیکن لڑائی کا فیصلہ ابھی تک نیزہ و شمشیر ہی کرتے تھے اور ان سے کام لینے کی مہارت سپاہی کا بڑا کمال سمجھی جاتی تھی۔ زمانۂ حال کی مصنوعی یا مشقی جنگوں کا رواج نہ تھا، اور جس قوم کو آئے دن اصلی لڑائیاں لڑنی پڑتی ہوں، اسے ان کی ضرورت بھی کیا تھی؟ تاہم عرب سپاہی چھاؤنیوں میں بےکار نہ رہتے تھے، بلکہ شمشیر زنی نیزہ بازی، تیر اندازی، کشتی، گھڑ دوڑ اور فوجی کرتب ان کی زندگی کے لازمی مشاغل تھے۔

سپاہیوں کو تنخواہوں کے علاوہ مالِ غنیمت سے حصّہ ملتا تھا اور وہ عام محاصل سے مستثنا ہوتے تھے۔ البتّہ وہ سپاہی یا سردار

جنھیں زمینیں جاگیر میں دی جاتی تھیں، صدقہ و زکوٰۃ کی مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔ ان تمام سرکاری محاصل کی نوعیت مذہبی تھی اور خوش حال مسلمانوں کو ذمیوں سے زیادہ محصول دینا پڑتا تھا[1] جزیہ ادا کرنے والے غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمے ہوتی تھی۔ اسی لیے یہ جزیہ گزار "ذمّی" کہلاتے ہیں۔ جو غیر مسلم اسلامی فوجوں میں بھرتی ہو جاتے، انھیں جزیہ ادا کرنا نہیں پڑتا تھا۔

مزارعین سے زمین کی حیثیت کے مطابق مال گزاری لی جاتی تھی۔ مورّخ گبن کے الفاظ میں، (تشخیصِ مالیہ کے لیے) اراضی کی پیمایش اور مردم و مویشی شماری کے جو قاعدے عربوں نے بنائے وہ ہر زمانے کے اہلِ حکومت کے واسطے سبق آموز ہیں[2]۔ مالیہ عموماً جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا جس میں کسان کو زیادہ ستانی کی شکایت نہیں رہتی اور پیداوار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جاتا ہے۔ سندھ میں بظاہر عربوں کے وقت کا یہ طریقہ انگریزوں کے زمانے تک جاری تھا۔ کہیں سنہ ۱۸۶۳ء میں جاکر سرکار نے مال گزاری میں روپیہ لینے کا قانون نافذ کیا[3]۔

---

[1] ایلیٹ کا بیان ہے کہ غیر مسلم ذمیوں کو زیادہ سے زیادہ پانچ دینار جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا (تاریخ ہند، ج اوّل صفحہ ۴۶۴) مولانا شبلی کی تحقیق ہے کہ جزیے کی سالانہ رقم بیس روپے (انگریزی) سے زیادہ نہ ہوتی تھی اور معمولی استطاعت والوں کو بارہ درہم یعنی آج کل کے چار پانچ روپے سالانہ دینے ہوتے تھے۔ (رسائلِ شبلی بہ حوالہ کتاب الخراج، صفحہ ۱۰۲ و صفحہ ۱۰۵)

[2] رومی سلطنت کا زوال اور خاتمہ، باب ۵۰، حاشیہ ۳۲۔

[3] امپی ریل گزیٹیر، ج ۲۲ صفحہ ۳۹۳۔

عربی ماخذوں میں ولایتِ سندھ کی کُل مال گزاری ایک کرور سے سوا کرور درہم تک بتائی گئی ہے۔ یہ آج کل کے پچاس ساٹھ لاکھ رُپے کے برابر ہوئی۔ اس میں مکران کا علاقہ شامل نہیں، مگر ولایتِ سندھ کا رقبہ موجودہ صوبے سے تقریباً دُگنا تھا۔ علاوہ ازیں بہت سی اراضی مذہبی اوقاف یا معافیات میں شمار ہوتی تھیں ان سے کوئی مالیہ نہیں لیا جاتا تھا ہے۔

حکومت خود اختیاری اور مذہبی رواداری

زمین کی مال گزاری وصول کرنے کا کام بیش تر انھی سندھی عمّال کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا تھا جو پہلے سے یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ باشندوں کے اندرونی معاملات میں بھی حکومت دخل نہ دیتی تھی۔ مسلمانوں کے باہمی تنازعے اور قانونی مسائل قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے تھے اور ہر بڑی بستی یا چھاؤنی میں اس قسم کی عدالتیں حکومت کی طرف سے قائم تھیں۔ قاضی شرعِ اسلامی کے مطابق خود احکام کا استخراج کرتے اور اپنی رائے سے فیصلہ سُناتے تھے۔ لیکن آگے چل کر خلافتِ عبّاسیہ میں اکثر مقامات پر فقہ حنفی پر عمل درآمد ہونے لگا تھا۔ یہ اسلامی قوانین صرف مسلمانوں پر نافذ کیے جاتے تھے۔ غیر مسلم رعایا ان کی پابند نہ تھی۔ بلکہ ہر جگہ مقامی پنچایتیں اپنی اپنی قوم یا بستی کے مقدمے اپنے رواج اور قانون کے مطابق طے کرتی تھیں۔ گویا اپنے لیے قانون وضع کرنا بھی انھی کے ہاتھ میں تھا۔ مذہبی معاملات میں وہ بالکل آزاد تھے۔ ہر شخص کو اپنے عقائد

اور دینی رسوم ادا کرنے کا اختیار تھا اور محمد ابن قاسم نے شروع ہی میں علمائے دمشق سے فتوا منگا لیا تھا کہ اُن کے مندروں کے ساتھ وہی مراعات کی جائیں گی جو اسلام نے یہودی اور مسیحی معابد کو عطا کی ہیں۔ یہ اسلامی تاریخ کا بہت اہم اور یادگار واقعہ ہو مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ رعایت کی گئی تھی کہ اُن کے مذہبی پیشواؤں کے امتیازات بحال رہنے دیے اور مال گزاری میں تین فی صدی لینے کا جو حق برہمنوں کو صرف برہمنی راج میں دیا گیا تھا وہ بھی برقرار رکھا تھا۔[1]

"چچ نامہ" میں محمد ابن قاسم کی مذہبی رواداری اور حُسنِ سلوک کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔ طرفہ تر یہ کہ محاصل کی تشخیص اور وصولی کا کام اہلِ سندھ کے مذہبی پیشواؤں، یعنی برہمنوں ہی کے تفویض کر دیا تھا۔ تجارتی شہروں میں وہاں کے مقامی تاجروں سے مشورہ لیے بغیر مسلمان حاکم عموماً کوئی دیوانی یا مالی کام نہ کرتے تھے۔ جب داہر کے وزیر سیاکر نے اطاعت قبول کی تو محمد ابن قاسم نے اُسے اپنے سابقہ عہدے پر بحال کر دیا اور صیغۂ راز کے معاملات میں بھی اس سے مشورہ کرنے لگا۔ اپنا یہ اعزاز و اعتماد دیکھ کر سیاکر نوجوان فاتح کا گرویدہ و جاں نثار ہو گیا۔[2] جنگی سرداروں اور مشیروں میں بھی داخل

---

[1] ایلیٹ، بحوالہ "چچ نامہ" وغیرہ۔ ج اوّل صفحہ ۱۸۲ و مابعد۔ نیز دیکھو "فتوح البلدان" صفحہ ۴۳۹۔ "تحفۃ الکرام" ج سوم صفحہ ۲۔

[2] "چچ نامہ" صفحہ ۲۰۲۔

کاکہ کوتک، موکہ بسایہ وغیرہ کئی سندھی عمائد کے نام آتے ہیں، جنھیں محمد کی عنایتوں نے ایسا خرید لیا تھا کہ وہ آیندہ لڑائیوں میں اسلامی فوج کے شریک اور سرفروش رفیق بن گئے ؛

حکومت کی رواداری اور عدل و مساوات کے قوانین کو بڑی تقویت عرب سپاہیوں کے طرزِ عمل سے پہنچتی تھی۔ وہ لڑائی کے وقت جس قدر سخت اور بے درد تھے، صلح کے بعد کہیں زیادہ نرم اور فیاض ثابت ہوئے۔ انھی کے اخلاق نے اہلِ سندھ کو ایسا مسخر کیا کہ بہت جلد ان میں گھل مل گئے۔ بُت پرستی کے باوجود سندھ کے اعلا طبقوں میں بودھ مت کے بنیادی مقاصد فراموش نہیں ہوئے تھے۔ یہ اخلاقی تعلیم دینِ اسلام سے مناسبت رکھتی تھی۔ لہٰذا سندھ کے اشراف و رؤسا کو توحید و مساوات کا مذہب قبول کرنے میں زیادہ رُکاوٹ نہ پیش آئی اور وہ کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ کتاب 'عجائب الہند' کی روایت ہے کہ کشمیر کے ایک راجا کی فرمایش سے قرآن مجید کی پہلی تفسیر مقامی زبان میں تیار ہوئی [1] جس کے معنی یہ ہیں کہ تیسری صدی ہجری میں سندھ کے باہر تک اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا تھا۔ موجودہ صوبۂ سرحد کے ایک اور راجا کے اسلام لانے کی روایت سے قیاس ہوتا ہے کہ ان اطراف میں جو لوگ اپنے پُرانے مذہب سے ناراض و بدگمان ہوتے وہ بھی دینِ عرب کی طرف دوڑ آتے تھے ؛ [2]

---

[1] 'عجائب الہند' از بزرگ بن شہریار ص۳ ؛ [2] 'فتوح البلدان' ص۴۴۶ ؛

عربی تمدّن کے اثرات

اسلامی مذہب و معاشرت کا اہلِ سندھ پر جو اثر پڑا، اُس کا مختلف زمانوں کے حالات بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوسکتا ہے لیکن اس کے لیے بڑی تفصیل اور تحقیق درکار ہو۔ ہماری مختصر اور عام تاریخ میں اتنی گنجائش نہیں ۔پھر بھی گزرتے گزرتے ہم دیکھتے ہیں کہ محمّد ابنِ قاسم نے جس وقت یہ مُلک فتح کیا تو قومیں کی قومیں خانہ بہ دوش، ناممتدن زندگی بسر کرتی تھیں ۔ رہزنی عام تھی ۔ ان کے وحشیانہ خصائل کی بِنا پر برہمن راجا نے بعض نہایت سخت قوانین بنائے تھے اور معمولی چوری پر مجرم کے زن و بچّہ کو آگ میں جلوا دیتا تھا۔[1] مگر دُو تین صدی کے بعد انھی علاقوں میں ہمیں جا بہ جا شائستہ شہری آباد نظر آتے ہیں جو صنعت وتجارت کی بہ دولت خوش حال اور تمدّن و تہذیب میں عراق و مصر کے قریب قریب مماثل بن گئے ہیں ؛

یہ تبدیلی تدریجی ہوئی ۔فتح سندھ کے سو برس بعد پہلا عرب جغرافیہ جو ہم تک پہنچا، ابن خردادبہ کی کتاب "المسالک والممالک" ہو ۔ اس میں شاہ راہوں کی مختصر کیفیت اور شہروں کی مسافت درج ہو ۔تاہم اتنا پتا چل جاتا ہو کہ ممالکِ اسلامیہ سے سندھ کی آمد و رفت اور تجارت چل پڑی تھی ۔ چین و روس اور افریقہ تک کے قافلے یہاں آنے جانے لگے تھے ۔ سندھ سے عُوْد،

---

[1] اِلیٹ ۔ ج سوم ص۱۸۶

بید اور بانس، خاصی بڑی مقدار میں دساور جاتے تھے۔[1]

ابن خردادبہ سے قریب قریب ایک صدی بعد الاصطخری نے ممالکِ اسلامیہ کی سیر کی اور "المسالک والممالک" ہی کے نام سے اپنا سفرنامہ تحریر کیا۔ بلادِ سندھ کے ذکر میں لکھتا ہے کہ منصورہ، جسے سندھی میں برہمن آباد کہتے ہیں، ایک میل کے قریب لمبا اور اسی قدر چوڑا شہر ہے۔[2] مہران کی ایک کھاڑی میں ٹاپو پر آباد ہے۔ یہاں کے رہنے والے (سب) مسلمان اور اہلِ عراق کا سا لباس پہنتے ہیں۔ اُن کی اور مضافات کے باشندوں کی زبان عربی اور سندھی ہے۔ اسی طرح ملتان میں لوگ عراق عرب کی وضع کی شلواریں وغیرہ پہنتے ہیں مگر یہ بستی منصورہ سے آدھی اور الرور کے برابر ہے۔ . . . سندھ کا تجارتی مرکز دیبل، مہران کے مغرب میں ساحل بحر پر واقع ہے . . .[3]

قریب قریب یہی کیفیت اسی زمانے کے دوسرے جغرافیہ نویس ابن حوقل نے تحریر کی ہے۔ اس نے سندھ کے عربی مدارس کا زیادہ توجہ سے معائنہ کیا اور بتایا ہے کہ ان میں عراق و شام کے

---

[1] ابن خردادبہ۔ ص۱۵۳

[2] عربی میل انگریزی میل سے چار سو گز زیادہ، یعنی کوئی ۲۳ ہزار گز کا ہوتا تھا۔ (دیکھو 'تقویم البلدان': تحقیق الامر المساحۃ)

[3] 'مسالک والممالک' (الاصطخری) ص۱۷۱ تا ص۱۷۵ ملخصاً۔ ایلیٹ کے انگریزی ترجمے میں کئی غلطیاں ہیں۔ خصوصاً یہ کہ ملتان و منصورہ میں عربی کی بجائے فارسی اور سندھی کا رواج لکھ دیا ہے جو اصل عبارت کے صریحاً خلاف ہے۔ البتہ مکران میں اصطخری نے لکھا ہے کہ فارسی اور مکرانی بولی جاتی تھی۔

سند یافتہ عُلما حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ منطق و فلسفے کی اعلا تعلیم دیتے تھے ۔ اسی (چوتھی) صدی ہجری کے اواخر میں مقدسی سندھ آیا اور اپنے جغرافیے میں یہاں کے چند مشہور محدثین اور مصنفین کا تذکرہ کرتا ہی۔[1]

ان فاضل سیّاحوں کی کتابیں پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ دو صدی کی عربی حکومت نے مُلکِ سندھ کی حالت بدل دی تھی ۔ اسلامی تمدّن کا رنگ چڑھ رہا تھا ۔ بہت سے بارونق شہر و قصبات تھے جہاں دولت مند تاجر ، خوش حال زمیں دار ، ہُنرمند اہلِ حرفہ آباد تھے ۔ سیاسی طور پر دیکھیے تو یہی چوتھی صدی وہ زمانہ ہی جس میں خلافتِ بغداد کو زوال آیا ۔ یمنی اور نزاری قبائل کی خوں ریز خانہ جنگی اور فرقۂ باطنیہ کی شورشوں نے عربی حکومت کی وحدت و قوّت کو پارہ پارہ کر دیا ۔ خود مُلکِ سندھ دو جُداگانہ ریاستوں میں بٹ گیا با ایں ہمہ مدنیت کا قدم پیچھے نہیں ہٹا اور تجارت و صنعت کے ساتھ علم و فن کی سرگرمیاں جاری رہیں ۔

اس موضوع پر ہمارا آخری ماخذ ادریسی کا جغرافیہ ہی جس نے چھٹی صدی ہجری میں اسلامی دُنیا کے حالات بڑی محنت

---

[1] احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم (مقدسی) ص ۴۷۴ تا ص ۴۸۱ ۔ ان میں سے بعض علما کے سندھ کے حالات "تذکرۃ الحفاظ" (ج دوم ص ۶۵ و ص ۲۵۶) اور معجم البلدان (ج سوم ص ۱۶۶) میں درج ہیں ۔ تاریخ کامل ابنِ اثیر (حالات سنہ ۱۶۰ھ) میں یہ روایت نقل کی ہی کہ مسلمانوں میں پہلے محدّث ابو حفص ربیع بصری بھی شرکتِ جہاد کے لیے سندھ آئے اور یہیں انتقال کیا ۔

اور تحقیق سے جمع کیے تھے۔[۱] بلادِ سندھ میں وہ سب سے پہلے دیبل کا ذکر کرتا ہے کہ گو اس کی زمین قابلِ زراعت نہیں لیکن یہ شہر خوب آباد اور سندھ کی بحری تجارت کا مرکز ہے۔ ایک طرف چین اور ممالکِ ہند سے، دُوسری طرف عمان و عراق سے اجناس کے جہاز یہاں پہنچتے ہیں اور مقامی تاجر انھیں خرید کر اندرونِ مُلک میں بھیجتے اور بہت نفع کماتے ہیں۔ دیبل سے تین دن کے راستے پر نیرون کا قلعہ بند شہر واقع ہے۔ باشندے آسودہ حال ہیں ... تین دن کی مزید مسافت پر منصورہ اُن چار شہروں میں سب سے بارونق و فائق ہے جو خلیفہ منصور عباسی کے نام پر بسائے گئے تھے۔[۲] اس کے بازار شہریوں سے اور گودام مالِ تجارت سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں کے عوام ایرانی لباس اور اُمرا ململ کے کُرتے پہنتے، اور بڑے بڑے بال رکھتے ہیں، چاندی اور تانبے کے سکّے رائج ہیں۔ مچھلی بہ افراط، گوشت ارزاں ملتا ہے۔ مُلکی اور بیرونی پھلوں کی کچھ کمی نہیں ....
منصورہ سے دو دن میں کالری پہنچ جاتے ہیں۔ یہ مہران کے

---

[۱] ادریسی کی اصل کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ سر ہنری ایلیٹ نے اس کے عربی متن کا لاطینی اور فرانسیسی تراجم سے مقابلہ کر کے جو خلاصہ اپنی 'تاریخ ہند' جلد اوّل (صـ۷۷ و مابعد) میں شامل کیا ہے، وہی ہمارا ماخذ ہے۔

[۲] یہ ادریسی کا سہو معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہیں بیان ہُوا، منصورہ کی بنیاد ایک مدت پہلے ہوئی تھی اگرچہ ممکن ہے بعد میں اسے خلیفہ منصور عباسی سے منسوب کر دیا گیا ہو۔

کنارے بہت خوب صورت قلعہ بند شہر ہے ۔ تجارت کی ترقی نے شارع عام سے دُور ہونے کے باوجود اُسے مرجع عام و خاص بنا دیا ہے . . . . ال رور کا دل کش شہر مہران کے دونوں طرف آباد اور ملتان کے برابر ہے ۔ . . . . شروسان ، اپنی وسعت کے علاوہ یہ امتیاز بھی رکھتا ہے کہ بہت سی نہریں اور فوّارے بنے ہوئے ہیں ۔ پیداوار نہایت عمدہ اور تجارت پُر نفع ہوتی ہے . . . . . اسی طرح منجابری کے خوش سواد شہر میں ہر طرف نہریں بنائی ہیں ۔ گرد بہت سے باغ ہیں . . . . مُلتان وسیع شہر ہے جہاں ہر قسم کی اجناس بہ کثرت ملتی ہیں ۔ سرکاری محاصل کم ہیں ۔ لوگ عموماً خوش حال ہیں ۔ مضافاتِ شہر میں ایک ندی سے آب پاشی کی جاتی ہے جو مہران میں جا ملی ہے ۔ شہر میں قلعہ موجود ہے مگر اس سے ایک میل کے فاصلے پر جندور میں مضبوط قلعوں کا سلسلہ بنایا گیا اور سب میں نہر کا پانی پہنچایا گیا ہے ملتان کا امیر تعطیل کا زمانہ اور بہار کا موسم یہیں گزارتا ہے . . . .

اسی طرح ادریسی نے اور بیس پچیس مشہور شہروں کا سندھ کی ذیل میں ذکر کیا ہے مگر ان میں سے بعض گجرات کے ساحل پر اور بعض مکران میں واقع تھے ۔ اکثر شہروں کے موجودہ نام یا مقام کا تعیّن کرنا دُشوار ہے اور پوری عبارتوں کو نقل کرنا بھی طوالت سے خالی نہیں ۔ مگر یہ جغرافیہ جو اپنے افادے اور صحتِ بیان میں معتبر تاریخوں کا درجہ رکھتا ہے ، اسلامی سندھ کا

ایک دِل پسند مرقّع پیش کرتا ہے اور اسے پڑھ کر یہ ماننے میں کچھ تامّل نہیں رہتا کہ تین صدی کی حکومت میں مسلمانوں نے اِن مُلکوں کو کچھ سے کچھ بنا دِیا تھا ۔ مکران کے صحرائی علاقوں تک میں متعدد شہر بسائے تھے جہاں تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں ۔ ہر قِسم کا سامانِ تمدّن افراط سے بنتا تھا ۔ وسیع پیمانے پر زراعت اور باغ بانی کی جاتی تھی ۔ لوگ خوش حال ، دُنیا کے معاملات سے باخبر ، خلیق و مہماں نواز تھے ۔ انھوں نے اسلامی مُلکوں کی معاشرت اور گروہِ کثیر نے وہی مذہب اختیار کر لیا تھا ؛

———(※)———

باب سوم

ورُودِ محمُود پاکستان و ہند میں

عرب مجاہدین سندھ میں جو روشنی لائے اس کی شعاعیں مشرق میں ملتان اور شمال میں پنج ند کے پار نہیں گئیں ۔ بغداد سے بُخارا، بُخارا سے غزنی کا چراغ جلا، تب کہیں سرحد و پنجاب میں اُجالا ہُوا۔ ورنہ تین صدی اوپر کی تاریخ بالکل تاریک ہے ۔ ریاست و حکومت ایک طرف، اِن مُلکوں میں یہی پتا نہیں چلتا کہ اُن دِنوں کون سے شہر کہاں کہاں آباد تھے اور تھے بھی یا سب جہل و وحشت کے ہاتھوں جنگل ہو گئے تھے ؟ چینی سیّاح ہوانگ چوانگ (ریاتسانگ) ساتویں صدی عیسوی میں یہاں آیا تو پشاور، تک سیلا، ساکل (= سیال کوٹ) ویران ہوتے جاتے تھے۔[1] لاہور کا سُراغ نہیں ملتا ۔ قیاس ہے کہ وہ بلوچی یا افغانی جٹوں کی لوہانہ برادری کا گڑھ ہوگا ۔ البتہ مُلک کے دونوں سروں پر دو بُت خانے دولت سے معمور و مشہور تھے ۔ ایک ضلع کانگڑہ میں نگر کوٹ

---

[1] الفنسٹن صفحہ ۲۸۳

دُوسرا پشاور کے نیچے دریائے سندھ کے کنارے اوہند یا دے ہند جسے بعد کی فارسی تاریخوں میں نقل نویسوں نے بے ہند لکھتے لکھتے "بتھندہ" سے ملتبس کر دیا ہے۔ اسی سے بعض فرنگی مصنفوں نے خیال آفرینی کی کہ جے پال اور انند پال کو جو سب سے پہلے سلاطینِ غزنی سے ٹکرائے بٹھنڈہ کے جاٹ راجا لکھ دیا۔[1] مگر یہ سراسر غلط قیاسی ہے۔ زیادہ قرینِ صواب لین پول وغیرہ کا نظریہ ہے جو انھیں وادیٔ کابل و سندھ کے راجا سمجھنے پر مائل ہیں۔ عجب نہیں کہ وہ "کُشان" بادشاہوں کی ذرّیت ہوں یا جٹ قوم سے ہوں لیکن خیبر کے پار قدیم روابط و اثرات رکھتے ہوں کہ جب غزنی میں ترکوں کی نئی بادشاہی جمی تو لمغان پر اپنا دعوا پیش کیا اور فوج لے کر لڑنے آئے۔ غزنی سے امیر سبکتگین[2] مدافعت کو نکلا مگر کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ برف باری نے راجا کا جوش ٹھنڈا کر دیا اور وہ خراج گزاری کے وعدے کر کے سلامت واپس ہو گیا (سنہ ۳۶۹ھ م سنہ ۹۷۹ء)؛ راجا نے وعدہ خلافی کی اور غزنی کے سفیروں کو قید میں ڈال

---

[1] مثلاً دیکھو "اوکسفورڈ ہسٹری"، صفحہ ۱۹

[2] تیسری صدی ہجری کے آخر میں خلافتِ عبّاسیہ کی سیاسی قوّت میں زوال آیا تو ترکستان میں سامانی خاندان کی ترک سلطنت قائم ہوئی۔ خراسان اور اس کے توابع یعنی کابل و غزنی وغیرہ سب ان کی عمل داری میں داخل، اور بخارا پایۂ تخت تھا۔ انھی بادشاہوں کا ترک غلام امیر البتگین گزرا ہے جس نے چوتھی صدی ہجری میں ایک نیم آزاد حکومت غزنی میں قائم کی، اس کا چوتھا جانشین ناصرالدین سبکتگین ترک سرداروں کے اتّفاقِ رائے سے سنہ ۳۶۶ھ (م سنہ ۹۷۶ء) میں امیرِ غزنی منتخب ہوا۔

دیا۔ تب سبکتگین خود فوج لے کے چلا اور غالبًا وادیٔ خرّم سے نکل کے پہلی مرتبہ موجودہ پاکستان کی حدود میں داخل ہُوا۔ راجا جے پال بڑا لاؤ لشکر لے کر مقابلے میں آیا مگر سبکتگین نے ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہ انبوہ ضبط و پیوستگی سے عاری ہے۔ پھر پانچ پانچ سو سواروں کے دستے مرتّب کیے کہ باری باری ٹوٹ ٹوٹ کر دشمن کے لشکر پر گرتے اور لڑتے ہوئے پار نکل جاتے تھے۔ قوی بازو ترکوں کے اِن تیز و تُند حملوں نے ہندی فوج کو پریشان کر دیا اور آخر میں امیر کے پُورے لشکر نے یورش کی تو وہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ہزاروں سپاہی بھاگتے میں مارے گئے۔ راجا کا خیمہ و خرگاہ میدان میں اور پشاور تک پُورا علاقہ جنگ کے نتیجے میں، سبکتگین کے ہاتھ آیا۔ ایک روایت کے مطابق، اسی موقع پہ شہرِ پشاور میں غزنی کی دو ہزار فوج اور پہلا مسلمان حاکم مقرّر کیا گیا۔ (سنہ ۳۸۰ھ، م سنہ ۹۹۰ء)

مگر یہ جنگ اور نیا الحاق۔ پھر دفاعی تھے۔ امیر سبکتگین کو بلخ و بُخارا کے جھگڑوں سے اتنی فرصت نہ ملی کہ مشرق کی طرف توجّہ کرتا البتہ جب اس کے بعد تختِ غزنی پر سیف الدّولہ محمود، باپ کا وارث ہُوا (سنہ ۳۸۷ھ، م سنہ ۹۹۷ء) تو اہلِ ہند نے تُرک مسلمانوں کی جارحانہ جنگ کے وہ نمونے دیکھے جن کی مثال ہفت خوانِ رستم اور امیر حمزہ کی داستانوں میں تو مل سکتی ہے،

اصلی تاریخوں میں کم ملے گی ۔ فرنگی مصنّف بھی کہ اسلام اور شاہانِ اسلام کی صرف عیب جوئی کرنا اُن کے قومی شعائر میں داخل ہے، سلطان محمود کے جنگی کارنامے پڑھ کر دنگ رہ جاتے ہیں ۔ ایک فوجی مبصّر اسے نپولین بونا پارٹ کا ہم سر قرار دیتا ہے[۱] اِل فنس ٹن شجاعت و سپہ سالاری سے بڑھ کر حسنِ انتظام پر حیران ہے کہ اتنی بڑی فوجوں کو اُس زمانے میں ہزاروں میل تک، اور ایک دو مرتبہ نہیں بیسیوں دفعہ، لانا لے جانا کیوں کر ممکن ہُوا؟ سب سے بڑھ کر انھیں یہ تعجب ہے کہ اتنے مذہبی جوش اور جنگ جوئی کے باوجود محمود نے لڑائی کے سوا ؛ قتل و خون ایک طرف کسی کو مسلمان بنانے کے لیے ہی کبھی جبر و تشدّد نہیں کیا[۲] رہے مسلمان مورّخ ، اُن کی نظر میں یہ نہ تھکنے والا غازیٔ ملّتِ اسلامی کا محبوب سورما تھا اور اُس کی شجاعت و عدالت، سعادت و سخاوت کے اتنے قصّے محفوظ ہیں کہ جمع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی ہے ۔ لیکن اس مختصر تاریخ میں ہم بیش تر انھی واقعات کو بیان کرسکیں گے جن کا پاکستان و ہند سے تعلّق ہے ؛

---

[۱] دیکھو کیپن کی 'تاریخِ ہند' : باب اوّل ، فصل سوم ؛

[۲] اِل فنس ٹن لکھتا ہے کہ اس میں شک نہیں محمود نہایت دین دار اور سچّا مسلمان تھا اور شاید کوئی بھی بڑی لڑائی ایسی نہ تھی جس میں سربسجود ہوکر اس نے خدا سے فتح و نصرت کی دُعا نہ مانگی ہو ۔ لیکن ہم ایک مثال بھی ایسی نہیں سُنتے کہ اُس نے کسی ہندو کو جبراً مسلمان کیا ہو ۔ اور ایک شہادت بھی ایسی نہیں ملتی کہ جنگ یا قلعہ گیری کے موقع کے سوا کسی ہندو کو قتل کرایا ہو . . . " (تاریخ ہند ص۳۳۶) نیز ملاحظہ ہو لین پول ، "میڈی ول اِن ڈیا" ص۱۸ و ص۲۲ وغیرہ ؛

ابتدائی حملے

نوجوان بھائی کو قابو میں لانے اور مغربی حریفوں سے خراسان کا قبضہ اور غزنی کی آزادی منوانے میں دو تین سال لگے۔ قوّت آزمائی کے لیے اِن اسلامی ملکوں میں وسیع میدان پڑا تھا لیکن محمود نے نیّت کر لی تھی کہ تا حدِ امکان ممالکِ ہند میں اِعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے گا۔ یہی آرزو اُسے ماوراءُالنّہر سے ہٹا کر وادیٔ سندھ کی طرف لائی۔ پہلا معرکہ سابقہ حریف راجا جے پال سے پشاور کی حوالی میں ہُوا۔ (سنہ ۳۹۲ھ، م سنہ ۱۰۰۱ء) غزنی کے مُتبک پا اور تیز دست سواروں نے گھیر گھیر کر ہندی سپاہیوں کو قتل کیا۔ راجا نے ہتیار ڈال دیے۔ زرِ کثیر اور اطاعت گزاری کا دوبارہ عہد و پیمان کر کے جان بچائی۔ محمود نے نندنہ پر جو دریائے جہلم کے کنارے مضبوط پہاڑی قلعہ تھا، قبضہ کر لیا۔ اور ملکِ پنجاب کی پہلی گھاٹی اسی معرکے میں سر ہو گئی ہے۔[۱]

مگر پنجاب میں آگے بڑھتے سے پہلے محمود نے ملتان اور مشرقی

---

[۱] نندنہ یا نندونہ اس زمانے میں جہلم کے کنارے پر، موجودہ خوشاب کے قریب مشہور قلعہ تھا۔ کاتبوں نے اسے بھی بے پروائی سے "بھٹنڈہ" لکھ دیا ہوگا کہ اکثر انگریز تاریخ نویس مغالطے میں پڑ گئے۔ میجر راورٹی کی دقیق تحقیق کی رہنمائی میں ہم یہ قیاس دوڑا سکتے ہیں کہ عجب نہیں جے پال کی راج دھانی یہی مقام ہو اور اسی کے ہاتھ سے جانے کے بعد وہ لاہور ہٹ آیا ہو جو اس نام سے تھا بھی تو اُن دنوں گم نام سا قلعہ ہوگا۔ (دیکھو راورٹی، حواشی ترجمہ طبقات ناصری ص ۴۳۵ و مابعد)

سندھ کا رُخ کیا اور آیندہ سال بھاتنہ یا بھاٹیہ کے راجا پر چڑھائی کی۔[1] جسے اپنی فوجی قوت اور ہاتھیوں کی کثرت پر بہت گھمنڈ تھا۔ ممکن ہے اس کے تمرّد کا ایک سبب یہ ہو کہ بھاٹیہ کے کئی طرف بڑے بڑے صحرا اور خوف ناک جنگلوں کی فصیلیں کھڑی تھیں جنھیں کسی غنیم کا طے کرنا دشوار تھا۔ مگر عنصری کے بہ قول، بادشاہ اِس پُر خطر جھاڑ جھنکاڑ سے ہَوا کی طرح گزرا[2] اور خاص بھاٹیہ کی حوالی میں راجا سے لڑائی ہوئی۔ وہ شکست کھا کر پہلے قلعے میں، پھر قریب کے جنگلوں میں جا چھپا تھا، مگر تعاقب کرنے والے شکاریوں کی طرح پیچھے لگے رہے۔ راجا نے مایوس ہوکر خودکشی کرلی اور اس کے مرنے سے یہ علاقہ بہ راہ راست غزنی کے ماتحت کر لیا گیا۔ (سنہ ۳۹۵ھ سنہ ۱۰۰۴ء)

معلوم ہوتا ہے بھاٹیہ کو ملتان کی حکومت درپردہ مدد دیتی تھی۔ گزشتہ باب میں یہاں قریشی امیروں کی آزاد ریاست قائم ہونے

---

[1] اس مقام کے متعلق شبہ ہے کہ کہاں واقع تھا۔ موجودہ بہاول پور کے قریب بھاٹیہ نام کا قلعہ عربوں نے فتح کیا تھا۔ محمود کا ملتان سے پہلے یہاں پہنچ جانا کسی قدر خلافِ قیاس ہے مگر بیرونی اسے الرور سے ۱۵ فرسخ (یعنی کوئی پچاس میل) شمال مشرق میں بتاتا ہے۔ اور یہ بھی ملتان کا جنوبی مقام ہُوا۔

[2] فتح بھاٹیہ کی مبارک باد میں عنصری کا قصیدہ مشہور ہے جس میں وہاں کے وحشت انگیز جنگل کا اس طرح ذکر آتا ہے:؎

نبات ہاش تو گفتی کہ کژ دمانندے　　گرہ گرہ شدہ و خارہا بروُ نشتر
بمطل گزشتہ بُرد شاہ شہریار چو باد　　بہ زور دیں و بہ آزار مذہبِ آذر

کا ذکر آچکا ہے۔ یہ لوگ مذہباً باطنی اور نسلاً غالب ابن لوی کی اولاد میں تھے۔ ؎ ممکن ہے عام مسلمان ان کے (باطنی) اسماعیلی مسلک اختیار کر لینے سے ناراض ہوں اور اسی وجہ سے انھیں قوم کی قوت کی بجائے سیاسی ساز باز کا سہارا لینا پڑتا ہو۔ ظاہر میں یہ امیر حکومتِ غزنی کی اطاعت و دوستی کا دم بھرتے تھے۔ باطن میں ہندو ہمسایوں کو بھڑکاتے اور مسلمان حملہ آوروں کے خلاف مدد پہنچاتے تھے۔ نتیجے میں خود ڈوبے اور اُن کو بھی لے ڈوبے۔ سنہ ۳۹۶ھ میں جب محمود نے ملتان کا رُخ کیا تو جے پال متوفی کے بیٹے راجا انند پال نے راستہ روکنے کی کوشش کی مگر ایک ہی ٹکر میں بد حواس ہو کر بھاگا اور چناب تک کہیں نہ ٹھیرا۔ غزنوی لشکر نے ملتان پر چڑھائی کی۔ وہاں کے امیر ابوالفتح نے دوبارہ قصور کی معافی مانگی اور اپنے باطنی عقائد سے توبہ کی۔ محمود نے ایک مرتبہ اور اسے معاف کر دیا، اور اب کے مغربی پنجاب میں ایک نو مسلم سکھ پال کو حاکم بنا کے خود ایلک خاں سے لڑنے چلا۔ ایلک ملکِ ترکستان کا امیر تھا اور طاقت ور حلیفوں کی مدد لے کر خراسان پر چڑھ آیا تھا۔ محمود نے بلخ کے قریب ایک خون ریز معرکے میں نمایاں فتح پائی جس نے بہادر سے بہادر دشمن کے دِل پر اس کی دھاک بٹھا دی۔ جنگ کا یہ جوش انگیز واقعہ مُلک مُلک میں مشہور ہو گیا کہ محمود کے

؎ "لوی" کو 'فرشتہ' کے بے باک مترجم بریگز نے "لودھی" بنایا اور اپنے متبعین کو مغالطے میں پھنسا دیا ہے۔

جنگی ہاتھی نے جھپٹ کر ایلک خاں کے علم بردار کو سونڈ میں لپیٹا اور اُچھال کر ہلاک کر دیا۔

اِدھر اِس عرصے میں انندپال نے ایک دفعہ اور تیاری کی کہ محمودی سیلاب کو پنجاب میں پھیلنے سے روکا جائے۔ دُور دُور قاصد بھیج کر راجوں مہاراجوں سے مدد منگائی، دین دھرم کے واسطے دیے اور غالباً اسی مذہبی تحریک میں تو مسلم سُکھ پال کا ایمان بگڑا کہ وہ محمُود سے منحرف ہو گیا۔ ہندو جتھے کو جہلم کے پار تک روکنے والا کوئی نہ رہا اور بعض اقوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمودی لشکر سے اس کا مقابلہ دریائے سندھ کے پار وَہِنْد کے قریب ہُوا۔ اس لڑائی میں غزنوی فوج کی تعداد نسبتاً اور بھی کم تھی۔ دشمن کی متحدہ افواج میں کھوکر قوم کی شرکت نے ایک خطرناک عنصر کا اضافہ کر دیا تھا۔ یہ جنگ جُو ننگے سر، ننگے پاؤں دیوانوں کی طرح حملہ کرتے تھے اور آخری دن کے معرکے میں خندقیں پھاند پھاند کر مسلمانوں کے پڑاؤ میں آ گھسے۔ ان کے عجیب ہتیاروں نے بہت سے مجاہدین کو زخمی اور ہلاک کر دیا۔ محمُود فکر میں تھا کہ لشکر کو پیچھے ہٹا لے جائے کہ تقدیر نے یاوری کی۔ راجا انندپال کا ہاتھی کسی آتش بازی کی چوٹ سے گھبرا کر اُلٹا بھاگا اور اپنے مالک کی قسمت اُلٹ دی! ہندی لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ایک عرب سردار عبداللہ طائی اور دُوسرا ترک ارسلان جاذب دو دِن تک بھاگنے والوں کا تعاقب اور ہزاروں کو تہِ تیغ کرتے رہے (سنہ ۳۹۹ھ م سنہ ۱۰۰۹ء)۔

اب شمالی پنجاب کا سارا میدان خالی تھا۔ محمود منزل بہ منزل مشرقی سرے تک بڑھا اور بھیم نگر یا نگر کوٹ (کانگڑہ) کا قلعہ گھیر لیا۔ یہ کوہستان ہمالیہ کی ایک جنوبی چوٹی پر وہاں کے بڑے مندر کا مستحکم حصار تھا جس کے اندر صدہا بُت استھانوں پہ بٹھائے گئے تھے۔ لاکھوں رُپے کا چڑھاوا چڑھتا تھا۔ گرد و نواح کے دیہات کی آمدنی مہنتوں کے لیے وقف تھی۔ قریب کے جوالا مکھی پہاڑ سے اکثر شعلہ بھڑکتا اور مندر کے رعب و تقدس کو چمکاتا رہتا تھا۔ لیکن تازہ معرکے راجوں، مہاراجوں کی قوت کو پراگندہ، اور دھرم کی حرارت کو افسردہ کر چکے تھے۔ وہی تلوار لے کر مندر کی حفاظت کو نہ آئے تو پنڈے اور شاستری یہ خدمت کیا ادا کرتے؟ محاصرے کے تیسرے ہی دن قلعے سے فریاد و فغاں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ مہنتوں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا اور ملیچھ بادشاہ سے عاجزانہ جان بخشی کی التجا کی۔ محمود نے انھیں امان دی۔ پھر چند مصاحبوں کے ساتھ مندر میں داخل ہوا۔ مسکوک اور غیر مسکوک سونے چاندی کے انبار، جواہرات کی ڈھیریاں پُشت ہا پُشت سے جمع ہو رہی تھیں۔ وہ سب ایک ہی دفعہ سمیٹ لیں۔ فوج کا حفاظتی دستہ قلعے میں چھوڑ کر سرور و منصور غزنی کو واپس ہوا۔ شہر کے باہر میدان میں مالِ غنیمت کی نمائش کرائی جسے دیکھنے کے لیے دُور دُور سے لوگ آتے اور آل سبکتگین کی خوش نصیبی پر عش عش کرتے ہوئے واپس جاتے تھے۔

نگر کوٹ کی طرح ، دو سال بعد تھانیسر کے بڑے مندر کو بھی محمود نے تاراج کیا ۔ جنوبی پنجاب اور دہلی کے راجا تلواریں تولتے رہ گئے ۔ مقابلے میں آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی ؛

قنوج کی مہم

سلاطینِ غزنی کے وقائع سرکاری طور پر قلم بند نہیں ہوئے اور ہوئے ہوں تو ہم تک سلامت نہیں پہنچے ۔ معاصرین یا کچھ بعد کے مورخوں نے اپنے طور پر انھیں مرتب کیا ۔ مگر ممالکِ عرب میں بیٹھ کر لکھنے والے مورخ ، پاکستان و ہند کے جغرافیے سے تفصیلی واقفیت نہ رکھتے تھے ۔ دوسرے محمود نے تیس اکتیس برس میں ، ہزاروں میل کے رقبے پر پے در پے اتنے معرکے سر کیے کہ مقامات اور سنین کو صحت کے ساتھ ضبط میں لانا دشوار ہوگیا ۔ بہرحال ، اتنا یقینی ہے کہ آیندہ سات سال میں موجودہ افغانستان ، سیستان اور بلوچستان کے سرکشوں کو اس نے تلوار کے زور سے مطیع کیا اور آئینِ اسلام و انتظام کا پابند بنایا ۔ دوسری طرف ایران میں قزوین ، اور شمال میں خوارزم (خیوا) تک ایسی یلغاریں کیں کہ اسلامی دنیا میں اس کی مہمات و فتوحات کا غل غلہ بپا ہوگیا ۔ یہی سبب تھا کہ ہندستان خاص یعنی قنوج پر فوج کشی کے ارادے سن کر ہزاروں مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے شوق میں ممالکِ بعید سے چل چل کر غزنی پہنچ گئے ۔ سنہ ۴۰۹ھ (م سنہ ۱۰۱۸ء) میں ایک لاکھ سوار

اور بیس ہزار پیادہ مجاہدین کا لشکرِ جرّار لے کر یہ غازی بادشاہ ممالکِ ہند کی طرف روانہ ہُوا۔ پنجاب میں طغیان و سرکشی کی تاب نہ رہی تھی۔ لیکن کشمیر کی طرف سے اطمینان کرنا ضروری تھا۔ تین سال قبل اُدھر جو مہم چلی اُسے برف باری نے روک دیا تھا۔ اس مرتبہ راجا کے پیمانِ اطاعت و خراج گزاری نے کشمیر کو پامالی سے بچایا۔ پھر اسلامی لشکر دامنِ کوہستان کو طے کرتا ہُوا، غالباً سہارن پور، مراد آباد کے موجودہ اضلاع میں آیا اور آگے بڑھ کر پایۂ تخت قنوج کے سامنے پہنچ گیا۔

یہ شہر راجا ہرش کے زمانے سے "ہندستان" کا دارالسلطنت مشہور تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں راجا بھوج کی راج دھانی رہا اور محمود کی فوج کشی کے وقت اُسی "پری ہار" خاندان کا راجا راجے پال [1] یہاں حکومت کرتا تھا۔ اس کی عملداری اپنے اسلاف کی نسبت کم ہو گئی تھی۔ پھر بھی شان شوکت اور شہرت میں زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ اس کی دولت و مال جاہ و جلال کے قصّے ممالکِ ہند اور باہر دُور دُور تک مشہور تھے۔ لیکن اسلامی فوج کے قریب آتے ہی راجا نے سفیر بھیج کر اطاعت و اخلاص کا اقرار کیا۔ پھر خود اہلِ خاندان اور

---

[1] "اوکسفورڈ ہسٹری" صفحہ ۱۹۲۔ یہی تاریخ بیان کرتی ہے کہ اسلامی لشکر جنوری سنہ ۱۰۱۹ء (رم سنہ ۴۱۰ھ) میں قنوج پہنچا تھا۔ قدیم عربی، فارسی تاریخوں میں راجا کا نام جے پال درج ہے۔ "فرشتہ" نے "کورہ" لکھا اور اس کے انگریز مترجم نے "کورا راے" بنا دیا ہے۔

عمائد کے ساتھ محمود کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر پیش کی۔ محمود نے نہ صرف جان بخشی کی بلکہ اُسے اپنی پناہ میں لے لیا اور آیندہ محض اسی کے دشمنوں کو سزا دینے کی خاطر ان علاقوں پر دوبارہ فوج کشی کی۔

انگریز تاریخ نگاروں کا یہ نظریہ کہ قنوج کو مدافعت کی مہلت نہیں مِلی تھی، صحیح نہیں معلوم ہوتا: اِس عظیم مہم کی تیاری اور آمد آمد کی خبر مدّت سے گرم تھی۔ اتنے بڑے لشکر کی پیش قدمی چُھپی نہ رہ سکتی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ محمود کی پےہم فتوحات اور زبردست یلغاروں نے شمالی ہند میں زلزلہ سا ڈال دیا تھا۔ قریب العصر تاریخوں نے اشارہ کیا اور واقعات گواہی دیتے ہیں کہ اہلِ ہند اُسے بلائے بے درماں سمجھ کر نہایت خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اسی مہم کی واپسی میں جب وہ متھرا پہنچا تو ہرچند یہ ہندوؤں کا بڑا مقدّس شہر تھا اور آس پاس کئی آزاد ریاستیں قائم تھیں، کسی کو ہمّت نہ ہوئی کہ مزاحمت کرنے نکلتا۔ بیس دن تک کرشن جی کی تیرتھ یاترا لُٹتی رہی۔ دیوتاؤں کے سیکڑوں بُت ٹوٹتے پھوٹتے رہے۔ آخر میں لشکر والوں نے کسی بات پہ بگڑ کر شہر کے ایک حصّے میں آگ لگا دی اور اسی میں بہت سے مندر جل کر خاک ہو گئے۔ منوں سونا چاندی، بیش قیمت جواہرات اونٹوں پہ لاد کر غزنی بھیج دیے گئے۔ کہیں روکنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ برن (بلندشہر) اور میرٹھ وغیرہ کئی ریاستیں جہاں سے اسلامی لشکر گزرا، وہاں کے

راجا دُور ہی سے خبر سُن کر فرار ہو گئے۔ بعض نے ڈر کر خودکشی کر لی ایک نے اپنے ساتھ بال بچّوں تک کو ہلاک کر ڈالا۔[1]

غزنی سے قنوج کا سفر ڈیڑھ ہزار میل سے کم نہ ہوگا۔ اتنی بڑی فوج کا وہاں جانا اور کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ کامیاب واپس آنا، جس قدر فخر و مسرّت کا موجب ہُوا ہو، بجا تھا۔ خلیفۂ بغداد (القادر باللہ) کو گراں بہا تحائف کے ساتھ ان فتوحات کی اطلاع بھیجی گئی تو اس نے حکم دیا کہ ہر مسجد میں فتح نامہ پڑھ کر سُنایا جائے اور سارے بغداد میں اُس روز ایسی خوشی منائی گئی کہ معلوم ہوتا تھا آج عید کا دن ہے۔ اقبال مند محمود کو دربارِ خلافت سے "سلطان یمین الدولہ" کا خطاب مرحمت ہُوا۔ تاریخ میں وہی پہلا مسلمان بادشاہ ہے جو سلطان کہلایا، اور اتنا مقبول تھا کہ بعد میں سبھی بادشاہوں نے طرّۂ امتیاز کی طرح اپنے سلکِ القاب میں سجایا۔

ہندوستان کے راجا تُرک تیغ زنوں کے سامنے نہ ٹھیرے تھے لیکن محمود واپس گیا تو قنوج پر چڑھ دوڑے اور وہاں کے راجے پال کو مسلمانوں سے مل جانے کے قصور پر ہلاک کر دیا۔ یہ جتھا کالنجر کے چندیل راجا کی تحریک سے بنا تھا جسے فارسی تاریخیں نندا وغیرہ کئی ناموں سے یاد کرتی ہیں۔ حالیہ تحقیق سے صحیح نام گنڈا (چندیل) ثابت ہُوا۔[2]

---

[1] یہ واقعات اُس عہد کی سبھی تاریخوں میں مذکور ہیں اگرچہ ان کی ترتیب اور سنین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

[2] "اوکس فورڈ ہسٹری" صفحہ ۱۹۲۔

محمود کو یہ خبریں پہنچیں تو غضب ناک ہو کر دوبارہ ہندستان پر فوج کشی کی (سنہ ۴۱۲ھ م سنہ ۱۰۲۱ء) اور کالنجر پر چڑھائی کرنے سے پہلے گوالیار کے مضبوط قلعے کو گھیر لیا جہاں سے لشکر کا راستہ زد میں آجانے کا اندیشہ تھا۔ راجا نے قیمتی تحائف اور اطاعت کے عہد و پیمان سے امان حاصل کی۔ ادھر سے اطمینان کر کے سلطان بندھیل کھنڈ میں در آیا۔ گنڈا نے بھاگ کر جنگلوں پہاڑوں کی پناہ لی۔ سلطان شمال کی طرف پلٹا اور قنوج کے گرد کئی راجا مہاراجوں کی جو راجے پال کے قتل میں حصہ دار تھے، سخت سرکوبی کی۔ جھنج و اسی وغیرہ متعدد قلعے اسی مہم میں تسخیر ہوئے لیکن سلطان دوآب گنگ و جمن سے آگے نہیں بڑھا بلکہ پھر پلٹ کر بندھیل کھنڈ پر تاخت کی۔ اس مرتبہ گنڈا بھاگنے کی مہلت نہ پا سکا۔ عاجزانہ امان مانگی زر و جواہر کے علاوہ کئی سو جنگی ہاتھی فاتح کی نذر کیے۔ سلطان کی مدح میں ایک دوہا بھی اپنی زبان میں رکھ کر گزرانا جس کا ترجمہ سُن کر محمود ایسا خوش ہُوا کہ چند قلعے اپنی طرف سے راجا کو انعام دیے۔[1]

الحاقِ پنجاب ۔ گجرات کی مہم

ہندستان کی یہ طولانی مہم ایک سال سے زیادہ جاری رہی۔ ٹھیک معلوم نہیں کہ تُرک فوجوں نے ہند کی گرمی اور برسات کہاں اور کس طرح بسر کی مگر سنہ ۴۱۳ھ،م سنہ ۱۰۲۲ء میں ہم

---

[1] "تاریخِ فرشتہ" بہ حوالۂ "زین الاخبار" وغیرہ

سلطان کو وسطِ پنجاب میں ایک انقلابی انتظام کرتے دیکھتے ہیں۔
فارسی تاریخوں میں لکھا ہو کہ تھانیسر کی مہم لے جاتے وقت ہی
مشیروں نے رائے دی تھی کہ پنجاب پر مستقل قبضہ کیے بغیر
آگے جانا احتیاط کے خلاف ہوگا۔ بادشاہ نے اسے تسلیم کیا تھا
لیکن کسی عملی کارروائی کی نوبت نہیں آئی۔ یہاں تک کہ اس
بعید و طویل فوج کشی کے دوران میں راجا اندپال کے وارث
کی طرف سے سرکشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ محمود کو بہت غصّہ
آیا۔ راجا "لوہور" میں قلعہ بند ہوگیا تھا۔ مگر سلطان کی ناراضی
اور اپنی مدافعت سے نا امید ہوکر ایک رات بیوی بچّوں سمیت
نکل بھاگا اور اجمیر کے راجا کے پاس پناہ لی۔ محمود نے ریاست
کی ضبطی اور پنجاب کے الحاق کا اعلان کیا ؂

اگرچہ لوہور یا لاہور کے مرکزی قلعہ ہونے اور الحاق کی تاریخ
میں اختلاف ہو لیکن کچھ شک نہیں کہ یہ اقدام قنوج کی دوسری
مہم کے سلسلے میں کیا گیا اور دریائے ستلج تک ملکِ پنجاب پر
بہ راہِ راست قبضہ ہو جانے سے مغربی پاکستان کی فتح مکمل ہوگئی
اِس اعتبار سے سلطان محمود کو پاکستان کا پہلا مسلمان بادشاہ قرار
دینا بجا ہوگا۔ مزید برآں، جیساکہ الفنسٹن وغیرہ انگریز مبصر لکھتے
ہیں، یہی الحاق ممالکِ ہند میں آیندہ اسلامی سلطنت کی پہلی
منزل بنا۔ اسی نے سیاسی تغیّر سے بڑھ کر ایک عمرانی اور
مذہبی انقلاب کی ابتدا کی اور ہزاروں مسلمان خاندانوں کو صوبۂ
سرحد و پنجاب میں مستقل طور پر لا بسایا۔ جگہ جگہ ان کی

چھاؤنیاں بنیں، نئے شہر آباد ہوئے، پُرانے شہروں کی ترمیم تجدید کی گئی۔ سلطان کو خاص طور پر خیال تھا کہ جدید انتظام اور آبادکاری کے لئے نہایت متدیّن، قابلِ اعتماد عامل انتخاب کیے جائیں اور عام روایت کے مطابق ولایتِ پنجاب کا پہلا حاکم یا صوبہ دار بھی اس نے اپنے عزیز ترین مملوک ایاز کو مقرر کیا۔ کننگ ہم نے جو ہمارے آثارِ قدیمہ کے انگریز ماہرین میں رتبۂ تقدم رکھتا ہے، تاریخِ پنجاب کے مولف ڈپٹی محمد لطیف کو ایک خط میں لکھا تھا کہ قلعۂ لاہور کی نئی تعمیر ایاز ہی نے کرائی اور شہر کا نام "محمود پور" تجویز کیا تھا مگر مشہور نہ ہوا۔ [1]

پنجاب کے انتظامات درست کرنے کے بعد، اس نہ تھکنے والے مجاہد نے سومنات پر حملے کی تیاری کی۔ سنہ ۴۱۵ھ م سنہ ۱۰۲۴ء کی گرمیاں گزار کر غزنی سے ملتان آیا اور یہیں سامان سفر درست کر کے موجودہ بہاول پور و

---

[1] تاریخِ پنجاب اُردو، ص۱۷۱ و ص۱۷۷۔ ڈاکٹر محمد ناظم صاحب جنھوں نے سلطان محمود پر ایک فاضلانہ مقالہ لکھ کر، ڈاکٹری کی سند پائی، اس قول سے اختلاف رکھتے ہیں۔

✱ یہ کتاب لکھی جا رہی تھی جب کہ حکومت ہند کی طرف سے اعلان ہوا کہ ممالکِ ہند آیندہ بھارت کے نام سے موسوم ہوں گے۔ لہذا اس تاریخ میں بھی اب یہی نام اختیار کر لیا گیا ہے۔

جیسلمیر کے راستے ، عام روایت کی بہ موجب ، اجمیر کو جا لیا۔[1] الفنسٹن لکھتا ہے کہ "(راج پوتانہ کے) ساڑھے تین سو میل، بے آب و گیاہ ریگستان سے آج کل ایسی حالت میں گزرنا بھی، جب کہ وہ کسی حلیف کا علاقہ ہو، نہایت دشوار مرحلہ ہے اور اسے پہلی دفعہ طے کرنا جب کہ کسی طرف سے بھی دشمن کے حملے کا امکان ہو، فی الواقع غیر معمولی جرات اور اسی قدر غیر معمولی قابلیت کا ثبوت ہے۔" (تاریخ ہند، صفحہ ۳۲۶)

پنجاب اور دوآب ہی کی مہمات میں سلطان محمود کی راستوں سے واقفیت، مشکلات و موانع اور دشمنوں کی قوت کا صحیح اندازہ قابلِ تعجب معلوم ہوتا ہے لیکن اِس پہلو سے بھی دیکھیے تو یہ دشوار و دراز مہم اُس کی حوصلہ مندی اور

---

[1] ڈاکٹر محمد ناظم کے نزدیک اِس حملے میں سلطان کے اجمیر پہنچنے کی روایت بھی درست نہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں فرخی کے قصیدۂ تہنیت (فتح سومنات) سے استناد کیا ہے۔ جو اس مہم میں سلطان کے ہم راہ آیا تھا اور اپنے قصیدے میں راستے کے مشہور مقامات کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں اجمیر کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ (دیکھو ڈاکٹر ناظم صاحب کا انگریزی مقالہ "سلطان محمود" صفحہ ۲۱۶) بے شبہ اجمیر سلطان کے سیدھے گجرات کے راستے سے بہت ہٹ کر جنوب میں واقع ہے۔ ڈاکٹر ناظم صاحب اس زمانے میں خود اجمیر شہر موجود ہونے ہی سے انکار کرتے ہیں۔ مگر دگزنے ٹیر، وغیرہ کی شہادتیں بتاتی ہیں کہ اُس کی بنیاد اجے پال نے دوسری صدی عیسوی میں رکھی تھی۔

✣

صحتِ تخمین کا بہترین ثبوت مانی جائے گی۔ سومنات کا مندر نہایت محفوظ، قلعہ بند جزیرہ تھا۔ گجرات کے مغربی ساحل سے ایک پتلی سی پٹی اُسے خشکی سے ملاتی تھی اور اس پٹی پر فصیلیں بنا دی گئی تھیں۔ غزنی سے یہاں آنے کا عام راستہ جنوبی سندھ اور کچھ سے گزرتا مگر محمود راج پوتانہ کے اُن راستوں سے آیا جس کا وہاں کے باشندوں کو شاید خیال تک نہ آیا ہوگا۔ چناں چہ کوہستانِ اروَلی کے دامن سے نکل کر جب وہ یکایک کاٹھیاواڑ کے دارالحکومت انہل واڑہ (یہ نہروالہ، موجودہ پٹن) کے میدانوں میں نمودار ہوا تو راجا اور پرجا سب حیران رہ گئے۔ راجا بھاگ کر دور نکل گیا۔ اسلامی لشکر بے روک ٹوک گجرات میں داخل اور سومنات کے سامنے آ پہنچا۔ حیرت زدہ پجاریوں نے فصیلوں پر کھڑے ہوکر کوسنے اور دھمکیاں دیں۔ جواب میں تیر چلے تو بھاگ کر مندر کے بالا حصار میں جا گھسے لیکن جب اسی ریلے میں مسلمانوں نے کمندیں ڈال کر چڑھنا شروع کیا تو قلعے کے محافظ راج پوت دوڑے اور دو دن تک ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ قلعہ فتح نہ ہوسکا۔ بہت سے پہرہ دار مارے گئے، بہت سے حملہ آور اُن کے دفاعی ہتیاروں سے زخمی اور بعض فصیلوں پر چڑھتے چڑھتے شہید ہوئے۔

اِس عرصے میں مندر کو بچانے کے لیے کئی راجا باہر کی طرف سے اپنی فوجیں لائے اور شہر پناہ کے سامنے خوں ریز

جنگ ہوئی ۔ ہندوؤں کو تازہ کمک پہنچ رہی تھی اور ایک مرتبہ مجاہدین نرغے میں آ گئے تھے لیکن جس وقت خود سلطان سب سے سخت گھمسان میں در آیا تو مسلمان ایسا جان توڑ کر لڑے کہ حریفوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور اندر قلعے والوں کا دل بیٹھ گیا ۔ وہ کشتیوں میں چڑھ چڑھ کر بھاگے اور مجاہدین کو روکنے والا کوئی نہ رہا ۔

جب قلعہ فتح ہو گیا تو محمود اعیانِ دولت کے ساتھ زمین دوز راستے سے مندر میں داخل ہوا جس کا بڑا ایوان چھپّن ستونوں پر قائم کیا گیا تھا ۔ چھت اور ستونوں میں نگینے جواہرات جڑے تھے اور سب سے بڑا بُت[1] مرصّع کاری کا نمونہ تھا ۔ برہمنت پجاری جو مندر میں رہ گئے تھے، گڑگڑائے اور سُلطانی امیروں نے بھی مشورہ دیا کہ زرِ کثیر قبول کر لیا جائے اور یہ بُت نہ توڑا جائے ۔ محمود نے وہ جواب دیا جو تاریخ میں یادگار اور ضرب المثل ہو گیا ہے :-

"میری آرزو ہے کہ قیامت کے دن 'محمود بُت شکن' کے نام سے پکارا جاؤں، محمود بُت فروش نہ کہلاؤں!"

پھر آگے بڑھ کر اپنا فولادی گُرز گھما کر مارا کہ وہ ستون جس کو

---

[1] یہ بُت حالیہ تحقیقات سے مہادیو کا لنگم ثابت ہُوا ۔ اسے توڑنے کے متعلق ممالکِ مشرق میں عجیب عجیب افسانے مشہور ہو گئے تھے مگر یہ یقینی ہے کہ وہ توڑا گیا اور اس کے ٹکڑے جامع مسجد غزنی اور حرمینِ شریفین بھیجے گئے ۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ غزنی والے ٹکڑے اس کے زمانے تک وہاں پڑے تھے ۔

صدیوں سے سجدے کیے جاتے تھے ، دو ٹکڑے ہوکر نیچے گرا۔ کہتے ہیں اُس کے اندر خلا تھا اور اُس میں نہایت بیش بہا جواہرات بھرے تھے ، وہ سب نکل پڑے ۔ اِخلاص کا انعام دُنیا میں بھی غازیوں کو مِل گیا !

محمود کو گجرات کی آب و ہوا اور ساحلی مناظر ایسے پسند آئے کہ وہ یہاں اپنا مرکز بنانے اور سراندیپ و سیام پر بحری مہم لے جانے کے منصوبے باندھنے لگا ۔ لیکن رفیقوں نے سمجھایا اور خود اسے خراسان و غزنی یاد آئے جن کی ایک ایک گھاٹی پر لڑ کر قبضہ کیا تھا ۔ غرض یہ خیال چھوڑ دیا اور کوئی سال بھر تک انہل واڑہ میں آرام لینے کے بعد صحرائے تھر کے راستے واپس روانہ ہُوا ۔ اُس نے راستے کی نزدیکی کا اندازہ درست کیا تھا مگر بعض ہندو رہبروں نے مسلمانوں کو صحرا میں بھٹکا دیا اور کئی دن تک سخت تکلیف اور جانی نقصانات اُٹھا کر وہ سندھ کے آباد علاقے میں پہنچ سکے ۔ پھر سندھ کے ساحلی قزاقوں کی سرکوبی کے بعد سلطان سنہ ۴۱۷ھ م سنہ ۱۰۲۶ء میں دارالسلطنت غزنی پہنچ گیا ؛

وفات اور تبصرہ

تقریباً بتیس برس کی انقلاب آفریں حکومت کے بعد اس جلیل القدر فاتح نے سنہ ۴۲۱ھ (م سنہ ۱۰۳۰ء) میں وفات پائی اور غزنی کی چھوٹی سی مملکت کو اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور قوی سلطنت بنا گیا جس میں موجودہ افغانستان ، خراسان ،

ایران و ترکستان کے وسیع قطعات، کرمان اور مغربی پاکستان شامل تھے۔ ہندستان میں ایک طرف قنوج، دوسری طرف گجرات تک اکثر راجا مہاراجا خراج گزاری کا دم بھرتے تھے؛ سلطان کو ممالکِ ہند اور یہاں کے نوادر سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کی کئی مثالیں تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان میں یہ نقل کرنے کے قابل ہے کہ قنوج کی دوسری مہم سے واپس آ کر جب غزنی میں ایک عظیم الشان مسجد اور اس کے ساتھ بہت بڑا کتب خانہ اور دارالعلوم تیار کرایا تو ان عمارتوں کے لیے اعلیٰ درجے کا سنگِ مرمر و رُخام تک ہندستان سے منگایا اور ان کے باغوں کے لیے بھی پاکستان و ہند کے بڑے بڑے پرورش یافتہ درخت اُکھڑوا کر لائے اور غزنی میں نصب کرائے گئے تھے![1]

ہندستان کی ایک اور جیتی جاگتی پیداوار ہاتھی ہے جس کا محمود نہایت قدر دان تھا۔ یہ دیو پیکر جانور سیکڑوں کی تعداد میں غزنی لائے گئے اور ان کی داشت و پرداخت کے لیے ایک مستقل محکمہ سب سے پہلے اسی مسلمان بادشاہ نے قائم کیا۔ اس کی فیل پسندی کی حکایتوں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ بندھیل کھنڈ کے ایک زبردست ہاتھی کی تعریف سُن کر محمودؔ نے بڑی سے بڑی قیمت پیش کی لیکن وہاں کا راجا انکار کرتا رہا۔ حُسنِ اتفاق سے وہ ایک رات اپنے لشکر سے نکل کر ازخود سلطانی خیمہ گاہ میں چلا آیا۔ محمود نہایت خوش

---

[1] - روضۃ الصفا، صـ۲ـ

ہُوا۔ ہاتھی کا نام "خداداد" تجویز کیا اور اس کی آمد کی خوشی میں ایک پُرتکلف ضیافت کی گئی۔

کہتے ہیں سامانی بادشاہوں کو فخر تھا کہ اُن کے عہدِ عروج میں اُن کے پاس سات رطل، یعنی کوئی تین سیر وزن کے ہیرے جمع ہو گئے تھے۔ یہ روایت سُن کر محمود سجدۂ شکر بجا لایا کیوں کہ خود اُس کے خزانے میں ان گراں قدر جواہرات کی مقدار ننوّ رطل سے بھی زیادہ تھی! سلطان کے تزک و احتشام کی ایک دل چسپ تصویر صاحب روضۃ الصفا نے الفاظ میں اُتاری ہے۔[1] یہ اُس مجلسِ مصالحت کا بیان ہے جسے محمود نے ایلک خاں اور اس کے بھائی کی نزاع کا فیصلہ کرنے کی غرض سے غزنی میں منعقد کیا تھا:۔

"ایوانِ مجلس کے راستے پر دو رویہ دو ہزار غلام زرّیں لباس پہنے صف بستہ تھے۔ ان کے آگے پانچ سو غلامانِ خاصہ کی قطار تھی جن کی سُنہری پٹیاں جواہرات سے مرصّع تھیں۔ تختِ شاہی کے گِرد حاجبوں کے گروہ میں ہر فرد قبضۂ شمشیر پر ہاتھ رکھے، اشارۂ سلطانی کا منتظر استادہ تھا۔ باہر میدان میں سات سو کوہ پیکر ہاتھی جنگی ساز و یراق اور زرّیں جھولوں سے آراستہ جھوم رہے تھے۔ پیادہ سپاہ اور زرہ پوش سواروں کی قطاریں

---

[1] "روضۃ الصفا" ص ۴۸

بہترین اسلحہ سے مسلح ، تلواریں کھینچے ، نیزہ تانے کھڑی تھیں ـــــ جس ایوانِ عالی شان میں سفیروں کو کھانا کھلایا گیا۔ وہ جواہرات کی چمک سے جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ اُس کی آرایش دیکھ کر سفیر و وزیر دنگ رہ گئے۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ کسی زمانے میں بھی ایسے نوادر عجم کے اکاسرہ ، رُوم کے قیاصرہ ، ہندُستان کے راے راجا اور عرب کے خلفا کے پاس جمع نہ ہوئے تھے ... " ؎

مگر اتنی کثیر دولت اور ایسی حیرت انگیز فتوحات حاصل کرنے سے بھی بڑھ کر سلطان محمود کی عظمت کا باعث یہ ہے کہ فارسی علم ادب کو اُسی نے پروان چڑھایا اور مشرق کی تہذیب پر وہ احسان کیے جو اس کے نام کو قرن ہائے دراز تک زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں ۔ نظامی سمرقندی نے اپنے مشہور قطعے میں یہی مضمون ادا کیا ہے ؎

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد　　کہ در رفعت ہمے با مہ مرا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپاے　　مدیحِ عنصری ماندست بر جاے!

یاد رہے کہ چوتھی صدی ہجری تک اسلامی دُنیا کی مشترک علمی اور ادَبی زبان عَربی تھی ۔ محمود کی تخت نشینی تک فارسی میں گنتی کی چند کتابیں لکھی یا عربی سے ترجمہ کی گئی تھیں ۔ تُرک امیروں کی قدردانی سے فارسی قصائد اور سیدھی سادی غزلیں کہی جانے لگی تھیں اور نوح بن منصور (سامانی) کی فرمائش سے دقیقی

نے شاہ نامہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ اس طرح، کہہ سکتے ہیں کہ فارسی شاعری گھٹنیوں چلنے لگی تھی مگر دوڑنے کی اس میں طاقت نہ آئی تھی۔ یہ عجیب اتفاقِ زمانہ ہی کہ اس بچّے کی پرورش وطنِ اصلی سے دُور غزنی کے پہاڑوں میں آلِ سبکتگیں کے ہاتھوں ہوئی!

اصل میں محمود جنگ جوئی اور سپہ گری کی مہارت کے ساتھ نہایت بامذاق، فاضل بادشاہ تھا۔ فارسی تاریخوں اور تذکروں میں اس کے طبع زاد چند شعر منقول[1] اور فقہ کی ایک کتاب کی تصنیف اُس سے منسوب ہی[2] لیکن اس کی علم دوستی کا سب سے اچھّا ثبوت غزنی کا دارالعلوم اور وہ کتب خانہ تھا جس کے لیے دُور دُور سے بیش قیمت مخطوطات جمع کیے اور سالانہ مصارف کے واسطے بہت بڑی جاگیر وقف کر دی تھی۔ مشاہیر علما کو خاص اہتمام سے بادشاہ بُلواتا اور بڑے اعزاز و اکرام سے غزنی میں رکھتا تھا۔ ان میں ابو ریحان بیرونی سب سے زیادہ مشہور ہی کہ ہیات و ریاضی میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اِن علوم پر اعلا درجے کی تصانیف اُس کی یادگار ہیں۔ مزید برآں کئی سال مغربی پاکستان کے علاقوں میں رہ کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندی علوم

---

[1] دیکھو عوفی کا تذکرہ ' لباب الالباب '۔ جس میں سلطان کا ایک نفیس قطعہ نقل کیا ہی۔

[2] ' روضۃ الصفا ' وغیرہ۔

اور مذاہب پر ایک بے مثل جامع کتاب (الہند) تالیف کی۔
سلطان کی معارف نوازی کے سلسلے میں 'طبقاتِ ناصری' سے جس کی ثقاہت مسلّم ہے، یہ جزوِ روایت نقل کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ایک رات سلطان محل سرا سے پیادہ جا رہا تھا۔ فرّاش طلائی شمع دان لیے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں ایک غریب طالب علم کو دیکھا کہ کسی دکان کے چراغ کے سامنے کھڑا کتاب مطالعہ کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ خود چراغ بتی کی مقدرت نہیں رکھتا۔ محمود نے اسی وقت اپنا شمع دان اُسے بخش دیا۔ پچھلی شب خواب میں نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی زیارت ہوئی کہ اِس علم پروری پر تحسین اور دعائے خیر ارشاد فرماتے ہیں۔

اہلِ علم و فضل کے علاوہ، سلطان کی قدر دانی اور داد و دہش نے صدہا ادیب و شعرا کو غزنی کھینچ بُلایا تھا۔ ان میں عنصری، اسدی، فرخی، منوچہری وغیرہ مشہور اساتذہ شامل ہیں جن کی عرق ریزی نے فارسی ادب کی آبیاری کی۔ خود بادشاہِ سخن فردوسی اپنی لاجواب مثنوی (شاہ نامہ) لکھ کر دربارِ غزنی میں لایا اور سُلطانی سرپرستی میں اس کی نظرِ ثانی اور بعض داستانوں کا اضافہ کیا۔ لیکن کچھ مدت بعد درباری سازشوں اور مذہبی بدگمانیوں سے ڈر کر اپنے وطن چلا گیا اور جب محمود نے اُس کی کتاب کا ایسا صلہ جو دُنیا کے کسی مصنف کو غالباً کسی بادشاہ نے کبھی نہ دیا تھا،

وطن ہی میں اُسے بھجوایا تو وہ انتقال کر چکا تھا۔[1]

ذاتی اوصاف کے اعتبار سے دیکھا جائے تو محمود کا مرتبہ بادشاہوں میں اور بھی بلند نظر آئے گا کہ اتنی بڑی سلطنت اور قوتِ قاہرہ حاصل ہونے کے باوجود وہ آخر تک نہایت سادہ مزاج، خلیق و شائستہ، ضابط و حلیم بادشاہ رہا۔ اس کی خطاکاروں سے درگزر، ناتوانوں سے ہمدردی، فریادیوں کی دادرسی ضرب المثل ہوگئی تھی۔ اہلِ لشکر کے ساتھ حُسنِ سلوک

---

[1] لین پول نے تعجب کیا ہے (میڈیول انڈیا صفحہ ۳۱) کہ روایتِ عام کی بموجب پہلے جو صلہ دیا گیا وہ ڈھائی ہزار اشرفی تھا کہ بجائے خود کچھ معمولی رقم نہیں۔ پھر شاعر کی بدگوئی سے درگزر کرکے ساٹھ ہزار اشرفی (۔۔ پچاس ہزار گنی) کا خطیر انعام اونٹوں پر لاد کر طوس بھیجا گیا " اس پر بھی لوگ محمود کو بخل اور ناقدردانی کا الزام دیتے ہیں!" اصل یہ ہے کہ باطنی اور اسی قسم کے مذہبی فرقے نہ صرف سلطان محمود بلکہ دُوسرے راسخ العقیدہ اسلامی سلاطین سے ناراض تھے اور انھیں بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کے افسانے گھڑنے اور تاریخی اور مذہبی روایات کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھی کی ریشہ دوانی سے سادہ دل مسلمانوں میں بہت سے تفرقے اور غلط عقیدے پیدا ہوئے۔ فردوسی کے قصّے کو رنگین بنانے سے ان عیاروں کا مطلب سلطان کو مطعون کرنا تھا اور ابھی تک وہ ایرانیوں میں تعصب کا ہدف ہے۔ انتہا یہ کہ انگریز محقق براؤن تک ان بے جا تعصبات سے نہ بچ سکا۔ حالآنکہ خود وہ ہجو جو فردوسی سے منسوب کی جاتی رہی، جعلی اور محمود سے بُغضِ تلبی کی پیداوار ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اِن واقعات کی فاضلانہ تحقیق کی اور حقیقتِ حال کو منکشف کیا ہے۔ اس کے لیے مرحوم کی کتاب " فردوسی پر چار مقالے" ملاحظہ ہو۔

اور شاہانہ انعام و اکرام نے سپاہیوں کو اس کا شیدا اور جاں نثار بنا دیا تھا۔ عام رعایا اسے عدل و انصاف کا سرچشمہ، جود و کرم کا بہتا دریا سمجھتی تھی جس نے کہ و مہ کو اپنی عطا پاشیوں سے سیراب کر دیا تھا۔ فردوسی کا یہ لطیف شعر اسی لیے زباں زدِ خاص و عام ہُوا کہ بادشاہ کی سچی ہردل عزیزی کی گواہی دیتا تھا: ؎

چو کودک لب از شیرِ مادر بشست
ہمی نامِ محمود گوید نخست!

محمود کے جانشین

غزنی کی حکومت میں تُرک امیروں کی رائے کو اتنا دخل تھا کہ شخصی حکومت کی بجائے ہم نے اپنی تاریخ میں اس کے لیے "ترک شاہی" کا نام تجویز کیا ہے۔ لیکن امیر سبکتگین کے بعد وہ موروثی یا خاندانی ضرور بن گئی۔ سلطان محمود کی جانشینی کا جھگڑا اسی کے فرزندوں میں برپا اور بالآخر مسعود کے حق میں فیصل ہُوا۔ یہ بادشاہ زیادہ تر شمالی ہم سایوں سے اُلجھا رہا۔ تاہم اُس کے عہدِ حکومت (سنہ ۴۲۲ھ تا سنہ ۴۳۲ھ) میں ہندوستان پر دو بڑے حملے ہوئے۔ ایک سپہ سالار احمد نیال تگین کی یلغار جس میں وہ دریائے گنگا کے کنارے کنارے بنارس تک بڑھا اور اس دولت مند شہر کو لوٹ کر واپس ہُوا۔ (سنہ ۴۲۴ھ م سنہ ۱۰۳۳ء)[1] آتے جاتے بہت سے مقامات فتح کیے گو مستقل قبضہ کسی پر نہیں رکھا،

---

[1] تاریخِ بیہقی ص۴۹۷۔ طبقاتِ ناصری، ترجمہ راورٹی، حاشیہ ص۹۱۔

نہ ایسا کرنا ممکن تھا۔ دوآب کے مسلمانوں میں ایک بزرگ سالار مسعود غازی کی اسلامی تبلیغ و فتوحات کے بہت سے قصّے مشہور ہیں ۔ عجب نہیں کہ ان میں اسی من چلے سردار نیال تگین کے کارناموں کے افسانوی اجزا مِل گئے ہوں ۔ دُوسری مرتبہ خود سلطان مسعود نے ستلج کے پار ہانسی اور سون پت کے قلعے فتح کیے اور دونوں جگہ اپنی فوج متعیّن کردی لیکن خانہ جنگی اور موت نے اُسے اپنے منصوبے پُورے کرنے کی مہلت نہ دی انھی بدنظمیوں میں نہ صرف ہانسی اور تھانیسر بلکہ نگرکوٹ کا قلعہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور دس بارہ برس بعد سلطان عبدالرشید کے زمانے میں دوبارہ واپس لیا گیا ؛

غزنوی خاندان کے دسویں بادشاہ ابراہیم کے عہد میں ہم اور دو حملوں کا ذِکر پڑھتے ہیں لیکن اس کے بعد سلاطینِ غزنی کی قوّت میں زوال آگیا ۔ حتّٰی کہ غوریوں سے شکست کھا کے وہ پنجاب میں ہٹ آئے ۔ ان کے آخری تین بادشاہوں کا ملجا و ماویٰ مغربی پاکستان ، اور دارالحکومت "لاہور" قرار پایا ۔ یہاں بھی نوخیز غوریوں نے انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا آخر سلطان خسرو ملک کی اچانک گرفتاری پر خاندانِ غزنوی کی بادشاہی کا خاتمہ ہوگیا ۔ (سنہ ۵۸۲ھ م سنہ ۱۱۸۶ء) ؛

ادیب اور صوفیہ

آلِ سبکتگین کی حکومت کچھ کم دو سو برس رہی ۔ ان بادشاہوں کے نام اور سنین باب کے آخر میں ضمیمہ کر دیے

گئے ہیں۔ لیکن ہماری دل چسپی کی خاص بات یہ ہو کہ صوبۂ سرحد و پنجاب کے الحاق اور سلطان محمود کی آبادکاری نے دو تین پُشت ہی کے اندر ان علاقوں پر اسلامی رنگ چڑھا دیا اور یہاں جگہ جگہ صدہا مدارس و مساجد تعمیر ہوگئیں۔ عربی فارسی تعلیم پھیل گئی۔ عوفی کو اپنے مشہور تذکرے میں ایک علاحدہ باب "شعرائے غزنہ و لوہور" کے لیے قائم کرنا ضروری معلوم ہُوا۔[۱] ان شعرا میں اُستاد ابوالفرج روَنی اور مسعود سعد سلمان اس عہد کے نامی سخن ور گزرے ہیں۔ سعد سلمان کو یہ امتیاز حاصل ہو کہ عربی فارسی کے علاوہ ایک دیوان "ہندوی" زبان میں اپنی یادگار چھوڑ گیا تھا۔[۲]

غزنوی سلاطین کا دارالحکومت بننے کے بعد لازماً لاہور میں بہت سے مسلمان اُمرا اور علما نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہوگی مگر چھٹی صدی ہجری کے عمرانی اور تہذیبی حالات ابھی تک تاریکی میں ہیں۔

۱۔ تذکرہ 'لباب الالباب' ج دوم، باب دہم۔

۲۔ روَن مضافاتِ لاہور میں تھا مگر مُلّا عبدالقادر کے وقت میں ہی ویران ہوگیا تھا (منتخب التواریخ ص۳۶) سعد سلمان کے پاکستانی ہونے میں یا ہندوی میں شاعری کرنے کی نسبت قریب زمانے میں شبہات ظاہر کیے گئے ہیں۔ ممکن ہو اس نام کے دو شاعروں میں خلط مبحث ہوگیا ہو، لیکن مذکورہ بالا شاعر کا حال اور نمونۂ کلام سب سے اوّل عوفی کے تذکرے میں منقول ہو۔ اسی طرح بداؤنی کی تحریر بہت وزن رکھتی ہو نیز ملاحظہ ہو 'خزانۂ عامرہ' (آزاد بلگرامی) جس میں اس کی وطنیت پر مدلّل بحث کی گئی ہو۔

ورنہ محمود اور مسعود ہی کے زمانے میں یہ شہر ایک اسلامی مرکز بنتا جاتا تھا۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں شیخ حسین زنجانی رح کا لاہور آنا اور علومِ روحانی کی تعلیم و تلقین کرنے کے شواہد موجود ہیں۔ اُن کے انتقال پر ہی اُن کے پیر بھائی شیخ علی ہجویری رح نے سنہ ۴۳۱ ھ میں مسندِ ارشاد سنبھالی اور معارف کے وہ خزانے لُٹائے کہ آج تک "داتا گنج بخش" کہلاتے ہیں۔ حضرت رح نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سب سے مقبول "کشف المحجوب" ہے کہ غالباً لاہور آنے سے پہلے تکمیل کو پہنچی۔ اس میں تصوّف کے ضروری مسائل بہ طریقِ جواب لکھے ہیں اور بزرگانِ صوفیہ کا مختصر تذکرہ شامل کر دیا ہے۔ آپ نے شیخ ابوالقاسم قُشیری کا زمانہ پایا جن کا رسالۂ قشیریہ تصوّف کی اُمہاتِ کتب میں شمار ہوتا ہے اور اُن سے استفادہ فرمایا ہے۔ ایک دیوانِ اشعار بھی لکھا تھا۔ مگر اس کا مسودہ کوئی صاحب مانگ کر لے گئے اور کچھ ردّ و بدل کر کے اپنی ملکیت بنا لیا۔ نفحات الانس میں جامی نے شیخ ہجویری رح کے شمائل و فضائل نقل کیے اور ایک قطعے میں لفظ "سردار" سے تاریخِ وفات (سنہ ۴۶۵ ھ) نکالی ہے ؎

چوں کہ سردارِ ملکِ معنی بود
سال وصلش بر آید از سردار [1]

---

[1] 'فوائد الفواد' میں اسی زمانے کے ایک اور صاحبِ کرامت بزرگ شیخ وندول لاہوری کا تذکرہ آتا ہے (ص ۵۵) مگر ان کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

ضمیمہ باب سوم

سلاطینِ غزنویہ

۱۔ امیر ناصرالدین سبکتگین۔ ۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ م ۹۹۷ء

۲۔ یمین الدولہ سلطان محمود غازی ۳۸۸ھ م ۹۹۸ء تا ۴۲۱ھ م ۱۰۳۰ء

۳۔ محمد بن سلطان محمود۔ ہفت ماہ

۴۔ سلطان مسعود بن محمود۔ ۴۲۲ھ تا ۴۳۲ھ م ۱۰۴۰ء

۵۔ سلطان مودود بن مسعود — تا ۴۴۱ھ م ۱۰۴۹ء

۶۔ مسعود ثانی بن مودود

۷۔ علی بن مسعود

۸۔ سلطان عبدالرشید بن مسعود

۹۔ سلطان فرخ زاد بن مسعود — تا ۴۵۱ھ م ۱۰۵۹ء

۱۰۔ سید السلاطین ابراہیم بن مسعود ۴۵۱ھ تا ۴۹۲ھ م ۱۰۹۹ء

۱۱۔ مسعود الکریم بن ابراہیم تا ۵۰۸ھ م ۱۱۱۴ء

۱۲۔ شیرزاد بن مسعود الکریم چند ماہ

۱۳۔ ملک ارسلان " " تا ۵۱۲ھ

۱۴۔ سلطان بہرام شاہ " " تا ۵۴۷ھ م ۱۱۵۲ء

۱۵۔ خسرو شاہ بن بہرام شاہ تا ۵۵۵ھ م ۱۱۶۰ء

۱۶۔ خسرو ملک بن خسرو شاہ تا ۵۸۲ھ م ۱۱۸۶ء

باب چہارم
شمالی ہندُستان کی تسخیر

سلطان مُعِزّ الدّین غوری

غزنی کے شمال مشرق میں کوہِ سفید کا سلسلہ شرقاً غرباً پھیلا ہُوا ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں اس کے پہاڑی قلعوں میں تُرک و تاجیک نسل کے قبائل آباد تھے۔ انھی میں غوری قبیلہ خالص تُرک، اور قدیم سے مسلمان ہونے کا دعوا رکھتا تھا۔ اگرچہ محمُود غزنوی نے ان کی قزّاقی سے تنگ آ کر یہ سب قلعے اور بستیاں فتح کیں تو جا بجا بُت پرستی کے آثار پائے اور یہاں سلطانی انتظام کے ساتھ اشاعتِ اسلام کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اِن تدبیروں سے یہ کوہستانی مُدنیت کے میدان میں آئے اور بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن و فراغت نے ان کی آبادی میں بہت جلد اضافہ کر دیا۔

سلاطین غزنی کمزور ہوئے تو غوریوں میں زور بھرا۔ اُدھر سلجوقی تُرکوں نے ایران میں ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ خراسان

آلِ سبکتگین سے چھین لیا اور دوسری مصیبت یہ نازل کی کہ غزّ (یا یُوز)، قوم کو ترکستان سے کابل کی طرف دھکیل دیا۔ یہ جنگجو، غزنی کے بادشاہ بہرام شاہ (سنہ ۵۱۲ھ تا سنہ ۵۴۷ھ م سنہ ۱۱۵۲ء) کے قابو میں نہ آتے تھے۔ غوریوں نے انھیں نکالا مگر خود غزنی پر قابض ہو گئے۔ بہرام شاہ اپنے پاکستانی علاقے سے فوج لایا اور غوری امیر سیف الدّین کو پکڑ کر سُولی پر چڑھا دیا۔ اسی کا بھائی علاء الدّین حسین تھا جس نے بہرام شاہ کو شکستیں دے کر پھر غزنی پر قبضہ کیا اور حکم دیا کہ شہر کو لوٹ کر آگ لگا دی جائے۔ کہتے ہیں سات روز تک برابر شہر جلتا اور شہریوں کا خون گلیوں میں بہتا رہا، اور علاء الدّین ایک محل میں بیٹھا عیش و طرب کا لُطف اُٹھاتا رہا آٹھویں رات مطربوں سے یہ نظم جو خود اپنی مدح میں لکھی تھی، گوائی:

جہاں داند کہ من شاہِ جہانم چراغِ دودۂ عباسیانم[1]

. . . .

بر آں بودم کہ از اوباشِ غزنی چو رودِ نیل جوئے خوں برانم
ولیکن گندہ پیرانند و طفلاں شفاعت می کند بختِ جوانم

. . . .

مگر اس جاں بخشی کا اعلان ہوتے ہوتے بھی کم سے کم ستّر ہزار باشندے مارے جا چکے تھے۔ پھر غزنی اور مضافات کی وُہ عمارتیں کہ اُن کا دُنیا میں مثل کم ہوگا، توڑ کر کھنڈر بنا دی گئیں

[1] اس کے باپ کا نام بھی عباس شنسبی تھا۔

انتقام کے تیشے سے سلطان محمود، مسعود اور ابراہیم کے مقبرے مستثنا رہے۔ ورنہ سلاطینِ غزنوی کی قبریں تک نہ بچیں۔ (سنہ ۵۴۷ ھ)۔ اسی علاء الدّین کو جو غزنی میں آگ لگانے سے "جہاں سوز" مشہور ہُوا سلطان سنجر پکڑ کر لے گیا تھا اور وہ بہت دن اس کے لشکر میں تنور سلگا کر پیٹ کی آگ بُجھاتا رہا۔ پھر چھوٹ کر وطن آیا بھی تو زیادہ دن نہ جیا اور حکومتِ غور پر اس کے ایک بھائی، پھر بھتیجے غیاث الدّین کا انتخاب ہُوا۔ (سنہ ۵۵۶ ھ م سنہ ۱۱۶۰ء) مگر پاکستان و بھارت کو سلطان غیاث الدّین سے سابقہ نہیں پڑا بلکہ وہ اس بادشاہ کا چھوٹا بھائی شہاب الدّین تھا[1] جس نے مُعِز الدّین محمّد بن سام کے لقب سے پہلے مغربی پاکستان پر قبضہ کیا پھر شمالی بھارت پر فوج کشی کی۔ اس کی حکومت کا آغاز غزنی کی صوبہ داری سے کیا جاتا ہے (سنہ ۵۶۹ ھ م سنہ ۱۱۷۳ء) اگرچہ بڑے بھائی کی زندگی میں اس نے کبھی خودمختاری کا دعوا نہیں کیا۔

غزنی کو غزوں کی ترک تاز اور عام بدامنی سے محفوظ کرنے کے بعد مُعِز الدّین پہلے بلوچستان و سندھ کے علاقے دوبارہ حکومتِ غزنی کے زیرِ نگیں لایا اور بھائی کی فرمائش سے ملتان کو باطنیوں کی شورش سے نجات دلائی۔ اُچھ میں ایک بھاٹیہ حاکم آزاد راجا بن گیا تھا، اسے مغلوب کیا اور

---

[1] اس کے جد کا نام بھی عبّاس (غنیبی) تھا۔

کچھ مدت بعد اسی سمت سے گجرات پر فوج کشی کی ۔ اسلامی تاریخوں میں یہاں کے راجا کا نام بھیم دیو لکھا ہے۔ حالیہ تحقیقات مول راج بتاتی ہے ۔ مگر نام جو بھی ہو، وہ ان دنوں شمالی ہند میں سب سے قوی راجا مانا جاتا تھا۔[1] ادھر غزنی کی فوج میں اب وہ جفاکش جاں فروش لڑنے والے نہ رہے تھے ۔ نہ لڑانے والا محمود تھا کہ حریف کی قوت اور مشکلاتِ سفر کو اچھی طرح جانچ لیتا ۔ معزالدین تھر کے ریگستان کو طے کر کے انہل واڑہ کے علاقے میں پہنچا تو سپاہی خستہ و مضمحل ہو چکے تھے راجا کے لشکرِ کثیر پر غلبہ نہ پا سکے ۔ غوری سپہ سالار بے نیل مرام واپس چلا گیا ۔ البتہ اس بے سود مہم سے اتنا فائدہ ہوا کہ آیندہ معزالدین کی توجہ پنجاب کی طرف منعطف ہو گئی اور چند حملوں میں یہ ملک اور پایۂ تخت لاہور اس کے قبضے میں آ گئے۔ سنہ ۵۸۲ ھ م سنہ ۱۱۸۶ء ؁

ترائن کے معرکے

چار سال بعد معزالدین ستلج کے پار بھٹنڈہ کے مشہور قلعے پر بڑھا اور بغیر کسی سخت مزاحمت کے اُسے اپنی عمل داری میں داخل کر لیا ۔ قلعے میں جو فوج تعینات کی گئی وہ ہزار گیارہ سو جوانوں پر مشتمل تھی جس سے قیاس ہوتا ہے کہ غوری بادشاہ کو ہندو حریفوں کی قوت کا صحیح اندازہ نہ تھا اور یا وہ اُن کو خاطر میں نہ لاتا تھا ۔ حالانکہ اُسی زمانے میں اجمیر کے

---

[1] اوکس فورڈ ہسٹری ص۱۸۹ و ص۲۱۱ ۔ نیز دیکھو ٹاڈ ۔ ج ۲ ص ۔ ۔

چوہان راج پوت ریاست دہلی کے وارث ہو گئے تھے اور ان کا راجا پرتھوی راج (رائے پتھورا) بہت من چلا سپاہی تھا[1] اسے بھٹنڈہ پر اپنی ملکیت کے دعوے تھے اور مسلمانوں کی آمد سُن کر بڑے لشکر کے ساتھ تھانیسر پہنچ گیا تھا۔[2] مُعزالدین کسی بڑی لڑائی کے لیے تیار ہو کر نہ آیا تھا مگر ہندی فوج کے آمادہ بہ جنگ ہونے کی خبر سُن کر لاہور جاتے جاتے پلٹ پڑا اور خود سنوٗ میل کے قریب آگے بڑھ کر ترائن (ضلع کرنال) کے میدان میں حریف سے جا بھڑا جس کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں تقریباً بارہ گنی زیادہ تھی[3] یہ بے جا دلیری نقصان و ناکامی کا باعث ہوئی۔ لڑائی میں خود سلطان زخم کھا کے بے ہوش ہو گیا اور اُسے بہ مشکل چند غلام میدان سے نکال کر لائے۔ پھر لاہور میں کئی ہفتے وہ صاحبِ فراش رہا۔[4] بھٹنڈہ کی مسلمان فوج ایک سال تک قلعے

---

[1] پرتھی راج کی بہادری کے ابھی تک گیت گائے جاتے ہیں۔ انھی میں اس کا یہ کارنامہ بہت مشہور ہے کہ اپنے خالہ زاد بھائی جے چند راجا قنوج کی بیٹی کو بھگا لایا تھا!

[2] ٹاڈؔ لکھتا ہے کہ ایک سو آٹھ راجا پرتھی راج کے باج گزار تھے۔ اے ٹلز ج ۲ ص۵۵

[3] فرشتہ (ص۵۵) بہ حوالہ "زین المآثر" لکھتا ہے کہ ہندو لشکر میں دو لاکھ سوار، تین ہزار جنگی ہاتھی تھے اور اس کے مقابلے میں معزالدین کی فوج ۱۲، ۱۴ ہزار سوار سے زیادہ نہ تھی ؎

[4] فرشتہ کے انگریزی ترجموں میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کا چالیس میل تک تعاقب کیا گیا۔ اور اسی کو الفنسٹن اور بعد کے انگریز تاریخ نویسوں نے طرح طرح کے مضحکہ انگیز مبالغوں کے ساتھ دُہرایا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں "تعاقب" کا لفظ تک نہیں آیا۔ نہ دوسری تاریخوں میں۔ اسی پر راورٹی نے ان انگریز محققوں کی بُری طرح خبر لی ہے۔ دیکھو حواشی ترجمہ طبقات ناصری ص۴۶۳ وغیرہ وغیرہ ؎

میں گھری رہی۔ آخر اس شرط پر کہ ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا، قلعہ پرتھی راج کے حوالے کردیا۔ اِن کامیابیوں سے راجا کی شجاعت کی ہندستان میں دھوم مچ گئی۔ اور دوسری لڑائی میں پہلے سے بھی زیادہ حلیف اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوگئے۔

اِدھر سلطان مُعزالدین کو اس شکست کا اتنا غم تھا، کہ عیش و آرام اپنے اوپر حرام کر لیا اور کئی مہینے کی مسلسل جدّوجہد سے ایک جرّار فوج مرتب کی۔ لاہور پہنچ کر اس نے پرتھی راج کو اطاعت اور قبولِ اسلام کا پیام بھیجا تھا لیکن راجا نے بہت سخت جواب دیے اور اپنا لاؤلشکر لے کر مقابلے میں روانہ ہُوا۔ ہم عصر تاریخوں میں اس کی سپاہ کا تخمینہ تین لاکھ سوار بتایا ہے۔ جنگی ہاتھی، تیرانداز اور پیادہ سپاہی ان کے علاوہ تھے۔ ڈیڑھ سو راجا اور راج کمار اپنے چیدہ دستے لے کر آئے اور قسمیں کھا کر شریکِ جنگ ہوئے تھے کہ ماریں گے یا مرجائیں گے، میدان سے قدم نہ ہٹائیں گے۔ ہندوؤں کے جوش خروش کا اندازہ چاند بھاٹ کے گیتوں سے بھی ہوسکتا ہے جس نے ان واقعات کو اپنی رزمیہ نظم "پرتھی راج راسو" میں مفصّل بیان کیا تھا اگرچہ بعد کی تحریفات نے اس کی تاریخی وقعت باقی نہیں رہنے دی ہے۔[1]

---

[1] دیکھو سرچارلس لائل کی تحقیق و تنقید ، انسائی کلو پیڈیا، طبع چہاردہم، ج ۱۱ صلمہ نیز حافظ محمود شیرانی مرحوم کا عالمانہ مقالہ اسی موضوع پر۔

عام روایت کے مطابق یہ جنگ بھی اسی ترائن کے میدان میں ہوئی (سنہ ۵۸۸ھ م سنہ ۱۱۹۲ء) جہاں پہلا معرکہ پڑا تھا۔ فریقین کی فوجی تعداد زیادہ صحت و تفصیل کے ساتھ محفوظ رہی کیوں کہ طبقاتِ ناصری اور قریب العصر تاریخوں کے علاوہ صاحبِ تاج المآثر نے اسی لڑائی سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا ہے۔ ان سب کو پڑھ کر ہم آج بھی اس خوں ریز مقاتلے کا تصوّر ذہن میں قائم کر سکتے ہیں جس نے ہندستان کی قسمت کا فیصلہ کیا: مُعِزّ الدّین کی فوج میں ایک لاکھ سے زیادہ سوار شامل تھے اور جدھر سے ان کا پرا گزرتا۔ وہاں برچھوں کی کثرت سے نیزوں کا بن نظر آنے لگتا تھا۔ چند ہاتھی بھی تھے مگر انھیں خیمہ و خرگاہ کے ساتھ پیچھے چھوڑ دیا تھا اور وہیں فوجِ ردیف کے دستے رہنے دیے تھے۔ باقی لشکر چار حصّوں میں آگے بڑھا اور اس کے دونوں طرف تیر اندازوں کے دستے لگا دیے گئے کہ غنیم کے جنگی ہاتھیوں کو نشانہ بنائیں اور جب وہ بڑھیں تو یہ ہٹ کر تیر باری سے انھیں پریشان و منتشر کرتے چلے جائیں۔

فرشتہ کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ جنگ سے دو تین دن پہلے فریقین میں جو نامہ و پیام ہوئے ان سے راج پوت اور بھی مغرور و مطمئن ہو گئے اور انھیں مسلمانوں کی طرف سے پیش دستی کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ اسی لیے جب صبح کے وقت طبل و دمامہ پر چوٹ پڑی اور دُور سے سُرخ و سیاہ پرچم

لہراتے نظر آئے جن پر " نصرٌ مِّنَ اللہ " جلی حروف میں تحریر تھا، تو وہ گھبرائے اور بہت جلد صفیں باندھ کر میدان میں آئے۔ انھوں نے جاں بازی دکھانے میں کوئی کمی نہیں کی لیکن مُعِز الدّین کی سپہ سالاری کے سامنے کثرت اور خالی بہادری کی پیش نہ جاسکی۔ صبا رفتار گھوڑوں پر اس کے سدھے ہوئے تیرانداز ہندی بازووں کی صفیں اُلٹ اُلٹ دیتے تھے۔ اور جب وہ پیچھے ہٹتے تو اسلامی شہسوار اُن کے قلبِ لشکر پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ پرتھی راج کے جنگی ہاتھی اس دو طرفہ مار کی روک تھام کے لیے دوڑتے دوڑتے تھکے جاتے تھے۔ ان عظیم الجثہ حیوانات کا سونڈوں کو پیچ و تاب دے کر چنگھاڑیں مارنا بہادروں کا دِل ہلائے دیتا تھا۔ ان کی جھولوں میں جو آئینے لگے تھے وہ سورج کی کرنوں سے چمک چمک کر آنکھوں کو خیرہ کیے دیتے تھے لیکن غوری سواروں کے دِلوں میں اس کالی بلا کا خوف تھا بھی تو جلد زائل ہوگیا اور تیر اندازوں کی چابک دستی نے خود ہاتھیوں کو مضمحل اور خوف زدہ کر دیا۔ ہندی فوج سمٹ سمٹ کر وسط میں جمع ہونے لگی اور بڑھ کر حملہ کرنے کے قابل نہیں رہی تھی جب کہ مُعِز الدّین نے فوجِ خاصہ کو جسے اب تک الگ لیے کھڑا تھا، حملے کا حکم دیا۔ بارہ ہزار سواروں نے اپنے برچھے سیدھے کیے اور گھوڑے اُڑا کر دشمن کے قلب پر آگرے۔ تازہ دم رسالے کا یہ حملہ بہت سخت تھا۔ بے دل راج پوت اس کی تاب نہ لاسکے بلکہ پہلی

ہی ٹکّر میں پیٹھ پھیر دی اور ہندی لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔ خود پرتھی راج فرار ہوا مگر میدانِ جنگ سے چند کوس کے فاصلے پر گرفتار ہو کے مارا گیا۔ فریقین کے نقصان کی ٹھیک تعداد معلوم نہیں۔ 'تاج المآثر' میں ہندی مقتولوں کا شمار ایک لاکھ بتایا گیا ہے۔ مگر اس کتاب کا مصنّف انشا پردازی کے زور میں احتیاط نہیں کرتا۔ اس ضمن میں یہ بات لکھنے کے لائق ہے کہ جنگ میں پرتھی راج کی طرف سے افغان اجیر سپاہی[1] اور مُعِز الدّین کی جانب سے راجا جمّوں کا بیٹا[2] اپنے ہم مذہبوں کے خلاف لڑنے آئے تھے۔

دہلی اور دو آب کی فتح

ترائن کی جنگ نے اجمیر و دہلی کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا تھا مگر شروع میں خراج گزاری کے وعدے پر یہ ریاستیں برقرار رکھی گئیں اور مسلمانوں کے قبضے کی حدود موجودہ انبالہ کے علاقے سے آگے نہیں بڑھیں۔ چناں چہ ان کی سرحدی چھاؤنیاں کہرام اور سمانہ میں تھیں۔ ان کی سرداری سلطان اپنے غلام قطب الدّین ایبک کے سپرد کر گیا تھا۔ مگر جب قطب الدّین ہانسی اور میرٹھ کے سرکشوں کو قابو میں لا رہا تھا، دہلی کے راجا نے انحراف کیا۔ ایبک نے اُسے شکست دی اور چند روز

---

[1] 'فرشتہ' ص۵۸۔ ناڈ کا بیان ہے کہ گجرات اور قنوج کے ہندو راجاؤں کی فوج میں ترک سپاہی رکھے جاتے تھے۔ ج ۱ ص۲۱۴

[2] راورٹی۔ 'ترجمہ طبقات'۔ حاشیہ ص۴۶۶

محاصرے کے بعد دہلی کا قلعہ چھین کر پوری ریاست کا الحاق کر لیا۔ (سنہ ۵۸۹ ھ، م سنہ ۱۱۹۳ ء) پھر اسی سال ستلج پار کے ان جدید مقبوضات کا مرکز دہلی کو بنا لیا اگرچہ ابھی تک ان کی حیثیت ایک صوبے سے بڑھ کر نہ تھی اور خود قطب الدین کو غلامی سے آزادی حاصل نہیں ہوئی تھی ؛

ان فتوحات نے اسلامی حکومت کی سرحدیں کئی ہندو ریاستوں سے ملا دیں جن میں قنوج کا راج سب سے قوی تھا۔ اس شہر کی شان و شوکت کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ اب یہ ایک چھوٹی مملکت کا پائے تخت رہ گیا تھا پھر بھی معزالدین کا ہم عصر راجا جے چند (ر) دولت و طاقت میں کسی سے کم نہ تھا۔ اور ٹاڈ کی روایت مانی جائے تو اس کے پاس کئی لاکھ پیادہ اور تیس ہزار زرہ پوش سواروں کی فوج تھی۔ [1] پرتھی راج سے سیاسی رقابت کے علاوہ اس کی عداوت کا ایک سبب یہ تھا کہ پرتھی راج اس کی بیٹی کو بھگا لے گیا تھا۔ لیکن بعض انگریزی تاریخوں کا یہ قول کہ اُس نے پرتھی راج کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی، بے بنیاد ہے۔ وہ پرتھی راج کا دُشمن صحیح، مسلمانوں کا دوست نہ تھا اور جب ایبک نے دہلی پر قبضہ کیا تو جے چند نے اس پر حملے کی تیاریاں کیں ؛

والیٔ دہلی کے پاس ابھی تک پچاس ہزار سے زیادہ فوج فراہم نہ ہو سکتی تھی۔ جے چند کی تیاریاں سُن کر خود معزالدین ہندستان

---

[1] ج ۲ ص ۶ و ۷ ؛

آ گیا اور چنداور (یا موجودہ چندوال) کی جنگ اُسی کی سپہ سالاری میں لڑی گئی (سنہ ۵۹۰ھ، م سنہ ۱۱۹۴ء) جے چند بھاگا اور غالبًا مارا گیا۔ نہ صرف قنوج بلکہ دوآب یعنی بھارت خاص (تا بنارس) پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور یہ پُورا مُلک تین ولایتوں میں تقسیم کیا گیا: کول (علی گڑھ) بداؤں اور اودھ جہاں کے والی بہ راہِ راست سلطان مُعز الدّین کے ماتحت تھے اسی طرح سال ڈیڑھ سال کے بعد قلعہ تھنکر (بیانہ) فتح ہُوا، تو شمالی راج پوتانہ میں ایک علاحدہ والی مقرر کیا گیا؛

سلطان معز الدّین کی شہادت

دوآب کی فتح کے بعد مُعز الدّین کو ہندُستان آنے کی فرصت نہ ملی۔ سنہ ۵۹۹ھ میں بڑے بھائی غیاث الدّین کا انتقال ہُوا تو پُوری غوری حکومت کی ذمّہ داری مُعز الدّین کے ہاتھ میں آ گئی وہ "سلطانِ اعظم" کے لقب سے ملقّب ہُوا اور شمال کی بعید مہمات میں اُلجھ گیا۔ پھر یہ سُن کر کہ کھوکھروں نے بہت سر اُٹھایا ہے اور والیٔ لاہور کے قابو میں نہیں آتے، وہ غزنی سے پشاور آیا اور جہلم چناب تک ان نیم وحشی قبائل کی سخت سرکوبی کی۔ ان کے سرداروں نے جمع ہو کر امان مانگی اور مال گزاری کی سب رقوم ادا کیں تب بادشاہ نے انھیں معافی دی، واپس غزنی جا رہا تھا کہ چند باطنی فدائیوں[1] نے اُسے سوتے میں شہید کر دیا

---

[1] فدائیوں کا خاص کام یہ تھا کہ اپنے امام کے حکم سے ہر مسلمان بادشاہ یا عالم کا جو فرقۂ باطنیہ کا مخالف ہو، چھُپ کر کام تمام کر دیں۔ سلطان مُعز الدّین نے

(باقی صفحۂ آئندہ پر)

(سنہ ۶۰۲ ھ، م سنہ ۱۲۰۶ء) قطعۂ تاریخ نقل کرنے کے لائق ہے:

شہادت ملک بحر و بر معزالدین کز ابتدائے جہاں مثل او نیامد یک
سوم زغرۂ شعبان بسال شش و دوم فتاد در رہ غزنین بہ منزل دمیک

ہر چند یہ بادشاہ سلطان محمود کا مثیل اور اتنا کام یاب نہ تھا لیکن اس کا بہت اچھا مقلّد ضرور تھا۔ فتح ہند کے محمودی منصوبے کو اسی نے تکمیل کے قریب پہنچایا اور بھارت خاص میں اسلامی حکومت کی بنیاد جما دی۔ اس کے ذاتی اوصاف کی نسبت جملہ مورّخ متفق ہیں کہ علاءالدین جہاں سوز جیسے خوں خوار چچا کا یہ بھتیجا نہایت خُدا ترس، عادل اور فیّاض بادشاہ تھا۔ غلاموں پر اس کی شفقت ضرب المثل ہے کہ اس گروہ کے صدہا افراد کو اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ خود اس کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ اسی بنا پر ایک دن کسی مصاحب نے تمنّا ظاہر کی کہ کاش اللہ تعالیٰ آپ کو فرزند عطا فرماتا کہ اس وسیع سلطنت کے وارث ہوتے۔ سلطان نے کہا: بادشاہوں کے چند بیٹے ہوا کرتے ہیں

(بقیۂ صفحۂ گزشتہ) ان کے سیاسی اقتدار کا ملتان اور قہستان (ایران) میں استیصال کیا اور اسی کی سرپرستی میں اکثر علمائے اسلام باطنی عقائد کی باضابطہ تکذیب کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے بہت لوگ اُن عقائد سے تائب ہوتے پس یہ فرقہ سلطان کا سخت دشمن ہوگیا اور قتل کے بعد افواہیں یہ مشہور کیں کہ کھوکھروں نے مارا یا امام فخرالدین رازی نے سلطان کو قتل کرایا ہے حال آں کہ وہ سلطان کے بڑے مدّاح اور احسان مند تھے (دیکھو زاورٹی ۴۸۶ھ۔ منتخب التواریخ ۵۳ھ)

مگر مجھے خدا نے بیسیوں بیٹے دیے ہیں - یہی میرے بعد سلطنت کے وارث ہوں گے اور میرا نام روشن کریں گے!" اور یہ محض قول نہ تھا بلکہ اعلا تربیت اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے دے کر اس نے ثابت کر دیا کہ وہ آیندہ اپنا وارث انھی غلاموں کو بنانا چاہتا ہی - چناں چہ جب اس کا بھتیجا حکومت غور کا بادشاہ ہوا تو اُس نے بھی چچا کی وصیت کے مطابق تاج الدّین یلدُز کو غزنی کا حاکم تسلیم کر لیا جو سلطان شہید کا سب سے عزیز غلام تھا ؎

ملوکِ معزیہ پاکستان و بھارت میں

یلدُز موجودہ صوبہ سرحد اور پنجاب پر بھی قبضہ رکھنا چاہتا تھا کہ دہلی میں اس کے داماد قطب الدّین ایبک نے اپنی بادشاہی کا اعلان اور پنجاب کا دعوا کیا - لڑائی کی نوبت آئی تو یلدُز کو شکست ہوئی - قطب الدین تعاقب کرتا ہُوا غزنی تک پہنچ گیا - مگر فتح کی خوشی میں عیش و نشاط میں مست ہو رہا تھا کہ یکایک حریف کے شہر میں گھس آنے کی خبر سُنی اور قطب الدّین کو بھاگتے ہی بنی - تاہم فرماں روائے غور (سلطان محمود بن غیاث الدّین غوری) نے قطب الدّین کو یلدُز کی طرح، خلعت بادشاہی سے سرفراز کیا اور اس کی باضابطہ تاج پوشی کا جشن بڑی دھوم دھام سے لاہور میں منایا گیا - تخت نشینی کی رسم ۱۸ ذی قعد سنہ ۶۰۲ھ (م سنہ ۱۲۰۶ء) کے دن ادا ہوئی [1] اور یہ تاریخ یاد

---

[1] طبقاتِ ناصری صفحہ ۱۴۰ بعض تاریخوں میں تاج پوشی کی تاریخ ربیع الاوّل سنہ ۶۰۲ھ لکھی ہی؎

رکھنے کے قابل ہو کیوں کہ قطب الدّین نہ صرف پنجاب بلکہ بھارت خاص کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ ہم اس کا حال آیندہ فصل میں ذرا تفصیل سے لکھیں گے۔ یہاں سلطان مُعزالدّین کے دو اور مشہور غلاموں کا تذکرہ اور فاتح بنگال کی مختصر کیفیت بیان کرنا مناسب ہوگا کہ اُسے بھی ملوکِ معزیہ میں شمار کیا جاتا ہو :۔

سلطان کا ایک نامور غلام ناصرالدّین قباچہ تھا جس نے اپنے آقا کی شہادت کے بعد سندھ میں خودمختار بادشاہی کا اعلان کیا۔ موجودہ بلوچستان اور صوبہ سرحد اور پنجاب کے شمالی اضلاع کے لیے اس کی تاج الدّین یلدُز اور قطب الدّین ایبک سے بارہا زور آزمائی ہوئی۔ حال آں کہ ایبک کی دُو بیٹیاں یکے بعد دیگرے اس کے نکاح میں آئی تھیں۔ ملتان پر عموماً اسی کا قبضہ رہا اور قطب الدّین کی وفات کے بعد وہ کچھ مدّت تک لاہور پر بھی قابض ہو گیا تھا۔ اِل تُتمش نے بھٹنڈا اور کہرام کے ضلعے بھی خراج ادا کرنے کے وعدے پر اُس کے سپرد کر دیے تھے لیکن وعدہ پُورا نہ کرسکا تو اُس کے عمّال وہاں سے نکال دیے گئے اور اوّل لاہور میں تاج الدّین یلدُز نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ پھر سنہ ۶۱۸ھ میں جلال الدّین (خوارزم شاہ) چنگیز خاں سے بچ کر شمالی پنجاب میں آیا تو قباچہ کو سندھ ہی کا بچانا مشکل ہو گیا۔ یہ شکست خوردہ ترک بھی زخمی شیروں کی طرح جنگ کرتے تھے اور مقامی فوجیں ان کے سامنے نہ ٹھیرتی تھیں۔ قباچہ ملتان

کے قلعے میں متحصّن ہو گیا۔ جلال الدین کو محاصرے کی فرصت نہ ملی لہٰذا سیہوان اور دیبل کی طرف چلا گیا۔ "تاریخ جہاں کشائے" کے قول کے مطابق یہاں سے نہر والہ (گجرات) کے علاقے پر بھی تاخت کی اور دیبل میں ایک مسجدِ جامع اپنے قیام کی یادگار میں تعمیر کرائی۔ پھر امرائے خراسان کی دعوت پر یہاں سے مُراجعت کی اور قباچہ نے اُس کے عاملوں سے لڑ جھگڑ کر مغربی سندھ اور بلوچستان کا علاقہ واپس لیا۔ قباچہ کی نام وری کا ایک سبب یہ ہُوا کہ چنگیزی طوفان سے جو امرا اور علما بچ کر بھاگے اور سندھ پہنچ گئے ان کو پناہ دی اور بڑے اعزاز اکرام سے پیش آیا۔ سنہ ۶۲۴ھ (م سنہ ۱۲۲۷ء) میں سلطان شمس الدین التمش کی سندھ پر فوج کشی کا حال آیندہ اوراق میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ اسی لڑائی میں قباچہ نے ڈوب کر جان دی اور سندھ سلطنت دہلی کی عمل داری میں داخل ہو گیا۔

بھارت میں سلطان معز الدین کا ایک قدیم اور عزیز غلام بہاء الدین طغرل تھا جسے تھنکر (بیانہ) کی ولایت اور قلعہ گوالیار کی تسخیر پر مامور کیا گیا تھا۔ طغرل کی فیّاضیاں مشہور تھیں۔ دُور دُور سے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ وہ جمنا کے آگے وادیٔ چنبل میں مسلمانوں کی حکومت جما رہا تھا اور گوالیار فتح کرنے کے سلسلے میں ایک نیا قلعہ سلطان کوٹ بھی تعمیر کرا لیا تھا کہ گوالیار کے محصوروں بنے بالا ہی بالا

قطب الدّین سے ساز کیا اور یہ جنگی قلعہ اس کے فرستادہ عمّال کے حوالے کر دیا۔ طغرل کو جب یہ اطلاع ہوئی تو بہت غضب ناک ہُوا اور قریب تھا کہ قطب الدّین سے اس کی جنگ چھڑ جائے لیکن تفضلے الٰہی سے بیمار ہو کر فوت ہوگیا اور تقدیر نے قطب الدّین کا ایک خطرناک حریف کم کر دیا ہے۔

بھارت میں سلطان مُعز الدّین کے عہد کا ایک نامی سردار اختیارالدّین محمد بن بختیار خلجی تھا جس کی ہمّت و شجاعت نے بنگال کا وسیع ملک دُنیائے اسلام سے منسلک کیا اور مشرقی پاکستان کی داغ بیل ڈالی۔ اُس کا نام اور قومیت لکھنے میں انگریزی تاریخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں وہ سلطان معزالدّین یا قطب الدّین کا غلام نہ تھا نہ اس کا نام "محمد بختیار" تھا نہ قومیّت افغانی تھی۔ خلج مشہور تُرک قبیلہ ہے۔ سلاطینِ غزنی کے عہد میں اس کے بہت سے افراد افغانستان کے جنوب مغربی علاقے میں آ بسے تھے اور غزنوی اور غوری فوجوں میں بھرتی ہو کر پاکستان و بھارت تک آئے۔ محمّد بن بختیار اسی ترک قبیلے کا سپاہی تھا۔ اسے خُدا نے غیر معمولی قوّتِ جسمانی عطا کی تھی مگر قد قامت کا ایسا بے ڈول تھا کہ غزنی اور دہلی دونوں جگہ کے فوجی عہدہ داروں نے اچھی خدمت دینے سے انکار کر دیا۔ آخر اودھ کے جدید صوبے میں جگہ ملی اور جنگی خدمات کے صلے میں، جیسا کہ اُن دنوں دستور تھا، دو پرگنے کی جاگیر

دی گئی۔ یہ پرگنے موجودہ مرزا پور اور بنارس کے ضلع میں واقع تھے اور یہیں سے محمّد نے بہار کے سرحدی اضلاع پر حملے شروع کیے ؎

واضح رہے کہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں بہار کے پال خاندان کی حکومت میں زوال آگیا تھا اور چھوٹے چھوٹے رئیس اپنے علاقے کے آزاد راجا بن بیٹھے تھے۔ ان سے الگ الگ لڑکر انھیں زیر کرنا کچھ مشکل نہ تھا اور بظاہر یہی سبب ہُوا کہ محمّد بن بختیار خلجی نے اپنی ذاتی کوششوں سے قلعۂ بہار اور منیر تسخیر کر لیے۔ یہ غالباً سنہ ۵۹۸-۹۹ھ (م سنہ ۱۲۰۰ءلہ) کے واقعات ہیں۔ مگر بنگال کی فتح بہار سے بھی زیادہ آسان اور حیرت انگیز ہوئی۔ اس مُلک پر سین خاندان کا برہمن راجا لکشمن (جسے مسلمان مورخ رائے لکھمنیہ لکھتے ہیں) حکومت کرتا تھا۔ راج دھانی موجودہ کلکتہ سے کوئی ساٹھ میل شمال کی جانب نودیا میں تھی۔ محمّد بن بختیار دو ڈھائی سو سوار لے کر بنگالہ میں اور پھر دو منزلہ سہ منزلہ کوچ کرتا ہُوا یکایک شہر نودیا میں پہنچ گیا۔ اس کی مختصر جمعیت بھی پیچھے رہ گئی تھی۔ صرف اٹھارہ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے بازار سے گزر کر بالا حصار یا اندرونی قلعے میں داخل ہو گئے۔ اہلِ بازار انھیں گھوڑوں کے سوداگر سمجھتے رہے۔ خلجیوں نے قلعے کے پھاٹک میں گھستے ہی دربانوں کو تہِ تیغ کیا اور

لہ اوکسفورڈ ہسٹری وغیرہ انگریزی تاریخوں میں بہار و بنگال کی یہ فتوحات سنہ ۱۱۹۹ء میں بتائی گئی ہیں ؎

دروازہ اندر سے بند کر کے راجا کے محل کی طرف جھپٹے ۔ اس ناگہانی چھاپے سے سارے محل میں شور مچ گیا ۔ راجا رسوئی میں بیٹھا تھا کہ "ترکوں" کے اندر گھس آنے کی خبر سُن کر حواس جاتے رہے ۔ جوتی چھوڑ کر ننگے پاؤں چور دروازے سے بھاگا اور بالا حصار پر محمّد کا قبضہ ہو گیا ۔ سلہ دو تین دن میں مسلمانوں کے باقی سوار آ گئے ۔ اور بہت جلد ایک نئی فوج مرتّب کر لی گئی ۔ راجا نے بھاگ کر موجودہ ڈھاکہ کے قریب بکرم پور میں پناہ لی اور مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی ۔ محمّد بن بختیار نے اپنا دارالحکومت لکھنوتی (یا گور) کو قرار دیا جس کے ضلع مالدا میں اب صرف کھنڈر رہ گئے ہیں ؁

یہ بلند ہمّت فاتح اتنا وسیع مُلک لے کر بھی سیر نہ ہُوا، اور یہ سُن کر کہ بنگال سے تبّت قریب اور ترکستان سے جا ملا ہے، محمّد نے اسے فتح کرنے کا قصد کیا اور غالباً موجودہ دارجلنگ سے آگے تک پہنچ گیا تھا لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور نیم وحشی قبائل کی لڑائیوں نے فوج کو بد دل کر دیا ۔ معلوم ہُوا کہ یہ مہم جلد اور آسانی سے طے نہیں ہو سکتی ۔ محمد بن بختیار واپس چلا تو سرحدِ بنگال کی ندی کا پُل مقامی باشندوں نے توڑ دیا تھا اور اُن پر چھاپے مارتے اور سامانِ رسد نہ پہنچنے دیتے تھے ۔ ناچار دریا میں گھوڑے ڈال دیے ۔ پار اُترنے کی کوشش

سلہ ایک خلجی سردار جو اس حملے میں خود شریک تھا، مولّفِ طبقاتِ ناصری کی سیاحتِ بنگال کے وقت اس سے ملا اور یہ واقعہ تفصیل سے سُناتا تھا ؁

میں بہت سے سپاہی ڈوب گئے۔ محمد بن بختیار اپنی حدود میں پہنچا تو چوتھائی فوج بھی نہیں بچی اور وہ خود ایسا علیل ہو گیا تھا کہ لکھنوتی نہ پہنچ سکا بلکہ دیوکوٹ میں وفات پائی (سنہ ۶۰۲ھ م سنہ ۱۲۰۶ء)۔ ایک سردار علی بن مردان خلجی پر شبہ تھا، کہ اس نے بیماری میں محمد بن بختیار کو ہلاک کر دیا ہے مگر وہ دہلی گیا اور وہاں اپنی صفائی پیش کی۔ پھر سلطان قطب الدین ایبک سے ولایت بنگال کی سند لے کر لکھنوتی آیا۔ قطب الدین کے انتقال پر اسی علی نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا تھا اور گو سلطان شمس الدین کے عہد میں یہ صوبہ بہار سے الگ کر کے پھر سلطنتِ دہلی کے زیرِ نگیں کر لیا گیا۔ تاہم بنگال اور مشرقی پاکستان کا پہلا مسلمان بادشاہ یہی علی بن مردان خلجی مانا جائے گا۔

سلطان قطب الدین ایبک

"ملوکِ معزیہ" میں سب سے زیادہ اقبال مند سلطان معزالدین کا ایک بدصورت غلام قطب الدین نکلا جسے چھنگلیا ٹوٹ جانے کی وجہ سے "ایبک شل" یعنی خستہ انگشت کہتے تھے۔ یہ ہنسی کا عُرف ایسا مشہور ہُوا کہ پھر اُس کا جزوِ اوّل نام کا جُز بن گیا، حال آں کہ "ایبک" کے معنی محض "انگشت" ہوتے ہیں۔ ایک عجیب اتّفاق یہ ہے کہ "ہندُستان" کا یہ پہلا فرماں روا بھی سندھ کے فاتح محمد ابن قاسم کی طرح عراق کا پرداختہ تھا۔ یعنی بچپن میں قاضی فخرالدین (ابنِ عبدالعزیز) کُوفی کے ہاتھ بکا۔ انھوں نے بچّوں کی طرح پالا اور تعلیم و تربیت کی۔ قاضی موصوف کے

انتقال کے بعد جوانی میں وہ ایک سوداگر کی معرفت سلطان معزالدّین غوری کی سرکار میں پہنچا اور اپنی خدمات و صفات سے سرداری کے درجے تک ترقّی کی ۔ خوارزم کی لڑائی میں سامانِ رسد فراہم کرنا ، اُس کے فرائض میں داخل تھا ۔ ایک مرتبہ شاہِ خوارزم کے لشکر نے اُس کی جمعیت کو گھیر لیا اور قطب الدّین کو پکڑ کر لوہے کے پنجرے میں قید کیا ۔ جب مُعِز الدّین نے حریف کو شکست دی تو وہ اونٹ بھی ہاتھ آیا جس پر قطب الدّین کا پنجرہ لدا تھا ۔ بادشاہ نے اُسے قید سے چُھڑایا اور طوقِ آہنی کی بہ جائے موتیوں کے ہار گلے میں پہنائے ۔

ترائن کی دُوسری لڑائی کے بعد ستلج پار کا علاقہ قطب الدّین کی تحویل میں دیا گیا اور اُسی نے میرٹھ فتح کیا پھر دہلی کے باج گزار راجا کی سرکشی کی سزا میں اُس کی ریاست ضبط کر لی سنہ ۸۹-۵۸۸ھ (م سنہ ۱۱۹۳ء) میں یہ قلعہ جو ابھی تک رائے پتھورا کے نام سے منسوب ہے مُسخّر ہُوا ۔ قطب الدّین نے اسی کو اپنا صدر مقام بنا کر مسجدِ قوّت الاسلام اور قطب مینار کی بِنا ڈالی ۔ یہ دُنیا کے مشہور ترین آثارِ قدیمہ میں شامل اور بانی کی بلند خیالی کی یادگار ہیں ۔ دُوسری چوہان ریاست جو پرتھی راج کے مرنے سے مسلمانوں کی باج گزار بنی ، اجمیر تھی ۔ وہاں کا راجا مسلمانوں کا وفادار رہا لیکن ہم سایہ ریاستوں نے اُسے بار بار ستایا اور قطب الدّین کو دو تین دفعہ اُسے بچانے کے لیے اجمیر جانا پڑا ۔ آخر جنگ جو راج پوتوں پر قابو رکھنے کے لیے اُس مرکزی مقام کا الحاق کرنا

ضروری معلوم ہُوا اور سنہ ۵۹۱ھ میں یہاں مسلمانوں کی مستقل چھاؤنی بنا دی گئی ۔ مسجد قوت الاسلام کی طرح یہاں بھی نئی عمارات کے سلسلے میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی ، جسے "اڑھائی دن کا جھونپڑا" کہتے اور یہ روایتی تاویل سُناتے ہیں کہ یہ عمارت ڈھائی دن میں تیار ہوگئی تھی ۔ حال آں کہ سنگِ سماق پر نفیس نقش و نگار تراشنے ہی میں کئی برس لگے ہوں گے [1] اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ان دونوں قطبی مسجدوں کی توسیع و تزئین سلطان شمس الدین کے عہد میں تکمیل کو پہنچی ہے۔

اجمیر پر قبضے کے بعد انہلواڑہ (کاٹھیاواڑ) کی طاقت ور حکومت سے جنگ چھڑنا لازمی بات تھی ۔ گزشتہ اوراق میں سلطان مُعِز الدین کا اس ریاست پر سندھ کی طرف سے فوج کشی کرنا اور واپس جانا ، ہم پڑھ چکے ہیں اسلامی تاریخوں میں یہ ریاست نہروالہ کے نام سے مذکور ہے ۔ اور اپنی داخلی قوت کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ راج پوتانہ و گجرات کے دُوسرے راجاؤں کو بھی مسلمانوں کے خلاف متحد کرنے میں پیش پیش رہتی تھی ۔ پہلی لڑائی میں جو نہروالہ کے قریب واقع ہوئی ، راجا کو نمایاں کام یابی ہوئی ۔ قطب الدین گھوڑے سے زخم کھا کر گرا تو اس کی فوج کو شکست کھا کر اجمیر ہٹنا پڑا تھا لیکن دُوسری مرتبہ کوہ آبو کے

---

[1] مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ ، جیمس فرگسن نے لکھا ہے کہ ان مسجدوں کی تزئین کے لیے جیسی نفیس و نازک کندہ کاری کی گئی ہے ، اس کی اتنے وسیع پیمانے پر کہیں مثال نہیں ملتی (" اسلامی فنِ تعمیر ہندُستان میں " صفحہ ۱۹۸)

دامن میں فتح نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ کئی ہزار ہندی سپاہی مارے گئے۔ راجا نے بھاگ کر جان بچائی۔ انہل واڑہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا (سنہ ۵۹۳ھ م سنہ ۱۱۹۷ء) گجرات کا جزیرہ نما ابھی تک ان کی عمل داری میں نہیں آسکا۔ تاہم شمال مغربی راج پوتانہ کی قوت ٹوٹ گئی۔ مسلمانوں کو اس خطرناک حریف سے وہ اندیشہ نہ رہا جیسا انہل واڑہ کی تسخیر سے پہلے لاحق رہتا تھا۔

دوآب گنگ وجمن کے جدید انتظامات جماتے وقت بندھیل کھنڈ کے چندیلوں کو قابو میں لانا ضروری ہوا۔ ان کی مرکزی ریاست (مہوبہ) کو پرتھی راج نے درہم برہم کر دیا تھا لیکن کالنجر کا مضبوط قلعہ سرکشوں کی پشت پناہی کو موجود تھا۔ قطب الدین نے سنہ ۵۹۹ھ میں اسے تسخیر کیا۔ اور یہاں مسلمان فوج کا ایک دستہ متعین کر دیا۔ اس طرح دوآب کے نئے صوبوں کی حفاظت اور آیندہ مالوہ پر پیش قدمی کا راستہ صاف ہوگیا۔

ان کامیابیوں کے باوجود جن کے اسلامی دنیا میں چرچے ہونے لگے تھے، قطب الدین ایبک ابھی تک اپنے آقا کا "غلام" تھا ہرچند سلطان معز الدین نے اسے "پسرخواندہ" بنایا اور یوں بھی اپنے غلاموں کو اولاد کی مثل عزیز رکھتا تھا۔ بہ ایں ہمہ "ہندستان" کے پہلے مسلمان بادشاہ کو غلامی سے باضابطہ آزادی اس وقت ملی، جب معز الدین کے شرعی وارث اور غور کے

فرماں روا (سلطان محمود ابن غیاث الدّین) نے اسے "چتر و امارتِ بادشاہی، خطاب سلطانی و خطِ آزادی" عنایت کیا اور اور مِلک قطب الدّین کی بجائے وہ "سلطان قطب الدّین" کے لقب سے لاہور میں تخت نشین ہُوا۔ یہ بھی اُس کی ذاتی قابلیت اور ساتھ والوں سے حُسنِ سلوک کا ثبوت ہے کہ اس جدید و جلیل القدر منصب کو اختیار کرنے پر لکھنوتی سے نہر والہ تک کوئی مخالف آواز بلند نہیں ہوئی۔ اور پنجاب و سرحد کو بھی وہ جب تک زندہ رہا اپنے خطرناک حریف تاج الدّین یلدُز سے بچانے میں کام یاب رہا۔

انھی پاکستانی صوبوں کی حفاظت کے لیے قطب الدّین کو آخر زمانے میں دہلی سے زیادہ لاہور میں قیام کرنا پڑتا تھا یہیں وہ چوگان کھیلتے ہیں گھوڑے سمیت گرا اور اسی صدمے سے وفات پائی (سنہ ۶۰۷ھ/م سنہ ۱۲۱۰ء) بازار انارکلی میں اس کا مقبرہ، اگرچہ جہل و ناقدری کی بدولت گلی کوچوں میں محجوب و مقیّد سا معلوم ہوتا ہے مگر غنیمت ہے کہ محفوظ رہا۔ اسی طرح گو اس کی کشور کشائی اور بادشاہی میں اوّلیت کے فخر کو لوگ بھول گئے لیکن اس کی سخاوت صدیوں تک ضرب المثل رہی اور وفات کے چار سو برس بعد کا مورّخ فرشتہ گواہی دیتا ہے کہ آج تک کسی کی داد و دہش کی انتہائی تعریف کرنی ہو تو اہلِ ہندستان اسے "قطب الدین کل" یعنی "اپنے زمانے کا قطب الدّین" کہتے ہیں۔ [1]

---

[1] فرشتہ، ص۶۳

اُسی عہد کے مشہور فاضل بہاءالدین کی یہ رباعی اکثر تاریخوں میں دُہرائی گئی ہے کہ ؎

ای بخشش لک تو در جہاں آوردہ
کاں را کفِ توکار بہ جاں آوردہ
از رشکِ کفِ تو خوں گرفتہ دلِ کاں
وز لعل بہانہ درمیاں آوردہ

فتوحاتِ بھارت کا جائزہ

شمالی بھارت کی جن فتوحات کا ذِکر پچھلے اوراق میں ہماری نظر سے گزرا، وہ دنیا کی سیاسی اور جنگی تاریخ کا بہت اہم واقعہ ہیں۔ بھٹنڈہ سے لکھنوتی کم وبیش ایک ہزار میل کے فاصلے پر تھی۔ اس علاقے کا عرض جسے معزالدین یا اس کے سرداروں نے فتح کیا چار سو میل سے کم نہ ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ بارہ تیرہ سال کے اندر مسلمان حملہ آوروں کا تخمیناً چار لاکھ مربع میل رقبے پر قبضہ ہوگیا جس میں دُنیا کے نہایت سرسبز و زرخیز خطے شامل تھے کوئی تحریری ماخذ ایسا نہیں کہ ہم ان ملکوں کی آبادی کا ٹھیک اندازہ کرسکیں لیکن جہاں کی ریاستوں میں کئی لاکھ سپاہی موجود ہوں وہاں کی آبادی ضرور کئی کروڑ ہوگی۔ اس کے مقابلے میں حملہ آور مسلمانوں کی کُل تعداد قطب الدین کے زمانے تک دو تین لاکھ سے زیادہ نہ تھی ؎

فتح کی وجہ بیان کرنے میں اکثر تاریخ لکھنے والے

متفق ہیں کہ جفاکشی اور دلاوری میں مسلمان فوقیت رکھتے تھے اور ان کا فوجی نظم ہندو حریفوں سے کہیں بہتر تھا۔ ان کے غلبہ پانے کی ایک اور وجہ ان کے مذہبی جوش اور ملی جذبات کو قرار دے سکتے ہیں۔ اِدھر اہلِ بھارت میں عوام کا حکومت سے رابطہ نہ تھا۔ ذات بندی نے قومی وحدت کا خاتمہ کر دیا تھا اور سیاسی انتشار کا یہ حال تھا کہ کرنل ٹاڈ کے بہ قول صرف دہلی آگرہ میرٹھ کے علاقے میں چھوٹی بڑی ایک سو اٹھارہ ریاستیں تھیں جہاں کے راجا موروثی اور قریب قریب خودمختار تھے۔ [1] پرتھی راج یا جو چند جیسے کسی بڑے راجا کی بھی سیادت کے معنی یہ ہوتے تھے کہ جنگ کے وقت ان برائے نام باج گزاروں سے فوجی امداد یا تیر تہوار کے موقع پر نذرانہ مل جائے ورنہ اپنے اپنے علاقوں میں وہ آزاد اور ہم سایوں کے ساتھ اکثر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ایسی خانہ جنگی میں ظاہر ہے کہ رعایا آرام اطمینان سے زندگی نہیں بسر کر سکتی اور ایک عام بد امنی پھیل جاتی ہے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ زیرِ نظر عہد میں اسی بد نظمی کی وجہ سے شمالی بھارت میں رہزنی بہت سے گروہوں کا پیشہ بن گئی تھی اور اسی نے تجارت بلکہ سفر و سیاحت کو بھی اتنا مخدوش بنا دیا تھا کہ بھارت کے اندرونی علاقوں میں آمد و رفت میل جول مبادلۂ خیالات کے ذرائع قریب قریب مسدود ہو گئے تھے۔

---

[1] اینلز .... ج ۲ صٹ

مسلمانوں کے نظامِ حکومت پر ہم آیندہ اوراق میں تبصرہ کریں گے۔ مگر یہاں یہ بات جتانے کے لائق ہے کہ ان کا بھارت میں آنا اور ان مُلکوں پر مستقل قبضہ جمانا عام باشندوں کے حق میں تائید غیبی سے کم نہ تھا۔ انھیں آئے دن کی خانہ جنگیوں سے بڑی حد تک نجات ملی اور سارے مُلک میں کسی یکساں انتظام قائم کرنے کا امکان پیدا ہُوا۔ راجا ہرش کے سیکڑوں برس بعد قطب الدین ایبک ہی ایسا اقبال مند بادشاہ بھارت والوں کو نظر آیا جس کا تمام شمالی بھارت کو " ایک چھتر کے نیچے " لانے کی آرزو کرنا بجا تھا۔ دوسرے جب ہم سوچیں کہ ملوکِ غزنی کی انھی فتوحات نے مسلمانوں کو ممالکِ بھارت میں بسایا اور دینِ اسلام کے عقائد و شعائر کو یہاں کی بُت پرست اقوام میں پھیلنے کی راہ نکالی، تو ماننا پڑے گا کہ قطب الدین کی لاہور میں تخت نشینی نہ صرف بھارت بلکہ ملّتِ اسلامی کی تاریخ میں ایک نئے اور انقلابی دور کا آغاز تھی۔

سلطان شمس الدین التمش

سلطان قطب الدین کے ناگہانی انتقال پر لاہور کے فوجی سرداروں نے اس کے (لے پالک[1]) بیٹے آرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ مصلحت یہ ہوگی کہ پنجاب کو غزنی اور سندھ کے

---

[1] معتبر تاریخوں میں قطب الدین کی صرف تین بیٹیوں کا ذکر آتا ہے۔ ان میں سے پہلی اور اس کے مرنے کے بعد دوسری والیٔ سندھ سے بیاہی گئی تھی۔ راورٹی کی تحقیق یہ ہے کہ آرام شاہ قطب الدین کا متبنّیٰ بیٹا تھا۔ (دیکھو اس کا ترجمہ طبقاتِ ناصری ص ۵۲۹)

دعوے داروں سے بچایا جائے۔ لیکن بھارت خاص کے صوبہ داروں نے یہ انتخاب قبول نہیں کیا۔ علی مردان خلجی بنگالہ میں خودمختار ہو بیٹھا۔ امرائے دہلی کو بھارت کے مقبوضات بچانے کے لیے یہیں کے کسی تجربہ کار و موزوں سردار کی تلاش ہوئی اور سپہ سالار علی اسمٰعیل کی تحریک سے انھوں نے شمس الدّین اِلتُتمش (یا اِل تمش) کا انتخاب کیا جو سلطان قطب الدّین کا داماد[1] اور اُن دنوں بداؤں کا صوبہ دار تھا۔

یہ نام ور بادشاہ جس نے بھارت کے اتنے بڑے رقبے پر حکومت کی کہ راجا اشوک کے سوا شاید اور کسی کو پہلے نصیب نہ ہوئی ہوگی، ایک ترک امیرزادہ تھا مگر حضرت یوسفؑ کی طرح سوتیلے بھائیوں نے اسے بچپن میں کسی سوداگر کے ہاتھ بیچ دیا اور بخارا کے ایک قاضی نے خرید کر اس کی پرورش کی جوان ہُوا تو قطب الدّین کے پاس لایا گیا اور وہ اس کے حُسنِ صورت اور فراست سے اتنا خوش ہُوا کہ مُنہ مانگی قیمت دے کر خرید لیا۔ پھر بہ تدریج ترقّی دی اور اقطاع بداوں کا حاکم بنایا جو اُن دنوں بہت باوقعت صوبہ تھا۔

شمس الدّین کے بادشاہ منتخب ہونے کی آرام شاہ اور اس کے ساتھیوں نے مخالفت کی۔ لاہور سے دہلی پر فوج بھی

---

[1] ممکن ہو یہ رشتہ پہلے سے طے ہو چکا ہو۔ لیکن 'طبقات ناصری' کے بیان سے مترشح ہوتا ہو کہ شادی کی رسم شمس الدّین کی تاج پوشی کے بعد دہلی میں ادا ہوئی۔ (صلکلا)

لے کر آئے مگر آرام شاہ ایک معرکے میں مارا گیا[1] بھارت کے صوبہ داروں ، سرداروں نے شمس الدین کے آگے گردن جھکا دی ۔ بنگالہ کے سرکش خلجیوں کو زیر کرنے کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت تھی لیکن ادھر توجہ کرنے سے پہلے سلطان کو قدیم اور قریب تر حریفوں سے سابقہ پڑا ۔ سلطان قطب الدین ایبک نے پنجاب کو تدبیر و شمشیر کے زور سے قبضے میں رکھا تھا ورنہ حق یہ ہے کہ اُن دنوں غزنی کا اِس پر حق فائق تھا اور شمس الدین کو ابتدا میں مصلحت یہی نظر آئی کہ تاج الدین یلدز سے دب کر صلح کر لے ۔ رسمِ قدیم کے مطابق تاج دار غزنی کی طرف سے بھارت کی بادشاہی کا خلعت شمس الدین کو دہلی بھیجا گیا اور وہ شکر گزاری میں پنجاب سے سردست دست بردار ہو گیا ۔ لیکن چند سال میں جب دہلی میں اس کا اقتدار جم گیا اور اُدھر یلدز خوارزمی لشکر کے مقابلے میں شکست کھا کر غزنی سے پنجاب آیا اور تختِ بھارت کی ہوس میں ستلج سے پار اُترا تو شمس الدین نے آگے بڑھ کر ترائن کے قریب اسے شکست دی اور گرفتار کر کے بداؤں بھیج دیا ۔ (سنہ ۶۱۲ھ/م سنہ ۱۲۱۵ء) غزنی کا یہ آخری بادشاہ وہیں پیوندِ خاک ہوا ۔ اب سلطان شمس الدین نے لاہور پر پیش قدمی کی ، اور

---

[1] فتوح السلاطین کی روایت ہے کہ وہ پہلے ہی بہ قضائے الٰہی فوت ہو گیا صفحہ ۱۰۶ ، بعض تاریخوں میں شکست کھا کے فرار ہونا لکھا ہے اور اس کے بعد کہیں ذکر نہیں آتا کہ کہاں چلا گیا ۔

پنجاب کے دوسرے مدّعی، قباچہ کو بیاس کے کنارے شکست دی۔ یہ صوبہ دوبارہ قبضے میں آ گیا لیکن جہلم کے پار سلطان کا حکم نہ چلتا تھا اور جنوب مشرقی حدود موجودہ ضلع منٹگمری سے آگے نہ جاتی تھیں۔ ممالکِ بھارت کے دوسرے سرے یعنی بنگال میں بھی سلطان کی حکمتِ عملی کامیاب رہی۔ یہاں سلطان قطب الدّین کے انتقال کی خبر سُنتے ہی علی مردان خلجی نے اپنی آزاد بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا (سنہ ۶۰۷ھ) لیکن بادشاہ ہو کر خود پسندی اور جبر و تعدّی کی وہ حرکتیں کیں کہ خلجی امرا عاجز آ گئے۔ انھوں نے ایکا کر کے علی مردان کو قتل کر دیا اور حسام الدّین خلجی کا انتخاب کیا جو سلطان غیاث الدّین کے لقب سے مشہور ہے۔ (سنہ ۶۱۱ھ) اس کے زمانے میں بنگال نے بڑی رونق پائی۔ اور لکھنوتی اہلِ علم و فن کا مرجع بن گیا۔ اس کی وفات کے پندرہ سولہ برس بعد صاحبِ طبقاتِ ناصری، ان علاقوں میں آیا تو غیاث الدّین کے انتظام اور رفاہِ عام کے بہت سے آثار دیکھے۔ اور اس کی سخاوت و رعایا پروری کے قصّے سُنے۔ وہ بنگال میں سلطان شمس الدّین اِل تمش کا خطبہ اور سکّہ جاری کرنے اور غالباً بہار کو بھی چھوڑ دینے پر آمادہ تھا لیکن بعد میں اسی صوبے کے لیے سلطانی صوبہ داروں سے جھگڑا ہو گیا۔ اِل تمش کا بیٹا ناصر الدّین ملکِ اودھ کا والی تھا۔ وہ باپ کی اجازت سے بنگال پر فوج لے گیا اور غیاث الدّین کو کئی امیروں سمیت گرفتار کر لیا۔ اسی کے ساتھ

بنگال کی پہلی آزاد بادشاہی کا صرف چند سال میں خاتمہ ہوگیا -

(سنہ ۶۲۴ ھ ' م ۱۲۲۷ء)

بنگالہ بہت وسیع ، آباد و زرخیز ملک تھا - یہاں کے صوبہ دار کو لازمی طور پر تمام اندرونی اختیارات حاصل ہوتے تھے - پھر بھی کبھی مرکزی عمّال کے تنگ کرنے سے اور کبھی بادشاہی کے شوق میں یہ صوبہ دار کامل آزادی کا دم بھرنے لگتے تھے اور پائےتخت سے ان کا فاصلہ ہی مدافعت کا کچھ کم مستحکم مورچہ نہ تھا - لیکن سلاطینِ دہلی کی جرأت و مستعدی پر آفریں ہو کہ پہلے محمد تغلق کے زمانے تک اور پھر مُغل بادشاہوں کے دور میں اِس ملک پر سیکڑوں سال ان کا تسلط قائم رہا ؛

فتوحاتِ راج پوتانہ (الحاقِ سندھ)

اِس اثنا میں سلطان اِل تمش نے راج پوتانہ کے دو بڑے قلعے فتح کیے - دوآب و دہلی کے بہت سے غیرت مند راج پوت ، مسلمانوں کی محکومی سے بچ کر ان ریگستانی انقطاع میں آبسے تھے اور یہ پورا ملک بہترین بھارتی سپاہیوں کا مسکن و مامن بن گیا تھا - گرمی کی شدت اور زمین کے دُشوار گزار و کم حاصل ہونے کی وجہ سے بھی مسلمان حملہ آوروں کو یہاں کے صحرا و کوہستان فتح کرنے کی ترغیب نہ ہوسکتی تھی لیکن انھی ریت کے ٹیلوں اور کوہ ارولی کی چوٹیوں کے پار گجرات و مالوہ کے سرسبز میدان تھے اور آن تک پہنچنے میں راج پوتانہ سے گزرنا پڑتا تھا - پس ان علاقوں کو قابو میں لانا ضروری ہُوا اور اسی ضمنی ضرورت سے

یہاں کے قلعوں کے لیے بار بار خون بہانے کی نوبت آئی ۔ زیرِ نظر زمانے میں رن تھنبور کا قلعہ مضبوطی میں ضرب المثل تھا۔[1] آج بھی اس کے آثار دیکھ کر تسخیر کی دشواریوں کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ یہ ارولی پربت کی ایک شاخ پر واقع ہے جس کے نیچے کے میدان سے غنیم کا چڑھنا اور عقب میں پہاڑیوں سے قلعے والوں کی آمد و رفت روکنا بہت مشکل تھا۔ لیکن سخت کوش ترکوں نے چند ہی ماہ میں محصوروں کو مایوس کر دیا اور یہ مستحکم قلعہ مسخر ہو گیا[2] (سنہ ۶۲۳ھ م سنہ ۱۲۲۶ء)

راج پوتانہ کے مغربی جانب مارواڑ کا صدر مقام اور پری ہار قوم کے دھون، راج پوتوں کا مرکز منڈور کئی قلعوں کا مجموعہ تھا ۔ موجودہ جودھ پور کے قریب اس کے کھنڈر سابقہ وسعت و سنگینی کی گواہی دیتے ہیں ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہاں اتنی مزاحمت بھی نہ ہوئی جتنی رن تھنبور میں ہوئی تھی اور سلطانی افواج نے اسے چند ہی حملوں میں چھین لیا ۔ (سنہ ۶۲۴ھ)

راج پوتانہ کی ان کامیابیوں نے سلطنتِ دہلی کو محفوظ و مضبوط

---

[1] «طبقاتِ ناصری» میں یہ ہندی روایت نقل کی ہے کہ رن تھنبور پر گزشتہ زمانوں میں ستر سے زیادہ حملے ہوئے مگر کوئی حملہ آور اسے فتح نہ کر سکا تھا ۔

[2] اسی موقع پر امیر روحانی نے وہ مشہور قصیدۂ تہنیت گزرانا جس کا مطلع ہے:۔

خبر بہ اہلِ سما مجد جبرئیلِ امیں — ز فتح نامۂ سلطان عہد شمس الدین

کر لیا تو سلطان شمس الدّین کو اپنے ہم زلف کا سر نیچا کرنے کی فرصت مل گئی۔ سندھ پر ان دنوں پہلے جلال الدّین خوارزمی نے حملے کیے اور پھر چنگیزی طوفان کی موجوں نے تلاطم ڈال دیا تھا۔ اس فتنۂ مغول کا حال آیندہ اوراق میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ یہاں یہ لکھنا کافی ہے کہ خوارزم شاہ خود سندھ سے ایران واپس گیا تو قباچہ نے اس کے سرداروں کو مکران، بلوچستان کے اضلاع میں دھکیل دیا اور وہ وہاں سے دھکے دے دے کر نکالے گئے تو سلطان دہلی سے فریاد کی اور التمش کو سندھ پر حملہ کرنے کی ایک اور تحریک پیدا ہوگئی۔

سنہ ۶۲۵ھ کے آغاز میں افواج دہلی نے حرکت کی اور بھٹنڈہ پہنچ کر مغرب کی طرف مُڑ گئیں۔ یہاں سے اُچھ کوئی دو سو میل دُور دریائے ستلج پر واقع تھا اور شہر کے باہر اسی دریا کے کنارے ناصر الدّین قباچہ نے حملہ آوروں کو روکنے کی تیاریاں کی تھیں۔ لیکن جب لاہور کے شمسی صوبہ دار نے شمال سے ملتان پر فوج کشی کی اور مدافعت کا یہ منصوبہ درہم برہم ہوگیا تو قباچہ کو دو طرفہ زد سے بچ کر بھکّر میں ہٹنا پڑا۔ اچھ کی فوج نے ہتیار ڈال دیے۔ قباچہ نے بیٹے کو سلطان شمس الدّین کی خدمت میں بھیج کر صلح کی درخواست کی۔ اس نے شرط لگائی کہ وہ خود حاضر ہو۔ بہادر قباچہ کو یہ عار گوارا نہ ہوا اور بھکّر کی فصیل سے دریا میں کود کر جان دے دی۔[1] پورے مُلکِ سندھ کا

[1] یہ 'طبقاتِ ناصری' کی روایت ہے جس کا مؤلف اُن دنوں (باقی بر صفحۂ آیندہ)

سیوستان و مکران تک دولتِ شمسی کے ساتھ الحاق کر لیا گیا۔ (سنہ ۶۲۵ھ م سنہ ۱۲۲۷ء) ؎

سندِ دربارِ خلافت اور فتح مالوہ

اہلِ دہلی نے سندھی فتوحات کی بڑی خوشی منائی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان اور شمالی بھارت میں صرف ناصرالدین قباچہ کو سلطانِ دہلی کی ہمسری کا دعوا رہ گیا تھا اور پنجاب کے شمسی عمال ہمیشہ اس مغربی رقیب کی طرف سے اندیشہ مند رہتے تھے۔ قباچہ کی موت اور سندھ کی خودمختاری ختم ہونے سے یہ خلش مٹ گئی دوسرے اسی زمانے میں خلیفۂ بغداد کے سفیر کشورِ ہند کی بادشاہی کی سند اور خلعت لے کر دہلی آئے جس نے جشنِ فتح کی دھوم دھام کو دوبالا کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دربارِ خلافت نے ممالکِ ہند کی جداگانہ بادشاہی تسلیم کی ورنہ پہلے وہ سلطنت غزنی کی تابع سمجھی جاتی تھی۔ خلیفۂ بغداد کا سیاسی اقتدار اسلامی ممالک سے زائل ہو چکا تھا لیکن رسمی احترام باقی تھا۔ اور ہر جگہ خطبوں میں اوّل خلیفۂ بغداد اور پھر مقامی فرماں روا کا نام لے کر دعا کی جاتی تھی۔ جو نیا ملک مسلمان فتح کرتے یا کوئی بادشاہ کہیں تخت نشین ہوتا اور خلافتِ بغداد کی جانب سے اسے سندِ بادشاہی مل جاتی تو وہ اسے اپنی عزّت اور تقویت کا باعث سمجھتا تھا۔ یہی رسم تھی جو سنہ ۶۲۶ھ

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) سندھ میں موجود تھا۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ قباچہ کشتی میں بیٹھ کر نکل جانا چاہتا تھا کہ کشتی دریائے سندھ میں ڈوب گئی ؎

میں بغداد کے سفیروں نے پایۂ تخت دہلی میں ادا کی ۔ سارے شہر کی بڑے تکلف سے آئینہ بندی ہوئی ۔ کمال تجمل و احتشام سے عام دربار سجایا گیا جس میں خلیفۃ المسلمین کی سند پڑھ کر سنائی اور سلطان کو عبائے شاہی پہنائی گئی ۔ بادشاہ کی طرف سے حضرت خلیفہ کے لیے گراں بہا تحائف نذر کیے گئے ۔ امرائے دولت کو خلعت اور عمّال کو انعام اکرام سے نوازا گیا ۔ اِن رسمی تکلفات اور ہنگامی خوش وقتیوں سے قطع نظر، کچھ شک نہیں کہ اِس بغدادی سفارت نے بھارت کا اسلامی، عربی مُلکوں سے ارتباط قوی کیا ۔ عراق و شام کے اہلِ علم اور تاجر زیادہ تعداد میں بھارت آنے جانے لگے ۔ تیس برس بعد جب چنگیز خاں کے پوتے ہُلاگو نے دارالخلافت کو تاراج و خراب کیا تو دہلی بھی بغداد کے خاص ماتم گساروں میں تھی ؛

اسی زمانے میں جب کہ قصرِ شاہی مسرّت اور تہنیت کے نغموں سے گونج رہا تھا، شہزادہ ناصرالدّین کے انتقال کی خبر آئی ۔ سلطان کا یہ لائق بیٹا بنگالہ کی خودمختاری کا خاتمہ کرنے کے بعد وہاں کا امیر و والی بنایا گیا تھا ۔ اس کی وفات سے بادشاہ کو دِلی صدمہ اور مشرقی اقطاع میں پھر شورش کے آثار پیدا ہوئے ۔ سلطان شمس الدّین کو خود وہاں جانا اور ازسرِ نو انتظام جمانا پڑا ۔ (سنہ ۶۲۸ ھ) واپس آنے کے بعد فتح مالوہ کے منصوبے کو عمل میں لانے کا موقع مِلا ۔ سنہ ۶۲۹ ھ (سنہ ۱۲۳۱ ء) میں افواجِ شاہی نے دہلی سے کوچ کیا اور سب سے پہلے گوالیار کو، جہاں کے راجا کی غداری

مشکوک تھی، طویل محاصرے کے بعد خالی کرا لیا۔ اِس سنگین و عظیم قلعے کی تسخیر کی تاریخ میں تاج الدّین دبیر کی یہ رباعی بہت مقبول ہوئی ؎

ہر قلعہ کہ سلطانِ سلاطیں بہ گرفت
از عَونِ خدا و نصرتِ دیں بہ گرفت
آں قلعۂ گوالیار و آں حصنِ حصیں
در ستّہ مئتہ و ثلاثیں بہ گرفت

آیندہ دو سال میں مالوہ کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ بھیلسا اور اُجین کی تسخیر سے سلطنتِ دہلی کی جنوبی حدوُد دریائے نربدا تک وسیع ہوگئیں۔ شاہانِ موریا کے بعد جن کی حدودِ سلطنت ایک حد تک ملتی ہیں، تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بھارت کے اتنے ممالک و اقطاع ایک مرکزی حکومت کے تحت میں آئے اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک ایک ہی بادشاہ کا سکّہ چلنے لگا۔ کشمیر کے ہندوٗ راجا غزنویوں کے آخر عہد ہی میں آزاد اور اپنی مسکین رعایا کے حق میں فرعونِ بے سامان بن گئے تھے۔[1] جہلم کے پار موجودہ صوبۂ سرحد میں اِن دنوں چنگیزی مغول نے ہل چل ڈال دی تھی۔ ورنہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے اکثر علاقے سلطان شمس الدّین اِل تتمش کے زیرِ نگیں تھے اور جزیرہ نمائے گجرات و دکن کو چھوڑ کر پوُرا شمالی بھارت " الکبریاءُللہ " کے شمسی علم کے زیرِ سایہ آگیا تھا۔

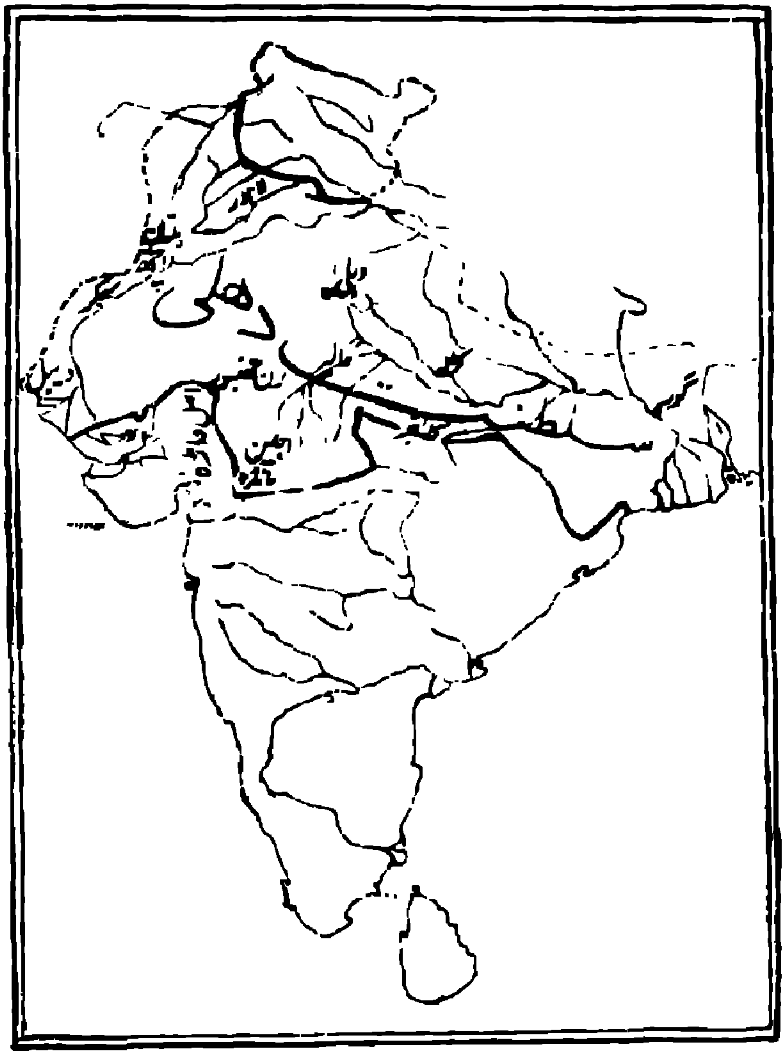
---

[1] ان کے مظالم کی نسبت دیکھو اوکس فورڈ ہسٹری صہ۱۴۲ وغیرہ۔

نقشہ سلطنت دہلی

عہد سلطان شمس الدین التمش

سنہ ۶۳۲ھ مطابق سنہ ۱۲۳۵ء



باب پنجم

سلاطینِ شمسی اور "فتنۂ مغول"

ممالکِ بھارت میں مسلمانوں کے انتظامات اور اسلامی تہذیب و تمدّن کی ترویج پر ہم اگلے باب میں بحث کریں گے۔ مناسب ہوگا کہ پہلے خاندانِ شمسیہ کی سیاسی تاریخ پر ایک نظر ڈال جائیں جس میں سلطان شمس الدّین کی اولاد کے ساتھ اس کے مملوک بلبن (اور کے قباد) کا زمانہ بھی محسوب ہوتا ہے۔ (سنہ ۶۰۷ھ تا سنہ ۶۸۸ھ، م سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۹۰ء)۔

سلطان شمس الدّین اِل تمش نے ۲۶ برس حکومت کر کے شعبان سنہ ۶۳۳ھ (م سنہ ۱۲۳۶ء) میں انتقال کیا۔ یہ ایسا دین دار و درویش دوست بادشاہ تھا کہ معتبر تذکروں نے اس کا شمار اولیاء اللہ میں کیا اور کئی کرامتیں نقل کی ہیں۔[1] محض دنیاوی اعتبار سے اُس کی یہ کامیابی ہی کچھ کم غیر معمولی نہ تھی کہ غلامی سے اتنی بڑی بادشاہی کے درجے تک پہنچا اور بہت سے

---

[1] دیکھو اخبار الاخیار، تذکرۃ الصالحین وغیرہ۔

طاقت در ہم چشموں نے اس کا انتخاب کیا اور غالباً کبھی اس انتخاب پر پشیمان نہیں ہوئے ۔ پھر وہ دُنیا سے رخصت ہُوا تو اپنے آقا سے کہیں بڑی سلطنت میراث میں اور مُلکی انتظامات سنبھالنے کے لیے ایک تربیت یافتہ جماعت مرتب کر گیا جس کے افراد "ترکانِ چہل گانی" کہلاتے ہیں ۔ مگر سلطان کی صلبی اولاد میں کوئی ایسا خلفِ رشید نہ نکلا کہ ان وسیع ممالک کی بادشاہی کے دشوار فرائض سے عہدہ برآ ہوتا ۔ بڑا اور سب سے لائق فرزند بنگالہ میں فوت ہو چکا تھا ۔ دُوسرے سات بیٹوں سے وہ اپنی بیٹی رضیہ کو قابلِ ترجیح سمجھتا تھا اور ایک دفعہ اسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا ۔ ے۱ لیکن شاید آخری بیماری میں منجھلے بیٹے رکن الدین سے رضامند ہو گیا تھا کہ امرا نے پہلے اسی کو وارثِ تاج و تخت بنایا ۔ چھ ہی مہینے میں اس نے اپنی نا اہلی ثابت کر دی ۔ امرائے دہلی نے تنگ آ کر اسے معزول اور سلطانہ رضیہ کو بادشاہ قبول کر لیا ۔ (ربیع الاوّل سنہ ۶۳۴ھ) یہ شہزادی مورِ جہاں داری سے خوب واقفیت رکھتی تھی اور اس کی شجاعت و فراست میں بھی کلام نہ تھا لیکن وہ دَور جس میں بادشاہ کی شخصیت پر تمام نظامِ حکومت کا مدار ہو، ایک عورت کی حکومت کے لیے سازگار نہ ہو سکتا تھا ۔ خصوصاً جب کہ رضیہ کے کئی جوان بھائی موجود اور مختلف اقطاع میں حکومت پر فائز تھے ۔ تُرک امیروں کی ناگواری کا ایک سبب یہ ہُوا کہ ملکہ نے یاقوت حبشی کو اصطبل کی داروغائی سے

ے۱ ۔ طبقاتِ ناصری، صفحہ ۱۸۱

امیرالامرائی کے منصب پر ترقی دی اور جب بڑے بڑے امیر اپنے صوبوں پر گئے تو یاقوت کا ستارہ ایسا چمکا کہ باقی درباری ماند پڑ گئے اوّل اوّل جن امیروں نے سرکشی کی تھی انھیں بہادر ملکہ نے تلوار سے سیدھا کیا لیکن آخر میں خود فوجِ شاہی کے ترک سردار منحرف ہو گئے۔ وہ بھٹنڈہ کے صوبہ دار التونیہ پر لشکر لے جا رہی تھی کہ راستے میں اہلِ سازش نے شب خون مار کر یاقوت کو ہلاک اور سلطانہ کو قید کر لیا۔ دہلی میں اس کے بھائی معزالدین بہرام شاہ کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔ رضیہ نے التونیہ سے شادی کر کے دوبارہ دہلی پر چڑھائی کی مگر بہت کم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا رہتک کے قریب وہ اور اس کا شوہر شکست کھا کر مارے گئے (ربیع الاوّل سنہ ۶۳۷ھ۔م سنہ ۱۲۳۹ء)

"فتنۂ مغول"

اسی بہرام شاہ کے عہدِ حکومت میں کفّار مغول نے پہلی مرتبہ دریائے سندھ کو عبور کیا اور پنجاب کو تہ و بالا کر ڈالا۔ یہ خوفناک حملہ آور قریبی سنین میں مغولستان (منگولیہ) کے پہاڑی بیابانوں سے اُٹھ کر ٹڈی دل کی طرح ایشیا کے اسلامی ملکوں پر پھیل گئے تھے اور افغانستان پر قبضہ جمانے کے بعد پاکستان و بھارت کے زرخیز علاقوں پر اُن کا دانت تھا۔ شمالی وسطِ ایشیا کے وحشی اقوام کے سیلاب تاریخ میں نئی بات نہ تھے۔ قرونِ ماضیہ میں وہ بارہا یورپ و ایشیا میں اُمنڈتے رہے۔ لیکن تفصیلِ واقعات کے اعتبار سے وہ "فتنۂ مغول" یہی ہے جس کے صحیح حالات

محفوظ رہے ؎ ۱

مغولستان کا علاقہ چین کے شمال میں بہت دُور تک پھیلا ہُوا ہے لیکن پہاڑی زمین اور سخت سردی کی وجہ سے پیداوار زیادہ نہیں ہوتی۔ انھی ویران قطعات میں صحرائی مغلوں کے قبیلے اپنے اونٹ اور گھوڑے چراتے پھرتے تھے۔ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں ان کے ایک سردار تمور چین نے رفتہ رفتہ بہت سے قبیلوں کا جتھا بنایا اور ہمسایہ مُلکوں سے لڑائی میں کامیابی پا کر "چنگیز خاں" یعنی سردار اعظم کے لقب سے مشہور ہُوا۔ اسلامی سلاطین میں اس کی پہلی ٹکر خوارزم (خیوا) کے سلطان علاء الدّین سے ہوئی۔ (سنہ ۶۱۴ ھ ۔ م سنہ ۱۲۱۷ ء) کہتے ہیں اسی بادشاہ کے اشارے سے مغلوں کے سفیر اور سوداگروں کے ایک قافلے کو کسی خوارزمی حاکم نے لوٹ کر مار ڈالا۔ صرف ایک شخص بچ کر نکل گیا تھا جس نے چنگیز خاں کو اس حادثے کی خبر پہنچائی اور وہ علاء الدّین خوارزم شاہ سے بدلہ لینے پر تُل گیا چنگیز خانی قاصد مغولستان کے ہر گوشے اور قبیلے میں دوڑ گئے اور چند ماہ کے اندر

؎ ۱ ساتویں صدی ہجری اور بعد کی کئی عربی فارسی تاریخوں میں چنگیز خانی یورش اور بلاد اسلامی کی تباہی کے واقعات نہایت صحت و صراحت سے قلم بند کیے گئے ہیں۔ ہمارے لیے ایک بہت اچھا ماخذ 'طبقاتِ ناصری' ہے جس کا مؤلف ان یورشوں کے وقت بعض لڑائیوں میں موجود تھا۔ دُوسرے معتبر ذرائع سے بھی اُس نے "فتنۂ مغول" کے حالات فراہم اور اپنی تاریخ کے آخر میں تحریر کیے ہیں۔

چھ لاکھ جنگ جُو سواروں کا لشکر جمع ہو گیا۔ [1] کوچ کے وقت دس دس سواروں کی ٹولیاں بنا دی گئیں۔ ہر ٹولی کے پاس ایک دیگچہ اور ایک مشک تھی کہ مل کر پکائیں اور پانی کے کام میں لائیں۔ گھوڑوں کے بہت سے گلّے فوج کے ساتھ تھے کہ راستے میں رسد نہ ملے تو اُن کے گوشت اور گھوڑیوں کے دودھ سے شکم پُری کی جائے۔ عام سپاہیوں کی وردی (ایک موٹے تہمد اور) چمڑے کے سینہ بند کے سوا کچھ نہ تھی اور صدہا سوار ایسے تھے کہ لگام کے سوا گھوڑے کا زین تک انھیں میسّر نہ تھا۔ البتہ ہر شخص نیزہ و شمشیر سے مسلّح اور تیروں کا کافی ذخیرہ لے کر چلا تھا۔

سنہ ۶۱۷ھ / م سنہ ۱۲۲۰ء میں یہ بے پناہ لشکر شاہ خوارزم کی فوجوں کو شکست دے کر سمرقند و بخارا کے علاقوں میں پھیل گیا۔ راستے میں جو شہر و قریہ ملا وہاں کے زن و مرد کو بے دریغ تہ تیغ کیا اور جگہ جگہ آگ لگا کر آبادی کا نام و نشان مٹا دیا۔ ان خوف ناک تاراجیوں سے نہ وہ شہر بچے جنھوں نے مغلوں کا مقابلہ کیا تھا، نہ وہ جنھوں نے رحم و کرم کی امّید پر اطاعت قبول کر لی تھی۔ شہر سمرقند کی فتح کے بعد مغلوں کا ایک لشکر شاہ خوارزم کے تعاقب میں بحرِ خزر کی طرف گیا۔ دُوسرے نے خراسان کے شاداب خطّوں کو

---

[1] تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض مشرقی تاریخیں زیادہ اور یورپی کتابیں کم تر بتاتی ہیں۔ ہم نے "طبقاتِ ناصری" کی پیروی کی ہے۔

غارت کیا۔ سنہ ۶۱۷ھ میں علاء الدّین خوارزم شاہ نے وفات پائی مگر اس کا بڑا بیٹا جلال الدّین (منک برنی) مغلوں سے بچتا ہُوا غزنی آگیا اور وہاں کے حاکم تاج الدّین یلدز کو آگے پنجاب کی طرف دھکیل دیا۔ یلدز کا لاہور آنا، سلطان شمس الدّین سے لڑائی اور شکست کا حال ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس عرصے میں خود چنگیز خاں اور خراسانی لشکر جلال الدّین کے تعاقب میں افغانستان پہنچ گیا اور خوارزمیوں کو بھی غزنی چھوڑ کر پاکستان کی پناہ ڈھونڈنی پڑی۔ (سنہ ۶۱۸ھ، م سنہ ۱۲۲۱ء)۔

سلطان جلال الدّین منک برنی [۱]

یہ ترک بادشاہ جس کی دلیری اور مصائب کے واقعات بوستانِ خیال کی داستانیں معلوم ہوتے ہیں، جاں نثاروں کی مختصر فوج کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا تھا کہ یکایک موجودہ وزیرستان کے پہاڑوں سے افواجِ مغول نے سر نکالا اور تین طرف سے سلطان کے پڑاؤ کو گھیر لیا۔ جلال الدّین اُن سے بچتا ہُوا غزنی اور غزنی سے پاکستان آیا تھا۔ اس کے رفیقوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور مقابلہ کئی لاکھ تیغ زنوں سے تھا جو اب تک کسی غنیم سے مغلوب نہ ہوئے تھے۔ لیکن دُشمن کے سامنے آجانے کے بعد اُس کی غیرت نے لڑے بغیر نکل جانا گوارا نہ کیا اور دریا کے مغربی کنارے

---

[۱] یہ ترکی عرف تاریخوں میں "منگ برنی"، "منگ برتی" اور "منگو برتی" تحریر ہے۔ پہلے لفظ کے معنی (وہ جس کی) ناک پر مہاسہ (ہو)۔

پر وہ خوں ریز لڑائی ہوئی جو شاید اقوامِ عالم میں مُحرک ہی لڑ سکتے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک سلطان کے سپاہی فوق العادت بہادری سے لڑتے اور کٹ کٹ کر گرتے رہے پھر بھی قلبِ سپاہ کی پیوستگی میں جیسے خود جلال الدین لڑا رہا تھا، کوئی فرق نہ آیا۔ حملہ آور سمندر کی موجوں کی طرح ہر طرف سے بڑھتے اور ٹکرا ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ چنگیز خاں کا حکم تھا کہ سلطان کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ اور اب جب کہ ترک جاں بازوں کی تعداد کل سات سو رہ گئی تھی، اس حکم کی تعمیل میں صرف چند ساعت کی تاخیر نظر آتی تھی۔ لیکن جلال الدین کا ایک عزیز قریب اسے لپٹ گیا کہ جس طرح ہو سکے لڑائی سے ہٹ کر نکل جائے، جس کا انجام، آغاز ہی کے وقت معلوم ہو چکا تھا۔ سلطان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جنگی گھوڑے سے اُتر کر اسپِ خاصہ پر سوار ہُوا۔ اہل و عیال کو الوداع کہی۔ ایک آخری حملہ کر کے مغلوں کے اگلے دستوں کو تھوڑی دُور تک ہٹا دیا۔ پھر گھوڑا پھیر کر دوڑاتا ہُوا دریا کی طرف لے گیا اور کنارے پر ایک چابک ایسا مارا کہ گھوڑا تڑپ کر دریا میں کُود پڑا! دریا کا کنارہ اس مقام پر آٹھ دس گز بلند تھا۔ اتنی بلندی سے سندھ جیسے تیز و عمیق دریا میں گھوڑا کُدا دینا ایسا ہوش رُبا کام تھا کہ دوست دُشمن سب کے مُنہ سے واہ نکل گئی۔ چنگیز خاں اور اُس کے جنگ آزما سردار حیرت سے تکتے رہ گئے۔ جلال الدین گھوڑا تیرا کر دُوسرے کنارے

پر پہنچ گیا۔[1] (سنہ ۶۱۸ھ)

دریائے سندھ کے پار جہلم تک قباچہ والیٔ سندھ حکومت کا دعوے دار تھا۔ پہاڑی علاقوں میں کھوکھروں کے آزاد قبائل آباد تھے۔ جہلم کے پار صوبۂ پنجاب انھی دنوں پھر سلطان دہلی کے ہاتھ آ گیا تھا۔ جلال الدین نے پہلے اسی صوبے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ جواب میں اِل تُتمِش نے سلطان کو دہلی میں اپنا مہمان عزیز بنانے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ایسے عزم و ہمت کے بادشاہ کو اپنے سر پر مسلط ہونے کا موقع دے۔ جلال الدین میں اتنی قوت نہ تھی کہ جبراً پنجاب کو چھین لیتا۔ مجبوراً کھوکھروں کو شکست دے کر اُن کے سردار (رائے "کوکار سنگین"[2]) کی بیٹی سے شادی کی اور چوں کہ ان قبائل کی پہلے ہی قباچہ سے لڑائی ٹھنی رہتی تھی، وہ سلطان کے ساتھ والیٔ سندھ سے لڑنے پر تیار ہو گئے اس طرح دو تین ہزار ترک اور چار پانچ ہزار کھوکھروں کی فوج بنا کر وہ اچھ پر بڑھا اور اس کے سردار اوزبک تائی نے شب خون مار کر قباچہ کو شکست دی۔ وہ پہلے بھاگ کر ملتان میں

---

[1] "طبقاتِ ناصری" میں یہ واقعات اجمالاً تحریر ہیں۔ راورٹی نے اپنے حواشی میں (جہاں کشا، وغیرہ کئی تاریخوں سے مدد لے کر تفصیل بیان کی ہے (صفحہ ۲۸۶) نیز دیکھو الیٹ۔ ج ۲، صفحہ ۵۵ و مابعد۔ جہاں گھوڑا کدایا وہ مقام زمانۂ حال تک "چوَل (یعنی صحرائے) جلالی" کہلاتا تھا۔

[2] ممکن ہے اصلی نام کچھ اور ہو اور یہ عرف نووارد ترکوں نے تجویز کر دیا ہو۔

پناہ گزیں ہُوا اور جلال الدین کو ساز و سامان کی کمی اور گرمی کی زیادتی سے محاصرہ جاری رکھنے کی فرصت نہ ملی۔ سندھ کے دُوسرے شہروں کو فتح کرتا ہُوا دیبل آیا اور نہروالہ کے علاقے پر بھی ایک تاخت کی۔ وہ مغربی سندھ اور بلوچستان میں مستقل حکومت قائم کرنے کی فکر میں تھا، جب کہ عراق و ایران سے تُرک اُمرا نے پھر بُلانا شروع کیا۔ ادھر چنگیز خاں واپس مغولستان چلا گیا تھا۔ لہٰذا سلطان بہ راہِ مکران پھر ایران آیا اور مرتے دم تک عراق و آذربائیجان میں شجاعت کے جوہر دکھاتا رہا۔ ایک روایت یہ ہے کہ آخر میں دِل دُنیا سے ایسا سرد ہُوا کہ درویشانہ لباس پہن کر بہت دن گُم نامی میں زندگی بسر کی۔[1]

مغول کے حملے اور لاہور کی تباہی

گر جلال الدین کی بہ دولت مغلوں نے پاکستان و بھارت کا راستہ دیکھ لیا۔ وہ اُسے نہ بھولے۔ خود چنگیز خاں نے بھارت کے راستے چین جانے کی تجویز کی تھی اور اس کی ہمّت و جفاکشی کے آگے فاصلے کی درازی کوئی بڑی دُشواری نہ تھی۔ لیکن اسی زمانے میں ترکستان کے بعض رئیسوں کی سرکشی کی خبر سُن کر وہ واپس خراسان چلا گیا اور بھارت سے گُزرنے یعنی، اس شاداب ملک کو ویران و تباہ کرنے کی آرزو دل میں تھی بھی، تو پُوری نہ ہوسکی۔[2] بہ ہر حال

---

[1] دیکھو راورٹی، حاشیہ "طبقاتِ ناصری" ص۲۹۹

[2] یہ خوں خوار و بے باک فاتح تین چار سال بعد اپنے وطن میں راہیِ ملکِ عدم ہوا (بقیہ برصفحہ آیندہ)

افغانستان پر مغلوں کا تسلط ہو جانے سے پنجاب و سندھ ان کی زد میں آ گئے اور سلطان شمس الدین کے انتقال کے بعد حملہ کرنے کا موقع ملا۔ سنہ ۶۳۹ھ / م سنہ ۱۲۴۱ء میں غور و ہرات کے مغل سرداروں نے طائر نامی سپہ سالار کے ماتحت دریائے سندھ کو عبور کیا اور یہ سن کر کہ ملتان کا والی کبیر خاں مقابلے کی پوری تیاری کر چکا ہے وہ اِدھر جاتے جاتے لاہور کی طرف مڑ گئے ؛

لاہور اِن دِنوں با رونق تجارتی شہر تھا لیکن الحاقِ سندھ کے بعد اس کی فوجی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ مغلوں کے ناگہانی حملے کے وقت قلعے میں جنگی ساز و سامان کافی نہ تھا۔ ملتان کی طرف سے مدد نہ آئی۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ شہر کے بہت سے ذی اثر باشندوں نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ سبب یہ کہ یہاں کے سوداگروں کو جن کے تجارتی قافلے وسطِ ایشیا کے ملکوں میں آتے جاتے تھے۔ چنگیز خانی حکام سے اجازت نامے مل گئے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) فوت ہو گیا (سنہ ۶۲۴ھ / م سنہ ۱۲۲۷ء) صاحبِ 'طبقاتِ ناصری' لکھتا ہے: "ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ جس وقت چنگیز خاں خراسان آیا۔ اس کی عمر پینسٹھ سال کی تھی۔ وہ دراز قامت، تنومند، طاقت ور آدمی تھا۔ چھدری داڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔ بلی کی سی کنجی آنکھیں تھیں۔ عقل و دانائی، ضبط و انتظام دلیری، خوں ریزی، سفاکی و ہیبت ناکی .... چہرے سے برستی تھی۔ مکر و استدراج یعنی شعبدہ بازی میں مہارت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں بعض بدروحیں اس کی دوست تھیں.... ..." صـ ۳۷۳

تھے جن میں حفاظتِ جان و مال کا وعدہ تحریر ہوتا تھا۔ یہ تحریریں ترکی اصطلاح میں "پایزہ" کہلاتی تھیں۔

شہر والوں کی بے اعتنائی دیکھ کر والیٔ لاہور ملکِ قراقش کو شہر کی مدافعت سے ناامیدی ہو گئی۔ دہلی ایک طرف، بھٹنڈہ یا سمانہ کی فوجی چھاؤنیوں سے بھی کوئی کمک نہ پہنچی ادھر حملہ آوروں کی منجنیقوں نے پیہم سنگ باری سے فصیلوں میں رخنے ڈال دیے۔ تیر اندازی کی طرح اس فن میں بھی مغلوں کو کمال حاصل ہو گیا تھا اور یہ بڑھ کر کہ چنگیز خاں کے لشکر میں دس ہزار سپاہی خاص منجنیق چلانے پر مقرر تھے،[1] ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مغلوں میں اس قلعہ شکن آلۂ جنگ کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی۔

آخر ایک رات قراقش اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور جس طرح ممکن ہوا لڑ بھڑ کر نکل گیا۔ اس واقعے نے اِدھر تو محصورین کو دل برداشتہ کیا، اُدھر محاصرین کے حملوں میں زیادہ شدت آ گئی اور اب وہ فصیل کے رخنوں میں گھس گھس کر شہر کے اندر تک آنے لگے۔ اس نازک موقع پر فوج کے دو گروہوں نے مدافعت کا بیڑہ اٹھایا، اور کوتوال شہر آق سنقر اور امیر آخور دین دار محمد، کی قیادت میں اُس وقت تک کہ ایک فرد بھی زندہ رہا، برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ سب کے سب شہید ہوئے اور

---

[1] طبقاتِ ناصری، صفحہ ۳۵۷، ایضاً صفحہ ۲۹۳ وغیرہ۔

حیاتِ جاوداں حاصل کی ہے۔[1]

اِن سرفروشوں کی جاں بازی رائیگاں نہ گئی۔ 'طبقاتِ ناصری' کی روایت کے مطابق مُغلوں کے تیس ہزار سے زیادہ سپاہی مارے گئے اور بہت کم ایسے تھے جو زخمی نہ ہوئے ہوں۔ پھر یہ کہ گو انھوں نے شہر میں گھُس کر سوداگروں کے پاپڑوں کی پروا کی نہ عورتوں بچّوں کی آہ و زاری پر رحم کھایا بلکہ قتلِ عام کر دیا اور جو چند نفوس زندہ بچے اُنھیں قید کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ باایں ہمہ اپنے بھاری نقصان کی وجہ سے وہ لاہور میں نہ ٹھیر سکے بلکہ شہر کو برباد و خراب کر کے بہت جلد غزنی واپس چلے گئے ہیں۔[2] لیکن ان کے اِسی حملے نے تمام شمالی ہند کو چونکا دیا اور سلاطینِ دہلی کے منصوبہ

---

[1] امیر آخور سے مراد فوجی گھوڑوں کا مہتمم ہے۔

[2] لاہور کی تباہی کی خبروں نے دہلی میں کہرام ڈال دیا تھا۔ مدّتوں تک لوگ ان عبرت ناک سوانح کو یاد کرتے رہے۔ شیخ نظام الدّین اولیاؒ کے ملفوظات (ر: فوائد الفوائد) میں لکھا ہے کہ حضرت ممدوح نے ایک بار فرمایا کہ لہاور میں کئی مہینے چاند وقت پر نظر نہیں آیا۔ لوگ قیاساً تیس دن کا مہینہ لگاتے رہے۔ حتیٰ کہ رمضان میں ۲۷ یا ۲۸ تاریخ کو ہلال نمودار ہُوا۔ ایک تو یہ نحوست، دوسرے انھی دنوں لاہور کے سوداگر گجرات گئے۔ کپڑے کی قیمت بیوپاریوں کو اصل سے دُگنی بتاتے رہے پھر آدھی پر معاملہ کر لیا۔ گجرات والوں نے کہا اگر تم لوگ اس طرح لین دین کرتے ہو تو تمھارا شہر کیوں کر آباد رہے گا؟ سوداگر واپس چلے تو معلوم ہُوا کفّار مغول نے شہر کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔" (ص۱۱۲) یہ سنہ ۷۱۹ھ یا سنہ ۷۲۰ھ یعنی تاراجی لاہور سے کوئی اسّی برس بعد کے ملفوظات ہیں۔

کشور کشائی پر اتنا اثر ڈالا کہ آیندہ نصف صدی تک انھیں اپنی حدودِ حکومت کو نربدا کے جنوب میں بڑھانے کی جرأت نہ ہوسکی۔ بلبن جیسے حوصلہ مند بادشاہ نے انھی مغول سے شمالی بھارت کو بچانے کی خاطر نئی فتوحات کا ارادہ ترک کردیا۔

سقوطِ لاہور کا ایک اور نتیجہ یہ ہُوا کہ کابل و غزنی کی طرح مُغلوں کو مغربی پاکستان کی ملکیت کا دعوا پیدا ہوگیا اور وہ بار بار سندھ و پنجاب پر حملے کرتے رہے۔ تین چار مرتبہ انھوں نے زیادہ وسیع پیمانے پر لشکرکشی کی جس کا ذکر آیندہ ہماری نظر سے گزرے گا۔ امیر تیمور کے طوفانی حملے نے گویا اسی قدیم دعوے کی تجدید کی اور آخر میں بابر نے نہ صرف لاہور بلکہ بھارت کے پایۂ تخت پر مستقل قبضہ کرلیا۔ اس طرح، مغل سلطنت کے قیام سے دسویں صدی ہجری میں وُہ آرزو پوری ہو کے رہی جو ساتویں صدی میں طائرِ مغل کو لاہور اُڑا کر لائی تھی۔

بہر تقدیر، اس موقع پر مُغلوں کا ٹل جانا بہت غنیمت ہُوا۔ ورنہ حکومتِ دہلی کو اپنے اندرونی تنازعوں سے ہنوز نجات نہیں ملی تھی۔ مغلوں کی لاہور پہ یورش سُن کر تھوڑے دن کے لیے لوگ اپنے اختلافات ضرور بھول گئے اور بادشاہ کے "قصرِ سفید" میں مسلمانوں کا عام جلسہ منعقد ہُوا جس میں مولانا منہاج الدین (صاحبِ طبقاتِ ناصری) نے بڑی پُر اثر تقریر کی۔ جوش کے عالم میں حاضرین نے از سرِ نو بادشاہ کی

اطاعت کا حلف اُٹھایا اور مغلوں کے مقابلے کے لیے بہت جلد ایک بڑا لشکر فراہم ہوگیا۔ مگر یہ فوج ابھی بیاس تک پہنچی تھی کہ حملہ آور لاہور سے واپس چلے گئے۔ ادھر دہلی میں بادشاہ نے کسی شخص کے کہنے میں آکر شہر کے مشہور فاضل قاضی شمس الدّین کو قتل کرا دیا۔ لوگوں میں سخت برہمی پھیل گئی۔ بادشاہ کے چالاک وزیر مہذّب الدّین نے فوجی سرداروں کو ایسا مشتعل کیا کہ وہی لشکر جو مغلوں سے لڑنے لاہور جا رہا تھا واپس دہلی آیا اور بادشاہ بہرام شاہ کو قید کر کے اس کے بھتیجے علاء الدّین مسعود کو منتخب کر لیا۔ (ذی قعدہ سنہ ۶۳۹ھ / م سنہ ۱۲۴۲ء) ہر چند یہ ایک ناتجربہ کار شہزادہ تھا لیکن انتخاب کرنے والے اُمرا نے بڑے بڑے عہدوں پر بہت مستعد اور لائق افراد مقرر کرائے اور انھی میں فوج کی از سرِ نو تنظیم غیاث الدّین الغ خاں کے سپرد ہوئی جسے تقدیر نے آیندہ بادشاہی کے لیے چُن لیا تھا۔ اسی نے مغول کے حملے روکنے کے لیے ایک تیز پا لشکر تیار کیا کہ وہ دوبارہ سندھ پر چڑھے تو یہ لشکر بہت جلد شہر اُچھ کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ مغلوں کی فوج کشی اُن کے مشہور سپہ سالار "سگ چشم" منگوتہ کی قیادت میں ہوئی تھی مگر اُچھ کے بہادر کوتوال محمّد صالح نے کئی ہفتے جم کر مقابلہ کیا یہاں تک کہ پائے تخت دہلی کی فوج آ پہنچی اور منگوتہ کو بلی کی طرح اُلٹے پاؤں بھاگ جانا ہی غنیمت ہُوا۔ نوجوان بادشاہ بھی کمکی فوج کے ساتھ آیا تھا مگر یہ عسکری زندگی اُسے راس نہ آئی

اور صعوبات سفر کی تلافی اُس نے ایسے مشاغل سے کرنی چاہی جو آدمی کی عقل و اخلاق کو بگاڑ دیتے ہیں۔ عیاشی کے ساتھ جب اُس کی تعدی کی شکایتیں حد سے گزرنے لگیں تو امرائے ترک نے اسے معزول و محبوس کر کے اِلتمش کے چھوٹے بیٹے ناصر الدین محمود کا انتخاب کر لیا (سنہ ۶۴۴ھ م سنہ ۱۲۴۵ء)۔

نیا بادشاہ نہایت شریف و صلح جوان تھا۔ اُس کی دین داری کے قصے تاریخوں میں مذکور اور آج تک لوگوں میں مشہور ہیں۔ اسی ہر دل عزیزی کی بدولت تخت نشینی کی رسم بڑی دھوم دھام سے دہلی میں ادا ہوئی[1] (۲۳ محرم) اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی اس کے اخلاق و اطوار پر کسی حرف گیری کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن وہ ایسی انتظامی قابلیت و قوت نہ رکھتا تھا کہ شورہ پُشتوں کو فتنہ انگیزی کا موقع نہ ملے۔ معلوم ہوتا ہے خود ناصر الدین اپنی کمزوری کو سمجھ گیا تھا اور یہ اس کی فراست یا نیک نیتی تھی کہ چند سال بعد حکومت کی باگ اپنے موزوں ترین امیر (بلبن) کے یہ کہہ کر حوالے کر دی کہ "میں تجھے اپنا نائب بناتا ہوں۔ سلطنت کا اختیار تیرے تفویض کرتا ہوں۔ تو کوئی ایسا کام نہ کیجو کہ کل سب سے بڑے بادشاہ کے دربار میں جواب نہ بن پڑے اور تجھے اور مجھے دونوں کو شرمندگی

---

[1] ہمارے مورخ مولانا منہاج الدین سراج نے بھی اس جشن کے موقع پر دو نظمیں لکھی تھیں۔ ان میں سے پہلا قصیدۂ تہنیت اس مشہور مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

آں شہنشاہے کہ حاتم بذل و رستم کوشش است
ناصرِ دنیا و دیں محمود بن اِل تُتمش است

نصیب ہو!"

غیاث الدین بلبن

پہلے حاجب و نائب شاہ - پھر بادشاہ کی حیثیت سے سلطنتِ دہلی پر تقریباً چالیس برس اسی ترک غلام نے فرماں روائی کی جسے تاریخ اُلغ خاں کے خطاب اور سلطان غیاث الدین بلبن کے گرامی نام سے ہمیشہ یاد رکھے گی - کہتے ہیں وہ بھی سلطان شمس الدین اِل تمش کے قبیلہ " البری " کا سردار زادہ تھا۔ چنگیز خانی سیلاب میں کوئی مغل سپاہی پکڑ لے گیا - بغداد میں کسی بزرگ جمال الدین بصری نے خریدا اور تربیت کی پھر دہلی میں پہنچے آیا جہاں ولایت زا ترکوں کی بڑی مانگ تھی - لیکن شروع میں وہ معمولی سپاہی بلکہ بھشتی یا فراش کا کام کرتا رہا - رفتہ رفتہ میر شکار اور ترکانِ چہل گانی کے زمرے میں داخل ہوا - سلاطینِ شمسی کے عزل و نصب میں حصہ لینے کی وجہ سے ایک گروہ لازماً اس کا دشمن ہو گیا تھا - دو تین مرتبہ عہدے سے معزول اور ایک دفعہ محبوس کیا گیا - تقدیر کو بڑے کام لینے تھے ورنہ اُن دنوں سیاسیات کے کھیل میں گردن کٹ جانے کی تقریباً اتنی ہی اہمیت تھی جتنی آج کل کرکٹ کے میچ میں کسی کھلاڑی کا نام کٹ جانے کی ہوتی ہے - سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں بھی جس کی بلبن کی بیٹی سے شادی ہوئی ، وہ دو تین برس معتوب اور دربارِ شاہی سے الگ رہا لیکن شمسی امرا کو قابو میں رکھنا سہل نہ تھا - یہ خواجہ تاش جب کبھی مل کر کام کرتے ، قصرِ حکومت کی

بنیاد ہلا دیتے تھے۔ آخر سلطان کو بلبن سے مصالحت ہی میں مصلحت نظر آئی۔ اور اُسی نے نایب الممالک بن کر چند سال میں خیرہ سر امیروں کی قوت توڑی۔ پھر سنہ ۶۶۴ھ[1]م سنہ ۱۲۶۶ء میں سلطان لاولد فوت ہُوا تو کسی امیر وزیر کو اختلاف کی جرأت نہ ہوئی اور وہی مسکین فرّاش جو کبھی مسندِ شاہی جھاڑتا تھا، اُس مسند کا بلا شرکت و مزاحمت مالک ہو گیا۔ اعلا درجے کی انتظامی قابلیت اور دلیری و سپہ گری کے علاوہ بلبن اصولِ حکم رانی کے متعلق مستقل نظریات رکھتا تھا اور اس کے مختلف احکام و نصائح کو جو ضیاء الدین برنی اور دُوسرے مورّخوں نے قلم بند کیے ہیں، یک جا کیا جائے تو ازمنۂ وسطیٰ کے فنِ مُلک داری پر ایک اور "سیاست نامہ" مرتب ہو سکتا ہے۔ کام یاب بادشاہی کے لیے، اسبابِ قوت کے ساتھ وہ "شعائرِ عظمت و جلال" کو لازم قرار دیتا تھا اور خود بادشاہ ہُوا تو انھی اصول کے مطابق اپنی زندگی ڈھالی۔ اس کے شاہانہ ماند و بود کی مورّخ برنی نے دل چسپ تصویر کھینچی ہے کہ جب دربار آراستہ ہوتا یا سواری چلتی تو صدہا نقیب و چاوش، سوار و پیادہ، ملوک و امرا گرد و پیش حاضر ہوتے۔ زابل و سیستان کے دیو پیکر جوانوں کو بیش قرار تنخواہیں دے کر نوکر رکھا تھا کہ ننگی تلواریں لیے بادشاہ کی خدمت میں کمربستہ رہیں۔ سواری چلتے میں قدم قدم پر صدائے بسم اللہ

---

[1] "فتوح السلاطین" میں سنہ ۶۶۵ھ تحریر ہے (صفحہ ۱۶۴) اور یہ مثنوی ناصر الدین کے لڑکوں کا بھی ضمناً ذکر کرتی ہے (صفحہ ۱۶۱)۔

اِس زور سے بلند ہوتی کہ بازار یا جنگل گونجنے لگتے۔ تماشائی اور سامعین کے بدن میں لرزہ پیدا ہو جاتا بلکہ بعض اوقات باریاب ہونے والے خواہ کہیں کے سفیر ہوں یا بھارت ہی کے رئیس و راجا سلام کے وقت خوف سے گر پڑتے، یا بے ہوش ہو جاتے تھے۔[1]

بلبن کو اقرار تھا کہ ایرانی اکاسرہ کی یہ تقلید اور خود پرستی اسلامی تعلیم کے خلاف مشرکانہ رنگ رکھتی ہے لیکن وہ حجت پیش کرتا تھا کہ اگر بادشاہ کا اعتقاد صحیح اور نیت درست ہو اور اس کا مدعا محض حق کی حمایت اور امن و انصاف کا قیام ہو تو وہ مواخذے سے بری ہو۔[2] عدل و انصاف کے معاملے میں خود اُسے کبھی مروت یا کسی دُنیاوی مصلحت کی پرواہ نہ ہوتی تھی۔ چناں چہ ایک مرتبہ بداؤں کے صوبہ دار نے اپنے فراش کو اتنا پٹوایا کہ وہ جان سے گزر گیا۔ اتفاق سے کچھ مدت بعد بادشاہ نے بداوں کا دورہ کیا۔ فراش کی بیوہ نے عرضی گزرانی اور جب واقعے کی تصدیق ہوگئی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ مجرم صوبہ دار کو بھی اُسی طرح پٹوایا جائے کہ وہ مستغیثہ کے سامنے ہلاک ہو جائے۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور ساتھ ہی بداوں کا بَرید یعنی ڈاک کا عہدہ دار جس نے حاکم صوبہ کی پاس داری میں اِس واقعے کی اطلاع نہیں دی تھی، سولی پر لٹکا دیا گیا! اسی قسم کی خطا پر بادشاہ کے قدیم اور

---

[1] برنی صفحہ ۳۰

[2] ایضاً صفحہ ۴۱

عزیز غلام ہیبت خاں صوبہ دار اودھ کے کوڑے لگوائے گئے۔ اور وہ شرمندگی میں پھر مرتے دم تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔[1] بلبن کی قہرمانی سیاست کا ایک اور نمونہ ہم بنگالہ کی بغاوت کے سلسلے میں پڑھیں گے لیکن معترض برنی کو اعتراف ہے کہ اتنی بے رحمی کے باوجود، محتاجوں کی امداد، بیوگان و یتامیٰ کی ہمدردی، زخمی یا بیمار سپاہیوں کے ساتھ مہربانی کرنے میں بلبن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ذاتی عادات میں بھی، بادشاہ ہونے کے بعد اس نے جوانی کی عیاشی اور لہو و لعب کے مشاغل چھوڑ کر، وہی پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کیا جو اُس کے آقا شمس الدین اِلتمش کا امتیازی وصف سمجھا جاتا تھا۔ مشائخ و علما کی بڑی تعظیم و توقیر کرتا۔ جمعے کو پابندی سے نمازِ باجماعت اور بارہا اُن بزرگوں کے وعظ میں شریک ہوتا اور بلا امتیاز سامعین کی صفوں میں جہاں جگہ ملتی، وہیں بیٹھ جاتا تھا۔[2]

دفاعی انتظامات

اِن عجیب اوصافِ ذاتی کے ساتھ بلبن نہایت بیدار مغز و

---

[1] برنی صفحہ ۲۵ دوسری تاریخوں میں بھی یہ واقعات منقول ہیں۔

[2] 'اخبار الاخیار' میں منقول ہے کہ اس عہد کے ایک متقی فاضل مولانا کمال الدین زاہد سے بلبن نے درخواست کی کہ آپ میرے ہاں نماز کی امامت فرمایا کریں۔ مولانا نے بگڑ کر کہا کہ میرے پاس نماز کے سوا کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ اب بادشاہ اُسے بھی چھین لینا چاہتا ہے۔ بلبن مولانا کی خفگی سے ڈر گیا۔ معافی مانگ کر رخصت کیا۔ (صفحہ ۷۲)

مستعد فرماں روا تھا۔ اُس نے اندرونِ مُلک میں حُسنِ انتظام اور قیامِ امن کی جو کوششیں کیں، ان کا ذکر کرنے سے پہلے ہم دفاعی انتظامات پر ایک نظر ڈالیں گے کیوں کہ مغلوں کے سرحدی ممالک پر مسلط ہو جانے سے اُن دنوں پاکستان و بھارت کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ایسا نہ پہلے ہُوا تھا نہ شاید بعد میں کبھی پیدا ہُوا۔ دُور اندیش و فرض شناس بلبن کو ساری عمر اسی خطرے کا سدِ باب کرنے کی فکر رہی اور اگر کبھی کوئی امیر وزیر گجرات یا دکن کے ممالک پر فوج کشی کا مشورہ دیتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتا کہ ہمیں سب سے پہلے اپنے مقبوضات کو حملۂ مغول سے محفوظ کرنا ضروری ہے۔ یہ فرض ادا ہو جائے تو پھر سلطنت میں توسیع بھی کرلیں گے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اُس زمانے میں جب کہ اطلاعات اور سفر کے جدید رسائل، ریل، تار، موٹر وغیرہ میسّر نہ تھے۔ حکومتِ دہلی کوہستانِ سلیمان کے قدرتی مورچوں سے کام نہ لے سکتی تھی، دریائے جہلم کے پار آبادی کم اور اکثر اراضی ناقابلِ زراعت تھیں اور ان مقامات میں بڑی بڑی چھاؤنیاں بنانا دُشوار تھا۔ ان اضلاع کے نیم متمدن اور جنگ جُو کھوکھر قبائل پاکستان و بھارت کی قوموں سے کوئی اخلاص و ہم دردی نہ رکھتے تھے اور لُوٹ کے لالچ میں ہر حملہ آور کا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ انھی اسباب سے دہلی کی تُرک سلطنت اور عہدِ مغلیہ کی تاریخ میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔

یعنی بابر و اکبر کے عہد سے پہلے جب تک مُلکِ افغانستان پر پاکستان یا دہلی کے بادشاہوں کا قبضہ نہ تھا، یہ مشرقی ممالک بیرونی حملوں سے کبھی بے خوف نہ رہ سکے ۔

ایک اور دقّت یہ تھی کہ سلطنتِ دہلی کی فوج میں بیش تر مسلمان بھرتی ہوتے تھے اور ان کی مجموعی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی کہ مغلوں کے بے پناہ سیلاب کو آسانی سے روک لیتی خصوصاً جب کہ یہ حملہ آور قزاقوں کی طرح گروہ در گروہ جدھر سے میدان خالی پاتے مُلک میں گھُس آتے اور گھِرنے کا اندیشہ ہوتا تو اُسی تیزپائی سے فرار ہو جاتے تھے ۔ وہ انتظامِ رسد رسانی و خیمہ و خرگاہ کے وسیع لوازم سے بڑی حد تک بے نیاز اور اسی کے ساتھ نہایت جفاکش، جری اور خوں خوار لڑنے والے تھے ۔ شجاعت میں غالباً ترک قوم ہی اُن سے بازی لے جا سکتی تھی اور سیاسی انتشار اور پے بہ پے ناکامیوں کے باوجود انھی نے مغلوں کے دل پر اپنی مردانگی کا سکہ بٹھا دیا تھا ۔ بھارت کی خوش قسمتی تھی کہ فتنۂ مغول کے وقت یہاں اسی قوم کے افراد برسرِ اقتدار تھے ۔

سلطان ناصرالدّین محمود کے عہد میں مغل حملہ آوروں کو پنجاب میں روکنے کی خدمت بلبن کے عم زاد بھائی شیر خاں سنقر کے تفویض ہوئی تھی ۔ یہ بہادر و مستعد سردار تھا لیکن جنگی تیاریوں کے ساتھ مغل حکومت سے دوستانہ تعلّقات رکھنا چاہتا تھا ۔ بلبن بادشاہ ہونے کے بعد اسے گوارا نہ کر سکا اور مغلوں

سے رابطے کے بجائے اُس نے دفاعی استحکامات کو ترقی دینے پر توجہ صرف کی۔ لاہور کے ویران و تاراج ہونے سے شمالی پنجاب کو بچانا محال ہوگیا تھا۔ چناب کے پار تمام علاقے پامال کر دینے سے مُغلوں کا مقصد یہی تھا کہ سلطنت دہلی اس حصے میں کوئی بڑا جنگی مرکز قائم نہ کرنے پائے۔ کھوکھروں کی قوم ان کی حلیف ہوگئی تھی اور جب تک بلبن نے ان غارت گروں کی سرکوبی نہ کی، وسطِ پنجاب کا علاقہ ویران رہا۔ آخر سنہ ۶۶۹ھ، م سنہ ۱۲۷۰ء میں خود یہ بادشاہ لاہور آیا۔ ازسرِ نو قلعے اور شہر کی تعمیر کی۔ بہت سے سرکاری معمار مقرر کیے کہ مضافات میں رعایا کے مکان بنائیں۔ پھر قدیم باشندوں کو جو نہایت شکستہ حال اور منتشر ہوگئے تھے، حتی الامکان دوبارہ لا لا کے بسایا اور ان اضلاع میں جہاں تیس برس تک ویران پڑے رہنے سے کنوئیں تک اٹ گئے تھے، نئے سرے سے آبادی بحال کی۔ وسطِ پنجاب اور لاہور کو نئی زندگی بخشنے کے ساتھ، سندھ و مُلتان کی فوجی تنظیم ازسرِ نو کی گئی جو مُلکِ پنجاب کا بازو تھے۔ ہر جگہ بہترین حاکم مقرر ہوئے اور صدر صوبہ دار یعنی گورنر جنرل بادشاہ نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمّد کو بنایا جس کا مستقر ملتان تھا۔ ان کارگر دفاعی انتظامات نے دریائے چناب تک پنجاب کو اور مغرب و جنوب میں ملکِ سندھ کو اتنا محفوظ کر دیا کہ آیندہ دس بارہ سال تک مغلوں کی کسی بڑی جماعت کو اِدھر آنے کی جُرات نہ ہوئی۔

اندرونی امن و انتظام

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہندوؤں کے آخری زمانے میں طوائف الملوکی نے عام بدنظمی پیدا کر دی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے ملوک طوائف اور خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ رہزنی بھی کم ہوئی لیکن جہاں علاقے کے علاقے اور قومیں کی قومیں عقیدہ رکھتی ہوں کہ ڈکیتی سپاہیانہ پیشہ اور جائز وجہ معاش ہے، وہاں اس کا انسداد کرنا تقریباً محال تھا۔ دوسرے بیسیوں ریاستیں ضبط ہونے سے ہزاروں سپاہی بے روزگار ہو گئے تھے اور خانہ جنگیاں رُک جانے سے آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دوآب اور ہر صوبے میں بڑے بڑے جنگل کھڑے تھے۔ عام رعایا رہزنوں کو گرفتار کرانے میں حکومت کو مدد نہ دیتی تھی۔ ان سب وجوہ سے یہ بلائے بد مقامی حکّام کے قابو میں نہ آتی تھی۔ کم سے کم بھارت خاص کے علاقے پر یہ بلبن کا بڑا احسان تھا کہ غالباً سب سے پہلے اُسی نے قزاقی کا استحصال کرنے کا وسیع منصوبہ تیار کیا۔ اور دہلی کے شمال سے مُلکِ اودھ تک بڑے بڑے جنگل کٹوا کر ہزارہا ڈکیتوں کو گھیر گھیر کے قتل کرایا۔ نواحِ دہلی میں میوات کے پہاڑی علاقے کے علاوہ ان قزاقوں کے سب سے بڑے مرکز کاٹھیر (بداوں) اور کمپل (موجودہ ضلع فرخ آباد) میں تھے۔ بادشاہ نے ایک ایک کر کے اُنھیں صاف کیا اور بعض جگہ اس قدر بے رحمی سے کام لیا کہ عورتوں اور بچوں

کے سوا کسی مرد کو زندہ نہ چھوڑا۔ رہزنوں کو زندہ یا سر کاٹ کر لانے کا انعام مقرر تھا اور لوگ انھیں اس طرح پھاندتے اور قتل کرتے پھرتے تھے جس طرح جنگلی درندوں کو۔[1] پھر بھی سال ہا سال کی مسلسل کوشش اور عدہا تھانے قائم کرنے کے بعد اس آفت کا سدِ باب ہو سکا۔ برنی شہادت دیتا ہے کہ "رہزنوں کی بلا بھارت کے راستوں سے دفع ہوئی اور ہمارے زمانے تک کہ بلبنی چوکیوں اور تھانوں کی تعمیر کو تین پشتیں گزر چکی ہیں، یہ انتظام انسدادِ رہزنی کا ضامن ہے"۔[2]

بنگالہ کی بغاوت

اندرونی انتظامات کے سلسلے میں بلبن کی حکمت عملی کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ جہاں اُس نے بیرونی فتوحات کا خیال چھوڑ دیا تھا، وہیں سلطنت کی مرکزیت کا وہ سرگرم حامی اور محافظ تھا۔ بنگالہ کی بغاوت فرو کرنے کے بعد جب اپنے

---

[1] لین پول لکھتا ہے کہ ایک لاکھ آدمی کی قربانی دے کر نواحِ دہلی کا علاقہ جو ڈکیتیوں کا گھر تھا امن پسند مزارعین کا ضلع بن سکا۔ مڈی ول اِن انڈیا صفحہ ۸۱۔

[2] گزشتہ ایام میں رہزنی کی شدت اور بلبنی انتظامات کو اس مورخ نے کافی تفصیل سے تحریر کیا ہے (صفحہ ۵۷ و مابعد) نیز ملاحظہ ہو امپی ریئل گزیٹیر، ج ۳، صفحہ ۳۲۷ حالات کنپل وغیرہ۔ بہ ایں ہمہ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ملک سے ٹھگی ڈکیتی بالکل مفقود ہو گئی تھی۔ البتہ شوارع عام اور بستیوں میں لوٹ مار کی وارداتیں بہت کم ہو گئی تھیں اور آمد و رفت یا تجارت اتنی مخدوش نہ رہی تھی جتنی پہلے یا مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد نظر آتی ہے۔

چھوٹے بیٹے ناصر الدّین بغرا خاں کو وہاں کا والی بنایا تو چلتے چلتے یہی تاکید کی کہ دیکھو بادشاہِ دہلی سے کبھی سرتابی نہ کرنا ہ۔
فرشتہ کی روایت ہے کہ سنہ ۶۷۸ھ میں بادشاہ ایسا علیل ہُوا کہ مہینے بھر تک محل سے برآمد نہ ہوسکا اور دُور کے شہروں میں اس کے مرنے کی افواہ پھیل گئی۔ لکھنوتی میں بلبن کا غلام طغرل صوبہ دار تھا اور انھی دنوں جاج نگر[۱] میں بہت سی فتوحات اور زر و مال چھین کر مسرور و سرشار ہوگیا تھا۔ ملک بنگ کے بغاوت پسند مصاحبوں کو چنگ پہ چڑھانے میں مہارت حاصل تھی۔[۲] طغرل کو یقین آگیا کہ بوڑھا بادشاہ زندہ بھی ہے تو مغلوں کے حملے روکنے سے اتنی فرصت نہ پائے گا کہ بنگال آئے۔ لہٰذا اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کردیا۔[۳] بلبن کو یہ خبر ملی تو رنج و غضب کی حالت میں، بہ قول برنی "خواب و خور بر او تلخ گشت"۔ زیادہ غصّے کی وجہ یہ کہ طغرل جس نے سلطان مغیث الدّین کے لقب سے بادشاہی کا ڈنکا بجایا، خود بلبن کا دست پروردہ

---

[۱] جاج نگر سے شمالی اوڑیسہ اور مشرقی گونڈوانہ کا علاقہ مراد ہے جو مہا ندی سے گوداوری تک پھیلا ہُوا تھا۔ برگز اور اِلفنسٹن کی غلط اندیشی سے بعد کی انگریزی تاریخیں اسے بہت دن اسام لکھتی رہیں ہ۔

[۲] کم سے کم برنی کے زمانے میں اہلِ بنگالہ اسی قسم کی شہرت رکھتے تھے۔ دہلی والے لکھنوتی کو "بلغاک پور" یعنی بغاوت پور کے نام سے یاد کرتے تھے۔

[۳] 'فتوح السلاطین' میں بغاوتِ بنگال کو چند سال پہلے یعنی سنہ ۶۷۲ھ کا واقعہ لکھا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہ۔

اور معتمد علیہ غلام تھا ۔ ادھر دو لشکروں نے جو بغاوت فرد کرنے کے لیے گئے، طغرل سے شکست کھائی ۔ بادشاہ غصّے سے بے تاب ہوگیا اور خود فوج لے کر بنگالہ چلا ۔ درازیٔ عمر اور درازیٔ راہ اس کے آہنی ارادے کو نہ روک سکی تو برسات اور ندیوں کی طغیانیاں کیا روک سکتی تھیں ۔ خوف زدہ حکّام نے بہتر سے بہتر انتظام کر دیا تھا ۔ دریائے گنگا میں باربرداری کی صدہا کشتیاں دوڑتی پھرتی تھیں ۔ شاہی لشکر کو جس میں بھیرو بنگاہ سب مِلا کے دو لاکھ آدمی تھے، رسد وغیرہ کی کوئی دقّت پیش نہ آئی ۔ بادشاہ کی آمد سُن کر طغرل فرار ہوگیا تھا ۔ لہٰذا بغیر مزاحمت بلادِ بنگال شاہی قبضے میں آگئے ۔ لیکن بلبن ارادہ کرچکا تھا کہ جب تک "نمک حرام" طغرل ہاتھ نہ آئے گا، تا زندگی تعاقب نہ چھوڑوں گا ۔ معلوم ہُوا کہ وہ جاج نگر کی طرف بھاگا ہے ۔ بادشاہ بھی لکھنوتی کا بندوبست کرکے پیچھے پیچھے چلا اور ہر طرف سراغ رساں دستے پھیلا دیے کہ کوہ وصحرا کا چپّہ چپّہ چھان ڈالیں ۔ آخر کئی مہینے کی شبانہ روز تگ و دو کے بعد پتا چل گیا ۔ اور شاہی ہراول کے ایک دستے نے فراریوں کے پڑاؤ پر چھاپہ مارا ۔ طغرل بھاگتے میں تیر کھاکے گِرا اور ساتھی یا مارے گئے یا گرفتار ہوئے ۔ پھر لکھنوتی آکر ہر شخص جس نے طغرل کی بادشاہی میں ذرا بھی رفاقت دکھائی تھی پکڑ لیا گیا ۔ اُن میں دہلی کے سپاہی سردار چھانٹ کر الگ کرلیے تھے کہ اُنھیں وطن پہنچ کر سزا دی جائے گی

باقی بنگال کے جملہ خطاکاروں کو سرِ بازار سولیوں پر لٹکا دیا گیا۔ کہتے ہیں ایک مست قلندر نے طغرل کو دعائیں دی تھیں۔ بلبن کی قہرمانی سیاست سے یہ دعاگو بھی نہ بچا!

شہزادہ محمد کی شہادت

بنگال و پاکستان مشرقی میں چھوٹے بیٹے ناصرالدین محمود (معروف بہ بُغرا خاں) کو صوبہ دار بنا کے اور بہت سی نصیحتیں کر کے بادشاہ واپس روانہ ہُوا۔ ہر صوبے اور اقطاع کا تفصیلی معائنہ کرتا اور ضروری ہدایات دیتا تھا۔ مورخ برنی جس کا دادا بنگال کی مہم میں بادشاہ کا ہم رکاب تھا، جدید انتظامات کی خوبی اور مُلک میں امن و فراغت کی شہادت دیتا ہے۔ بلبن کو اس سے بھی بڑھ کر خوشی یہ تھی کہ مغلوں کے مقابلے میں جو دفاعی تدبیریں کی تھیں وہ نہایت کامیاب ہوئیں اور کامیابی کا سہرا فرزند رشید محمد کے سر بندھا۔ یہ شہزادہ مردانگی و فرزانگی دونوں سے متصف تھا اور اہلِ علم کی سرپرستی کی بدولت ہم عصر تاریخ و ادبیات میں اس کا نام جلی حرفوں سے تحریر ہُوا۔ بادشاہ نے اسے قاآن مِلک کا خطاب دیا اور اس کی کارکردگی اور سعادت مندی سے ہمیشہ خوش رہا۔ بارہ تیرہ سال تک مغربی پاکستان کو مُغل حملہ آوروں سے بچانے کی دُشوار خدمت بڑی خوبی اور مستعدی سے انجام دی۔ علمی اور مجلسی مشاغل میں انہماک رکھنے کے باوجود جب کبھی کسی پیش قدمی کی خبر سُنتا، اُسی وقت بزمِ ادب کو چھوڑ کر میدانِ رزم میں پہنچ جاتا تھا۔ حفاظتِ سلطنت

کا یہی فرض ادا کرنے میں آخر اُس کی جان گئی (سنہ ۶۸۴ھ م سنہ ۱۲۸۵ء)۔ مُغلوں کا حملہ بڑے زور شور سے سپہ سالار تمُر (یا تیمور) خاں کی قیادت میں ہُوا تھا لیکن میدان کے دونوں بڑے معرکوں میں اُنھیں شکست ہوئی۔ شہزادہ محمدؐ تعاقب کے جوش میں لشکر سے آگے نکل گیا تھا۔ مغلوں نے گھات لگائی اور اس کی مختصر جمعیت کو ایک ندی کے کنارے گھیر لیا۔ شہزادے کا بچ کر نکل جانا ممکن تھا مگر رفیقوں کو چھوڑنا اُسے گوارا نہ ہُوا اور اسی آویزش میں مارا گیا۔ ساتھیوں میں سے معدودے چند بچ کر بھاگے باقی کام آئے یا مُغلوں نے انھیں اسیر کر لیا؛ [1]

اِس المناک سانحے نے پاکستان و بھارت میں جا بجا کُہرام ڈال دیا۔ بوڑھے بادشاہ کی ایسے جوان اور لائق فرزند کے مارے جانے سے کمر ٹوٹ گئی۔ امیر خسروؒ اور امیر حسن جیسے صاحبِ قلم شہزادہ محمدؐ کے ندیم اور شہادت کے غالباً عینی شاہد تھے۔ ان کے نظم و نثر کے مرثیوں نے اور بھی غضب ڈھایا۔ خصوصاً

---

[1] ضیاء الدین برنی نے ان واقعات کو بے ربط اور مجمل طور پر لکھا ہے۔ طبقاتِ اکبری' اور بدایونی میں دوسرے ماخذوں سے تفصیل کی گئی ہے۔ یہ بات کہ امیر خسروؒ اسی معرکے میں مغلوں کے ہاتھ میں اسیر ہوئے (فرشتہ وغیرہ) غالباً قیاسی ہے اگرچہ ان کی گرفتاری اور کوئی دو برس تک بلخ میں قید رہ کر رہا ہونا، مثنوی خضر خاں دول رانی اور اُن کے دوسرے اشعار و اقوال سے ثابت ہے۔

امیر خسروؒ کا ترکیب بند جو سعدی شیرازیؒ کے مرثیۂ بغداد کی بحر میں لکھا تھا، ایسا درد انگیز و عبرت افزا ہے کہ اسے پڑھ کر آج بھی اس ہر دلِ عزیز شہزادے کی موت کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ ایک بند میں اہلِ ملتان کے رنج و ماتم کا ذکر کرتے ہیں:[۵]

مہر و مہ بر روئے آں فرخ لقا بگریستند
روز و شب بر سال آں اندک بقا بگریستند
خلقِ ملتاں، مرد و زن مویہ کناں و مو کناں
کو بہ کو و سو بہ سو و جا بہ جا بگریستند
از خروشِ گریہ و بانگِ دہل شب کس نہ خفت
بس کہ در ہر خانہ، اہلِ عزا بگریستند۔۔۔

خاندانِ شمسیہ کا خاتمہ

فتوح السلاطین کی روایت ہے کہ شہزادہ شہید کی لاش مغلوں سے زرِ کثیر دے کر حاصل اور اعزاز و اکرام سے ملتان میں دفن کی گئی۔ (صفحہ ۱۸۰) بلبن پہلے ہی پیرانہ سالی کی وجہ سے ضعیف و علیل رہنے لگا تھا۔ جوان بیٹے کے غم سے نڈھال ہو گیا۔ اپنی جانشینی کے لیے بغرا خاں کو بنگالہ سے بلوایا مگر اسے دربار دہلی کی فضا پسند نہ آئی اور بادشاہ کی مزاج پرسی کر کے چپکے سے واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے شہزادہ محمد کے فرزند کو نامزد کیا تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد مقتدر امیروں نے بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو منتخب کر لیا۔ (سنہ ۶۸۶ھ، م سنہ ۱۲۸۵ء) وہ اٹھارہ سال

کا ناعاقبت اندیش لڑکا تھا اور شاید بادشاہی کا مطلب ہی یہ سمجھا کہ بے غل و غش عیش کیا جائے ۔ نوجوان بادشاہ کا یہ میلان بہت جلد ایسی ازخود رفتگی کے درجے کو پہنچ گیا کہ نہ صرف اُس کی صحت و حکومت برباد ہوئی بلکہ پایۂ تخت دہلی میں طوائف اور ڈوم دھاڑیوں کی کثرت سے عام بد اخلاقی پھیل گئی ۔ سلطنت کا انتظام پہلے ہی "داد بک" (یعنی وزیر عدالت) ملک نظام الدین کے قبضے میں تھا ۔ بادشاہ کی مدہوشی دیکھ کر وہ تاج و تخت حاصل کرنے کے منصوبے باندھنے لگا۔ کیقباد کے باپ بغرا خاں کو لکھنوتی میں یہ خبریں ملیں اور تحریری پند و نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا تو اشتیاق آمیز خط لکھ کر بیٹے کو بلایا۔ اور فوج لے کر خود بہار کی سرحدوں تک بڑھ آیا ۔ اُمرائے دہلی مجبور ہوئے کہ جنگی تیاری کے ساتھ بادشاہ کو اودھ لے چلیں ۔ یہیں سرو[1] ندی کے کنارے باپ بیٹے کی مُلاقات ہوئی۔ بُغرا خاں نے ناخلف بیٹے کی یہ شرط منظور کر لی کہ خراج گزار کی حیثیت سے دربار میں آداب بجا لایا ۔ تختِ شاہی کے قریب پہنچ کر "خاک بوسی" کے لیے جُھکنا چاہتا تھا کہ کیقباد سے نہ رہا گیا اور تخت سے اُتر کر باپ کے قدموں میں گر پڑا ۔ باپ نے گلے سے لگا لیا ؛ امیر خسرو رح کی بے نظیر مثنوی 'قران السعدین' انھی واقعات کا تاریخی مرقع پیش کرتی ہے ۔ باپ کے رو رو کے سمجھانے سے بادشاہ نے پرہیز و پارسائی کی قسمیں کھائی تھیں،

---

[1] سرجو یا گھاگرا

مگر واپس ہونے کے بعد راستے ہی میں توبہ توڑ دی۔ اور احمقانہ افراط کی وجہ سے بہت جلد "ضعیف و زرد" بلکہ فالج میں مبتلا ہو گیا۔ بلبن کے زمانے میں ترک امرا کی گروہ بندی اور قوت شکست کر دی گئی تھی۔ دو تین با اثر سردار باقی تھے انھوں نے کے قباد کی بجائے اس کے سہ سالہ فرزند شمس الدّین کیومرث کی بادشاہی کا اعلان کرایا اور اپنے خلجی رفیقوں کو مروا دینے کی سازش کی۔ مگر وہ کنواں جو اُن کے لیے کھودا تھا خود ہی اُس میں گر پڑے۔ ملک جلال الدّین خلجی کے رفیقوں نے تُرک امیروں اور بیمار و نزار کے قباد کا خاتمہ کر دیا اور چند مہینے اتالیقِ سلطنت رہنے کے بعد یہی آزمودہ کار سپہ سالار سلطنتِ دہلی کا مالک ہو گیا؛ (محرّم سنہ ۶۸۹ھ، م سنہ ۱۲۹۰ء)۔ [1]

---

[1] برنی نے جلال الدّین کی تختِ نشینی کی تاریخ سنہ ۶۸۸ھ لکھی ہے اور شاید کیومرث کی چند روزہ بادشاہی کو شمار نہیں کیا۔ تاریخِ فرشتہ میں سنہ ۶۸۷ھ اور بھی غلط ہے۔ لیکن امیر خسرو نے اپنی تاریخی مثنوی "مفتاح الفتوح" میں صراحتًہ مذکورہ بالا تاریخ سے خلجی بادشاہی کا آغاز کیا ہے۔ دوسرے شواہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

باب ششم

ابتدائی نظامِ حکومت اور تمدّن

اب مسلمانوں کو مغربی پاکستان سے بڑھ کر ممالک بھارت میں آتے ہوئے تقریباً ایک صدی گزر چکی تھی ۔ اُن کی دلیری اور وسیع فتوحات دُنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں ۔لیکن لڑائیاں جیتنے کے بعد اتنے بڑے رقبے اور کروروں نفوس کی آبادی میں حکومت قائم رکھنا بھی کچھ کم قابلِ تعجب کارنامہ نہیں تھا ۔ انگریز تاریخ نویس عموماً جہل و حسد سے ، یا فتنہ پردازی اور تفرقہ اندازی کے لیے واقعات کو مدت سے مسخ کرتے اور مسلمانوں کے دَورِ حکومت کو بُرے سے بُرے رنگ میں دکھاتے رہے ہیں ۔ وہ بھی کیا کریں : ؎

چشمِ بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر!

ان غلط بیانیوں کی تردید کرنے کی ہماری تاریخ میں گنجائش نہیں ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ صحت و احتیاط کے ساتھ حقیقتِ

حال کو سمجھنے اور سنبھالنے کی کوشش کریں ؛

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین اِل تُتمش کے انتخاب ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان کے تُرک اُمرا نے انھی ممالک میں مستقل سکونت رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور نہ کیا ہو تو بھی چنگیزی سیلاب آجانے سے ان کا ایران و توران سے رہا سہا تعلق منقطع ہو گیا۔ ان کے اکثر خاندان ہندستان کے اقطاع و بلاد میں بس گئے اور اکثر بسنے والوں نے یہیں کی بیویوں سے اپنے گھر بسا لیے۔ تاہم نو وارد فاتحین کی تعداد ابھی اتنی کم تھی کہ ان کا قیام ایک فوجی قبضے کی نوعیت رکھتا تھا اور ان کے نظامِ حکومت میں آخر تک عسکریت موجود رہی ؛

رائج الوقت اصول کے مطابق حکومت کا صدر و مختار کار شخصی بادشاہ ہوتا تھا۔ اس کا حُکم ناطق اور فرمان، قول فیصل مانا جاتا تھا جس میں چُون و چرا کی گنجایش نہ تھی۔ لیکن بادشاہی کا جو آیئن تُرک فاتحین غزنی و بُخارا سے ہندستان لائے، اس میں اُمرا یا فوجی سرداروں کا کافی دخل پایا جاتا ہے۔ ہر چند "بادشاہی" موروثی یا خاندانی منصب بن گئی تھی، نئے بادشاہ کا انتخاب اُمرا کے مشورے کے بغیر نہ ہوتا تھا۔ زیرِ نظر عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ جتنے موروثی بادشاہ تختِ دہلی پر بیٹھے، وہ سب چند ہی سال کے اندر نا اہل قرار دے کر معزول کر دیے گئے بجُز ناصر الدین محمود کے، کہ وہ بادشاہی کے

اختیارات سے خود ہی عملاً دست کش ہوگیا تھا۔

اُمرا کی مشاورت کے ضوابط کیا تھے۔ کس حیثیت کے امیر، کس طرح مشورہ کرتے اور ان کے فیصلوں کا نفاذ کیوں کر اور کس حد تک ہوتا تھا؟ اس بارے میں ہماری معلومات ناقص اور قیاسی ہیں۔ 'طبقات ناصری' میں ایک عہدہ دار "امیرِ مجلس" کا ذکر آتا ہے اور بعض عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مہماتِ امور میں اُمرا کو مشورے کے لیے جمع کرتا تھا۔[1] لیکن اوّل تو اُس کے اختیارات و فرائض سے ہم ناواقف ہیں۔ دوسرے بلبن کے زمانے سے اس کا نام سُننے میں نہیں آتا۔ اسی طرح اُمرائے "چہل گانی" کی جماعت گو سلطان شمس الدین کے عہد میں باضابطہ مرتب ہوئی ہو، بہ ظاہر آیندہ یہ سلسلہ جاری نہیں رہا۔[2]

عہدہ بادشاہی کی مجمل کیفیت سُناتے وقت، ایک اور حقیقت یاد دلانے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ ہندستان کے یہ پہلے

---

[1] دیکھو راورٹی کا انگریزی ترجمہ اور حواشی صفحہ ۶۳۴ و صفحہ ۷۴۳۔

[2] اُمرا یا ترکانِ چہل گانی سلطان شمس الدین کے غلام تھے جنھیں اس نے تربیت دے کر بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا تھا۔ ایسے پچیس "ملوکِ شمسی" کا "طبقاتِ ناصری" نے جداگانہ باب میں تذکرہ لکھا ہے۔ سلطان شمس الدین کے بعد سلطنت کے انتظام اور خود بادشاہوں کے عزل و نصب میں ان امرا کا بہت دخل رہا۔ مگر ان کے بعد کوئی ایسی جماعت نہیں بنی۔

ترک بادشاہ زر خرید غلام یا اُن کی اولاد میں تھے ۔ انگریزی تاریخوں میں اُن کو "خاندانِ غلاماں" کا خطاب دیا گیا ہے۔ لیکن غلاموں کا بار بار بادشاہی کے مرتبے تک پہنچنا، اور موروثی بادشاہوں سے زیادہ کام یاب رہنا ہی بیّن ثبوت ہے کہ اسلامی تعلیم نے غلامی کی نوعیت میں کیسی بنیادی اور کارگر تبدیلی کر دی تھی جس کا غیر مُسلم اقوام تصوّر ہی نہیں کرسکتیں۔ آج بھی مساوات پرست امریکہ میں یہ قرینہ نظر نہیں آتا کہ حبشی نسل کا کوئی "آزاد" امریکی باشندہ وہاں صدارت و امارت کے درجے تک پہنچ جائے گا۔ برخلاف ملّتِ اسلامی کے، جس کے بڑے بڑے اعیان و اشراف اپنے غلام بادشاہوں کے سامنے خوشی سے سرِ اطاعت خم کر دیتے تھے ... سلطنتِ دہلی میں یہ سلسلہ بھی ملوکِ شمسی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اگلے بادشاہ اگرچہ ادنا درجے سے بڑھے لیکن آزاد سپاہی تھے جیسا کہ اُن کے حال میں آیندہ ہم پڑھیں گے ✤

مرکزی عہدہ دار

بادشاہ کی ذاتی ضروریات، دربار، محل سرا، شاہی کارخانوں کے واسطے صدہا خُدّام ہوتے تھے۔ اِن سے قطع نظر، بہت سے عمّال مقرّر کیے جاتے کہ فوجی، دیوانی، عدالتی مقدمات بادشاہ کے حضور میں پیش کریں کیوں کہ اِن سب محکموں کا اعلا حاکم وہی تھا۔ یہ شاہی عہدہ دار اُن دنوں حاجب،

وکیل در، باربک وغیرہ ناموں سے یاد کیے جاتے تھے مگر ان کے فرائض اور مدارج و مواجب کی صراحت نہیں ملتی۔ دیگر ترک ممالک پر انھیں قیاس کرنا احتیاط کے خلاف ہوگا۔ بھارت کے حالات اور ضروریات مختلف تھیں۔ زمانۂ حاضرہ کی اصطلاح میں انھیں سکرٹری اور اے ڈی سی کے مماثل سمجھنا چاہئے۔ صدر حاجب یا امیرِ حجاب جسے آگے چل کر دبیرِ ممالک کہنے لگے، چیف سکرٹری کی طرح کا عہدہ دار ہوتا تھا۔

وزیر یا "نائب ممالک" کے اختیارات بہت وسیع پائے جاتے ہیں۔ مال گزاری کی وصولی، تقررات، تنخواہ یا جاگیر کا تعین بیش تر اسی کے ہاتھ میں تھا۔ خزانے کا بڑا عہدہ دار "مستوفیٔ ممالک" ہوتا، جو آمد و خرچ کا حساب کرتا اور بغیر اس کی تنقیح و تصدیق کے خزانے سے کوئی رقم اجرا نہ ہوتی تھی۔ دیوان کا لفظ ابھی تک عربی معنی ہی میں مستعمل تھا۔ یعنی "ایوانِ وزارت" یا محکمۂ مال کے معنی میں۔ عہدے کا نام نہیں بنا تھا۔

ملوک و امرا کے الفاظ عموماً فوجی حکام اور سپہ سالاروں کے واسطے بولے جاتے تھے۔ وزیرِ فوج کی قسم کے عہدے کا ذکر نہیں آتا۔ البتہ "عارضِ ممالک" بادشاہی افواج کی بھرتی اور وقت پر تیار رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ فوج کی تربیت، ساز و سامان کی فراہمی مختلف امیروں کے سپرد کر دی جاتی

تھی - فوجِ رکاب (یعنی شاہی باڈی گارڈ) کے پیادہ و سوار جنھیں پائک ، سرہنگ اور خاصہ‌دار کہتے تھے ، براہِ راست بادشاہ یا اس کے ذاتی غلاموں اور سرداروں کے ماتحت رکھے جاتے تھے ۔ کوتوالی ، نیز عدالتی اُمور کا وزیر "امیرداد" یا "داد بک" کہلاتا اگرچہ اسے مقدّمات فیصل کرنے سے سروکار نہ تھا ۔ یہ خدمت قاضیوں کے سپرد تھی اور سب سے بڑی عدالت کا حاکم قاضیٔ ممالک ، صدرِ صدور ، صدرِ جہاں اور کبھی کبھی شیخ الاسلام کے لقب سے ملقّب ہوتا تھا۔ اضلاع و بلاد میں قاضیوں کا تقرر۔ اور مقدّمات کا آخری فیصلہ وہی کرتا۔ دربار میں خاندانِ شاہی کے بعد سب عہدہ داروں سے بڑھ کر اسی کی عزّت کی جاتی تھی ۔ فیصلے عموماً فقہ حنفی کے مطابق کیے جاتے اور ان میں انتظامی عہدہ داروں کا مطلق دخل نہ ہوتا تھا ۔ ہندوؤں کو آزادی تھی کہ اپنے دیوانی اور فوج داری مقدّمات کا فیصلہ دیہی یا قومی پنچایتوں میں کریں ۔ اِن فیصلوں کے نفاذ میں حکومت ان کی درخواست پر یا ضرورت دیکھ کر مدد دیتی تھی ۔

پایۂ تخت (اور بڑے شہروں) میں ایک شاہی عہدہ دار کوتوال ہوتا تھا جس کے ماتحت فوجی پولیس کی جمعیت رکھی جاتی اور اسے کچھ انتظامی یا فوج داری کے اختیارات دے دیے جاتے لیکن شخصی مقدّمات لازماً قاضی کی عدالت میں پیش کرنے پڑتے تھے ۔ اور بلوائے عام یا ہنگامی صورتوں کے علاوہ قاضی کے

فیصلے کے بغیر کوئی سزا مجرم کو نہ دی جاتی تھی۔ محبس یا قید خانے کا انتظام بھی کوتوال سے متعلق تھا۔

صوبہ داروں کے حالات کی اطلاع دینے کے لیے صدر مقامات پر "برید" یعنی ڈاک کے عہدہ دار مقرر تھے۔ ان سب کا اعلا حاکم برید ممالک پایۂ تخت میں یا بادشاہ کے ساتھ رہتا۔ ڈاک کے باقاعدہ لانے لے جانے پر کافی توجہ کی جاتی تھی۔ بلبن کے عہدِ حکومت میں بنگالہ اور جاج نگر کی فوج کشی کے وقت بھی دہلی کی ڈاک ہفتے میں تین مرتبہ لشکر میں پہنچ جاتی تھی۔ شاہی ڈاک کے ساتھ اور لوگ اپنے خطوط روانہ کرسکتے تھے۔ اُمرا، صوبہ دار اور بڑے تاجروں کے ہرکارے ہر طرف الگ دوڑتے رہتے تھے۔[1] اور اس زمانے کی تاریخیں پڑھ کر یا مکتوبات کے مجموعے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے اندرونی علاقوں میں لوگ خاصی طرح خط کتابت کرسکتے تھے۔[2]

صوبہ دار یا مقطع

اگرچہ مال گزاری کی شرح اور محاصل کی منظوری مرکزی

---

[1] ڈاک کے انتظام کے متعلق ابنِ بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں صراحت سے لکھا ہے، اور ایسے جہاں گرد سیّاح کی تعریف یقیناً وزن رکھتی ہے۔ نیز دیکھو برنی ص ۸۷

[2] امیر خسروؒ، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور کچھ بعد کے مجموعہ مکاتیب ابھی تک محفوظ ہیں۔

حکومت دیتی تھی لیکن ہر جگہ اراضی کی پیمایش، تشخیصِ مال اور وصولی کا کام صوبہ دار کی نگرانی میں انجام پاتا۔ صوبے کے لیے زیرِ نظر عہد میں "اقطاع" اور صوبہ دار کی بجائے مقطع یا والی کی اصطلاح مروّج تھی۔ ان کے اختیارات اور مراتب میں کافی فرق پایا جاتا ہو جس کا سبب اُن کی ذاتی وجاہت اور اقطاع کی مختلف حیثیت ہوتی تھی۔ پایۂ تخت سے دُور کے اقطاع، جیسے بنگالہ یا مُلتان، بہت وسیع تھے۔ اِن کے والیوں کو اندرونی نظم و نسق کے علاوہ بیرونی دُشمنوں سے جنگ تک کا اختیار دے دیا جاتا تھا اور خطبہ و سکّہ کے سوا جو ہمیشہ بادشاہ کے نام کا رائج ہوتا، بعض صوبہ دار بادشاہوں کا درجہ رکھتے تھے، مرکزی حکومت خراج کی مقررہ رقم اور فوجی امداد لینے کے سوا، اندرونی معاملات میں عموماً دخل نہ دیتی تھی۔ چوں کہ صوبہ داروں کی نیک نامی اور آیندہ ترقی بلکہ ذاتی حشمت و اقتدار صوبے کی خوش حالی پر منحصر تھے لہٰذا وہ آبادی بڑھانے اور ویران علاقے بسانے میں کوشاں رہتے۔ چناں چہ ہم ہر صوبے میں جنگل صاف کرانے، زراعت و فلاحت میں ترقی دینے اور نئے شہر بسانے کے واقعات پڑھتے ہیں۔ بنگالہ میں جہاں کثرتِ باراں سے پانی کھڑا ہوجاتا تھا، مسلمان صوبہ داروں ہی نے بلند، سنگ بستہ پُشتے بنوائے تاکہ برسات میں آمد و رفت جاری رہے ورنہ پہلے راستے مسدود ہوجاتے اور یہ شکایت انگریزی دَور میں بھی کبھی کبھی سُنی جاتی تھی

کیوں کہ اسلامی عہد کے پُشتے مرمّت نہ ہونے کے باعث شکستہ اور بےکار ہو گئے۔ [1]

اقطاع کے اضلاع یا پرگنوں میں صوبہ دار انتظامی اور مال گزاری کے حاکم مقرر کرتا تھا۔ انھیں اُس زمانے میں نائب، خواجہ، متصرّف، شحنہ وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ سرکار و محال (یا ضلع اور تحصیل) کی باقاعدہ تقسیم کی نوبت نہ آئی تھی۔ حکومت کا بڑا کام امن و انتظام قائم رکھنا اور مقررہ محاصل و مال گزاری وصول کرنا تھا۔ یہ خدمت دیہات کے پٹیل، پٹواری، مقدّم اور چودھری جس طرح پہلے انجام دیتے تھے، اب بھی انھی کے تفویض رہی۔

ذرائع سفر، تجارت وصناعات

اُن دنوں ریل ایک طرف پکّی سڑکیں بھی نہ تھیں۔ سفر بڑی دیر میں طے ہوتے تھے۔ کچّے راستوں میں ہندُستان کی قدیم بیل گاڑیاں، چھکڑے اور باربرداری کے اونٹ، گھوڑے گدھے چلتے تھے۔ پالکی، سنگھاسن، چنڈول اور ہاتھی امیرانہ سواریاں تھیں۔ لیکن مسلمان امیروں نے ایسے دُوردم اونٹ اور گھوڑے سدھانے کا خاص اہتمام کیا تھا جو

---

[1] ان پُشتوں کے کھنڈر جگہ جگہ موجود ہیں۔ اس بارے میں محکمۂ آثارِ قدیمہ (بھارت) کی تحقیقات کا خلاصہ راورٹی نے 'طبقاتِ ناصری' کے حواشی میں تحریر کیا ہے۔ (ص ۵۸۶) متن کتاب میں ان کی تعمیر کے متعلق دیکھو ص ۱۶۲۔

ایک دن رات میں سو میل کی منزل معمولاً طے کر سکتے تھے۔ سوار فوجوں کے ساٹھ ستر میل روزانہ طے کرنے کی مثالیں ملتی ہیں لیکن لمبے سفر میں فوج کی منزل ۲۴، ۲۵ میل (روزانہ) سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ عام مسافر یا تجارتی قافلے اور بھی آہستہ چلتے اور ہر دس بارہ میل پر سرائے یا دیہات میں پڑاؤ کرتے جاتے تھے۔ آمد و رفت اور تجارتی یا فوجی باربرداری کے لیے جہاں دریا تھے، وہاں کشتیوں سے کام لیا جاتا تھا خاص کر دریائے سندھ میں بہت سی کشتیاں باہر کا تجارتی مال اندر اور یہاں کی دساور بحری بندرگاہوں تک لے جاتی تھیں۔ وہاں سے ایک طرف چین اور جزائرِ شرقی، دوسری طرف خلیج فارس اور بحرِ عرب کے سواحل تک بحری تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ برّی تجارت کے بڑے بڑے قافلوں کے مرکز اچھ اور ملتان بن گئے تھے جہاں سے وسطی اور مغربی ایشیا کا مال براہِ دہلی ہندوستان کے شہروں میں پہنچتا تھا۔[2]

اشیائے تجارت کی تفصیل اور مقدار و مالیت کا تخمینہ لگانا ممکن نہیں۔ البتہ شاہی دربار کے اسبابِ تجمل، امرا کے قیمتی ملبوسات، زیورات و ظروف، سامانِ آرائش اور اسلامی ملکوں کی نادر مصنوعات کثرت سے ہندوستان آتی

---

[1] طبقاتِ ناصری ص۳۲۳، راورٹی کا ترجمہ اور حواشی ص۸۵۱ و ص۸۶۴

[2] 〃 〃 ص۵۳

اور مُنہ مانگے دام پاتی تھیں۔ جب حکومت دہلی کو استحکام حاصل ہُوا تو انھی مُلکوں سے صنّاع اور کاری گر، خصوصاً اسلحہ ساز اور معمار نقلِ وطن کرکے دہلی آنے لگے۔ فتنۂ چنگیز نے اس مہاجرت کی رفتار کو بہت تیز کر دیا اور جہاں صدہا اشراف و اُمرا وطن چھوڑ چھوڑ کر ممالکِ بھارت و پاکستان میں آئے، وہاں ہزاروں مسلم پیشہ وروں کو بھی پناہ کی یہی جگہ نظر آئی کیوں کہ مُغل حملہ آور انھیں پکڑ پکڑ کر جبراً مغولستان لے جاتے تھے۔[1] ہندُستان آکر ان مہاجر کاری گروں نے اسلحہ سازی، شال بانی، زر دوزی، میناکاری وغیرہ اعلا صنعتوں کے بہت سے نئے کارخانے بنائے اور دہلی، اجمیر، بدایوں اور دُوسرے شہروں کی اسلامی عمارات بنانے میں حصّہ لیا۔

نئے اسلامی شہر

تجارت و صنعت بلکہ اسلامی تمدّن کا سب سے بڑا مرکز دار السلطنت تھا۔ مسلمانوں کے آنے سے پہلے دہلی ایک چھوٹی سی بستی تھی جس کا قلعہ ابھی تک "راے پتھورا" سے منسوب کرتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے ایک صدی کے اندر اُسے نہایت وسیع اور شان دار شہر بلکہ شہروں کا

---

[1] ممالکِ اسلامی میں صنّاعوں کی کثرت کا اندازہ اسی ایک واقعے سے ہوسکتا ہے کہ چنگیز خاں نے شہر سمرقند فتح کیا تو وہاں ان کا شمار تیس ہزار مرد کیا جاتا تھا۔ (راورٹی۔ حاشیہ ص ۹۷۹)

مجموعہ بنا دیا جو مہرولی کی پہاڑیوں سے لے کر موجودہ اوکھلے کے آگے تک پھیلا ہُوا تھا۔ اِن پُرانی "دہلیوں" کے کھنڈر ہی کوئی پچاس مربّع میل کا رقبہ گھیرتے ہیں۔ ان میں بہت سے آثار اُن قصور و محلّات کے ہیں جو بلبن کے بعد تعمیر ہوئے لیکن شہر کی عظمت کی بنیاد شمسی عہد ہی میں پڑ چکی تھی جب کہ فتنۂ مغول کے خانہ برباد ہزاروں کی تعداد میں یہاں آئے۔ فارسی تاریخوں میں پندرہ محلّوں کے نام لکھے ہیں جو ایسے امیر زادوں، شہزادوں سے موسوم ہوئے جنھوں نے مُلک بدر ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ یہ محلّے بجائے خود قلعے ہوتے تھے جن میں پیادہ و سوار کی جمعیت اور شاگرد پیشہ، تجّار و اہلِ حرفہ کی بڑی تعداد سکونت رکھتی تھی۔

مردم شماری کا اُن دنوں دستور نہ تھا۔ مگر ہم شہر کی کُل آبادی کا اندازہ سپاہیوں کی تعداد سے کر سکتے ہیں جنھوں نے دہلی میں گھر بنا لیے تھے۔ سلطان ناصرالدّین محمود کے زمانے میں ان کی تعداد دو لاکھ پیادہ اور پچاس ہزار سوار شمار ہوتی تھی۔[1] اب قیاس کرنا چاہیے کہ

---

[1] طبقاتِ ناصری، ص۳۱۷، راورٹی ص۸۵۶، عہدِ خلجی کے فوجی اعداد سے بھی جو ضمناً تاریخوں میں درج ہیں، مذکورہ بالا قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھو برنی ص۲۶۲ وغیرہ۔

ان کے اہل و عیال، متعلقین، ملازمین سب مِلا کر کتنے ہو جائیں گے؟ [1] تبین سے ساٹھ برس بعد افریقی سیاح ابنِ بطوطہ دہلی آیا تو اس نے بھی شہر کی بڑی تعریف توصیف کی حال آں کہ یہاں کی آبادی کا بڑا حصّہ چند سال پہلے سلطان محمد تغلق نے جبرًا دولت آباد دکن میں منتقل کر دیا تھا۔ اسی چودھویں صدی عیسوی میں پرتگیز سیاح اور سوداگر بنگالہ کے دارالحکومت لکھنوتی میں وارد ہوئے تو اس کی میلوں تک مسلسل آبادی دیکھ کر حیران ہو گئے اور اس شہر میں بارہ لاکھ "گھروں" کا اندازہ کیا۔ [2] لکھنوتی کے علاوہ مُلتان، اچھ، بداوں، اجمیر، بھکّر، دیپال پور اور لاہور (مغلوں کی تاراجی سے قبل) وغیرہ کئی مقامات کا ذکر آتا ہے جنھیں اس عہد میں مسلمانوں کے توطّن اور ذوقِ تعمیر نے بڑے بڑے شہر بنا دیا تھا۔

کُل آبادی، محاصلِ سلطنت کا تخمینہ اور سکّہ

تمام سلطنت کی آبادی کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں۔ اس بارے میں محاصلِ سلطنت کا تخمینہ کر کے کچھ قیاس دوڑا سکتے ہیں۔ زمین کی مال گزاری

---

[1] جہاں اتنی بڑی فوج فراہم ہو سکتی ہو، وہاں کُل آبادی کا تخمینہ دس لاکھ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہرات، بخارا اور عربی ممالک میں قاہرہ وغیرہ کئی بڑے شہروں کی اُن دِنوں آبادی کا اندازہ اسی کے لگ بھگ کیا جاتا تھا۔

[2] دیکھو راورٹی۔ حاشیہ ص۵۸۲۔

ں سے عُشر و زکوٰۃ اور غیر مسلموں سے جزیہ - یہی اس
ے کے اصلی ذریعۂ آمدنی تھے - دُوسرے محاصل عموماً
اور مقدار میں معمولی ہوتے تھے - بحری درآمد برآمد یعنی
ری کا محصول بھی غالباً شاہی خزانے میں داخل نہیں کیا
تھا بلکہ صوبہ دار ہی اسے وصول کرتے اور اپنے علاقے
حفاظتی انتظام کے ذمّہ دار ہوتے تھے - جزیہ صِرف
ے پیتے لوگوں سے لیا جاتا اور کم آمدنی والوں کے علاوہ
، پروہت وغیرہ مذہبی پیشوا مستثنا چھوڑ دیے گئے تھے۔
محاصلِ سلطنت کی مقدار تاریخ فیروز شاہی (سراجِ عفیف)
ملتی ہے - یہ اعداد، مُعتبر لیکن بلبن سے تقریباً سو برس بعد
ہیں جب کہ بنگالہ و بہار کے وسیع صوبے سلطنتِ دہلی
تحت سے نکل چکے تھے - عفیف کا بیان ہے (ص۲۹۳) کہ
ں سلطنت کی میزان "۶ کرور پچھتّر لاکھ تنکہ" تھی؛
یا تنکہ بہ معنی سفید، تُرکی لفظ ہے اور اُن دِنوں اسلامی
ت کا روپیہ، یعنی ایک تولہ چاندی کا سکّہ اسی نام سے
م تھا - سونے کی بارہ ماشی اشرفی کو بھی تنکۂ زر
لہ سُرخ کہتے تھے مگر زیادہ رواج اسی چاندی کے
، کا تھا جس کے چونسٹھ جیتل (یعنی آج کل کے
عنے) اور ہر جیتل کے چار فلوس یا دانگ (= دھیلے)
، تھے - محمّد تغلق نے دو جیتل کی دوگانی، اور
کی چہارگانی چلائی تھی جنھیں آج کل کی دوانی چونّی کا

نقشِ اوّل کہنا چاہیے ؂ ۱

اب اگر پونے سات کرور تنکہ آمدنی کا ہم اپنے زمانے سے مقابلہ کرنا چاہیں تو پہلے رُپے کی قوتِ خرید کو جانچنا ضروری ہوگا۔ سلطان علاءُ الدّین خلجی کے عہد میں اجناس کے جو سرکاری نرخ مقرّر ہوئے، اُن کی تفصیل آگے آئے گی، مگر اسی بنیاد پر یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ قوتِ خرید کے اعتبار سے بلبنی تنکہ ہمارے بیس بائیس رُپے (پاکستانی) کے برابر ہوتا تھا۔

صاحبِ طبقاتِ ناصری کو جاگیر میں ایک گاؤں ملا جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار جیتل تھی (ص ۲۹۵)۔ اس حساب سے پونے سات کرور تنکہ سرکاری مالیہ وصول کرنے کے لیے سوا لاکھ سے زیادہ گاؤں ہونے چاہییں۔ عہد علائی میں ایک گاؤں کی آبادی کا تخمینہ دو سو تا تین سو مرد کیا جاتا تھا۔ ؂۲ گاؤں کی پوری آبادی کم سے کم پان سو ماننی چاہیے اس طرح مغربی پاکستان اور شمالی بھارت کی مردم شماری کا ظنی تخمینہ پانچ کرور سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو موجودہ آبادی کا تقریباً ایک تہائی ہُوا۔ ضمناً یہ بھی قیاس کرسکتے ہیں، کہ

؂۱ اِن سکوں کے متعلق ہماری معلومات تشنہ ہیں۔ تاہم ایڈورڈ ٹامس نے بڑی محنت سے ان کا سُراغ لگایا اور اپنی تحقیقات "کرانکلز... کنگز" میں شائع کی ہیں۔ (ص ۴۹ و ص ۱۱۶ وغیرہ) نیز دیکھو الیٹ ج دوم ص ۲۴۲۔

؂۲ شمس سراج عفیف ص ۹۵۔

دیہات والوں کی فی کس آمدنی کا اندازہ ہمارے ساٹھ ستر روپے سالانہ سے کم نہ تھا۔ اور یہ اُس زمانے کے سادہ تمدّن اور قلیل ضروریات کے اعتبار سے نسبتہً خوش حالی کی دلیل معلوم ہوتا ہے ؛

عام مسلمانوں کی معاشرت

دیہات کی آبادی ابھی تک غیر مُسلم تھی۔ مسلمان شہروں یا بڑے قصبوں میں رہتے تھے جن کی نوعیت چھاونیوں کی سی تھی۔ ہندُستان میں توطّن اور ہندی بیویوں سے شادی کے باوجود وہ عام طور پر سپاہی پیشہ تھے۔ زمانۂ امن میں بھی تیر و شمشیر کی مشق کرتے، گھوڑے دوڑاتے، شکار کھیلتے، کُشتیاں لڑتے، جفاکشی، مشقت آموزی کے مشغلوں سے دِل بہلاتے تھے۔ ملوک و اُمرا کو چھوڑ کر، عام مسلمانوں کی معاشرت* زمانۂ حاضرہ کے معیار سے دیکھیے تو بہت سادہ اور معمولی نظر آئے گی۔ پُرانی دہلی کے کھنڈروں میں اِدھر اُدھر، اور دولت آباد (دکن) میں یک جا، شکستہ گھروں کو غور سے معائنہ کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تازہ وارد مسلمان مختصر مکانوں میں رہتے تھے۔ اِن میں عموماً اکہرا یا دوہرا دالان، دونوں طرف حجرے، صحن چیاں، سامنے چھوٹا مگر خاصا روشن، ہموار صحن، مقابل کی طرف باورچی خانہ، طہارت خانہ اور ڈیوڑھی، جس سے مردانہ نشست کا کام لیا جاتا تھا۔ مکانوں سے ملحق اصطبل نہیں پائے گئے۔ حال آں کہ یہ سپاہی پیشہ، زیادہ تر سوار ہوتے اور

ہر ایک کے پاس دو یا کم سے کم ایک گھوڑا رہتا تھا، ضرور ہے کہ ان کے گھوڑوں کے لیے چھاؤنی یا محلّوں میں مشترکہ اصطبل ہوں گے ۔ گھروں میں کہیں کہیں چھوٹے حوض بنے ہیں ۔مگر اندر غسل خانے بنانے کا دستور نہ تھا ، البتّہ ہر بستی میں بڑے بڑے حمّام ضرور ہوتے جن میں حجامت ، مالش اور اکثر ورزش کا بھی انتظام کیا جاتا اور معمولی اُجرت پر ہر شخص کو گرم پانی سے مَل مَل کر نہلایا جاتا تھا ۔ مسجدوں میں غسل خانوں کا رواج شاید کچھ عرصے بعد ہُوا مگر ان میں وضو کے بڑے حوض اور پختہ کنوئیں عموماً عمارت کے ساتھ بنائے جاتے تھے ۔ چھوٹی بستی میں بھی مسجدیں پختہ اور فراخ تعمیر کی جاتیں ۔ بڑی مسجدوں کے متعلق اکثر مدرسے ، اور طلبہ اور اساتذہ کے رہنے کے حجرے بنے ہوتے تھے ۔ پایۂ تخت دہلی اور بلاد سندھ میں کئی بڑی درس گاہوں کا ذکر آتا ہے جہاں علومِ دین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی ۔ عدالتی عہدوں کے لیے ایسے مدارس کا سند یافتہ ہونا ، کام یابی کی ضمانت تھی لہٰذا یہ مدرسے طلبہ سے معمور رہتے ۔ ان میں اکثر طلبہ کے خورد و نوش کا سرکاری طور پر انتظام تھا ۔ تعلیم کی کوئی فیس یا اُجرت نہ لی جاتی تھی ۔

تعلیم کی ایسی ارزانی اور آسانی کے باوجود عام مسلمان سپاہی زادے ، معمولی نوشت و خواند ، قرآن خوانی اور چند ضروری مسائل سیکھ لینا کافی سمجھتے تھے ۔ دُنیاوی علوم یا ادبیات پڑھانے

کی عام درس گاہیں نہ تھیں۔ سلاطین و اُمرا اپنے بچّوں کی ایسی تعلیم کا اپنی ڈیوڑھیوں میں انتظام کرتے تو وہ بھی فارسی ادبیات تک محدود ہوتی تھی۔ رزمیہ کلام (خصوصًا شاہ نامہ، فردوسی، سکندر نامہ نظامی) قدرتی طور پر جنگ جُو تُرکوں میں مقبول تھا۔ مگر تعلیم یافتہ طبقے میں قصائدِ فارسی اور قریب العصر اُستاد حضرت سعدی رح کے قدردانوں کی کمی نہ تھی اور جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، ممالکِ بھارت میں شعر و سخن کا خاصا چرچا ہو گیا تھا۔ دیگر ترکی ممالک کی طرح یہاں کے مسلمانوں کی ادبی اور درباری زبان بھی فارسی تھی ؛

ایک اور مقام جہاں عوام یا متوسّط درجے کے شہری جمع ہوتے، کارواں سرائیں تھیں۔ ہر اسلامی آبادی میں یہ نہایت وسیع اور پختہ بنائی جاتیں بلکہ نئے شہر آباد کرنے کی شرط ہی مسجد و سرا کی تعمیر ہوتی تھی۔ یہاں ہر طرف کے مسافر، تاجر، سیّاح آتے اور مختلف مقامات کی خبریں سُناتے۔ سانگ، تماشے، کشتیاں، کھیل اکثر انھی کے وسیع صحنوں میں کھیلے جاتے تھے۔ قہوہ و چائے کا رواج نہ تھا لیکن شربت، فالودے کی دُکانیں عمومًا ان سراؤں کے ساتھ ہوتیں اور ہندُستان میں جہاں آٹھ مہینے گرمی پڑتی ہو، یہی مشروبات مقبول تھے۔ بڑی دعوتوں کا انتظام بھی سراؤں میں آسانی سے ہو جاتا تھا۔ حلوائیوں، نان بائیوں کی دُکانیں متصل ہوتی تھیں اور یہ پیشے معاشری اور مالی اعتبار سے خاص معزز خیال کیے جاتے تھے کہ میرحسن یا

(امیر حسن) سجزی جیسے مہذب، فاضل لوگ یہ پیشہ کرتے تھے"۔

مسلمانوں کے کھانے میں اُن دِنوں گوشت کی مقدار زیادہ ہوتی تھی مگر چٹ پٹے یا مصالحہ دار مرغن کھانوں کا زیادہ رواج نہ ہُوا تھا حتیٰ کہ قورمہ، پلاؤ، متنجن کا بھی عصری کتابوں میں کم ذکر آتا ہے حالاں کہ نام ہی چُغلی کھاتے ہیں کہ یہ کھانے تُرکی تھے۔ برخلاف اس کے عام کھانوں میں تُتماج (ایک قسم کی یخنی) سکبا (کئی گوشتوں کا شوربا) اشکنبہ (= اوجھ) ہریسہ اور اسی قسم کے سادہ سالن پسند کیے جاتے تھے۔ توے کی پتلی چپاتی شاید بالکل نہیں چلی تھی۔ تنوری نان کا عام رواج تھا۔ پھلوں میں "ہندستان" ہمیشہ سے ہیٹا رہا۔ مسلمان اُمرا نے انگور و انار وغیرہ کاشت کرنے کی شروع سے کوشش کی مگر کوئی نمایاں کام یابی نہیں ہوئی اور یہ لطیف پھل ولایت سے تازہ آنے مشکل تھے۔ بھارتی مسلمانوں کو وہاں کے خشک میوے اور مغزیات پر قناعت کرنی پڑتی تھی۔ البتّہ وہ یہاں کے پھلوں اور آم کو ترقّی دینے پر متوجّہ ہو گئے تھے"۔ [1]

نو وارد مسلمانوں کو ایک اور تبدیلی اپنے لباس میں کرنی

---

[1] فوائد الفوائد میں حضرت سلطان المشائخ رح کا قول نقل کیا ہے کہ بداؤں میں سلطان شمس الدّین اِل تُتمش نے آم کھایا۔ اور چوں کہ یہ نام ترکی زبان میں فحش معنی رکھتا ہے، اسے "نغزک" لقب دیا جو سال ہا سال تک مروّج رہا۔ (ص۲۱۳) اس نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو یہ پھل بہت پسند آیا۔

پڑی ۔ چلّے کے جاڑوں میں وہ صرف چند ہفتے پوستین اور اونی لباس پہن کر توران و خراسان کی یاد تازہ کر لیتے ہوں گے ۔ ورنہ نئے دیس میں آٹھ نَو مہینے ہلکا سوتی کپڑا پہنے بغیر چارہ نہ تھا ۔ یہاں کی غیر مسلم اقوام کی کم لباسی بلکہ نیم عُریانی اُن کے مذاق کے خلاف تھی ۔ ہم عام طور پر اُنھیں شلوار یا اونچا پاجامہ اور ڈھیلے کُرتے پہنتے دیکھتے ہیں ۔ بانکے ترچھے انگرکھے اور چُست اچکنوں کی وضع بعد کی جدّتیں ہیں ۔ زیرِ نظر عہد میں علما اور مشائخ ، چُغے اور جُبّے ۔ ملوک و اُمرا ، قبائیں ، کُھلے گلے کے نیمے اور عوام تنگ آستین کی ڈھیلی اچکنیں یا عبائیں ، وہ بھی شادی بیاہ اور عیدین پر استعمال کرتے تھے ۔ ورنہ فوجی سپاہیوں کی بالائی پوشِش صرف چلتے ، دگلے ، نیم آستین (مرزئی) کی قِسم کے لباس تھے ۔ جاڑوں میں روئی کی فُرغل چل گئی تھی ۔ شال ، دوشالے ، الوان ، کا عام رواج غالباً کچھ مدّت کے بعد ہُوا ہے ۔ بہرنوع ، یہ یقینی ہے کہ مسلمانوں کے ہندُستان میں بس جانے سے یہاں پارچہ بافی (اور خیاطی) کو بڑی ترقّی ہوئی ۔ ایک طرف روئی کی کاشت بڑھی ۔ دوسری طرف ہزاروں افراد سوت کاتنے ، کپڑا بُننے کا روزگار کرنے لگے ۔ سوتی کپڑا نہ صرف پوشاک بلکہ بستر ، فرش فروش ، عمامے ، چادر ، رومال کے لیے بھی درکار ہوتا تھا ۔ اُمرا کے قالین ، غالیچے اور کارچوبی مسندوں کا

ذکر نہیں ۔ عام گھروں میں جاجم اور گدّے کی نشست تھی۔ پھر سفید چاندنیاں ، خاص کر شادی بیاہ ، مولود وغیرہ کی محفلوں میں بچھنے لگیں ۔ تخت چوکی ، پلنگ ، پر بھی اسی قسم کا فرش بچھتا تھا ۔ میز کرسی ، کوچ ، سوفے کا مطلق رواج نہ تھا اگرچہ خلجی اور تغلق بادشاہوں کے محل میں ہم مونڈھوں کا چلن ہوتا سُنتے ہیں ؛

مسلمانوں کی آبادی

پارچہ باف بھی ہندو نظامِ معاشرت میں ایک جُداگانہ نیچ "جاتی" (ذات) قرار دیے گئے تھے ۔ مسلمانوں سے جب ان کا معاشی رابطہ بڑھا تو سب سے پہلے یہی لوگ اسلامی دائرے میں کھنچ آئے اور ان میں مذہب اسلام کی اتنی اشاعت ہوئی کہ اب "ہندستان" میں پارچہ بافوں کی اکثریت مسلمان ہے ۔ اسی طرح دُوسرے پیشہ ور جنھیں ہندوؤں نے ذلیل اور کمین بنا رکھا تھا ، آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگے ۔ یہ قدرتی اور معاشی اسباب تھے جن سے مسلمانوں کی تعداد میں آیندہ اضافہ ہُوا ، ورنہ زیرِ نظر عہد میں اُن کے مردوں کا شمار تخمیناً دس لاکھ سے زیادہ نہ ہوگا اور بلبن کے زمانے تک اُن کی مجموعی آبادی (مغربی پاکستان کو چھوڑکر) کم و بیش تیس لاکھ قیاس میں آتی ہے ۔ اگرچہ یہ سب غیر ہندی نسل کے ذکور یا اُنھی کی اولاد پر مشتمل تھی ۔

بیرونی قوموں میں بھی ، خالص ترکی عنصر کم ہوتا جاتا تھا ۔

چنگیز خانی حملوں کے بعد ترکستان کے باشندوں کی درآمد اور بھی کم ہو گئی ۔ قطب الدین ایبک کے وقت سے تُرک سردار و سپاہی کی ہندستان میں بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی ۔ تقریباً ایک صدی تک بادشاہی اور سیاسی اقتدار انھی ترک امیروں کے ہاتھ میں رہا ۔ لیکن جب وہ مخلوط ہوتے اور گزرتے گئے اور تازہ ولایت تُرک جانشینی کے لیے میسّر نہ آئے تو دُوسرے عناصر کو غلبہ ہُوا جن میں غور و ہرات کے خلجی نمایاں تھے کہ نسلاً تُرک مگر وطناً غوری یا خراسانی مانے جاتے ہیں ۔ ملوکِ شمسی کا انھی کے ہاتھوں خاتمہ ہُوا اور اس اعتبار سے کہ سلطنتِ "ہندستان" کا اصل بانی مُعِز الدین غوری تھا ، یہ تقدیر کی بے انصافی نہ تھی کہ فراختائی تُرکوں کی بجائے بالآخر غوری ترکوں کو تختِ دہلی کا وارث بنا دیا ؟

باب ہفتم

اسلامی علوم اور ادبیات

اسلامی سپہ سالاروں کے پیچھے پیچھے علمائے اسلام، قضاۃ اور بزرگانِ صوفیہ کا گروہ ممالکِ بھارت میں داخل ہوا۔ غزنوی عہد کے دو تین بزرگوں کا جو لاہور میں آئے، اوپر ذکر آچکا ہے۔ چھٹی صدی ہجری (بارھویں عیسوی) کے آخر میں جب ایبک اپنے نئے پایۂ تخت دہلی کی تعمیر کر رہا تھا، خواجہ معین الدین اجمیری رح نے سلطنت کے جنوبی سرے کو اپنا مسکن بنایا اور بت پرستی کے اِس گڑھ میں بیٹھ کر توحید کی وہ آگ سلگائی جس کی حرارت ابھی تک اہلِ شوق کے دِل گرماتی ہے۔ حضرت رح کے بہت سے خلفا نے بھی آپ کی پیروی کی جن میں قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بدرالدین غزنوی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہم کے اسمائے گرامی قطب تارے سے زیادہ روشن ہیں۔ ملوکِ شمسی ہی کے

میں شیخ بہاءُ الدّین زکریا رہ مُلتان میں اور شیخ فریدالدّین
شکر رہ پاک پٹن میں تزکیۂ نفوس اور معرفتِ الٰہی کی دہ
دینے میں مصروف رہے جس کے فیوض شمالی بھارت
پاکستان کے ہر گوشے میں پھیل گئے ۔ اسی دَور کے اواخر
شیخ نظام الدّین اولیا رہ کی بابرکت مجلس، پایۂ تخت دہلی
مرجع انام بنی اور ہزاروں اشخاص ، عام و خاص آپ
رُوحانی کمالات سے فیض یاب ہوئے ؛ اس رُوحانی
ں کا دائرہ مسلمانوں ہی میں محدود سمجھنا چاہیے ۔ غیرمسلموں
دین کی تبلیغ کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا ۔ تبلیغ ایک
ں ، اس بات کا بھی تاریخی ثبوت نہیں مِلتا کہ ہمارے
یا صوفیہ براہِ راست بھارتی باشندوں میں جاتے اور اُن
رابطہ پیدا کرتے تھے ۔ اس کام میں بھارتی زبانوں سے
قفیت ہی بڑی رُکاوٹ تھی اور جہاں تک معلوم ہوسکا
ں یہ مذہبی پیشوا نہ یہاں کی مقامی بولیاں اچھی طرح
تے تھے نہ سیکھنے پر کوئی خاص توجہ فرماتے تھے ۔ البتہ
بزرگوں کا ہندستان کے شہروں میں توطن اور ستودہ
ت و اطوار کا اثر پڑے بغیر نہ رہتا تھا جس کے
اسطہ نتائج آیندہ ظہور میں آئے ؛

بزرگانِ صوفیہ کے حالات میں بہت سی کتابیں اور
ے لکھے گئے اور خود ان کی کئی تصانیف ہم تک پہنچی
ں ۔ "کشف المحجوب" ، کا تیسرے باب کے آخر میں ذکر آچکا

ہی۔ ساتویں صدی کے چشتی اولیا کے ملفوظات اور اشعار کے چند مجموعے ملتے ہیں۔ اِن کی صحت مشتبہ ہی بجز چند رسائل کے جو قاضی حمید الدّین ناگوری رح نے لکھے تھے۔ ان میں "لوائح" اور "طالع شموس" کافی مشہور ہیں۔ قاضی صاحب بڑے عالم فاضل شخص تھے مگر "مشربِ وجد و سماع" اُن پر غالب تھا۔ اپنی کتابوں میں معارفِ تصوّف بھی "بہ زبانِ عشق و ولولہ" بیان کرتے ہیں[1]۔ 'فوائد الفوائد' میں حکایت لکھی ہی کہ ایک مرتبہ شیخ فرید الدّین رح کو قوّال نہیں ملے تو حکم دیا کہ قاضی حمیدالدّین کا مکتوب لاکر پڑھا جائے۔ پہلی ہی سطر سُنائی گئی تھی کہ شیخ رح پر وجد طاری ہوگیا اور بار بار یہ رُباعی جو مکتوب میں تھی دُہراتے تھے ؎

آں عقل کُجا کہ در کمالِ تو رسد　　آں روح کُجا کہ در جلالِ تو رسد
گیرم کہ تو پردہ بر گرفتی زجمال　　آں دیدہ کُجا کہ در جمالِ تو رسد؟

'فوائد الفواد'

یہ کتاب زیرِ نظر عہد کے بعد لکھی گئی لیکن سلطان المشائخ شیخ نظام الدّین اولیا رح کا ابتدائی زمانہ ملوک شمسی کے دَور میں گُزرا ہی۔ انھی کے ملفوظات امیرحسن دہلوی نے اِس نام سے جمع کیے ہیں۔ کتاب شروع سے مقبول رہی۔ اسی لیئے بہت ممکن ہی مطبوعہ نسخوں میں اغلاط یا الحاق ہو گئے ہوں،

---

[1] اخبار الاخیار صک۳۔

لیکن مجموعی طور پر اس کی صحت مسلّم ہے۔ امیر حسن رح اکثر جُمعے کے جُمعے حضرتِ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان صحبتوں میں حضرت جو گفتگو فرماتے، اُسے گھر آکر قلم بند کر لیتے تھے۔ دو تین مرتبہ یہ مجموعے خود حضرت کی نظر سے گزُرے اور آپ نے لکھنے کی اجازت دی۔ یہ سلسلہ سنہ ۷۰۷ھ سے شروع ہُوا اور کئی طویل وقفوں کے ساتھ سنہ ۷۲۲ھ تک جاری رہا۔ مولّف اپنے زمانے کے نامور شاعر، صاحبِ قلم تھے۔ پیر کی با برکت صحبت کا حال اور سبق آموز اقوال، جن میں جگہ جگہ مفید تاریخی یا سوانحی روایات آجاتی ہیں، اس خوبی سے نقل کیے کہ آنکھوں میں نقشہ پھر جاتا ہے۔ آئیے ہم ان کی زبان سے حضرت سلطان المشائخ رح کے کچھ ارشاد سُنیں:—

«آدینہ۔ پنجم ماہِ شوّال (سنہ ۷۰۷ھ)

بعد از نماز دولت پائے بوس حاصل شُد۔ سخن در ترک و تجرید اُفتاد و در اثنائے آں فرمود کہ درویشے بود در غایت فقر و مسکنت۔ شکم او از غایت گرُسنگی باپُشت چفسیدہ، در راہے می رفت۔ خواجہ محمد پتوہ کہ یارِ ماست یک دانگ پیش او نہاد۔ او جواب داد کہ من امروز کُنجارہ* سیر خوردہ ام۔ مرا امروز بدیں دانگ حاجت نیست۔ بعد ازاں خواجہ (ذکرہ اللّٰہُ بالخیر)

---

* چاول یا مکئی کی کھیلیں۔

در رغبتِ صدق او تعجب می کرد و می فرمود کہ نہے قناعت و قوت وصبر . . . . . . "

(۲۸ دوشنبہ بست و پنجم جمادی الاوّل سنہ ۷۰۸ ھ)

دولتِ پاے بوس حاصل شُد ۔ سخن در فضیلت اِطعام اُفتاد ۔ بہ لفظِ مبارک راند کہ نیکو چیزے ست طعام بہ خلق دادن ۔ در اثناے آں فرمود کہ خواجہ علی پسر خواجہ بزرگ رکن الدین (رحمۃ اللہ علیہم بالخیر اجمعین) در خروجِ کفار تتار گرفتار شدہ ۔ اُو را پیش چنگیز خاں بُردند۔ یکے از مریدانِ آں خانوادہ آں جا حاضر بود ۔ ہمانا کہ آں جا شکنتے داشت ۔ چوں خواجہ علی را اسیر دید، حیراں ماند ۔ با خود اندیشید کہ طریقِ خلاص او چگونہ باشد، و او را بچہ نوع پیش چنگیز خاں ذِکر کنم ؟ اگر گویم کہ از دودمانِ کرامت و بزرگی ست ، او چہ داند ؟ و اگر ذِکرِ طاعت و عبادت کنم ، ہم موثر نیامد ؛ بعد از تاملِ بسیار پیش چنگیز خاں رفت و گُفت : پدرِ ایں مرد بزرگے بود ، طعام بہ خلق دادے ۔ او را خلاص باید کرد ۔" چنگیز خاں گفت : طعام ، خلقِ خود را دادے یا خلق بیگانہ را ؟ آں مرد گفت : خلقِ خانہ را ہر کس طعام دہد امّا پدرِ ایں ، خلق بیگانہ را طعام دادے ۔" چنگیز خاں ازیں خوش شد کہ بزرگ کسے بود کہ خلقِ خُدا را طعام می دلو۔ پس در حال فرمود کہ او را مخلص کنند ۔ خلعتے ہم بداد د

عذر خواست بعد ازاں خواجہ (ذکر اللہ بالخیر) فرمود کہ طعام دادن در کُل مذاہب پسندیدہ است ۔ ۔ ۔ ۔ "

" چہارم ماہِ مبارک رمضان، عمّت میامنہ (سنہ ۷۱۷ھ) بہ سعادتِ پائے بوس رسیدہ شُد ۔ متعلّمے بیامد ۔ خواجہ (ذکر اللہ بالخیر) از حالِ او استکشافے کرد ۔ گفت : من تحصیل کردہ ام ۔ بہ درِ سرائے* آمد و شد مے کنم تا مرا نانے و فراغتے میسّر آید ۔" چوں او بازگشت خواجہ (ذکر اللہ بالخیر) ایں دو مصرعہ بہ زبانِ مبارک راند : ؎

شعر در وصفِ حال بس سرہ ایست

چوں بہ خواہش رسید مسخرہ ایست

آں گاہ گفت : شعرے چیزے لطیف است، امّا چوں مدح می کنند و بر کسے می برند، سخت بے ذوق است ۔ و علمِ ہم چناں بہ نفسِ خویش بس شریف چیزے است امّا چوں آں را کسب می سازند و بہ در ہا می روند، عزّت آں می رود ۔" دریں میاں غلامے ہم از مریداں رسید و یک ہندوے برابر خود آوردہ گفت کہ ایں برادر منست ۔ چوں ہر دو بنشستند خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) ازاں غلام پرسید کہ ایں برادر تو ہیچ میلے بہ مسلمانی دارد ؟ او عرض داشت کرد کہ بہ جہت ایں معنی آوردم تا بہ برکتِ مخدوم مسلماں شود ۔ خواجہ (ذکرہ اللہ بالخیر) چشم پُر آب کرد و فرمود کہ ایں قوم چُناں بہ گفتِ کسے دل نہ گردد ۔ امّا اگر صحبتِ صلحے بیابد

* یعنی سرکاری دفتر

امید باشد کہ بہ برکت او مسلماں شود ۔ ۔ ۔ ۔ "

علوم شریعت

یہ سالکانِ طریقت نہایت راسخ العقیدہ عابد و زاہد مسلمان تھے اور ابھی تک منصب ارشاد کا اہل صرف انھی حضرات کو سمجھا جاتا تھا جنھوں نے علومِ شریعت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہو۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کا یہ قصّہ تاریخوں میں مذکور ہے کہ نوجوانی میں خواجہ قطب الدینؒ سے ملتان میں ملے تو جوش میں آکر فوراً ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ مگر حضرت نے روک دیا اور تاکید کی کہ پہلے علومِ دین کی تکمیل کر لو پھر طریقت کے کوچے میں قدم دھرنا کیوں کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ "مُرید بے علم مسخرۂ شیطان است"۔[1] زہد وتقویٰ کے ساتھ علمی فضیلت کا یہ بلند معیار تھا، جو صوفیہ اس پر پُورے اُترتے، اُن کی بڑی عزت و حُرمت کی جاتی۔ اُن کی خدمت کرنا ثوابِ دارین کا موجب سمجھا جاتا تھا۔ ان کی خانقاہیں رُوحانی تعلیم کے بارونق مدارس بن گئی تھیں۔

---

[1] لکھنوتی کے شیخ سراج الدین عثمانؒ کا تذکرہ آتا ہے کہ مدّت تک سلطان المشائخؒ کے حضور میں رہے۔ حضرت چاہتے تھے کہ انھیں کلاہِ خلافت عطا فرمائیں مگر وہ صاحبِ علم نہ تھے اس لیے تامّل فرماتے تھے۔ آخر مولانا زرادی نے ایک صرف نحو کی کتاب خاص شیخ عثمان کے واسطے تالیف کی اور چند مہینے میں عربی زبان پڑھا دی، تب سلطان المشائخ نے خلافت کی سند دے کر بنگال روانہ کیا۔ (اخبار الاخیار ص۸۴)

اسی کے ساتھ، مسلمان سلاطین و اُمرا علومِ ظاہری کی تعلیم کا نہایت فیاضی سے اہتمام کرتے کہ ہر طالب علم بلا خرچ دینی علوم حاصل کر سکتا تھا۔ درس گاہیں عموماً مسجدوں میں یا ملحق تعمیر کی جاتیں۔ ان کی نگہداشت اور معلّمین و طلبہ کے ضروری مصارف مدرسہ بنانے والوں کے ذمّے ہوتے اور اکثر بڑی بڑی جاگیریں اسی غرض سے وقف کر دی جاتی تھیں۔ ذی ثروت افراد اپنے گھروں میں معلّمین کو مقرّر کر لیتے اور ان کی اولاد کے ساتھ دوسرے لڑکے بھی ان خانگی مدارس میں تعلیم پاتے تھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اُس زمانے میں تعلیم کی مقدّم غرض یہ تھی کہ آدمی صحیح اخلاق و عقائد سے بہرہ مند ہو۔ لہٰذا مدارس عام ہوں یا خانگی ان میں بیش تر علومِ دین اور اخلاقیات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ممالکِ بھارت میں بستے ہی جنگ آزما مسلمانوں کا تقریباً ہر شہر میں بڑی بڑی درس گاہیں قائم کرنا اور اُن سے صدہا علما و فقہا کا تعلیم پاکر ہر طرف پھیل جانا، لائقِ تعجّب اور اس بات کی دلیل نظر آتا ہے کہ ابھی تک مسلمانوں میں علم کی کتنی وقعت اور تحصیل کا کیسا شوق تھا۔ تاریخوں میں اُچھ کے دارالعلوم "فیروزی" دہلی کے شاہی مدرسہ "ناصریہ"، مُلتان، بداؤں، کڑہ، لکھنوتی، کے بڑے مدارس کا تذکرہ آتا ہے جہاں اُس زمانے کی اعلا تعلیم اور فضیلت کی سند دی جاتی تھی۔ ان سند یافتہ بھارتی مسلمانوں میں بعض مشہور اُستاد، فقہا اور صاحبِ تصنیف علما گزرے ہیں

اور اسلامی حکومت کی اسی پہلی صدی کے بھارتی مصنفوں میں امام رضی الدین صغانی، خاص طور پر لائق ذکر ہیں کہ اُن کے علم و فضل کو اسلامی مُلکوں میں دُور دُور تسلیم کیا گیا۔ وہ بھی حضرت سلطان المشائخ رح کی طرح بداوں میں پیدا ہوئے تھے۔ خاصی بڑی عمر میں بغداد جا کر علومِ دین کی تکمیل کی اور وہاں حدیث کا درس بھی دیتے رہے۔ ان کی تالیف "مشارق الانوار" حدیث کی نہایت مفید و معتبر کتاب مانی جاتی ہو۔ قبولیت کا اسی سے اندازہ کیجیے کہ دسویں صدی ہجری تک اُس کی ۲۴، ۲۵ شرحیں اور حواشی لکھے گئے جو بجائے خود مستقل کتابیں ہیں[۱] ان کی اور بھی کئی تصانیف تھیں۔ سنہ ۶۵۰ھ میں وفات پائی۔

اِس عہد کے تاریخی ماخذ (۱) 'طبقاتِ ناصری'

ہر مسلمان کشورکُش کے عَلَم کے ساتھ، کسی نہ کسی مورّخ کا قلم چلتا تھا۔ جو بادشاہ زیادہ عرصے تک حکمراں و کامراں رہے، ان کے حالات بھی عموماً زیادہ وضاحت سے محفوظ ہیں۔ مگر یہ تاریخیں بیش تر "جنگی وقائع" کی شان رکھتی ہیں۔ جن میں بادشاہوں کے رزمیہ کارنامے درج ہیں۔ کسی رفاہی کام، درباری جشن و جلوس، بادشاہ کے ذاتی اوصاف و مشاغل کا بھی

---

[۱] 'کشف الظنون' ج اوّل ۱۷۱۳۔ 'مآثر الکرام' میں انھیں سہواً "لاہوری" لکھا ہو، ہمارا مستند ماخذ 'فوائد الفواد' ہو۔ 'مشارق الانوار' کا ایک محشّٰی اُردو ترجمہ چھپ چکا ہو مگر مترجم کو غالباً معلوم نہ تھا کہ صاحب کتاب ہندوستان کے آدمی ہیں۔

ذکر آ جاتا ہے۔ غیر معمولی حادثات، قحط و وبا، زلزلے ضمناً مذکور ہیں۔ عام اہلِ ملک سے مورخ سروکار نہیں رکھتا۔ ملکی تجارت، صنعت و حرفت، بلکہ حکومت کے نظم و نسق پر بھی ان کتابوں سے بہت کم روشنی پڑتی ہے اور مجموعی طور پر، ان سے زمانۂ حال کے تاریخی ذوق کی سیری نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات ناظرین غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چناں چہ انگریز کے عہدِ حکومت میں ہندستان کی جو تاریخیں لکھی گئیں اور مدارس کے نصاب میں داخل ہیں، ان میں کُشت و خون کی مسلسل روایتوں کے سوا کچھ نہیں نظر آتا۔ انگریز تاریخ نویس دوسری ہم عصر تصانیف کی تلاش اور مطالعے کی زحمت نہیں اُٹھاتے۔ بعض نے یہ غضب کیا کہ جن ماخذوں سے اپنی تاریخیں مرتب کیں، انھیں بھی صحت یا دیانت داری سے نقل نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ ان انگریزی کتابوں میں جا بہ جا فاحش غلطیاں پائی جاتی ہیں اور وہ اکثر ایسے اجنبی سیّاح کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں جو مُلک سے واقف ہے نہ اہلِ مُلک سے بلکہ محض چند روزہ گشت لگا کر بیش تر سماعی روایات اور ذاتی تاثرات قلم بند کرتا چلا جاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ انقلاباتِ روزگار نے عہدِ گزشتہ کی صدہا قلمی کتابوں کو نابود کر دیا اور ان کے صرف نام اور حوالے بعد کی کتابوں میں باقی رہ گئے۔ دوسری خرابی یہ ہوئی کہ جو مخطوطات بچ رہے، ان میں کتابت کی ایسی غلطیاں اور بے احتیاطیاں ہوئیں کہ صحیح پڑھنا اور سمجھنا مشکل ہو گیا۔ زیرِ نظر عہد کی مشہور تاریخ

"طبقاتِ ناصری" اس کی مثال ہے - یہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ نے تصحیح کے اہتمام سے شائع کی، پھر بھی اغلاط و اسقام سے پُر ہے - البتہ میجر راورٹی نے اس کا انگریزی ترجمہ بڑی عرق ریزی سے کیا اور مختلف نسخوں کے علاوہ، تقریباً ساٹھ دوسری تاریخوں سے مقابلہ کر کے[1] حتی الامکان تصحیح کا حق ادا کیا - ان کے فاضلانہ حواشی نے ترجمے کی قدر اور بڑھا دی اور ہم نے جا بہ جا اُن سے استفادہ کیا ہے ؛

"طبقاتِ ناصری" کے موٴلف قاضی منہاج الدّین سراج (جوزجانی) ہرات کے ایک ضلعے کے ممتاز خاندانِ علما سے تھے - سلاطینِ غُور سے ان کا رابطہ تھا اور سلطان مُعزالدّین کا لاہور پر قبضہ ہُوا تو موٴلف کے باپ کو وہاں غوری افواج کا قاضی مقرر کیا گیا - اسی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے قیاس کر لیا کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے - لیکن خود موٴلف کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ پہلی مرتبہ تیس برس کی عمر میں پاکستان آئے - ناصرالدّین قباچہ والیٔ سندھ نے بڑی مُدارات کی اور اُچّھ کی مشہور درس گاہ "فیروزی" کا صدر معلم مقرر کر دیا (سنہ ۶۲۴ ھ)[2] مگر دوسرے ہی سال سلطان شمس الدّین اِل تُتمش نے سندھ پر فوج کشی کی اور اچّھ فتح کر کے دہلی واپس گیا تو قاضی موصوف بادشاہ دہلی کے ہم رکاب تھے - وہ پہلے گوالیار کے قاضی پھر دہلی کے مدرسۂ ناصریہ کے صدر، اور سلطان ناصرالدّین محمود کے زمانے میں قاضی القضاۃ اور خطاب صدر جہاں سے مشرف

---

[1] "طبقاتِ ناصری" صفحہ ۱۴۳ ؛

ہوئے۔ "طبقاتِ ناصری" اور ایک مثنوی ("ناصر نامہ") جو اب مفقود ہے، اسی فیاض و حلیم بادشاہ کے نام پر تصنیف کی ؎ [1]

علومِ ظاہری، قوتِ تقریر و وعظ گوئی کے علاوہ یہ فاضل مولّف طریقت و تصوّف میں بھی خاص مرتبہ رکھتے ہیں اور' فوائد الفواد' میں سلطان المشائخ رح ان کے عارفانہ کلام اور وجد و حال کی چشم دید کیفیت بیان کرتے ہیں۔ اپنے منصب اور عہدے کی وجہ سے انھیں تاریخی واقعات جمع کرنے کا عمدہ موقع ملا اور گو وہ تاریخ کے نقاد نہیں، تاہم اوّل سے بہت ثقہ اور باوقعت مورّخ مانے جاتے ہیں۔ اور چوں کہ فارسی زبان کے قدیم نثر نگاروں میں داخل ہیں، پروفسر براؤن نے بھی "تاریخِ ادبیاتِ ایران" میں بطورِ خاص ان کا تذکرہ کیا ہے ؎ [2] دستورِ زمانہ کے مطابق قاضی منہاج ابتدائے آفرینش سے اپنی تاریخ کا آغاز کرتے ہیں لیکن سب سے کارآمد ابواب یا "طبقات" وہ ہیں جن میں سلاطینِ غزنی و غور، ملوکِ مُعِزی، سلاطین اور ملوکِ شمسی کے حالات درج ہیں۔ آخر میں ایک مفصّل باب "فتنۂ مغول" پر، جو مولّف کی زندگی میں برپا ہُوا، کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے ؎ یہ تاریخ سنہ ۶۵۷ تا سنہ ۵۸ ھ میں مکمل ہوئی ؎

(۱) تاج المآثر (۲) عوفی کی تالیفات اور دُوسری تاریخیں

ہندُستان میں مسلمانوں کے ابتدائی زمانے کی مختصر تاریخ

---

[1] دیکھو، اخبار الاخیار، ص۴۶۔ فوائد الفواد، ص۱۹۱ وغیرہ

[2] جلد دوم ص۴۶۲ ؎

"تاج المآثر" پُرتکلف انشا پردازی کا نمونہ ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ شاید یہ نادر کتاب اُن کے علم میں نہیں آئی۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد میں تھا۔ راقم الحروف نے مطالعہ کیا اور اس پر مجلسِ مخطوطات فارسی میں ایک مقالہ پڑھا تھا۔ غیر معروف ہونے کا ایک سبب یہ ہوگا کہ کتاب دُوسری جنگِ ترائن سے شروع ہو کر قطب الدین ایبک[۱] کے تذکرے اور اِل تُتمش کے ابتدائی زمانۂ حکومت کے احوال پر ختم ہوگئی ہے۔ سرہنری الیٹ نے اس کا ایک قدیم نسخہ بہم پہنچایا اور اپنی "تاریخِ ہند" کی جلد دوم میں اقتباس دیا ہے۔

"تاج المآثر" کا مصنف صدر الدین محمد بن حسن نظامی 'چہار مقالہ' کے مشہور مولف نظامی سمرقندی کا فرزند تھا۔[۲] چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں ہندُستان آیا اور اس کی تاریخ بھی 'طبقاتِ ناصری' سے کوئی تیس برس پہلے لکھی گئی۔ اِس اعتبار سے وہی "ہندُستان" کا پہلا مسلمان مورّخ ہے جس کی اصل کتاب محفوظ رہی۔ مگر تاریخی قدر و قیمت کے لحاظ سے وہ 'طبقاتِ ناصری' کے ایک طبقے کے بھی برابر نہیں بلکہ شوقِ

---

[۱] مورّخ کا اصل ممدوح ایبک ہے۔ اسی کی تعریف میں یہ برجستہ قطعہ نظم کرتا ہے ؎

از تیغ او بجائے صلیب وکلیسیا — در دارِ کفر مسجد و محراب و منبراست

آں جا کہ بود نعرہ و فریادِ مشرکاں — اکنوں خروش و نعرۂ اللہ اکبراست

اگرچہ پہلے شعر کا ہندُستان میں کوئی محل نہیں نظر آتا ؛

[۲] "تاریخِ گزیدہ (طبع لندن) صفحہ ۸۲۰ ؛

انشا پردازی کی بدولت نثریہ شاعری کا نمونہ بن کے رہ گئی ہے جنگ کے اسلحہ، بزم کے لوازم، قدرتی مناظر، اور موسموں کے بیان میں ورق کے ورق رنگ دیے ہیں۔ تحریر میں طرح طرح کی صنعتیں دکھائی ہیں لیکن واقعات کی تفصیل کی طرف مصنّف کو چنداں توجہ نہ تھی۔ اسی لیے یہ کتاب مورّخ کے زیادہ کارآمد نہیں۔ البتہ یہ مرصّع تحریر اُس عہد کے ادبی مذاق کا نمونہ دکھاتی ہے اور کبھی کبھی غور و خراسان کے شہسوار بھی چشمِ تصوّر کو ہندوستان کے میدانوں میں جولانیاں کرتے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں۔[1]

ایک اور دلچسپ کتاب جو پایۂ تخت دہلی میں تکمیل کو پہنچی، "جامع الحکایات" (: جوامع الحکایات و لوامع الروایات) ہے۔ اس کا مؤلف نورالدّین عوفی ساتویں صدی ہجری کے فارسی

---

[1] انشا پردازی کی موجوں میں کہیں کہیں سچے موتی غلطاں ہیں۔ مثلاً دہلی (بلکہ "ہندوستان") کی پہلی "مسجد آدینہ" (یعنی مسجد قوت الاسلام) کی تعریف میں لکھتا ہے:

"دیوارش بسانِ سدِ سکندر و بنائے ہرمان بہ سنگِ خارہ استحکام یافت۔ و منبر و محراب بہ لطائف کتابت و دقائق صنعت آراستہ شدہ بہ اشکال غریب و نقوش بدیع ساختہ پرداختہ گشت و قبّہ ہائے زرّیں مانند چتر آئینہ کردار۔ قطعہ

ازیں سپس من و صحرائے صحن او کہ دلم ز تنگنائے بسیطِ جہاں بہ جاں آمد
زسینہ دل بہ تماشا بر آمدم بدہاں چو ذکرِ نزہت آں بقعہ در زباں آمد"

ادیبوں میں ممتاز تھا ۔ اس کا تذکرۂ شعرا " لباب الالباب " قدیم فارسی شعرا کے احوال میں مجمل مگر خاصی مستند معلومات فراہم کرتا ہے لیکن اسے ' جامع الحکایات ' جیسی شہرت نہیں حاصل ہوئی جو اوّل سے فارسی علم ادب کی نہایت مقبول و منتخب کتاب مانی گئی ہے ۔ عوفی کا وطن بخارا تھا ۔ کفارِ مغول کی یورشوں نے ان علاقوں میں تباہی پھیلائی تو بہت سے اہلِ علم و فن ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ۔ وہ بھی پھرتا پھراتا ، سندھ پہنچ کر قباچہ کی سرکار میں ' جامع الحکایات ' لکھنے پر مامور ہوا ۔ کتاب تمام نہ ہوئی تھی کہ وہ حکومت ہی تمام ہوگئی ۔ قاضی منہاج الدین کی طرح عوفی بھی ال تمش کے دربار میں دہلی آگیا ۔ یہیں یہ ضخیم کتاب سنہ ۶۳۰ھ (م سنہ ۱۲۳۰ ء) میں مکمل اور اپنے مربی نظام الملک جُنیدی کے نام سے معنون کی جو اُن دنوں سلطنتِ دہلی کا علم دوست وزیر تھا ۔

کتاب میں انبیا ، اولیا ، ملوک و امرا کے قصے جمع کیے ہیں ۔ بہت سی روایات تاریخ نگار کے لیے بہترین مصالحہ ہیں ۔ اگرچہ ان کی ترتیب مختلف ابواب میں اس طرح کی ہے کہ ایک ہی مضمون یا شخص کے حالات متفرق ہوگئے ہیں ۔ اصل کتاب (دوسری عالم گیر جنگ سے قبل) چند ضخیم جلدوں میں چھاپی جا رہی تھی مگر یہ کام ادھورا رہ گیا ۔ اُردو میں پروفیسر شیرانی مرحوم کی مدد سے اس کا ایک بہت اچھا انتخاب انجمنِ ترقیٔ اُردو نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے ۔

خاندانِ شمسیہ کے خاتمے کے چند سال بعد کی ایک تاریخ 'خزائن الفتوح' (یا تاریخ علائی) امیر خسرو رح کی یادگار ہے لیکن اس میں علاءُ الدّین خلجی کے چند معرکے الفاظ کی میناکاری میں معمّے بن گئے ہیں۔ بہ خلاف اس کے امیر کی تاریخی مثنویاں سچّے واقعات کی سچّی تصویریں ہیں اور ان سے سنین اور جزئیات کی صحت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کسی آیندہ عنوان میں ہم پھر ان پر نظر ڈالیں گے۔ ایک اور نثری تاریخ ضیاءُ الدّین برنی کی "فیروز شاہی" ہے کہ ملوکِ شمسی کے خاتمے کے بہت سال بعد فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ مگر مورّخ کو دعوا ہے کہ 'طبقاتِ ناصری' نے ہندُستان کی تاریخ کو جہاں چھوڑا تھا، اس نے وہاں سے شروع کیا اور اپنے زمانے تک پہنچا دیا ہے۔ برنی بڑی عمر پا کر فوت ہُوا۔ اس کے بزرگ بلبن اور خلجی سلاطین کے وقت میں معزز عہدوں پر مامور تھے اور وہ انھی کی روایتیں نقل کرتا ہے۔ لیکن شاید پیرانہ سالی میں کتاب لکھنے بیٹھا تو سنین و واقعات کی تحریری یادداشتیں موجود نہ تھیں۔ حافظے کی مدد سے تاریخ لکھی اور کئی جگہ غلطی کھائی یا ضروری واقعات نذرِ نسیاں ہوگئے۔ بعض انگریز اُسے پسند کرتے اور بعض اہلِ تحقیق یہ بدگمانی کرتے ہیں کہ وہ معلومات کی کوتاہی، ذاتی رائے زنی سے پوری کرنی چاہتا ہے اور اپنے زمانے (خاص کر محمّد تغلق) کے حالات میں اس کے ذاتی تعصّبات اتنے دخیل ہیں کہ انھیں بجنسہٖ قبول کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔

برنی کا ہم عصر عصامی تھا جس کی منظوم تاریخ "فتوح السلاطین" چند سال ہوئے آگرہ میں چھپی اور حال میں محمد یوشع صاحب کی تصحیح و تحشیہ سے مدراس یونی ورسٹی نے الگ شائع کی ہے۔ مصنف کے ذاتی حالات بلکہ پورا نام تک کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ البتہ اس کے جدّ امجد فخر الملک عصامی (وزیر بغداد) کا اِلتتمش کے زمانے میں دہلی آکر بسنا تاریخوں میں مذکور ہے۔ مُصنف بھی اُن لوگوں میں تھا جو دہلی سے دولت آباد منتقل کیے جانے پر محمد تغلق سے سخت بیزار ہوئے۔ مثنوی نظم کرنے کے وقت (یعنی سنہ ۷۵۰ھ میں) دکن آزاد مملکت بن چکا تھا۔ شاعر کو جلے دِل کے پھپولے پھوڑنے میں کسی کا خوف نہ تھا ⁂ لیکن اس پہلو سے قطع نظر۔ اپنے زمانے کی بہت سی روایتیں عصامی نے وہ لکھی ہیں جو برنی یا اور جگہ نہیں ملتیں۔ اس کی مثنوی شاعری کے اعتبار سے معمولی سہی، ہمارے تاریخی مصادر میں یقیناً بہت اچھا اضافہ ہے ⁂

ادیب اور شعرا

قوم کے ذہنی اور ذوقی مدارج کا پیمانہ، ادبیات ہوتی ہیں ملوکِ شمسی کے عہد میں بہت سے قادر الکلام شعرا اور اعلا درجے کے فارسی انشا پرداز دربارِ دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ اور جہاں جہاں مسلمانوں کے بڑے شہر بسے، وہاں ہم شعر و سخن کا چرچا سنتے ہیں۔ اہلِ قلم اور شعرا کے مختصر حالات اور کلام کے نمونے فراہم کرنے کا مُلّا عبد القادر بداونی نے

خاص اہتمام کیا تھا ۔ متاخرین میں آزاد بلگرامی کی کتابیں ان کا تذکرہ سناتی ہیں ۔ زمانۂ حال میں چند اُردو اور انگریزی تذکروں میں قدیم فارسی گو شعرا کا نام آ جاتا ہے مگر ان کی تصانیف اور اشعار کے مجموعے اکثر تلف ہو چکے ہیں ۔ سلطان شمس الدین کے عہد میں ناصری اور امیر روحانی بخاری مشہور ہیں ۔ فتح رن تھنبور کی تہنیت میں روحانی کے قصیدے کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ ناصری کے قصیدۂ مدح کا صرف مطلع اس لیے چمکتا رہ گیا کہ اسی کو سُن کر سلطان شمس الدین نے فی شعر ہزار تنکہ (روپیہ) کے حساب سے ترسے پن ہزار تنکہ شاعر کو صلہ دیا تھا ۔ حقیقت میں مطلع غضب کا گرم ہے : ؎

ای فتنہ از نہیبِ تو زنہار خواستہ
تیغِ تو پیل و مال ز کفار خواستہ!

یہ دونوں شاعر باہر سے آئے تھے ۔ ان کے مقابلے میں شہاب مہمرہ بداوں میں پیدا ہُوا اور بڑا فاضل ادیب مانا جاتا تھا ۔ امیر خسرو رح ایک جگہ تعلی فرماتے ہیں کہ میرے زمزمے مہمرہ کو قبر سے اُٹھا بٹھائیں گے : ؎

در بداوں مہمرہ سرمست برخیزد زخواب
گر برآید غلغلہ مرغانِ دہلی زیں نوا

مُلا عبدالقادر نے اس کے چند قصیدے اپنی تاریخ میں نقل کر کے ہم وطنی کا حق ادا کیا ہے ۔ 'فرہنگِ جہاں گیری' میں جابجا شہاب کے شعر سنداً دیے گئے ہیں ۔ لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا

کوئی دیوان یا مجموعۂ کلام کہیں نہیں ملتا۔ [1] یہی کیفیت شمس الدین دبیر کی ہے کہ شعرا اور لغت نویس اس کی سند لاتے ہیں [2]، مورخ سخن سنجی کی ستایش کرتے ہیں مگر تصانیف زمانے کی آندھیوں میں اُڑ گئیں۔ دو ایک ورق مُلا عبدالقادر نے ڈھونڈ لیے تھے کہ ہم تک پہنچ گئے۔ یہ بلبن کے فرزند بغرا خاں والئ بنگال کی مدح میں قصیدہ ہے جس کے آخر میں شاعر سے اتنی خودستائی کیے بغیر نہ رہا گیا کہ :۔

خسروا شمس دبیر است قوی پختہ سخن | نیست چوں دفتریاں سوختۂ دیوانی، خام
ہست آویختہ شعرش چو زر پختہ نیست | سخنش چوں سخنِ پختۂ خاقانی، خام

ایک اور ادیب جسے بدآونی "ملک الملوک والکلام" کے خطاب سے یاد کرتا ہے، امیر فخر الدین عمید (تولکی) تھا کہ اپنی فضیلت و وجاہت سے مستوفئ ممالک (یعنی وزیرِ خزانہ) مقرر ہوا۔ مُلا عبدالقادر ہی کے وقت میں اس کا کلام "عزیز الوجود" ہو گیا تھا لہٰذا مُلا صاحب نے واقعی احسان کیا کہ ۶، ۷ قصیدے جو مل سکے،

---

[1] مُلا صاحب نے اسے ایل تمش کے بیٹے رکن الدین کے عہد کا شاعر لکھا ہے حال آں کہ اس بادشاہی کے پاے چھ ہی مہینے میں اُکھڑ گئے تھے۔ البتہ اس کی مدح میں شہاب کا ایک قصیدہ محفوظ رہا جس کی ہر بیت میں "گرگ و کرگ، پیل و شیر" چاروں لازماً لائے گئے ہیں۔ مطلع یہ ہے :۔

ہر زماں ایں کرگ و گرگ و پیل و شیرِ طفل خوار
آں کند با من کہ پیل و کرگ وقتِ کارزار

[2] امیر خسرو اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں فخر کرتے ہیں کہ میرے کلام کو شمس دبیر نے پسند کیا۔

تمام و کمال اپنی تاریخ میں درج کر دیے ہیں۔ مورخ ضیاءُ الدین برنی شاعر کا قریب العصر اور مدّاح ہے۔ اس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ عمید کے گرد فارسی شعرا کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو ایران و توران کی بجائے ہندوستان کو فارسی شاعری کا آزاد مرکز بنانا چاہتے تھے۔ بہر تقدیر، کچھ شک نہیں کہ قدرتِ کلام اور فصاحتِ بیان میں عمید اوّل درجے کے فارسی شعرا میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ شاید غزل گوئی، جس کا اُن دِنوں ایران میں چرچا بڑھتا جاتا تھا، اُسے ناپسند تھی۔ ایک قصیدہٗ حمد کا اس طرح آغاز کیا ہے:؎

برخیز عمید ار نہ فسرد است دلِ تو
بہ گزر ز غزل حمدِ خداوندِ جہاں گو
مدّاحی درگاہِ خدا کُن کہ بر افراشت
بے زحمتِ آلات بسے گنبدِ مینو

ایک اور قصیدے کی اُٹھان دیکھیے: ؎

ای ز نہیبِ حُکمِ تو خم زدہ قامتِ فلک
خطبۂ کبریاے تو وحدک لا شریک لک
مُلکِ تو مُلکِ ثابت است، مُلک تو مُلکِ راستیں
مُلک نہ مُلکِ منقلب، مُلک نہ مُلکِ مشترک . . . .

انھی اربابِ فضیلت کے پہلو بہ پہلو، جو کہ مناصبِ جلیلہ پر فائز تھے، کئی اور اہلِ علم و قلم کے نام آتے ہیں، جیسے مؤیّد جرجامی، ارسلان کاتبی، سعد منطقی، قاضی مغیث ہانسوی وغیرہ۔ لیکن اس مختصر تبصرے میں ہم صرف چند سطریں امیر حسن دہلوی

پر اور لکھے دیتے ہیں جن کی لطیف تالیف " فوائد الفوائد " کا اوپر تذکرہ آ چکا ہے ـــ وہ اپنے ہم مذاق پیر بھائی ، امیر خسرو سے عمر میں بڑے تھے لیکن تصوف کے کوچے میں بہت دیر بعد داخل ہوئے ۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ای حسن توبہ آں زماں کردی
کہ ترا طاقتِ گناہ نہ ماند!

حسن غزل گو شاعر ہیں ۔ ان کا سلیس و شیریں کلام ایران میں بھی داد پائے بغیر نہیں رہا ۔ چند سال ہوئے دیوان، حیدرآباد دکن کے دیوان ، مہاراجا کشن پرشاد شاد نے شائع کرا دیا ہے ؛

طوطی ہند امیر خسرو رح

مگر اقلیم سخن کی بادشاہی امیر خسرو رح کے نصیب میں آئی تھی ۔ ممالکِ ہند کے جملہ شعرا کا کلام ان کی شہرت کے نقارخانے میں طوطی کی آواز ہو گیا ۔ اُن کے والد امیر سیف الدین ، مضافاتِ بلخ سے ہندستان آئے اور پٹیالی میں آباد ہوئے جو اب ایٹہ کے ضلع میں واقع ہے ۔ اُن دنوں بداؤں کے تابع تھا ۔ وہیں کے نومسلم رئیس یا راوت کی بیٹی سے شادی کی اور اسی پیوند سے سنہ ۶۵۱ ھ میں امیر خسرو پیدا ہوئے ۔ باپ کا بچپن میں انتقال ہو گیا ۔ نانا دہلی لے آئے ۔ یہاں فطری ذہانت کو اہلِ علم و ادب کی صحبت نے ایسا چمکایا کہ لڑکپن ہی میں غزلوں کا پورا دیوان مرتب ہو گیا ۔ یہ " تحفۃ الصغر " تھا ۔ بعد میں تین دیوان اور جمع کیے ان میں " غرۃ الکمال " آپ کی شاعری کا نصف النہار ہے ۔ اسی

کے دیباچے میں امیر نے ذاتی حالات بھی اجمالاً لکھ دیے ہیں۔ "خزائن الفتوح"، "چہار درویش" (فارسی) اور "اعجازِ خسروی" انشا پردازی کی یادگار ہیں۔ مگر دُنیائے شاعری میں سکۂ خسروی کو "پنج گنج" نے معراج دیا۔ یہ خمسۂ نظامی رح کے جوڑ کی پانچ مثنویاں ہیں۔ ہزّال شاعر عُبیدؔ نے امیر کی اسی جسارت پر گرفت کی تھی کہ:

نمی زیبد خسرو را ز خامی کہ سکبا پُخت در دیگِ نظامی

مگر ہمارے لیے سب سے مفید ان کی چار تاریخی مثنویاں ہیں: (۱) قِران السعدین (۲) حضر خاں دول رانی (۳) نُہ سپہر اور (۴) تغلق نامہ۔ ان میں اپنے زمانے کے مختلف واقعات کو اِس خوبی اور صحت سے نظم کیا ہے کہ شاید دُنیا کی کسی زبان میں بھی اُن کی نظیر مِلنی دُشوار ہوگی۔ سنین کی صحت اور جُزئیات کے سمجھنے میں اُن سے بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ دہلی کے کئی بادشاہوں کے ندیم تھے اور ان کے اکثر واقعات چشم دید بیان کرتے ہیں۔ اس عہد کی معاشرت کے مرقّع دیکھنے ہوں تو اصل مثنویاں مطالعہ کرنی چاہییں۔ یہ چند سال ہوئے بڑے اہتمام کے ساتھ مدرستہ العلوم، علی گڑھ کی طرف سے شائع کی گئی تھیں۔ "تغلق نامہ" دو صدی سے مفقود تھا۔ اتّفاقاً دست یاب ہُوا اور مجلسِ مخطوطات حیدرآباد کی طرف سے راقم نے چھپوایا ہے۔

فارسی کی طرح امیر خسرو عربی، ترکی اور ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ میر تقی میرؔ اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے انھیں ریختہ کا پہلا

شاعر بلکہ موجد بتایا ہے اور دو شعر بھی منسوب کیے ہیں جنھیں اُردو کہنا غلط نہ ہوگا۔ لیکن ابھی مستقل زبان کی حیثیت سے اُردو وجود میں نہیں آئی تھی۔ امیر خسرو کے ہندی آمیز اشعار کو واقعی اُن کے ہوں تو بھی تفننِ طبع سمجھنا چاہیئے۔ کتاب "خالق باری" اُن کی تصنیف مشہور تھی۔ وہ عہدِ شاہ جہانی کے ایک دوسرے خسرو کا کارنامہ ثابت ہوئی۔[1] ہندی گیت، پہیلیاں وغیرہ ممکن ہے انھی کے ہوں لیکن انھیں تحقیق کی کسوٹی پر گھسنا باقی ہے ؛

امیر خسرو فنِ موسیقی میں مہارتِ کامل رکھتے تھے اور ہندی گویّوں نے، کہتے ہیں، ان کو آٹھواں "نائک" یعنی اس فن کا امام مانا ہے۔ خیال، قوّالی وغیرہ چند راگنیوں کی ایجاد اور ستار کی اختراع بھی اُن سے منسوب کرتے ہیں ؛ راہِ طریقت میں وہ خانوادۂ چشت کے محترم رُکن اور سلطان المشائخؒ کے عزیز ترین مُرید تھے۔ ان کی پیر سے ارادت مندی اور پیر کی اُن سے محبّت صوفیوں میں ضرب المثل ہوگئی ہے۔ ان کی نسبت یہ لُطف آمیز رباعی بھی حضرتؒ ہی کی بتلاتے ہیں : ـــــہ

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیتِ مُلکِ سخن آں خسرو راست
ایں خسروِ ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خُدائے ناصرِ خسروِ ماست!

سلطان المشائخؒ کا انتقال دہلی میں ہوا تو امیر خسرو غیاث الدّین

---

[1] اصل "خالق باری" پروفیسر شیرانی مرحوم کی فاضلانہ تحقیق کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے شائع کر دی ہے۔

تغلق کے ہمراہ بنگال گئے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں خبر سُنتے ہی برہنہ پا چل کھڑے ہوئے اور یہاں پیر کی قبر سے لپٹ لپٹ کر اتنا روئے کہ چند ہی روز میں گھُل کے تمام ہو گئے۔ (سنہ ۷۲۵ ھ م سنہ ۱۳۲۵ء) مولانا شہاب معمائی نے "طوطیِ شکر مقال" سے تاریخِ وفات نکالی ہے۔ سلطان المشائخ کے عُرس کے چھ مہینے بعد اُن کا عرس یا "چھوٹی سترھویں" منائی جاتی ہے۔ ان کے تقریباً دو سال بعد امیر حسن دہلوی نے دولت آباد میں وفات پائی۔ اُن کی قبر وہیں قصبہ خلد آباد کے باہر ہے۔ حضرت جامی دونوں کے انتقال پر یک جا اظہارِ غم فرماتے ہیں ؎

آں دو طوطی کہ ز نوخیزی شاں ۔ بود در ہند شکر ریزیٔ شاں
آخرش سخرۂ افلاک شدند ۔ خامُشانِ قفسِ خاک شدند!

باب ہشتم

خاندانِ خلجی

نئے خانوادۂ شاہی کا بانی جلال الدین فیروز شروع میں سامانے کا "نائب" مقرر ہوا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے "کلکٹر" سمجھنا چاہیے۔ خلجیوں کا قبائلی اتحاد مشہور تھا۔ کہیں ایک خلجی کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جاتا تو برادری کے لوگ جُوق جُوق وہاں پہنچنے لگتے تھے۔ جلال الدین کی مہمان نوازی، یار باشی نے اُسے عزیز اقارب کا مرجع بنا دیا۔ یہاں تک کہ مخبروں نے بادشاہ (کے قباد) کے کان بھرے، اور باغیانہ تیاریوں کا الزام لگایا۔ جلال الدین جواب دہی کے لیے پایۂ تخت میں طلب کیا گیا۔ فتوح السلاطین کا بیان ہے کہ کیتھل کے بازار سے وہ اور اس کا بھائی شاہی پولیس کی حراست میں گزرے۔ گھوڑے پر سوار، پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ بازار میں ایک مجذوب بیٹھا تھا، اُس نے ہانک لگائی کہ واہ ری تقدیر تیرے کیا کہنے! بادشاہی کے لیے فیروز کو گرفتار کر کے لے جا رہی ہے؟[1]

---

[1] ف س۔ صفحہ ۲۰۳

بادشاہ کے حضور میں ملزم پیش اور بے گناہ ثابت ہوئے۔ مخبروں نے سزا پائی۔ خلجی پہلے سے زیادہ بادشاہ کا معتمد علیہ اور پایۂ تخت کی فوج کا اعلا ناظم یا "عرضِ ممالک" بنایا گیا۔ لامحالہ خلجی سپاہی اور سردار کثیر تعداد میں بھرتی ہونے لگے۔ کیقباد کلوکھری (کیلو گڑھی؟) کے نئے محل میں رہتا تھا اسی کے قریب بھوگل کی پہاڑی پر عرض ممالک نے اپنا تنبو لگایا اور موضع "بہار پور"[1] میں ایک بڑی چھاؤنی آراستہ کرلی۔ شہر کی اصل آبادی اُن دِنوں مہرولی کے گرد و جوار میں چند میل اوپر واقع تھی۔ جلال الدین فیروز کی بڑھتی قوت دیکھ کر تُرک امیروں کو خوف اور حسد پیدا ہُوا۔ انھوں نے مفلوج بادشاہ کی بجائے اس کے سہ سالہ بیٹے کو تخت پر بٹھایا اور آپ مختار کار بن کے اُن عہدہ داروں کو جو خالص تُرک یا اُن کے رفیق نہ تھے، مناصبِ جلیلہ سے جبراً الگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ فہرست میں سب سے اوپر جلال الدین خلجی کا نام تحریر تھا۔ یہ اصل کاغذ خلجی کو مِل گیا۔ ایک ترک امیر (ایتمر کچھن) جو اُسے دھوکے سے محل میں لانے کے لیے آیا تھا، وہ تو بھوگل پہاڑی پر مارا گیا۔ دُوسرا تُرک سرغنہ بلوے میں کام آیا۔ جلال الدین خلجی کے بیٹے زبردستی شیرخوار بادشاہ کو لے جانے کے لیے محل میں گھُس آئے تھے۔ یہ خبر سُن کر ہزاروں شہر والے دوڑ پڑے اور خلجی سواروں کو گھیر لیا۔ کوتوال نے

---

[1] ف س ص ۱۷۰۔ اس نام کا گاؤں اب تک بستی نظام الدین اولیا کے عقب میں آباد ہے۔

بڑی مشکل سے بلوائیوں کو روکا ۔ ادھر دونوں تُرک امیروں کے خاتمے کے بعد اکثر عہدہ داروں نے بہار پور میں جلال الدین خلجی کی اطاعت قبول کر لی ۔ ایک شخص جس کے باپ کو سلطان کے قباد نے مروا ڈالا تھا ، اسی گڑ بڑ میں کلوکھری کے محل میں پہنچا اور مفلوج و معزول بادشاہ کو ، جو پہلے ہی دم توڑ رہا تھا ، بستر پر مار کر لاش جمنا میں پھینک دی ؛

جیسا کہ باب پنجم میں ہم پڑھ چکے ہیں ۔ سنہ ۶۸۹ھ (م ۱۲۹۰ء) میں جلال الدین خلجی نے تختِ دہلی پر جلوس کیا ۔ مگر منکسر مزاجی سے ایوانِ بلبنی کی بجائے اپنا تخت اسی چبوترے پر بچھوایا جہاں بلبن کے عہد میں امیر اُمرا صف بستہ کھڑے ہُوا کرتے تھے ۔ پایۂ تخت دہلی کے مسلمانوں کی ناراضی کو بھی نئے بادشاہ نے حق بجانب تسلیم کیا اور اپنی سکونت شہر کے باہر ہی رکھی ۔ یہاں (موجودہ اوکھلے کے شمال میں) جمنا کے کنارے بہت بڑا باغ لگایا ۔ نئی عمارتیں بنوائیں ۔ کے قباد کی ادھوری عمارتوں کی تکمیل کی ۔ اُمرا نے بھی بادشاہ کی تقلید کی اور تھوڑی مدت میں سارا شہر ادھر ڈھل آیا ۔ آج کل کی نئی دہلی کی طرح اسے "شہرِ نو" اور پہلی آبادی کو "پُرانی دہلی" کہتے تھے ۔ نئے شہر کے گرد بڑی شان دار فصیل چُنی گئی تھی جس کی تعریف میں امیر خسرو کے قصیدے کا شعر مشہور ہے ؎

شہا در شہرِ نو کردی حصارے
کہ رفت از کنگرہا تا قمر سنگ

مغلوں کا حملہ

بوڑھے بادشاہ کی نیک نفسی کا یہ حال تھا کہ خونی ڈکیتوں تک کو سخت سزائیں دینے سے بچتا تھا۔ امیر و وزیر، سیاست کو بادشاہی رعب داب اور قیامِ امن و انصاف کے لیے ضروری بتاتے تو بادشاہ رحم دِلی اور خوفِ خُدا پر واعظانہ تقریریں کرتا۔ نوجوان امیروں میں واقعی ایسی بے رُعبی پیدا ہوئی کہ اپنے جلسوں میں اُس کا مذاق اُڑانے لگے۔ بلبن کے بھتیجے ملک اختیارالدین (عرف چھجو) نے کڑے میں علانیہ سرکشی پر کمر باندھی۔ مگر شاہی فوجوں نے شکست دی اور زنجیروں میں باندھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اسے بھی جلال الدین نے معاف کر دیا اور صرف معزولی پر اکتفا کی۔ راج پوتانہ اور مالوہ کے سرحدی علاقوں میں مقامی رئیس و راجا بعض قلعوں پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے ان مقامات کا دورہ اور ازسرِ نو انتظام درست کیا لیکن حتی الامکان جنگ و قتال کی نوبت نہ آنے دی۔ بلکہ رن تھنبور کا محاصرہ اُٹھا کر دہلی چلا آیا۔

یہ اندرونی فساد تو کسی نہ کسی طرح رفع دفع ہو گئے مگر کیقباد کے زمانے سے حکومتِ دہلی کی غفلت کی خبریں سُن کر مغلوں کو دوبارہ حملے کا موقع مِلا اور وہ کابُل سے ایک بڑا لشکر لے کر سندھ کے پار اُتر آئے۔ واضح رہے کہ اب وہ پہلے کی طرح کافر و بُت پرست نہ تھے بلکہ ممالکِ اسلامی میں دو تین پُشت کی بود و باش نے انھیں دینِ اسلام سے آشنا کر دیا تھا اور بہت سے مغل

سردار و سپاہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس لشکر کا سردار بھی ہلاکو کا نواسہ، مگر ایک نومسلم مغل امیر کا مسلمان بیٹا مسمی عبداللہ تھا۔ خلجی فوج سے "برنرام" کے مقام پر مقابلہ ہوا جس کا محل وقوع بلکہ نام تک مشکوک ہے۔ قرینہ کہتا ہے کہ مغلوں کا ہراول بہت آگے وسطِ پنجاب میں بڑھ آیا تھا اور یہیں افواجِ دہلی نے اسے گھیر کر بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا۔ اصل فوج سے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ لشکرِ مغل نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ واپس چلا جائے۔ سنہ ۶۹۱ھ مطابق سنہ ۱۲۹۱ء) ۔ اکثر مغل قیدیوں نے سلطان کی تحریک و ترغیب سے اسلام قبول کیا۔ اُن کے سردار الغو خاں کو جو چنگیز خاں کا نواسہ ہوتا تھا، بادشاہ نے اپنی بیٹی بیاہ دی اور یہ نومسلم مغول غیاث پورہ میں جہاں اب بستی نظام الدین جو واقع ہے، آباد کیے گئے۔ یہ محلہ "مغل پورہ" موسوم ہوا جس کے جداگانہ رسم و رواج اور مغل لہجے میں بول چال کا کئی صدی بعد تک کی کتابوں میں ذکر آتا اور خاکہ اُڑایا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی پہلی تاخت دکن پر

ہندستان میں "ساس بہو کی لڑائی" ضرب المثل ہے لیکن یہ داماد اور ساس کی ان بن تھی جس کے نتیجے میں ایک اسلامی لشکر نے ملکِ دکن پر تاخت کی اور شمالی گنگا سے چل کر جنوبی گنگا (یعنی گوداوری) کی وادی میں نمودار ہوا۔ کڑے سے قلعہ دیوگری (موجودہ دولت آباد) کا فاصلہ سیدھے خط میں چھ سو میل

اور آج کل ریل یا آباد راستوں سے چلیئے تو آٹھ سو میل کے قریب ہے لیکن علاء الدین حاکم کڑا غیر آباد علاقوں سے گھنے جنگل، بڑے بڑے پہاڑ اور بغیر پُل کے تیزرَو دریا طے کرتا ہُوا آیا تھا۔ اس کی مشکلات اور خطراتِ سفر کا اب ہم تصوّر بھی نہیں کرسکتے کیوں کہ اس حیرت انگیز و یادگار یلغار کا مفصّل حال کسی صاحبِ قلم نے تحریر نہیں کیا۔ ہم عصر تاریخوں میں صرف اتنا مذکور ہے کہ یہ باہمّت اور جفاکش سردار کڑے سے چل کر دو مہینے میں ایلچ پُور پہنچ گیا۔ جو اُن دِنوں راجگانِ دیوگری کے توابع میں داخل تھا ؛

علاؤالدین خلجی کا اصلی نام محمد اور ترکی عرف "گرشاسپ" تحریر ہے۔[1] وہ خلجی بادشاہ جلال الدین فیروز کا سگا بھتیجا اور داماد تھا۔ جوانی میں بارہا سپہ گری کے جوہر دکھائے اور بھیلسے کی مکرّر فتح بیش تر اسی کی سعی و شجاعت کے طفیل حاصل ہوئی۔ صلے میں بادشاہ نے کڑے کے ساتھ اقطاعِ اَودھ کی ولایت ہونہار بھتیجے کے تفویض کی اور یہ درخواست کہ وہ چندیری پر ہم لے جائے' منظور کرلی ؛ چندیری آج کل ریاست گوالیار میں چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے لیکن گِرد و پیش کے کھنڈر گواہی دیتے ہیں کہ ایک زمانے میں بڑی راج دھانی تھی جس نے کئی بار شمال کے حملہ آوروں سے ٹکر لی۔ عہدِ خلجی میں اس مقام کی جنگی اہمیت یہ تھی کہ ملکِ مالوہ سے دکن کے راستے اس کی زد میں تھے۔ مگر علاء الدین کا چندیری

---

[1] 'فتوح السلاطین' میں علی گرشاسپ لکھا ہے ؛

پر مہم لے جانے کی اجازت لینا، محض حیلہ تھا کہ اُس کی فوجی تیاریوں پر کوئی شبہہ نہ کر سکے۔ اصل میں بھیلسے کی فتح کے وقت ہی وہ دکن کی دولت مندی کے قصے سُن گیا اور وہاں کے راستوں کا حال معلوم کر گیا تھا۔ اس کی بلند ہمتی کے آگے دُشوار سے دُشوار منصوبے آسان تھے لیکن مہم کا نفسیاتی محرک کہ کسی افسانے کی خیالی بنیاد معلوم ہوتا ہے، یہ تھا کہ علاءُ الدّین گھر کے اندر اپنی بے دست و پائی دیکھ کر باہر اتنی لمبی اُڑان بھرنے پر آمادہ ہُوا! وہ جو خطرناک سے خطرناک دُشمن کو خاطر میں نہ لاتا تھا، اپنی اہلِ خانہ کے سامنے اُسے بھیگی بلّی بننا پڑتا۔ بیوی کو شہزادگی کا غرور تھا۔ خوش دامن اور زیادہ بد دماغ خاتون تھی۔ "ملکۂ جہاں" کے تازہ خطاب نے اُسے آپے سے باہر کر دیا تھا۔ علاءُ الدّین ان عورتوں کی بدسلوکی سے تنگ آ گیا اور گھر چھوڑ کے نکل جانے اور جان کی بازی لگانے پر تیار ہو گیا!

ہم عصر تاریخوں میں علاءُ الدّین کے لشکر کی تعداد تین چار ہزار سوار لکھی ہے۔[1] فرشتہ سات آٹھ ہزار بتاتا ہے۔ بہرحال وہ تعداد میں جتنے کم تھے، بہادری اور جاں نثاری میں اتنے ہی زیادہ چیدہ و آزمودہ سپاہی تھے کہ یہ پُوچھے بغیر کہ کہاں جانا اور کب واپس آنا

---

[1] 'فتوح السلاطین' میں لکھا ہے کہ کڑے سے چلتے وقت فوج کا جائزہ لیا گیا ہے

شنیدم ازاں عرض، جنگی سوار ہزارے سہ چار آمد اندر شمار

مقدّرغ برنی کے چچا علاءُ الملک کو علاءُ الدین کڑے میں اپنا نائب بنا گیا تھا۔ برنی بھی یہی تعداد بتاتا ہے۔

ہوگا، ہم رکاب چل کھڑے ہوئے (سنہ ۶۹۴ھ م سنہ ۱۲۹۴ء) علاءالدین نے مالوہ اور وسطِ ہند میں غیر آباد علاقے طے کیے تاکہ راستے کی ریاستوں میں کسی طویل آویزش، و جنگ کی نوبت نہ آئے۔ دو مہینے تک کوہ وصحرا میں غوطہ لگانے کے بعد یکایک ایلچ پور کے سامنے نکلا۔ شہرت یہ دی کہ بادشاہِ دہلی کا ایک امیر راج مندری کے راجا کے پاس جا رہا ہے۔ پھر ضروری سامانِ رسد لے کر اتنی تیزی سے آگے چلا کہ دیوگری کے راجا کو اس کی آمد کی اطلاع اُس وقت ہوئی جب وہ شیادری (یا کوہِ اجنتا) کی پہاڑیوں سے نکل کر گھٹی لاجورا کے میدان میں داخل ہوگیا۔ یہ مقام اب لاسورا یا لاسور کہلاتا اور دیوگری سے ۱۲، ۱۴ میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ عصامی نے اپنی منظوم تاریخ "فتوح السلاطین" اس یلغار سے کوئی پچاس برس بعد دولت آباد میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ وہ بیان کرتا ہے کہ جس وقت علائی لشکر لاسور کے قریب پہنچا تو کسی ترک سوار نے ایک تیر کمان میں رکھ کر بستی کی طرف چلایا۔ وہ نیچے گر کے آدھے سے زیادہ زمین میں غرق ہوگیا۔ ایک سن رسیدہ کسان یہ تیر لاسور کے حاکم کانہا کے پاس لایا۔ وہ دوڑا ہُوا راجا رام دیو کے سامنے دیوگری لے گیا۔ اور تیر دکھا کر کہا، ترکوں کی فوج مُلک میں آپہنچی، اب خیر نہیں نظر آتی۔ تیر اتنا لمبا اور بھاری تھا کہ راجا کو یقین نہ آیا۔ عصامی کہتا ہے، یہ تیر ہلاکت کا ہرکارا تھا۔ اور بے شبہ وہ دکن پر شمالی ہند کے تسلط کا پیام بر ثابت ہُوا ہے۔

شل ہی، قسمت ہمت والوں کا ساتھ دیتی ہے۔ لشکر علائی کی آمد کے وقت دیوگری کے بہت سے سپاہی راجا کے بیٹے اور بیوی کے ہم راہ نیرتھ کرنے گئے تھے۔ تاہم جتنی فوج موجود تھی کانہا کی سرداری میں آگے بھیجی کہ ہو سکے تو سیلاب بلا کو لاسور کے میدانوں میں روکے۔ کانہا نے شکست کھائی۔ حملہ آوروں کو دیوگری کے قلعے تک بڑھنے اور محاصرہ کر لینے میں کوئی رُکاوٹ نہ رہی۔ شمالی دکن کے پستہ قامت سپاہی تنومند ہیکل خلجیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے مگر کہتے ہیں لاسور کے معرکے میں دو دکنی عورتیں ایسی بہادری سے لڑیں کہ مردوں کے مُنہ پھیر دیے۔ فتح کے بعد علاؤالدین نے سرداروں کو جمع کیا اور یاد دلایا کہ اگر کم زوری دکھائی اور ناکام ہو کر جاؤگے تو راستے میں تمام ہو جاؤگے اور زندہ پہنچے بھی تو وطن میں کسی کو کیا مُنہ دکھاؤگے؟ سب نے رفاقت و جاں بازی کا از سرِ نو حلف اُٹھایا اور راجا کے شہر "کھڑکے" پر جا چڑھے۔ بظاہر یہی شہر بعد میں "کھڑکے" یا "کھڑکی" کہلایا اور اس کی جگہ اورنگ آباد آباد ہُوا۔ خاص دیوگری کے پہاڑی قلعے کے گرد اُن دِنوں کوئی آبادی نہ تھی۔ دولت آباد کے نام سے یہاں بہت دن بعد محمد تغلق نے شہر بنایا اور وہ شہر پناہ تعمیر کی جس کے وسیع محیط کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔

خود راجا رام دیو قلعے میں محصور ہو گیا تھا۔ یہاں پھر قسمت نے خلجی قسمت آزما سے ساز کیا۔ بھاگنے کی گڑبڑ میں آٹا سمجھ کر جو بوریاں دیوگری میں لائی گئیں، ان میں نمک بھرا تھا۔ فرشتہ صراحت

کرتا ہے کہ یہ نمک اسی روز کوکن کے تاجر "کھٹکے" کی منڈی میں لائے تھے۔ غرض، راجا کو قلعے میں سامانِ رسد نہ آنے کا علم ہُوا تو امان طلب کی اور کثیر مال و زر کے علاوہ اپنی بیٹی علاؤالدین کے حوالے کی۔[1] صلح کے جلسے ہو رہے تھے کہ راجا کا بیٹا فوج لیے ہوئے دیوگری پلٹا۔ "فتوح السلاطین" میں لکھا ہے کہ باپ کی نہایش سے وہ بغیر جنگ کیے علائی لشکرگاہ میں چلا آیا۔[2] فرشتہ "ملحقاتِ طبقاتِ ناصری" کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ حوالیٔ قلعہ میں سخت جنگ ہوئی۔ ملک نصرت قلعے کی حفاظت پر مامور تھا۔ اس نے دُور سے دیکھا کہ مسلمانوں کی مُٹھی بھر جمعیت دُشمن کے دل بادل میں گھِر گئی۔ پس چکّر دے کے ایک طرف سے دکنیوں پر جا پڑا اور وہ اسے اصل بادشاہی فوج کی آمد سمجھ کر جیسی کہ خلجیوں نے افواہ مشہور کر دی تھی، بھاگ نکلے۔ ان کی شکست نے علاؤالدین کے مطالبات کو سخت تر کر دیا اور دیوگری سے وہ منوں سونا، چاندی، موتی اور جواہرات اتنی مقدار میں لے گیا کہ خزانۂ دہلی میں اس کا عشرِ عشیر بھی موجود نہ ہوگا۔ تاوانِ جنگ میں ساٹھ ہاتھی اور سو بڑے بڑے اونٹ

---

[1] "فتوح السلاطین" صفحہ ۲۳۴

[2] یہ مثنوی اس کا نام بھیلم بتاتی ہے۔ دوسری تاریخوں میں بھیم دیو اور شنکر بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے "بھیم" بھیلم ہی کی بگڑی ہوئی کتابت ہو۔ بہرحال عصامی کہتا ہے کہ جب باپ نے قاصد بھیج کر حقیقتِ حال سمجھائی تو یہ راجکمار مان گیا:

چو بھیلم ازیں کار آگاہ گشت ز دعوائے جنگ و خصومت گزشت

ہاتھ آئے۔ انھی پر یہ مال لد کر کڑے روانہ ہُوا۔ ہمارے سب تاریخ نگار متفق ہیں کہ ایک حملے میں اتنا مال متاع شاید کسی فاتح کو کبھی نہ مِلا ہوگا لیکن غور سے دیکھیے تو یہ بے حساب دولت بھی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنے وہ نتائج جو اِس دولت کے ہاتھ آنے سے برآمد ہوئے۔ کیوں کہ ایک طرف تو یہی کامیاب تاخت دکن کی تسخیر کا پیش خیمہ بنی اور دُوسری طرف بہت کچھ اسی مال و زر کی خاطر علاء الدّین کی چچا سے بگڑی۔ پھر اسی دولت کی مدد سے اس نے دہلی کی سلطنت خریدی اور تختِ شاہی پر قابض ہوگیا؛

جلال الدّین کا قتل

دیوگری کے محاصرے اور معرکے میں تین چار ہفتے سے زیادہ صرف نہیں ہوئے مگر واپس کڑے پہنچتے پہنچتے چھ مہینے گزر گئے اِن تاریخوں میں کچھ التباس ہوگیا ہے۔ تاہم یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۶۹۴ھ میں کڑے سے چلا اور اوائل سنہ ۶۹۵ھ مطابق سنہ ۱۲۹۵ء میں واپس پہنچ گیا۔ اس طویل مدت میں اُس کا نائب برابر بادشاہ کو خط بھیجتا رہا کہ علاءُ الدّین چندیری کے محاصرے میں مصروف ہے مگر خود علاءُ الدّین کی کوئی تحریر نہیں ملی۔ کئی بادشاہی ندیم اس کی طرف سے بدگمان تھے اور بادشاہ کو خبردار کرتے رہتے تھے۔ جلال الدّین اپنی مہر و محبّت اور پدرانہ شفقت کے بھروسے ان کی مطلق نہ سنتا تھا۔ البتہ بھتیجے کی خیر خبر نہ ملنے سے فکرمند ہُوا اور خود گوالیار گیا کہ وہاں اس کی کیفیت

آسانی سے معلوم ہو جائے گی۔ غالباً اسی سفر و شکار کے دوران میں قلعۂ گوالیار کے باہر ایک وسیع چبوترہ اور شان دار مسافر خانہ تعمیر کیا اور اس کے کتبے کے لیے خود یہ رباعی کہی: ؎

ما را کہ قدم بر سرِ گردوں ساید
از تودۂ سنگ و گِل چہ قدر افزاید
ایں سنگِ شکستہ زاں نہادیم درست
باشد کہ دلِ شکستۂ آساید

درباری شعرا اور علما نے تعریف کی تو پھر دُوسری رباعی لکھی: ؎

باشد کہ دریں جا گزرِ کس باشد
کِش خرقہ ردائے چرخِ اطلس باشد
شاید کہ ز یُمنِ قدمِ میمونش
یک ذرّہ بہ ما رسد ہماں بس باشد

اس عرصے میں علاءُ الدّین کی واپسی اور فتح سے بڑھ کر بے اندازہ مالِ غنیمت لانے کی سارے مُلک میں شہرت ہوگئی۔ بادشاہ دہلی واپس آیا تو علاءُ الدّین کے عریضے پہنچے جن میں اعترافِ قصور، بیش بہا تحائف پیش کرنے کا وعدہ اور عفوِ تقصیر کی منت سماجت تحریر تھی بادشاہ نے فوراً معافی کا فرمان اور دو ندیموں کو بھیجا کہ علاءُ الدّین کو سمجھا بُجھا کر کڑے سے دہلی لائیں۔ وہ در پردہ لکھنوتی نکل جانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ بادشاہی قاصدوں کو اُس نے چُپکے سے حراست میں لے لیا مگر یہ سُن کر کہ چچا کو عزیز بھتیجے سے زیادہ دیوگری کے جواہرات کی لَو لگی ہوئی ہے، فریب سے خط لکھا کہ

پایۂ تخت آنے میں در اندازوں کی مخالفت سے مجھے، اپنی جان کا اندیشہ ہے اگر خود بادشاہ کڑے آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو یہیں تمام غنائم بے کم و کاست نذر کر دیے جائیں گے۔ کسی کو کمی بیشی کے الزام دینے کا موقع نہیں ملے گا"۔ ہرچند خیرخواہوں نے منع کیا، جلال الدین ایسا دھوکے یا لالچ میں آیا کہ ماہِ رمضان اور برسات کے باوجود کشتی میں سوار ہو کر کڑے پہنچ گیا۔ دُوسرے کنارے پر علاءُ الدّین فوجی جمعیت لیے ہوئے استقبال کو آیا۔ عصر کے بعد روزہ دار سلطان کا بجرا کنارے پر لگا۔ بھتیجے نے اترتے ہی جُھک کر قدم لیے مگر عین اس وقت کہ بوڑھا چچا بغل گیر ہو کر محبت کی باتیں کر رہا تھا، خونیوں نے گھات سے نکل کر حملہ کیا۔ جلال الدین واپس بجرے کی طرف یہ کہتا ہُوا دوڑا کہ "اے علائے بدبخت، چہ کردی؟" لیکن قاتلوں نے کشتی تک پہنچنے کی مہلت نہ دی کنارے ہی پر گرا کر سر کاٹ لیا۔ (رمضان سنہ ۶۹۵ ھ م سنہ ۱۲۹۵ ء)

علاءُ الدّین کی تخت نشینی

علاءُ الدّین خلجی نے جیسی سنگ دلی کے ساتھ اپنے چچا اور ولی نعمت کو قتل کرایا، اس نے لوگوں کو قدرتی طور پر سخت متنفر کر دیا۔ ہم عصر برنی کے ہر ورق سے یہی بے زاری ٹپکتی ہے اور دُوسری قریب العصر یا بعد کی تاریخیں سب اس پر لعنت و نفرین بھیجتی ہیں۔ مگر خود کڑے کے لوگ تاویل کرتے تھے اور صاحب 'فتوح السلاطین' بھی اِدھر مائل نظر آتا ہے کہ

جلال الدین خلجی مال و دولت پر قبضہ کرنے کے علاوہ علاؤ الدین کو اپنے لشکر میں لے جاکر قید یا قتل کرنے کی فکر میں تھا۔[1] ایک مجذوب جنھیں کڑے والے "کڑک" صاحب کہتے ہیں اور بعض تاریخوں، تذکروں میں کرک نام آیا ہے،[2] علاؤالدین کے سرپرست تھے۔ انھوں نے یہ ہانک لگائی تھی کہ "ہر کہ آرد باتو جنگ۔ تن در کشتی سر در گنگ"۔

یہ تو مجذوب صاحب کی کرامت ہوئی۔ دہلی کی بادشاہی، ملکہ جہاں کی حماقت نے علاؤ الدین کو دلوائی۔ جلال الدین کا بڑا بیٹا ارکلی خاں ملتان میں سندھ و پنجاب کی حفاظت پر مامور اور بہادری میں مشہور تھا۔ ملکہ نے اُس کی بجائے چھوٹے بیٹے قدر خاں کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ امیروں وزیروں سے بادلِ ناخواستہ نذریں دِلوائیں۔ خود "کوشکِ سبز" میں آکر عہدے اور منصب تقسیم کیے۔ نوجوان بادشاہ "رکن الدین ابراہیم" ملقب ہُوا۔ ارکلی خاں ملتان سے دہلی آ رہا تھا۔ یہ خبریں سُن کر بہت بگڑا اور وہیں رُک گیا۔ سلطنت اپنے سب سے قوی بازو کی مدد سے محروم ہوگئی ہے۔ اُدھر علاؤ الدین اگرچہ چچا کو مار کر خودمختاری کا نقارہ بجوا چکا تھا لیکن پایۂ تخت پر بڑھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

---

[1] فتوح، صفحہ ۲۴۳ ہے۔

[2] " صفحہ ۲۲۹۔ فرشتہ نے بھی "معتبر لوگوں سے" یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ جلال الدین کا ایک قاتل تو دیوانہ ہوگیا دُوسرا جذام کے مرض میں مبتلا ہوکر مرا ہے۔

لکھنوتی جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ماں بیٹوں میں اختلاف کا حال سُنا تو فوراً دہلی کی طرف چلا اور اس شان سے چلا کہ تمام راستے سونے چاندی کے پھول نچھاور کرتا جاتا تھا۔ ہاتھی پر ایک چھوٹی سی منجنیق رکھوالی تھی۔ وہ یہ "اخترِ زر" دُور دُور تک پھینکتی اور خلقت اُنھیں لُوٹ کر اپنی جھولیاں بھرتی تھی۔ امیر خسروؒ فرماتے ہیں کہ اسی زر افشاں منجنیق سے دہلی کا قلعہ فتح ہُوا:—

"خزانہ ریز شد منزل بہ منزل ۔ بہ زر کردہ کلیدِ کار مشکل
چو با دہلی فتاد از فتح کارش ۔ گرفت از منجنیق زر حصارش"

زر پاشی کی بدولت ہزاروں سپاہی مہیّا ہو گئے۔ مُلّا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ بداؤں پہنچتے پہنچتے ساٹھ ہزار فوج زیرِ عَلم جمع تھی برسات کے کیچڑ پانی سے راستے خراب تھے مگر علاءُ الدّین کا عزم و ہمّت کسی دُشواری کو خاطر میں نہ لایا۔ نہ صرف بدآؤں کا صوبہ دار فرار ہُوا بلکہ خود دہلی کے حکّام خوف زدہ ہوگئے۔ ملکہ جہاں، ناتجربہ کار بادشاہ اور نئے امیر و وزیر کو لے کر ملتان بھاگی۔ شہر میں اُن کے جانے سے شور مچ گیا اور جلال الدّین کے قتل کا ماتم تازہ ہوگیا ؎

"برآمد ز ہر سو یکے ہائے ہائے کہ کشور رہا کرد کشور کشائے
ہمہ شہر از دیدہ شد خوں فشاں سہ روز و سہ شب کس نخورد آب و ناں"

(فتوح السلاطین)

علاءُ الدّین بڑے کرّ و فر سے شہر میں داخل ہُوا۔ اور اسی سال (سنہ ۶۹۵ھ، م سنہ ۱۲۹۵ء) کے آخری مہینے میں تاج پوشی

کی رسم دھوم دھام سے منائی گئی۔ عیش و طرب کے جملہ سامان مہیا، اور بادشاہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر عوام و خواص کی مہمانی کا اہتمام ہُوا۔ قدیم عمائد و اُمرا کے مناصب و جاگیرات میں اضافے کیئے گئے۔ مساکین و مستحقین کو صدقہ و خیرات میں لاکھوں روپے ملے اور ہر طبقے کے لوگوں میں اتنے انعام بٹے کہ محتاج فارغ البال اور خوش حال مالا مال ہوگئے۔ ان رنگ رلیوں میں کسی کو یاد نہ رہا کہ جس شخص کی اطاعت گزاری کا آج حلف اُٹھا رہے ہیں کل اُسے کتنی گالیاں دیتے تھے۔ ضیاءالدین برنی لکھتا ہے کہ ساری خلقت روپے کی دیوانی اور نئے نئے سانگ تماشوں میں ایسی محو تھی کہ علاؤالدین کے فعلِ قبیح اور کفرانِ نعمت کا کوئی ذکر ہی زبان پر نہ لاتا تھا۔ (ص۲۴۸)

سلطان مقتول کے وارثوں کی طرف سے خلش باقی تھی، وہ چند ہفتے میں دُور ہوگئی۔ علائی لشکر کے مقابلے میں ملتان کی شاہی فوجوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ ارکلی خاں اس کی ماں، بھائی اور جُملہ رفیقوں کو جاں بخشی کے وعدے پر اطاعت قبول کرنی پڑی۔ بڑے شہزادے اندھے کر کے قلعۂ ہانسی میں اور خواتینِ شاہی دہلی میں نظر بند کی گئیں۔

مغلوں کے حملے

یہ مُہم علاؤالدین کے بھائی الماس بیگ اور ملک ہزبرالدین ظفر خاں نے سر کی تھی۔ وہ سلطان کے سب سے دلیر و معتمد علیہ امیر تھے اور انھی کو مغلوں کے مقابلے میں بھیجا گیا جو سلطنتِ

دہلی کی افراتفری سُن کر، دوبارہ سندھ بلکہ چناب کے پار اُتر آئے تھے۔ شاہی فوجوں نے جلندھر سے آگے بڑھ کر انھیں روکا اور حوالیٔ لاہور[1] میں سخت شکست دی۔ (۶۹۶ھ م ۱۲۹۶ء) فارسی تاریخوں میں اُن کے حملوں کو ایسی بے ترتیبی سے تحریر کیا ہے کہ ان کی تعداد اور کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ مناسب ہوگا کہ ہم ان سب کو ایک جگہ بیان کر دیں کیوں کہ ہمارے خیال میں یہ مغلوں کے کسی واحد منصوبے ہی کے اجزا تھے۔

یہ حملے خراسان کی طرف سے ہوتے تھے جہاں زیرِ نظر عہد میں قتلغ شاہ حکمراں تھا۔ وہ ایران کے مغل بادشاہ غازان محمود (۶۹۵ تا ۷۰۴ھ م ۱۳۰۴ء) کا مشہور سپہ سالار گزرا ہے اور ہماری تاریخوں میں بظاہر اُسی کو قتلغ خواجہ کہا گیا یا کسی دُوسرے قُتلغ سے خلط ملط کر دیا ہے جو ماوراء النّہر کا "مغل شہزادہ" تھا حوالیٔ لاہور میں شکست کھا کر یہ حملہ آور موجودہ بلوچستان و سندھ میں جا گھُسے اور سیوستان کے بعض قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ وہیں ظفر خاں نے سنہ ۶۹۷ھ میں انھیں گھیر گھیر کر مارا اور بہت سے قیدی دہلی بھجوائے۔ اب خود قتلغ خواجہ نے ایسے وسیع پیمانے پر لشکرکشی کی کہ چنگیز خانی سیلاب کی یاد تازہ ہوگئی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس دفعہ پائے تخت دہلی کی خیر

---

[1] برنی نے اس لڑائی کا بہت مجمل ذکر کیا ہے (ص ۲۴۹) فرشتہ اور منتخب التواریخ، نے دُوسرے ماخذوں سے خاصی تفصیل دی ہے۔ منتخب میں لڑائی کا مقام "جارن منجور" درج ہے۔ یہ لاہور کے قریب کوئی مقام تھا (ص ۱۸۲)

نہ ہوگا۔ کیوں کہ مغلوں نے راستے میں کسی شہر کو تاراج و خراب نہیں کیا بلکہ سیدھے دہلی تک آئے اور جمنا کا رُخ چھوڑ کر، تین طرف سے شہر کو گھیر لیا۔ ان کی آمد سے ڈر کر ہزاروں پناہ گزیں دہلی میں آ بھرے۔ ناکہ بندی نے رسد رسانی کے ذرائع معطل کر دیے۔ لامحالہ اجناس کی قیمتیں چڑھیں۔ چند ہی روز کی تکلیف نے آرام طلب شہریوں کی پریشانی بڑھا دی۔ ایک امیر نے خلوت میں بادشاہ کو صلاح دی کہ جس طرح ممکن ہو روپیہ دے کر یہ بلا ٹالی جائے مگر بادشاہ نے اُسے جھڑک دیا اور فوجی تیاریوں کی تکمیل کر کے شہر پناہ سے باہر میدان میں نکل آیا۔ شاہی فوج کی تعداد مغلوں کی دو کے مقابلے میں تقریباً تین لاکھ تھی[1] اور ظفر خاں، اُلغ خاں، غازی مِلک (تغلق) جیسے آزمودہ کار سپہ سالار دہلی میں حاضر تھے۔ 'فتوح السلاطین' میں ہم بعض دِل چسپ جُزئیات مطالعہ کرتے ہیں۔[2] مثلاً یہ کہ ظفر خاں نے زنانہ سنگار اور لباس قتلغ خواجہ کو بھجوایا اور پیام دیا تھا کہ ہمّت ہے تو خود میدان میں آؤ ورنہ یہ

---

[1] فوجِ مغل کا شمار سب تاریخوں میں بیس تمن یعنی دو لاکھ لکھا ہے (برنی صفحہ ۲۵۴) عصامی صفحہ ۲۵۶ وما بعدہٗ

[2] برنی نے لڑائی کے حالات خاصی تفصیل سے مگر بہت بے ترتیب لکھے ہیں۔ عصامی کا بیان نظم کی پابندی کے باوجود زیادہ مشرح اور واضح ہے۔ (فتوح صفحہ ۲۵۴ تا صفحہ ۲۷۰)

اوڑھنی اوڑھ لو ! اسی پر مشتعل ہو کر یہ سپہ سالار پُورے اہتمام و عزم کے ساتھ حملہ آور ہُوا ۔ دُوسری بات یہ کہ مُغل اس مہم میں اپنی عورتوں کو بھی ہم راہ لائے تھے ۔

مورخ فرشتہ لکھتا ہے کہ تا دمِ تحریر (یعنی ۱۰۱۵ ھ م ۱۶۰۵ء) شمالی ہندستان کی تاریخ میں اتنی بڑی لڑائی، کم سے کم مسلمانوں کے عہد میں، کوئی نہیں ہوئی جس میں فریقین کی سپاہ پانچ لاکھ سے زیادہ تھی ۔ مہرولی کی پہاڑیوں سے مغرب میں بڑھیں تو ایک وسیع نشیبی میدان ملے گا جس میں کیلی کا موضع ابھی تک موجود ہے ۔ یہیں دہلی کی یہ خوں ریز جنگ لڑی گئی ۔ مغلوں کی جفاکشی، جاں بازی اور سُبک پائی میں کلام نہیں مگر جس وقت ظفر خاں کہ قوت و شجاعت میں رستمِ زماں کہلاتا تھا، شاہی میمنہ لے کر بڑھا اور جنگی ہاتھیوں کو دُشمن پر ہُول کر رسالے کے پے در پے حملے کیے تو مغلوں کا بایاں بازو اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا ۔ اس کی صفیں ٹُوٹ کر اصل جمعیت سے دُور ہوتی چلی گئیں ۔ سوارانِ دہلی نے انھیں گھیر گھیر کر قتل کیا اور میلوں تک ظفر خاں انھیں اسی طرح دباتا اور مارتا چلا گیا ۔ حتّٰی کہ اسی دلیری کی وجہ سے خود اُس کی جان گئی ۔ تاہم مغلوں کا اتنا نقصان ہُوا کہ پھر وہ مقابلے میں نہ ٹھیر سکے اور دو تین دن میں بھُلاوا دے کر راتوں رات واپس چلے گئے ۔ (سنہ ۶۹۷ ھ م سنہ ۱۲۹۷ء)

اس ناکامی کے بعد کئی سال تک مُغلوں نے پیش دستی نہیں کی ۔ علائی افواج گجرات، راج پوتانہ و دکن میں مصروفِ کشور کشائی

رہیں ۔ غالباً پائے تخت کا فوجوں سے خالی ہونا سُن کر ہی سنہ ۷۰۳ھ میں مغلوں نے پاکستان و ہند میں تُرک تاز تازہ کی اور ان کا نامی سردار ترغی بے موسم کی آندھی کی طرح یکایک پنجاب سے بڑھ کر پاے تخت پر آ چڑھا ۔ یہ بارہ تمن ، یعنی ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی تھے اور بادشاہ کے پاس آدھی فوج بھی نہ تھی ۔ مجبوراً شہر کے گرد خندقیں کُھدوائیں ۔ نئے شہر سیری کو جس طرح ہوسکا مورچہ بند کیا اور ہر طرف آدمی دوڑائے کہ قریبی اقطاع و اضلاع سے کچھ کُمک آجائے ۔ اس میں بہت تاخیر ہوئی ۔ مغلوں نے شہر کی غیر محفوظ منڈیاں اور مضافات لُوٹ لیے اور جو اکّا دُکّا شہری ان کی زد میں آئے انھیں ہلاک کر دیا ۔ لوگ محاصرے سے پریشان اور خود علاؤ الدّین مضطرب ہو گیا تھا کہ اتنے میں جس طرح یک بارگی یہ ٹڈی دل آیا تھا اسی طرح اچانک تیزی سے واپس چلا گیا ۔ اکثر اہلِ شہر کا عقیدہ تھا کہ مغلوں کی بلا جنگ پسپائی حضرت سلطان المشائخ رح کی کرامت سے ظہور میں آئی مگر بادشاہ کو اس حملے نے متنبہ کر دیا کہ مغلوں کی طرف سے غفلت کتنی خطرناک ہے ۔ وہ پُوری تن دہی سے فوج کی توسیع و تنظیم پر متوجّہ ہُوا ۔ پاکستان کے تمام قلعے درست و مضبوط کیے ۔ چھاؤنیوں کی جنگی قوّت میں بہت کچھ اضافہ کیا ۔ دیپال پور ان دفاعی انتظامات کا مرکز اور غازی ملک (تغلق) پنجاب اور مُلتان و سندھ کا فوجی والی بنایا گیا ۔ جدید مصارف سے لازماً خزانۂ شاہی پر بڑا بار پڑا ۔ ان

مالی مسائل کو حل کرنے کی اس اَن پڑھ بادشاہ نے بعض انقلابی تدابیر اختیار کیں جن کی ہم آیندہ باب میں صراحت کریں گے ؛

علاء الدین کی یہ تیاریاں غالباً تکمیل کو نہ پہنچی تھیں کہ مغلوں کے دو لشکروں نے پھر تاخت کی اور جمنا کے پار اُتر کر دوآب کے سرسبز علاقوں میں لُوٹ مار مچائی - ان کے سرلشکر علی بیگ اور ترتاق [1] ، دو مغل شہزادے تھے اور دونوں ہزاروں ساتھیوں سمیت گھیر کر گرفتار کر لیے گئے - قیدیوں کی اونٹوں پر بٹھا کر شہر اور مضافات میں پہلے تشہیر کرائی ، پھر ایک بہت بڑے عام جلسے میں گردنیں ماری گئیں اور ان کے بریدہ سروں سے سیری کے برج و بارہ میں مصالحے کا کام لیا گیا [2] (۷۰۴ھ م ۱۳۰۴ء) کہتے ہیں اسی ذلت آمیز شکست بلکہ کامل تباہی کا بدلہ لینے کے لیے مغلوں نے آیندہ

---

[1] 'منتخب التواریخ' (ص ۱۸۵) فرشتہ یا اس کے کاتب نے "خواجہ ترپال" لکھا ہے - عصامی ، "ترتاک" تحریر کرتا ہے - برنی کے نسخوں میں اختلاف ہے - عصامی کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ ان شہزادوں کو پہلے چھوڑ دیا تھا اور ایک مدت بعد شورہ پشتی کے باعث قتل کیا گیا ؛ (ص ۳۰۳ وما بعد)

[2] اکثر تاریخوں میں لکھا ہے کہ ان مغل سرلشکروں کے سر کاٹ کر دہلی کے بداؤں دروازے پر لٹکائے تھے - مگر 'منتخب التواریخ' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بداؤں بھیجے گئے اور وہیں جنوبی دروازے پر آویزاں ہوئے ، (ص ۱۸۶) ؛

سال پھر دو حملے کیے مگر پنجاب کی طرف نہ آ سکے بلکہ بلوچستان کے پہاڑوں سے اُتر کر سندھ میں گھس گئے اور آخری بار سندھ سے بھی آگے ماڑواڑ کے علاقے تک پہنچے لیکن دونوں دفعہ غازی ملک تغلق نے ان کی ایسی ناکہ بندی کی کہ بھاگ کر بھی نہ جانے دیا اور ہزار ہا گرفتار کر کے دہلی بھیجے گئے۔ یہ بے دین قوم چنگیز خاں کے زمانے سے جب قتلِ عام کراتی تو مقتولوں کے سروں سے "کلّہ منار" یعنی مخروطی بُرج بنواتی اور ان کے عرض و ارتفاع کو موجبِ فخر و سربلندی تصوّر کرتی تھی۔ اب ان کے سروں سے دہلی میں بُرج تعمیر ہُوا جس کے آثار مورّخ فرشتہ کے زمانے تک باقی تھے۔[1]

غازی ملک نے اپنی دفاعی کام یابیوں پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ اب اپنی جدید و جنگ جُو فوجوں سے قندھار و غزنی پر حملے کئے اور مغلوں پر اپنی تیغ زنی اور اقبال علائی کی ایسی دھاک بٹھائی کہ پھر انھیں ایک زمانے تک پاکستان و ہند پر تاخت کرنے کی ہمّت نہ ہوئی۔

---

[1] فرشتہ، کبک مغل کے حملے کے بیان میں جسے اس کے کاتب اور انگریز مترجموں نے "کنگ" بنا دیا ہے۔

باب نہم

فتوحاتِ گجرات و دکن

سنہ ۶۹۷ھ میں قتلغ خواجہ کے شکست کھانے اور دہلی سے ناکام جانے سے خود نیم خواندہ بادشاہ کے دماغ میں غرور کی ایسی ہوا بھری کہ نشے کی ترنگ میں دُور دُور کی سوجھنے لگی کبھی سکندر اعظم کی طرح ساری دُنیا کو فتح کرنے کے منصوبے باندھتا اور خود غرض خوشامدی یقین دلاتے کہ جو بات اُس یونانی بادشاہ سے نہ بن پڑی، آپ کی ہمت و تدبیر کردکھائیگی حتیٰ کہ القاب شاہی میں "سکندر ثانی" کا اضافہ کردیا گیا۔ کبھی علاءالدین کو نصرت خاں، اُلغ خاں وغیرہ "چار یاروں" کی مدد سے ایک نیا دین جاری کرنے کی سوجھتی تھی۔ غنیمت ہے ابوالفضل و فیضی جیسے ذہین مصاحب نہ ملے ورنہ ممکن تھا کہ "دینِ الٰہی اکبرشاہی" کا نقشِ اوّل تین صدی پہلے تیار ہوجاتا۔ برنی کا بیان ہے کہ اس کا چچا علاءُالملک جو علاءالدین کا قدیم خیرخواہ اور معتمد علیہ تھا، ایک بار یہ منصوبے سُن کر خاموش نہ رہ سکا اور ڈرتے ڈرتے بادشاہ کو سمجھایا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ

رسالت رسول آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ختم ہو چکی۔ اگر آپ کسی نئے مذہب بنانے کی بات منہ سے نکالیں گے تو اہلِ اسلام آپ سے بے زار و متنفر ہو جائیں گے۔ رہا دُنیا کو فتح کرنا سو مناسب ہے کہ اس کا آغاز ممالکِ ہند سے کیا جائے اور گجرات، مالوہ وغیرہ پھر ممالکِ دکن کی خاطر خواہ تسخیر فرمائی جائے تاکہ اپنا مُلک چھوڑ کر باہر جانے میں بادشاہ کو گھر کی فکر نہ رہے"۔

موٹے "علاءُ الملک" کی یہ موٹی موٹی باتیں علاءُ الدّین کی سمجھ میں آگئیں۔ اِدھر اطلاع مِلی کہ بادشاہ کے بھائی اُلغ خاں کی سعی و محنت رن تھنبور کے فتح کرنے میں ناکام رہی جس کے قریب انھی دنوں راجپوتوں نے ایک اور نیا قلعہ بنایا، یا اتنا مضبوط کر لیا تھا کہ اُسے لیے بغیر رن تھنبور کی تسخیر دُشوار تھی۔ یہ جھائن تھا جس کا اب ٹھیک پتا نہیں چلتا۔ [1] راج پوتوں کو مزید تقویت اس لیے پہنچ گئی تھی کہ محمد شہ نامے نومسلم مغل سردار ملک نصرت سے لڑ جھگڑ کر اپنی جمعیت سمیت رن تھنبور کے راجا ہمیر دیو کے پاس چلا آیا۔ بادشاہ نے دہلی میں اس کے اہل و عیال کو ظالمانہ سزائیں دیں اور ہمیر دیو نے ان پناہ گیروں کی ایسی قدر و منزلت بڑھائی کہ راجا کے گرویدہ و جاں نثار ہو گئے۔ جب ہمیر دیو مارا گیا اور زخمی محمد شہ بادشاہ کے روبرو پیش ہُوا تو اس وقت بھی وہ ہمیر کی وفاداری کا دم بھرتا

---

[1] دیکھو ایلیٹ۔ ج ۳ ص۱۷۱۔ مُلّا عبدالقادر کے زمانے میں اسے "شہرِ نَو" کہتے تھے۔ (ص ۱۹۰)

ہُوا، جان سے گزر گیا۔ [1]

بادشاہ کو دہلی اور بداوں سے فتنہ و فساد کی خبریں ملیں، مگر اُس نے محاصرے سے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ رن تھنبور کی گہری خندق میں اتنی ریت کی بوریاں ڈلوائیں کہ وہ بھرتے بھرتے اصل فصیل کے برابر اونچی ہو گئی۔ مدافعین تیر برساتے، آگ پھینکتے رہے۔ جاں باز مسلمان مرتے کھپتے، یہ خطرناک کام کیے گئے اور بالآخر اسی ریت کے پُشتے سے کُود کُود کر قلعے میں گھس گئے۔ راجا مارا گیا۔ بڑے کشت و خون کے بعد رن تھنبور تسخیر ہو گیا۔ (۷۰۲ھ/۱۳۰۲ء)

نئے قوانین

انہی چار پانچ سال کی مدت میں دو مرتبہ علاءُ الدّین خلجی پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ ایک دفعہ اُس کے عزیز اکت (اکد) خاں نے شکار میں زخمی کیا اور مُردہ سمجھ کر اپنی بادشاہی کا اعلان تک کرا دیا۔ لیکن چند ہی گھنٹے میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ محاصرۂ رن تھنبور کے دوران میں جب کہ کوتوال شہر علاءُ الملک بادشاہ کے

---

[1] کہتے ہیں علاءُ الدّین خلجی نے محمد شاہ سے سوال کیا کہ اگر زخم اچھا اور تو شفایاب ہو گیا تو کیا کرے گا؟ اس نے کہا: "تجھے مار کر ہمیر کے بیٹے کو رن تھنبور کا راجا بناؤں گا۔" بد مزاج علاءُ الدّین نے یہ سُن کر اُسے قتل کرا دیا مگر پھر اس کی وفاداری کے اعتراف میں شاہانہ تجہیز و تکفین کا حکم دیا۔

ہم راہ گیا تھا ، اُس کے نائب کو ایک غلام حاجی مولا نے ہلاک کر دیا ۔ اور علوی نام ایک سیّد کو جو ماں کی طرف سے شمس الدّین اِلتمش کا نواسہ ہوتا تھا ، جبراً تخت پر بٹھایا ۔ مولا کے بہت سے شورہ پشت رفیق شہر کے چند محلات پر قابض ہو گئے اور خزانۂ شاہی ان کے تصرّف میں آ گیا ۔ لیکن ایک ہی ہفتے میں دُوسرے امیروں نے فساد پر قابو پا لیا ۔ مولا کے ساتھ بے گناہ سیّد بھی مارا گیا ۔ ممکن ہو اس شورش میں کچھ مذہب کی لاگ ہو ۔ لیکن اکت خاں یا بداؤں کے فساد محض سیاسی نوعیت رکھتے تھے ۔ انھیں ہم سایہ اضلاع کے شاہی حکّام نے دفع کر دیا ۔ تاہم علاءُ الدّین کو یہ احساس ضرور ہو گیا کہ مسلمانوں کے مختلف طبقے اس کی حکومت سے ناراض ہیں ۔ دُوسرے یہ کہ بے فکرے دولت مند عموماً شراب خواری کے نشے میں اس قسم کے منصوبے سوچتے اور فتنہ و فساد برپا کرتے ہیں ۔ لہٰذا اپنے خیرخواہوں کے مشورے سے بادشاہ نے سخت انسدادی قوانین نافذ کیے ۔ اوّل تو وہ جاگیریں ، انعامات ، معافیاں جو " زائد از ضرورت " قرار دی گئیں ، ضبط ہُوئیں ۔ ان میں اکثر وہ عطیات تھے کہ آغازِ حکومت کے وقت تالیفِ قلوب کے لیے بہت دریا دلی سے لوگوں کو دیے گئے تھے ۔ بعض محصول اور زرستانی کے نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ۔ پھر قمار بازی اور مسکرات کی ممانعت کر دی اور

بادشاہ نے سب سے پہلے خود شراب خواری سے توبہ کی۔ شاہی میز خانے میں مے گساری کے جس قدر ظروف تھے، سب تڑوا دیے۔ شراب بیچنے اور علانیہ پینے کی سخت سزائیں مقرر کیں اور نکتہ چیں برنی کو اقرار ہے کہ مسکرات کی علانیہ خرید و فروخت موقوف ہوگئی ۔[1]

اُمرا کے اندرونی حالات سے واقفیت اور سیاسی سازشوں کے انسداد کی نئی نئی تدبیریں نکالی گئیں۔ خفیہ پولیس یا جاسوسی کا نہایت وسیع محکمہ بنا اور یہ ضابطہ جاری ہُوا کہ اُمرا بادشاہ کی اجازت کے بغیر باہم شادی بیاہ اور زیادہ میل جول نہ رکھیں برنی کہتا ہے یہ نگرانی اتنی شدید تھی کہ امیر اُمرا گھروں میں بھی بآواز بات کرنے سے ڈرتے تھے ۔[2] لیکن پولیس کی نئی تنظیم و توسیع سے ایک بالواسطہ فائدہ یہ ہُوا کہ آمد و رفت کے راستے نہایت محفوظ ہوگئے۔ سوداگروں، مسافروں کی زیادہ پاسبانی ہونے لگی ۔ سندھ و کشمیر، لاہور و کابل، تلنگانہ اور ملیبار تک کی سڑکیں، دہلی کے گلی کوچوں کا نمونہ بن گئیں ۔

---

[1] برنی صفحہ ۲۸۴ - فتوح السلاطین میں لکھا ہے کہ ایک روز بادشاہ کی مجلسِ نشاط گرم تھی۔ کسی نے آکر خبر سُنائی کہ غلّے کی کم یابی کی وجہ سے آج ایک انبوہ منڈی میں گھس آیا اور دو تین بڈھے اس ہجوم میں کچلے گئے۔ بادشاہ کو یہ سُن کر سخت ندامت ہوئی اور اسی وقت شراب سے توبہ کی ۔ (صفحہ ۲۱۳)

[2] لین پول لکھتا ہے کہ یہ تشدّد روس کے جاسوسی نظام سے بھی بڑھ گیا تھا۔ میڈی ویل انڈیا صفحہ ۱۰۱ ۔

بندوبست مال گزاری و شرح اجناس

دیہات میں سرکاری مال گزاری وصول کرنے والے چودھری نمبردار وغیرہ جتنا سرکار کے خزانے میں داخل کرتے، اسی کے برابر فریب سے روپیہ لے کر اپنا گھر بھرتے تھے۔ محکمے کے سرکاری عہدے داروں کو رشوتیں اور نذرانوں کی عادت پڑ گئی تھی۔ بادشاہ نے اِن دونوں گروہوں سے سخت محاسبہ کیا۔ صدہا سرکاری ملازمین یک قلم برخاست کر دیے۔ پھر دوآب، مالوہ اور پنجاب کے تمام اضلاع کی پیمایش اور ازسرِ نو مال گزاری تشخیص کرائی۔ نائب وزیر شرف قای نے جو دیانت و قابلیت میں ممالکِ ہند میں نظیر نہ رکھتا تھا، خود ایک ایک گاؤں کی جمع بندی کا ملاحظہ کیا اور کئی سال کی پیہم مشقّت سے جانچ اور مال گزاری کی رقوم مقرر کیں۔ دیہی عمّال کی لُوٹ مار کا ایسا انسداد ہُوا کہ بہت سے مُفت خورے یہ کام چھوڑ کر بیٹھ گئے اور جن سے چودھراہٹ نہ چھوڑی گئی، وہ محض اعزازی چودھری رہ گئے۔ برنی کہتا ہے کہ چند ہی سال میں ان کی ساری اکڑ جاتی رہی۔ گھوڑے کی سواری اور قیمتی لباس پہننا، اسلحہ لگانا اور پان چباتے پھرنا، سب موقوف ہو گیا۔ (صفحہ ۲۸۸ و مابعد)

مگر ان اصلاحات سے بھی زیادہ حیرت انگیز علاء الدّین کے شرحِ اجناس کے ضابطے تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا، اُسے چند ہی مہمات اور مغلوں کے پے در پے حملوں سے صاف نظر آ گیا کہ جب تک فوجی تعداد اور جنگی ساز و سامان میں اضافہ نہ کیا

جائے گا، اُس وقت تک دُنیا کی فتح تو ایک طرف، خود اپنا مُلک محفوظ رکھنا دُشوار ہو۔ نظر برایں، آمدنی اور خرچ کی اچھی طرح جانچ پڑتال کی گئی۔ دفاعی قلعے اور نئی چھاونیاں بنانے اور فوج کی تعداد بڑھانے کی مفصّل تجاویز مرتّب ہوئیں۔ اسی سلسلے میں ضروری معلوم ہُوا کہ استعمالی اشیا اور اجناس کی قیمتیں منضبط کی جائیں تاکہ فوجی ملازمین کی جو تنخواہیں مقرّر ہوں ان میں وہ بہ آسانی گزارہ کرسکیں۔ یہ انضباط اُس "کن ٹرول" سے جس کا گزشتہ عالمگیر جنگ میں نفاذ ہُوا، شاید زیادہ ہمہ گیر تھا۔ اشیائے خوردونوش، پارچہ، ظروف، مویشی، اونٹ گھوڑے غرض بازار میں بکنے والی کوئی چیز مُشکل سے ایسی ہوگی جس کی قیمت مقرّر نہ کی گئی ہو۔ عام اجناس کے بڑے بڑے انبار خانے حکومت کی طرف سے قائم ہوئے کہ قحط و خشک سالی میں بھی غلّے کا نرخ بدلنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ شہر کے بداوں دروازے کے اندر ایک بڑی سرائے "سرائے عدل" کے نام سے تعمیر ہوئی۔ یہیں کپڑے کی منڈی تھی۔ قیمتوں کے تعیّن کی طرح بکری کے اوقات مقرّر تھے ظہر کے بعد، اور کسی دُوسری جگہ کپڑا فروخت نہ ہوسکتا تھا۔ ہم عصر مؤرّخ شہادت دیتا ہے کہ فی الواقع علاءالدّین کے جیتے جی اُس کے مقرّرہ نرخ و ارزانی میں فرق نہیں آیا جو اس بادشاہ کی حیرت انگیز انتظامی قابلیت کا ثبوت ہے۔ [1]

[1] برنی ان ضابطوں کا تفصیل سے حال لکھ گیا ہے جس سے اُس زمانے کے اقتصادی حالات کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ (ص ۳۰۴ تا صفحہ ۳۲۰)

نرخوں کی نگرانی کے لیے لازمًا ایک نیا محکمہ تیار کرنا پڑا ۔ ہر بڑی منڈی میں سرکاری شحنہ مقرر ہوئے جن کی سختی نے تھوڑے ہی عرصے میں تجارت پیشہ لوگوں کو نئے ضوابط کا پابند بنا دیا ۔ ہے چند اشیا اور ان کے سرکاری نرخ تبنی کی تاریخ سے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں :

۱ ۔	گیہوں	فی من (علائی)	۷ ½	جیتل
۲ ۔	جَو	"	۴	"
۳ ۔	چنا	"	۵	"
۴ ۔	شالی (دھان)	"	۵	"
۵ ۔	ماش	"	۵	"
۶ ۔	موٹھ	"	۳	"

(علائی من ہمارے زمانے کے ۱۲ سیر کے برابر، اور جیتل، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ایک تنکہ (یعنی ایک تولہ چاندی) کے چونسٹھ ہوتے تھے ۔)

۷ ۔	مصری	فی سیر (علائی)	۲	جیتل
۸ ۔	شکر سفید	"	۱	"
۹ ۔	شکر سُرخ	"	½	"
۱۰ ۔	تِلوں کا تیل	"	۱	"
۱۱ ۔	نمک ۔ پانچ سیر	"	۱	"

(علائی سیر ۲۴ تولے یعنی ہمارے ۵ چھٹانک سے ایک تولہ کم ہوتا تھا)

۱۲ - "چیر" دہلوی (ریشمی مل مل؟)	فی تھان	۱۲ تنکہ
۱۳ - سیری اعلا (سوتی مل مل؟)	″	۵ تنکہ
۱۴ - سیری ادنا	″	۲ تنکہ
۱۵ - کرپاس (عمدہ قسم کا گاڑھا)	۲۰ گز ″	۱ تنکہ
۱۶ - کرپاس ادنا	۴۰ گز	۱ تنکہ

---

۱۷ - گھوڑا، قسمِ اعلا	مار سے ماعنا ۱۲۰ تنکہ
۱۸ - ″ معمولی	۹۰ تا ″
۱۹ - ٹٹو	۱۲ تا ۳۰ ″

برنی لکھتا ہے کہ گوشت ترکاری، دھنیے پودینے تک کی قیمت معین کی گئی تھی۔ سوئی، کنگھی، جوتی اور برتنوں میں مٹی کا مٹکا، ٹھلیا تک نہیں چھوٹے تھے۔ اسی طرح حلوائی کی اعلا ادنا مٹھائیاں اور نان بائی کی تافتان سے لے کر سوکھی روٹی تک سرکاری ضوابط کی پابند بنا دی گئی تھیں۔ کسی ظریف مصاحب نے بادشاہ کو خوش دیکھ کر ایک دن عرض کیا کہ شاہی احکام نے تمام اہلِ بازار کے ہوش درست کر دیے ہیں مگر اربابِ نشاط اور زنانِ بازاری ابھی تک مطلق العنان ہیں۔ بادشاہ ہنسا اور کوتوال کو بلا کر اُن کے مجروں اور گانے بجانے کی مفصل اُجرتیں مقرر کرنے کا حکم دیا۔

نئی فوج اور اس کے کارنامے

دفاعی قلعوں کی ترمیم و تجدید اور اسلحہ سازی کی ترقی کے ساتھ اب چار لاکھ پچھتر ہزار سوار کی وہ جرّار فوج مرتب ہوئی جس نے مغلوں کو شکست دینے میں بلبنی سپاہ کی شہرت کو ماند کر دیا۔ ان سواروں کی شرح تنخواہ ۱۳۴ اور دو اسپہ (یعنی دو گھوڑے رکھنے والے سوار) کی ۱۹۸ تنکہ ماہانہ تھی۔ اور ہم ایک گزشتہ باب میں تخمینہ لگا چکے ہیں کہ قوت خرید کے لحاظ سے علائی تنکہ ہمارے ۲۰، ۲۲ روپے (پاکستانی) کے برابر ہوتا تھا۔ ان فوجوں کے بڑے بڑے سپہ سالاروں میں بادشاہ کے بھائی (الماس بیگ) اُلغ خاں، ملک نصرت، غازی ملک (تغلق) عین الملک ملتانی اور آگے چل کر ملک کافور فاتح دکن کے نام تاریخ میں مشہور ہیں۔ کافور جو گجرات کی جنگ میں گرفتار کر کے لایا گیا، بادشاہ کا نہایت عزیز غلام تھا کہ اپنی جنگی قابلیت سے بڑھتے بڑھتے ملک نائب یعنی وزیر اعظم کے عہدے پر پہنچا۔ اور غازی ملک تغلق کو خود قضا و قدر نے آخر منصب بادشاہی تک لا پہنچایا۔

علاؤ الدین کی تخت نشینی کے وقت مارواڑ، جھالاواڑ، اور انہلواڑ (نہروالہ) کی ریاستیں سلاطینِ دہلی کی رسماً خراج گزار تھیں لیکن جب موقع ملتا، آزادی کا دم بھرنے لگتی تھیں۔ جلوس علائی کے دوسرے ہی سال (۶۹۷ھ) اُلغ خاں اور ملک نصرت نے ان ریاستوں کو دوبارہ مطیع کرنے کے

علاوہ خاص جزیرہ نمائے گجرات پر فوج کشی کی۔ وہاں کا بڑا راجا (کرن) اپنی ریاست کے ساتھ رانی کنولا دیوی کو چھوڑ کر فرار ہُوا اور بگلانے کے پہاڑی خطوں میں پناہ لی۔(بگلانہ آج کل احاطہ بمبئی کے اضلاع سورت و خاندیس میں بٹا ہُوا ہی۔) لیکن گجرات کے دُوسرے رئیس و راجا کئی سال تک قابو میں نہ آئے اس کے لیے نہ صرف یہاں کافی فوج مقرر کرنی ضروری تھی بلکہ راجپوتانہ کی طرف سے پُورا اطمینان کرنا مقدم تھا۔ رن تھنبور و جہاین کی تسخیر کا حال اوپر ہماری نظر سے گُزر چکا ہی۔ ۷۰۳ھ/ ۱۳۰۳ء میں سرکش راجپوتوں کے آخری گڑھ چتوڑ پر خود بادشاہ لے چڑھائی کی۔ گجرات کا صوبہ‌دار الغ خاں مغربی راجپوتانے کو پامال کرتا ہُوا کُمک لایا۔ عین الملک چتوڑ کے جنوب میں مالوہ کی طرف بھیجا گیا اور اُجین، مانڈو، دھار کے راج دھانی قلعے سر کر لیے۔ چتوڑ آٹھ مہینے کی محنت سے فتح ہُوا[1] راجا کے بھانجے رتن سین نے وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ بہ‌طور باج گزار

[1] علاؤالدین کی فتح چتوڑ سے دو صدی بعد ملک محمد جائسی نے اپنی لاجواب ہندی مثنوی "پدماوت" نظم کی۔ اس میں پدمنی کا خیالی افسانہ بطور تمثیل تصنیف کیا اور آخر میں صراحت کر دی کہ اس کے نام اور واقعات محض خیالی ہیں۔ بہ‌ایں ہمہ بعد کے بعض تاریخ نویس مغالطے میں پڑ گئے یا دل‌چسپی کے لیے اُسے اپنی تاریخوں میں نقل کر گئے۔ انگریزوں نے بڑھا چڑھا کے اسے اصلی واقعہ بتا کے درسی تاریخوں میں داخل کر لیا۔

کے یہ ریاست اُسے واگزاشت کی گئی اور وہ تا زندگی علاؤالدّین کی اطاعت میں سرگرم رہا ۔

راج پوتانہ اور مالوہ میں بادشاہی تسلط ہو جانے سے دکن کا راستہ صاف ہوگیا۔ ۷۰۶ھ / م ۱۳۰۶ء میں بادشاہ نے ایک لاکھ سوار کا عظیم لشکر تیار کیا۔ اپنے عزیز غلام ملک کافور کو تمام فوجی اختیارات اور چتر و سرا پردہ لگانے کے شاہی امتیاز عنایت کیے۔ فوج کا نائب وزیر (عرض ممالک) خواجہ حاجی انتظامی اور حسابی معاملات کا بڑا تجربہ کار تھا، اسے ساتھ کر دیا۔ راستے کے شاہی عمّال اور صوبہ داروں کو تاکیدی احکام بھیجے گئے کہ ملک کافور کی ہدایت پر بے چون و چرا تعاون کریں۔ اسی ضمن میں ایک یادگار واقعہ یہ پیش آیا کہ گجرات کی رانی کنولا دی نے جو علاؤ الدّین کے حرم سرا میں داخل کی جاچکی تھی بادشاہ سے درخواست کی کہ میری بیٹی دیول دی کو کسی طرح بُلوا دیا جائے۔ وہ اپنے باپ رائے کرن کے پاس بگلانے میں تھی۔ الغ خاں صوبہ دارِ گجرات ملک کافور کی مدد کے لیے آرہا تھا۔ بادشاہی حکم کے ملتے ہی بگلانے کی طرف مُڑ گیا رائے کرن فرار ہو کر مغربی گھاٹ کے پہاڑوں میں روپوش ہُوا اور مایۂ فسادِ دیول دی کو دیوگری روانہ کر دیا۔ اُلغ خاں کی فوجیں تلاش و تعقّب میں ہر طرف دوڑ رہی تھیں۔ ایک دستے کو عین دیوگری کے قریب الورا گاوں میں اتفاق سے وہ جماعت مل گئی جو راج کماری کو بگلانے سے لے کر آ رہی

تھی۔ دیول دی کو ہاتھوں ہاتھ اُلغ خاں کے پاس لایا گیا وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ صبا رفتار کہاروں کے کندھے پر دیول دی کی نینس دکن سے دہلی پہنچی اور وہاں چند روز بعد اس کی خضر خاں ولی عہد سے شادی کر دی گئی ؎ بادشاہِ سخن امیر خسروؒ نے اِن سچے واقعات کو اپنی مشہور مثنوی "خضر خاں دیول دی" میں اس لطف سے نظم کیا ہے کہ کوئی خیالی داستان بھی رنگینی اور دلکشی میں مشکل سے بازی لے جائے گی ؎

دیوگری کا راجا علاءُ الدین کی پہلی تاخت ہی میں ہار مان گیا تھا۔ کافور کے لشکرِ عظیم کے سامنے کیا ٹھیرتا۔ بہت آگے بڑھ کر ملک نائب کا استقبال کیا۔ بیش بہا تحائف پیش کیے پھر خود دہلی پہنچ کر اطاعت و وفاداری کی تجدید کی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر خطاب راے رایاں اور چترِ سفید سے سرفراز کیا اور نہ صرف اس کی ریاست بحال رکھی بلکہ بگلانے اور جنوبی گجرات کے کچھ اضلاع اپنی طرف سے مرحمت فرمائے۔ راجا بندۂ بے دام بن گیا۔ آیندہ جنوبی دکن کی مہمات میں دیوگری کی رفاقت و مرکزیت سے بادشاہی افواج کو بڑی مدد ملی یہ ۷۰۶ سے ۷۱۲ھ (م ۱۳۱۲ء) تک چار مرتبہ ممالکِ دکن میں نو کی طرح آئیں۔ ورنگل (تلنگانہ) دور سمندر (میسور) اور سب سے جنوبی ریاست پانڈیا کی راج دھانی مدورا تک بڑھیں جس کا فاصلہ دہلی سے ڈیڑھ ہزار میل کے قریب ہے۔ ان کی پیش قدمی

اور جنگی کارناموں کی تفصیل لکھی جائے تو ایک ضخیم داستان تیار ہو جائے۔ ہر چند یہ فتوحات سپاہیوں کی شجاعت و جفاکشی، سرداروں اور سپہ سالار کی ہمت و ذہانت کے طفیل حاصل ہوئیں لیکن ان سب کی تہ میں بادشاہ کا عزم و حوصلہ اور جذبۂ کشورکشائی کام کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ اُس کی عجیب و غریب اور پیہم کامیابیوں کو خرقِ عادت سمجھنے لگے تھے اور ایک گروہ انھیں حضرت سلطان المشائخؒ کی دُعا کی برکت جانتا تھا۔ مفتوحہ جنوبی ریاستوں کو خراج گزاری اور بادشاہ کے سکّہ و خطبہ کے رواج دینے کی شرط پر برقرار رکھا گیا تھا۔ حکومت دہلی کا براہِ راست قبضہ اس لیے بھی دشوار تھا کہ چند ساحلی بندرگاہوں کے سوا دکن میں آٹھویں صدی ہجری کے اوائل تک مسلمانوں کی کوئی آبادی نہ تھی اور شمالی ہند کے سپاہی زیادہ عرصے اپنے گھروں سے اتنے فاصلے پر رہنا گوارا نہ کرتے تھے۔ دکن کے مستقل قبضے میں یہی دُشواریاں تھیں جنھیں حل کرنے کی غرض سے محمد تغلق کو "دولت آباد" بسانے کی تدبیر سوجھی۔ اس منصوبے کا حال اور نتائج ہم اگلے باب میں مطالعہ کریں گے۔

بادشاہ اور قاضی کا دلچسپ مکالمہ

علاءُ الدین کے عہدِ حکومت میں بڑے بڑے علما اور مشائخ جمع تھے۔ خاص پائےتخت میں ہر قسم کے اربابِ کمال کی کثرت تھی۔ ہم عصر تاریخوں اور تذکروں میں ان کے نام اور علمی یا فنی کام مذکور ہیں۔ انھی میں سے ایک مولانا مغیث الدین بیانوی

کا بادشاہ سے پُر لطف مکالمہ برنی نے تحریر کیا ہے۔ وہ درباری قاضی تھے اور بادشاہ کا انھیں تقرب حاصل تھا۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں:

پہلے ہی جب بادشاہ نے قاضی صاحب سے کہا کہ میں تم سے چند مسئلے پوچھنے چاہتا ہوں تو وہ گھبرائے۔ کیوں کہ برنی لکھتا ہے کہ علاؤ الدین علما کو ریاکار و مکار سمجھ کر ان سے بات نہ کرتا تھا۔ قاضی صاحب نے ہاتھ باندھ کر کہا کہ شاید بادشاہ سلامت مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور مجھ کو سزا دینا چاہتے ہیں اگر ایسا ہے تو سوال جواب کی زحمت کیوں فرمائی جائے۔ میری گردن حاضر ہے ... بادشاہ نے قاضی صاحب کو اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں اور اگر وہ احکامِ شریعت کے مطابق صحیح جواب دیں گے تو انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

پہلے دو سوال ذمیوں اور رشوت خواروں کے متعلق تھے۔ ان کے جواب، بادشاہ کے طریقِ عمل سے کم و بیش موافقت رکھتے تھے۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ پہلی تاخت کے وقت جو مال دیوگری سے حاصل ہوا وہ شرعاً کس کا ہے؟

قاضی نے کہا "وہ مجاہدین میں برابر تقسیم ہونا چاہیے"۔

بادشاہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ پھر سوال کیا: اور یہ مالِ غنیمت جو میں نے اپنے زمانۂ بادشاہی میں جمع کیا ہے، اس میں میرا اور میری بیویوں اور اولاد کا کتنا حق ہے؟"

قاضی نے کہا "حضور کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ مگر آپ

شریعت کا حکم دریافت کرتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ یہ سب روپیہ مسلمانوں کے بیت المال کا ہے۔ آپ اپنی ذات اور اہل و عیال کے لیے اسی قدر لے سکتے ہیں جس قدر دُوسرے مسلمان حق دار ہیں ... رہا وہ خرچ جو مُلکی مصالح اور حکومت کے رعب داب کے واسطے ضروری ہو۔ اُس کے جواز کی گنجایش نکل سکتی ہے"۔

علاءُ الدّین نے کہا: "اچھا، یہ جو میں باغیوں فتنہ انگیزوں کو، ان کی اولاد و رفقا سمیت سزائے قتل دیتا ہوں اور ان کا سارا مال متاع ضبط کر لیتا ہوں۔ اور اسی طرح چوروں بدکاروں کو جان سے مرواتا، شرابیوں کو کنوئیں میں قید کراتا ہوں، یہ بھی تم خلافِ شریعت قرار دو گے؟"

جواب میں قاضی اُٹھ کر دُور کونے میں جا کھڑے ہوئے اور سر بادشاہ کی طرف جھکا کر پُکارے: یہ سب سزائیں شریعت کے خلاف ہیں!

بادشاہ غضب ناک ہو کر اُٹھا، کف پای پہن کر حرم سرا میں چلا گیا۔ قاضی صاحب جلدی سے اپنے گھر گئے کہ اہل و عیال کو آخری وداع اور ضروری وصیّت کریں ... لیکن دُوسرے دن بادشاہ نے دربار میں بُلایا۔ خلافِ امید خلعتِ فاخرہ اور ایک ہزار تنکہ انعام دیا۔ پھر کہا کہ گو میں مسائلِ شرعی سے واقف نہیں ہوں۔ مگر مسلمان، مسلمان زادہ ہوں۔ میرے خیال میں اس مُلک کے اور اِس زمانے کے لوگ معمولی سزاؤں سے

قابو میں نہیں آسکتے ۔ نہ آپ کے وعظ و نصیحت کا اُن پر کوئی اثر ہوتا ہے . . . . میری نیت بخیر اور منشا خلقِ خدا کی بہتری ہے ۔ توبہ کا دروازہ کھُلا ہے ۔ مجھے خُدا کی رحمت پر بھروسہ ہے کہ میری تعدّی کو معاف فرمائے گا" ۔

الحاقِ دیوگری

اتنی وسیع فتوحات اور عظیم اقتدار حاصل کر کے سلطان علاءُ الدّین خلجی نے ۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء میں وفات پائی ۔ تاریخ میں وہ پہلا فرماں روا ہوا ہے جس نے قریب قریب تمام پاکستان اور ہند و دکن میں اپنا خطبہ پڑھوایا اور اپنی بادشاہی کا سکّہ چلایا ۔ ولی عہد خضر خاں کو باپ نے آخری بیماری میں خفا ہو کر گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا ۔ ملک کافور نے مرحوم بادشاہ کا ایک وصیت نامہ پیش کیا اور اس کے مطابق سب سے چھوٹے بیٹے شہاب الدّین کی تخت نشینی کا اعلان کرایا ۔ علاءُ الدّین کی زندگی ہی میں کافور سلطنت کے جُزو کُل پر حاوی ہو گیا تھا ، اب علانیہ حکومت قبضۂ اختیار میں آ گئی ۔ دو بڑے شہزادے قید میں اندھے کرا دیے ۔ تیسرے کو قتل کرانے کے لیے چند خُونی تیار کیے ۔ مگر شہزادے نے اُن سے ایسی پُر اثر تقریر کی کہ وہ پگھل گئے اور پھر غالباً اُنھیں ملک نائب کی سیاست سے بچنے کی صورت یہی نظر آئی کہ اُس کی خواب گاہ میں جا کر خود اسے قتل کر دیا ۔ یہی تیسرا شہزادہ قطب الدّین مبارک کے نام سے محرّم ۷۱۷ھ میں وارثِ سلطنت بنا ۔

نئے بادشاہ نے باپ کی دولت بے دریغ لُٹائی ۔ چوں کہ خود قیدی رہا تھا ، قیدیوں سے خاص ہمدردی تھی ۔ تخت نشین ہو کر پہلا کام یہ کیا کہ تقریباً ستر ہزار قیدی جو علاؤ الدّین کے جدید قوانین کی خلاف ورزی کے سبب گرفتارِ بلا تھے ، یک قلم آزاد کیے۔ سرکاری نرخ اور متعلقہ ضوابط کی تنسیخ کا حکم دیا ۔ اگرچہ قیمتیں فوراً چڑھ گئیں مگر اہلِ بازار بہت خوش ہوئے ؛ راج پوتانہ اور مالوہ پر مسلمانوں کا قبضہ پورا جم گیا تھا ۔ البتہ گجرات میں شورش برپا ہوئی ۔ اسے عین الملک نے فرو کیا اور پھر بادشاہ کے خُسر ظفر خاں کی صوبہ داری میں مفسدوں کا قرار واقعی استیصال ہو گیا؛ دکن میں رام دیو کی جگہ اُس کا داماد ہرپال راجا ہُوا تھا ۔ اُس نے سارے مہاراشٹر میں بغاوت کی آگ بھڑکائی اور چند سرحدی قلعوں کو بادشاہی پاسبانوں سے چھین لیا ۔ ان مرہٹہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے خود بادشاہ مہم لے کر دکن گیا ۔ شاہی لشکر کا مقابلہ کرنے کی باغیوں میں ہمت نہ تھی ۔ ہرپال سمیت سب گرفتار ہو کر مارے گئے ۔ دیوگری کی ریاست اقطاعِ شاہی میں ضم کر لی گئی ۔ مہاراشٹر میں جا بجا نئی چھاؤنیاں قائم ہوئیں ۔ قلعہ دیوگری دکن کے مسلمان صوبہ دار کا مرکز قرار پایا ؛

انقلابِ حکومت

دکن سے واپسی میں بادشاہ کے ایک رشتہ دار اسد الدّین نے اسے مارنے کی سازش کی ۔ یہ راز کُھل گیا ۔ اسد کے ساتھ کئی بے گناہ سردار بادشاہ کے غصّے کا شکار ہوئے ۔ اسی ضمن

میں تینوں بھائیوں کو جو بصارت سے محروم کرکے گوالیار میں قید تھے۔ اُس نے قتل کرا دیا۔ پھر بے عمل وغش عیاشی سے عقل و اخلاق بگڑتے چلے گئے۔ ایک نومسلم غلام خسرو خاں کی محبت نے ایسا اندھا کیا کہ نیک و بد میں کوئی تمیز نہ رہی بڑے بڑے امیر ذلیل وخوار اور خسرو خاں، سلطان اور سلطنت دونوں کا مختار کار بن گیا۔ پھر اسی بے وفا غلام نے اپنے برادری ہم قوموں کی جمعیت تیار کی اور مست و لایعقل بادشاہ کو قتل کرا دیا۔ دو چار مسلمان امیر جن کی قطب الدین مبارک شاہ نے آبرو ریزی کی تھی، سازش میں شریک تھے۔ چند دھوکے سے حراست میں لے لیے گئے۔ بعض عہدے اور دولت کے لالچ میں اور بعض اصلاحِ حال سے مایوس ہوکر خسرو خاں کے ساتھ ہوگئے اور اس نے سلطان ناصر الدین کے نام سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ۷۲۰ھ م ۱۳۲۰ء

لوگوں کے دل گواہی دیتے تھے کہ یہ چند روز کی بہار ہے تاہم خسرو خاں کو اتنی فرصت ضرور مل گئی کہ اس نے خلجی خاندان کے افراد کو چُن چُن کر قتل کیا۔ محلاتِ شاہی میں خون کی ندیاں بہائیں۔ اہلِ حرم کی بے حرمتی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور شہر والوں پر ایسے ظلم وستم کیے جن کی تفصیل ناگفتہ بہ ہے۔ مگر یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ اہلِ دہلی کے لیے یہ وحشیانہ حرکات بالکل نئی نہ تھیں۔ علاءُ الدین جوشِ غضب میں اور اس کا جانشین مستی و مدہوشی میں اسی قسم کے ظالمانہ اور

شرمناک افعال کا تماشا دکھا چکے تھے۔ البتہ پہلے یہ بدعنوانیاں اکیلا بادشاہ کرتا تھا اور اس کی داد و دہش یا جنگی کارناموں سے بدنامی کی سیاہی دُھلتی رہتی تھی۔ اب خسرو خاں کی برادری کا ہر فرد فرعونِ بے سامان بن گیا اور اُن کی وحشیانہ جہالت اور قابوچی پن سے نفرت و غم میں اور زیادہ تلخی پیدا ہوگئی۔

خسرو خاں کو سب سے زیادہ خطرہ پاکستان کے صوبہ دار غازی مِلک (تغلق) سے تھا جس کی شجاعت اور کامیاب سپہ سالاری کا پہلے ذِکر آچکا ہے۔ خاندانِ شاہی کی دہلی میں تباہی سُن کر اسے سخت صدمہ ہُوا لیکن اس کا فرزند فخر الدین جُونا، جو آگے چل کر سلطان محمد تغلق کے لقب سے بادشاہ بنا، اُن دِنوں پایۂ تخت میں تھا۔ اُسے گزند پہنچ جانے کے خوف سے غازی مِلک چند روز تک کوئی جنگی کارروائی نہ کرسکا۔ بارے ایک شام کو جُونا دہلی سے چُھپ کر صحیح سلامت سرستی پہنچ گیا جہاں اس کے باپ کا فوجی دستہ قلعے میں متعین تھا۔ یہ سنتے ہی تغلق نے دوسرے امیروں اور صوبہ داروں کے پاس ہرکارے دوڑائے کہ غدّار خسرو خاں سے اپنے ولی نعمت کا انتقام لینے میں تعاون کریں، اور خود لشکر لے کر دیپال پور سے دہلی روانہ ہُوا۔ راستے میں دو ایک معرکے پڑے۔ آخری لڑائی پایۂ تخت کے قریب لہراوت کے میدان میں لڑی گئی۔ جہاں آج کل نئی دہلی بنی ہے۔ خسرو کی کثرتِ تعداد اور ساز و سامان کی افراط، تغلق کی شجاعت و کاردانی پر غالب نہ آسکی۔ ہزاروں پرواری مارے گئے اور جو بھاگے

انھیں ہر جگہ لوگوں نے پکڑ پکڑ کر قتل کیا۔ خسرو خاں چھپتا پھرتا تھا۔ آخر بھوک پیاس سے مجبور ہو کر ایک مالی کی جھونپڑی میں پناہ لی اور اسے اپنی انگوٹھی بیچنے کو دی۔ جوہری نے مالی پر شبہ کیا۔ کوتوالی کے جاسوس تلاش میں پھر رہے تھے۔ فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ بادشاہ کُش خسرو پکڑا گیا اور تشہیر و تذلیل کے بعد قتل ہوا۔[1]

یہ سفاک غاصب اپنے کیے کی سزا پا چکے تو فاتح سردار شہر میں آیا اور قصرِ ہزار ستوں میں مجلس عزا برپا کی۔ خاندانِ علائی کی تباہی پر عمائد و اُمرا نے جمع ہو کر عبرت کے آنسو بہائے۔ تغلق کی فتح اور ظالموں سے انتقام لینے پر خُدا کا شکر ادا کیا۔ غازی ملک نے ایک پُر اثر تقریر کی اور کہا کہ اگر بدقسمتی سے شاہی خاندان کا کوئی فردِ زندہ نہیں بچا تو بزرگانِ قوم کو چاہئے کہ اس منصب کے لیے موزوں ترین آدمی کا انتخاب کر لیں اور مَیں عہد کرتا ہوں کہ جس کا آپ انتخاب کریں گے، مَیں بھی اُس کی دل و جان سے اطاعت کروں گا۔

حاضرین نے جواب میں خود اُس کے جنگی کارنامے، اور شریفانہ اوصاف کی تحسین و تکرار کی اور بالاتفاق اسے اپنا بادشاہ

[1] امیر خسرو رح نے ان واقعات کو برنی کی تاریخ سے زیادہ صحت و صراحت کے ساتھ "تغلق نامہ" میں نظم کیا ہے اور یہ تاریخی مثنوی بہت دن گم رہنے کے بعد حال میں دستیاب ہوئی اور چھاپ دی گئی ہے۔

منتخب کر لیا ؎ (شعبان ۷۲۰ ھ، م ۱۳۲۰ ء) سلہ برنی لکھتا ہے کہ چوں کہ غازی ملک نے خسرو خاں کے مقابلے میں ملّتِ اسلام کی دست گیری کی تھی، اسے غیاث الدین کا لقب دیا گیا۔ اصلی نام کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ ابن بطوطہ نے شیخ رکن الدین ملتانی ؒ سے روایت کی ہے کہ وہ ترکوں کے قبیلۂ "کرونا" کا غریب آدمی تھا جو شروع میں سندھ آیا اور سلطان علاء الدین کے بھائی اُلغ خاں کی فوج میں بہت ادنا درجے کی نوکری سے بڑھا اور بہ تدریج سردار و سپہ سالار اور بادشاہی کے مرتبے تک پہنچ گیا ؎ واللّٰہُ یُؤتی ملکہٗ من یّشاء واللّٰہُ ذو الفضل العظیم ؎

سلہ شاید برنی کی غیر واضح عبارت نے فرشتہ کو دھوکے میں ڈالا اور وہ خسرو خاں کے غدر اور تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ سنہ ۷۲۱ ھ لکھ گیا اور یہی غلطی اکثر انگریزی تاریخوں میں متعدی ہوئی۔ "منتخب التواریخ" میں صحیح سن ۷۲۰ ھ لکھا ہے۔ ہم عصر مثنویاں "تغلق نامہ" اور "فتوح السلاطین" یہی سال بتاتی ہیں ؎

باب دہم

خاندانِ تغلق[1]

سلطان غیاث الدین تغلق اوّل کے اخلاق و اوصاف کی تعریف میں ہم عصر مورّخ (برنی) نے ورق کے ورق تحریر کیے ہیں۔ ہم انتظامی قابلیت کو دیکھتے ہیں کہ صرف چار پانچ سال کی حکومت میں نظم و نسق کی کلیں درست کر دیں۔ دیوانی اور فوجی عمّال کو ٹھیک وقت پر نقد تنخواہیں ملنے لگیں جس میں پہلے بہت بے قاعدگی آگئی تھی۔ امن و اطمینان کی بہ دولت مُلک میں عام خوش حالی کے آثار پیدا ہوئے۔ بہت سے ویران علاقے

---

[1] لفظ "تغلق" کی نسبت فرشتہ نے "ملحقاتِ طبقاتِ ناصری" کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اصل میں یہ ترکی زبان کا اسمِ صفت "قُتلغ" تھا جس کے معنی بڑے یا بزرگ کے آتے ہیں۔ اسی کو اہلِ ہند نے اُلٹ کر تغلق بنا لیا۔ (فرشتہ صفحہ ۱۳۰) مشکل لفظوں کو اس طرح اُلٹ لینا، ہندی دماغ اور تلفّظ کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ علمی دنیا نے بھی اِس تصرّف کو بے تامّل قبول کر لیا۔ حال آں کہ قُتلغ کی ایک اور شکل "قُتلُو" بھی موجود تھی۔

آباد اور بنجر زمینیں مزروعہ ہوگئیں اور برنی کے بیان کے مطابق آب پاشی کے لیے نہر کاوی کا طریقہ سب سے پہلے اسی بیدار مغز بادشاہ کے عہد میں یہاں جاری ہوا۔ (ص ۳۲۹)

جنوبی ہند میں انھی دنوں مسلمانوں کے خلاف ہندو راجاؤں کا ایک جتھا بنا اور ورنگل کا لدّر دیو بھی اس میں شریک ہوگیا دہلی یہ خبریں پہنچیں تو ولی عہدِ سلطنت ملک فخر الدین جُونا جسے اُلغ خاں کا خطاب ملا تھا، بڑے ساز و سامان کے ساتھ ورنگل پر بھیجا گیا (۷۲۲ھ، م ۱۳۲۲ء)۔ مالوہ اور شمالی دکن کے امدادی لشکر راستے میں آ ملے اور تلنگانہ میں بازارِ قتال گرم ہوا راجا نے قلعہ بند ہوکر قصور کی معافی چاہی اور حسبِ سابق خراج ادا کرنے کی پیش کش کی۔ جُونا رضامند نہ ہوا اور محاصرہ جاری رکھا۔ قلعے میں سامانِ خورد و نوش کی کمی نہ تھی اور لشکر شاہی میں قلعہ شکن آلات نہ تھے۔ خود محاصرین محاصرے کی طوالت سے تنگ آ گئے۔ تلنگانہ کی مرطوب آب و ہوا نے بہتوں کو بیمار ڈال دیا ایک بڑی پریشانی یہ ہوئی کہ دہلی کی ڈاک جو ہفتے میں دو، ورنہ ایک بار ضرور پہنچ جاتی تھی، چار ہفتے تک نہ آئی۔ فاصلہ ہزار میل سے زیادہ اور راستے میں غیر آباد جنگل پہاڑ کھڑے تھے ڈاک چوکی کے زنجیرے کی ایک کڑی کہیں سے نکل گئی تو پورا سلسلہ معطّل ہوگیا۔ سوے اتفاق سے اُلغ خاں کے دو تین مصاحب دہلی سے آئے تھے۔ ان میں ایک شخص عُبید[1] نامی

---

[1] اسی آٹھویں صدی ہجری میں ایران میں عبید زاکانی ایک مشہور رباعی بظرافت [illegible]

نجوم و رمل میں مہارت کا دعوا رکھتا تھا ، اس لیے زائچہ کھینچ کر فتح کی تاریخ لگا دی تھی ۔ وہ قریب آئی اور فتح کا کوئی قرینہ نظر نہ آیا تو اس فریبی نجومی نے فوج کے سرداروں میں یہ افواہ اڑا دی کہ بادشاہ کا دہلی میں انتقال ہوگیا ، الغ خاں نے خبر چھپانے کے لیے ڈاک روک لی ہے ۔ چند ترک امیروں کو اس بات کا یقین آگیا اور وہ اپنی فوجیں لے کر ورنگل سے چل دیے ۔ سارے لشکر میں افراتفری پھیل گئی ۔ الغ خاں کو مجبوراً محاصرہ اٹھا کر دیوگری واپس آنا پڑا ۔ یہاں پہنچتے پہنچتے ڈاک کا سلسلہ درست ہوگیا اور دہلی کے مراسلات آنے لگے ۔ ادھر دیوگری کے صوبہ دار نے نافرمان امیروں کو پکڑوا لیا ۔ بعض مارے گئے ۔ اکثر سپاہی اور سردار واپس آگئے ۔ الغ خاں دوبارہ اپنا لشکر مرتب کر کے تلنگانہ پر چڑھا اور اس مرتبہ ورنگل فتح ، راجا اعوان و انصار سمیت گرفتار کر لیا گیا ۔ الغ خاں نے یہاں اور بیدر ، کوہیر وغیرہ کئی قلعوں میں اپنی فوجیں تعینات کیں ۔ جا بہ جا دہلی کے حکام اور عمال مقرر ہوئے ۔ ورنگل کا نام بدل کر سلطان پور تجویز کیا ، اور مہاراشٹر کی طرح تلنگانہ بھی دہلی کی اسلامی سلطنت کا صوبہ بنا لیا گیا ۔ (۷۲۳ھ ، م ۱۳۲۳ء)

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) ہجوگو شاعر گزرا ہے ۔ ہماری کئی فارسی تاریخوں میں اس عتبید کو ”ازاکانی عبید“ بنا دیا ہے ۔ عتبید کی فریب کاری کی سب سے اچھی صراحت ”فتوح السلاطین“ میں ملتی ہے ۔ (ص ۳۹۲)

انھی ایام میں بادشاہ کو بنگالہ میں فساد و خانہ جنگی کی اطلاع ملی یہاں بغرا خاں (فرزند بلبن) کے وقت سے صوبہ داری موروثی ہو گئی تھی۔ یہ حکمران سلطنتِ دہلی کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے خطبہ اور سکہ بادشاہِ دہلی ہی کا چلتا تھا۔ کبھی کبھی خراج کے طور پر قیمتی تحفے دربارِ دہلی کو ارسال ہوتے رہتے تھے۔ لیکن اپنے صوبے کے معاملات میں وہ قریب قریب آزاد ہو گئے تھے۔ سبب یہ کہ بنگالہ پایۂ تخت دہلی سے دو مہینے کی مسافت پر تھا۔ دوسرے، ابتدائی فتح کے وقت سے مسلمانوں کی خاصی تعداد بنگالہ میں آباد ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے، یہاں بودھ مت والوں میں دینِ اسلام کی خوب اشاعت ہوئی، جس طرح سندھ میں ہوئی تھی۔ شہروں کی رونق اور فوجوں کی کثرت سے قیاس ہوتا ہے کہ زیرِ نظر زمانے میں کُل اسلامی آبادی کا شمار دس لاکھ سے کم نہ ہوگا۔ ان سب کا وطن بنگال بن گیا تھا۔ وہ اپنی مملکت میں بیرونی مداخلت کو ضرور ناپسند کرتے ہوں گے اور خود دہلی کے مسلمان بادشاہوں کو اُن پر جبر کرنا پسند نہ ہوگا۔ اس موقع پر بھی فوج کشی کی تحریک اصلی وارث شہاب الدین [1] کی طرف سے کی گئی تھی جسے ایک باغی بھائی بہادر شاہ نے عاجز کر دیا تھا۔ بادشاہی لشکر پہلے لکھنوتی آیا۔ پھر سپہ سالار بہرام خاں مشرقی پاکستان پر بھیجا گیا جہاں بہادر نے سنارگاؤں سے نکل کر شاہی فوج پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ فراری

---

[1] برنی ص ۴۶۱، 'فتوح السلاطین' اور بعد کی تاریخوں میں ناصر الدین نام لکھا ہے اور بعض نے اسے بُغرا خاں ہی سمجھا ہے۔

کے وقت ایک کنیز کو جس کا والہ و شیدا تھا، ساتھ لے جانا چاہتا تھا کہ کسی ندی کی دلدل میں پھنس گیا، اور اپنی محبوبہ سمیت اسیر ہُوا۔ تغلق نے شہاب الدین کو حکومتِ بنگالہ پر بحال رکھا اور بہادر شہ کو اپنے ہمراہ دہلی لے آیا پ[1] (۷۲۴ھ، م ۱۳۲۴ء)

آیندہ تیس پینتیس برس تک بنگالہ سلاطینِ دہلی کی سیادت کو مانتا رہا۔ مگر محمد تغلق کے آخری ایامِ حکومت میں یہاں کے والی علانیہ منحرف ہو گئے اور فیروز شاہ تغلق کو طوعاً و کرہاً ان کی آزادی ماننی پڑی۔ (۷۵۷ھ، م ۱۳۵۶ء) بنگالہ کی اس آزاد اسلامی حکومت کا حال آیندہ اوراق میں ہماری نظر سے گزرے گا ؛

بنگالہ سے واپسی میں غیاث الدین تغلق نے ریاستِ ترہٹ کو فتح کیا جس کا علاقہ موجودہ دربھنگا اور مظفرپور کے اضلاع پر مشتمل اور سرحد نیپال تک وسیع تھا۔ راجا کا مرکزی قلعہ ایسے گھنے جنگلوں میں واقع تھا کہ ان میں سے بڑی فوج بمشکل گزر سکتی تھی۔ بادشاہِ دہلی نے خود ہاتھ میں تبر سنبھالا، اور اس قدرتی فصیل کو کاٹنا شروع کیا۔ پھر تو ساری فوج پل پڑی اور چند روز میں ہزاروں درخت گرا دیے۔ راجا

---

[1] برنی ص ۴۴۹۔ فتوح السلاطین ص ۴۱۲ و مابعد۔ اس مثنوی میں بہادر شاہ کو "بودہ" لکھا ہے۔ فاضل مصحح نے اسے "بوہرہ" (تاجر) تصور کیا۔ دوسری تاریخوں میں "بورہ" یا "بڈا" درج ہے۔ یہ حرف بھارت میں اب تک بڈے، بڈھن کی صورتوں میں مروج ہے ؛

گرفتار ہُوا۔ ترہٹ میں بادشاہی عامل مقرر کر دیے گئے۔

(۷۲۴ھ)

سلطان محمد تغلق

غیاث الدین تغلق بنگالہ کی مہم سے واپس آیا تو شہر سے ایک منزل آگے شاہانہ استقبال کا انتظام کیا گیا۔ ولی عہد جسے وہ دلی میں نائب بنا گیا تھا، اور تمام عمائد و اُمرا پیشوائی کو آئے اور بخیر و سلامت واپس آنے پر دھوم کا جشن منایا۔ استقبالی دربار کے لیے ایک عارضی کوشک بنوائی تھی اور یہیں بادشاہ کی پُرتکلف ضیافت کی گئی۔ کھانے کے بعد اکثر حاضرین باہر آ گئے مگر بادشاہ اندر بیٹھا تھا کہ ہاتھیوں کی دوڑ سے یہ نئی عمارت جس کے ستون چوبی تھے، لرزنے لگی۔ مُلّا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ اُسے لرزتے دیکھ کر ہی اکثر حاضرین باہر نکل آئے تھے کہ اتنے میں چھت گری اور بادشاہ مع چند حاضر باشوں کے دب کر مر گیا۔ اس افسوس ناک حادثے نے جشنِ مسرت کو مجلسِ ماتم بنا دیا اور تین دن تک تمام اہلِ شہر اشک بار و سوگوار رہے (ربیع الاوّل ۷۲۵ھ/م ۱۳۲۵ء) آیندہ محمد تغلق سے ناراضی پھیلی تو لوگوں نے عام طور پر کہنا شروع کیا کہ اُس نے عمداً باپ کی ہلاکت کا منصوبہ بنایا تھا۔[1]

---

[1] مورخ برنی لکھتا ہے کہ جس وقت دسترخوان بچھایا گیا، اسی وقت نو تعمیر قصر پر بجلی گری، اور اس کے ٹوٹنے سے سلطان اور شہزادہ محمود چھت کے نیچے دب گئے۔ باقی اکثر حاضرین ہاتھ دھونے کے لیے باہر آئے تھے (باقی برصفحہ آیندہ)

بہر تقدیر، غیاث الدین کی وفات کے بعد فخر الدین جونا سلطان محمد تغلق کے نام سے بادشاہ ہوا۔ جس کی عجیب صفات نے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں اُسے انگشت نما کر دیا ہے۔ ضیاء الدین برنی اس کا ہم عصر و ہم جلیس تھا۔ وہ اوصاف سے زیادہ سلطان کے عیوب بیان کرتا ہے۔ اسی طرح عصامی بادشاہ سے نہایت ناراض ہے اور "فتوح السلاطین" میں دِل کھول کر اس کی بُرائیاں لکھتا ہے۔ افریقی سیّاح ابن بطوطہ اسی عہد میں ہندستان آیا اور بہت دن دہلی میں بادشاہ کا مہمان بلکہ قاضی کے عہدے پر ممتاز رہا۔ اسے بھی محمد تغلق کے ذاتی اعمال و عادات میں بہت سی بُرائیاں نظر آئیں۔ بادشاہ کے کئی بڑے بڑے منصوبے نقصان اور ناکامی پر مُنتج ہوئے اور ان سے اس کی بد نامی میں اضافہ ہوگیا۔ معاصرین کے ان تعصبات کو ملحوظ رکھ کر ہمیں تاریخی واقعات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

برنی گواہی دیتا ہے کہ بادشاہ ہوتے ہی محمد تغلق کی سخت نگرانی کی وجہ سے سلطنت کے قریب اور بعید صوبوں کا فرق مٹ گیا: جس وضاحت سے نواحِ دہلی کی جمع بندی اور سرکاری آمد و خرچ

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) وہ بچ رہے۔ (ص ۴۵۲) مگر اس ناگہانی بجلی گرنے کی روایت سے بھی لوگوں کا شک دُور نہیں ہوتا اور کئی تاریخوں میں لکھا ہے کہ محمد تغلق نے عمداً یہ قصر ایسا بنوایا تھا کہ گر پڑے اور بادشاہ ہلاک ہو جائے۔ ابنِ بطوطہ نے یہی روایت لکھی ہے اور عصامی نے بہ طورِ "قیاس" یہی شبہ کیا ہے۔ ص ۴۲۳ ۔ منتخب التواریخ، ص ۲۲۵۔

کے نقشے " دیوانِ وزارت " میں موجود رہتے تھے اسی طرح بنگال و دکن کے ایک ایک پرگنے کے کاغذات مرتب اور مہیا ہو گئے۔ قصر ہزار ستون میں شاہی دفتر قائم ہُوا۔ جس باریک بینی سے مضافاتِ دہلی کے عاملوں، اہل کاروں کے حسابات کی جانچ پڑتال ہوتی اور فاضلات یا بقایا میں چند پیسے کی بُھول چُوک بھی ناممکن تھی، اسی طرح بعید اقطاع اور اضلاع کے والیوں اور متصرّفوں سے پیسے پیسے کا حساب لیا جاتا تھا . . . ہر روز سو سو، دو دو سو شاہی فرمان مختلف حکّام کے نام نافذ ہوتے۔ ایک نیا محکمہ (= دیوان) محض شاہی فرامین کی تحریر و اجرای اور جوابات کی وصولی کے لیے قائم کیا گیا تھا . . . " (صـ ۳۶۸ و صـ ۷)

اس نگرانی اور مستعدی نے سرکاری آمدنی میں بڑا اضافہ کیا۔ شاہی خزانہ معمور ہوگیا۔ اسی نسبت سے سلطان کی داد و دہش ایسی بڑھی کہ بہ قول فرشتہ، حاتم و معن کی سخاوت گرد ہوگئی۔ تاتار خاں بادشاہ کا مُنہ بولا بھائی تھا۔ اُسے سُنار گاؤں (مشرقی پاکستان) کا حاکم بنا کر بھیجا تو چتر و دُور باش کے ساتھ، ایک سو ہاتھی ایک ہزار گھوڑے، ایک لاکھ اشرفیاں انعام دیں۔ ملک سنجر بدخشانی کو اسّی لاکھ، عماد الدین ریحانی کو ستّر لاکھ اور اپنے اُستاد مولانا عضد الدین کو چالیس لاکھ تنکے (= روپے) یک مشت عطا کیے . . . علما اور طلبہ، مستحقین و مساکین کو روزانہ ہزار ہا روپیہ دلوایا جاتا تھا۔ بیرونی ممالک سے جتنے اشخاص محمد تغلق کے عہدِ حکومت میں دہلی آئے کبھی نہ آئے تھے۔ وہ خود اعلا درجے کا

فاضل، معقول و منقول کا عالم، شاعر و سخن سنج، طبیب و مورّخ، انشا پرداز و خوش نویس تھا۔ اہلِ علم و ہنر کی دِل کھول کر قدردانی کرتا تھا۔ بعض ہم عصر مورّخوں نے لکھا ہے کہ قدرتی ذہانت کے علاوہ قیافہ شناسی میں بھی خاص ملکہ رکھتا تھا۔

شمال و جنوب کے سرحدی انتظامات

بادشاہ کی بلند خیالی اور عالی ہمتی میں انتہا پسندی شامل تھی۔ اسی لیے اُس کی غیر معمولی نوازش و فیاضی کا شہرہ آیندہ مظالم و سخت گیری کی فریاد و فغاں میں دب گیا۔ انھی متضاد اوصاف کا جلوہ سرکاری کاموں میں نظر آتا ہے۔ وقتِ واحد میں ہم اسے پاکستان اور ماورائے سرحد کی حفاظت اور دُوسرے سرے پر اقصائے جنوب کی تنظیم اور تکمیلِ فتح میں مصروف دیکھتے ہیں۔ جلوس کے دُوسرے سال خراسان کے مغل سپہ سالار ترمہ شیرین) نے سندھ و پنجاب پر حملہ کیا بلکہ چکّر کھا کے میرٹھ کی نواح تک پہنچ گیا۔ یہاں شاہی لشکر نے شکست دی۔ مگر ترمہ اسی تیز رفتاری سے ملتان و سندھ کے راستے واپس نکل گیا۔ بادشاہ خود لاہور آیا اور وہاں سے ایک لشکر مغلوں کی سرکوبی کے لیے سرحد کی طرف بھیجا جس نے پشاور و کلانور پر یلغار کی۔ یہاں کی مغل فوجوں کو سخت نقصان اُٹھا کر کابل کی طرف فرار ہونا پڑا۔ محمد تغلق نے خوب سمجھ لیا تھا کہ جب تک کوہستانِ سلیمان کے پار دفاعی مورچہ نہ بنایا جائے، پاکستان اِس قسم کی قزاقانہ ترک تازیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اُس نے وادیٔ

کابل کو فتح کرنے کا ایک وسیع منصوبہ بنایا جسے برنی "فتح خراسان" کا منصوبہ لکھتا ہے۔ لیکن غزنی تک اقدام کے بعد وہ دُوسرے انتظامی اور مالی قضیوں میں پھنس گیا اور پھر اس طرف توجہ نہ کرسکا۔ تاہم مُغلوں کی یورشیں رُک گئیں اور آیندہ پچاس ساٹھ برس تک وہ سندھ کے پار اُترنے کی جرات نہ کرسکے[1]

دُوسری سرحد پر، ممالکِ دکن میں قبضہ قائم رکھنے کی بادشاہ نے یہ تجویز سوچی کہ دیوگری میں ایک اسلامی شہر بلکہ (دوسرا) پایۂ تخت تعمیر کیا جائے۔ چناں چہ اس پہاڑی قلعے کے باہر بہت وسیع فصیل بنوائی۔ نئے شہر کا نام دولت آباد رکھا۔ مسجدیں، سرائیں،

---

[1] برنی نے ترمہ شیرین کے حملے کا ذکر نہیں کیا اور "فتح خراسان" کے منصوبے کو بھی بہت نافہمی سے بیان کیا ہے۔ 'فتوح السلاطین' میں اس مغل حملے کا تذکرہ کئی سال بعد آیا ہے۔ اور بادشاہ کے لاہور سے مہم روانہ کرنے کو بہت پہلے جُداگانہ عنوان کے نیچے لکھا گیا ہے۔ اس کے یہ چند شعر نقل کرنے کے لائق ہیں :- (ص ۴۲۳) ؎

"سران سپہ چوں بہ فرمانِ شاہ — ز لاہور راندند یک سر سپاہ
یکایک کلانور و فرشور را — گرفتند گردانِ لشکرکشا
زن و بچۂ کافراں شد اسیر — برآمد ز اقصائے اردوں نفیر
مغل کاں بہ ہر سال از آب سند — گزشتے بہ تاراجِ اقطاع ہند
دراں سال برعکس ایں رفت کار — بہ مُلکِ مغل تاخت ہندی سوار..."

محمد تغلق کے آخری ایام میں خراسان کے مغل بادشاہ نے کچھ امدادی فوج سندھ کا فساد رفع کرنے کے واسطے بھیجی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے دوستانہ تعلقات ہوگئے تھے۔

سرکاری عمارات کے علاوہ بازار و محلات تعمیر کرائے۔ بازاروں میں سے ایک چوک "طرب آباد" کے نام سے گانا گانے اور سننے والوں کے واسطے بھی بنوا دیا۔ دہلی سے یہاں تک راستے صاف اور ہر منزل پر لوگوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ عمائد و امرائے دہلی سے منہ مانگی قیمتیں دے کر ان کے دہلی کے مکانات اور جائدادیں خرید لیں۔ پھر حکم دیا کہ وہ اہل و عیال کے ساتھ جاکر دولت آباد میں آباد ہوں۔ اس حکم پر سب سے پہلے خود بادشاہ کی ماں مخدومہ جہاں نے عمل کیا اور ان کے ہم راہ نوکر، چاکر، وظیفہ خوار متوسلین اور درویشوں کی فوج کی فوج دہلی سے اٹھ کر دولت آباد چلی گئی۔ دوسرے امیر امرا اپنے خدم حشم کے ساتھ روانہ ہوئے اور قریب قریب سارا شہر خالی ہو گیا[1] (۷۲۷ھ، ۱۳۲۷م)

دکن میں مسلمانوں کے بسانے کی شاید اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ صرف ایک شہر کی آبادی کو دولت آباد منتقل کر دیا جائے اور پھر اس شہر کو قرب و جوار کے لوگوں سے دوبارہ بسا لیا جائے۔ سلطان محمد تغلق نے یہی کوشش کی تھی مگر دہلی جیسے بارونق، بنے بنائے شہر کو چھوڑ کر، اتنے دور دراز مقام پہ جانا اکثر اہلِ شہر کو سخت ناگوار گزرا اور بے شبہ سفر کی صعوبت

---

[1] دہلی سے اُن دنوں وہ قدیم شہر مراد ہوتا تھا جو ایبک و التتمش نے موجودہ مہرولی میں آباد کیا۔ "شہرِ نو" "سیری" وغیرہ کئی "دہلیاں" بعد میں آباد ہوئیں۔ یہ صاف طور پر پتا نہیں چلتا کہ محمد تغلق نے صرف پرانے شہر کی آبادی منتقل کی تھی یا سب "دہلیوں" کی؟

نے ان کی ناگواری کو اور بڑھا دیا۔ جس کی ایک تحریری شہادت فتوح السلاطین سے مل سکتی ہے۔ مصنّف کے سارے خاندان کو بھی اس عام جلا وطنی میں گھر سے نکلنا پڑا اور اس کا نود سالہ دادا، عزّ الدّین عصامی پہلی ہی منزل پر دُوسری دُنیا میں پہنچ گیا۔ مصنّف نے ظالم اور "دشمنِ خلق" تغلق شاہ کو پانی پی پی کے کوسنے دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ آبادی کا شاید دسواں حصّہ زندہ سلامت دولت آباد پہنچا باقی سب راستے میں مرکھپ گئے! یہ محض مبالغہ ہے اور اسی طرح جبریہ گھر خالی کرانے کے واقعات میں بھی افسانہ طرازی کی گئی ہے۔[1] بہر حال اہلِ دہلی پر جو کچھ بیتی ہو، حقیقت یہ ہے کہ اُن کی دولت آباد منتقلی کی بدولت ہی دکن میں مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ نے مستقل سکونت اختیار کی۔ یہ لوگ دہلی کی مرکزی حکومت سے جلد آزاد ہوگئے مگر یہ بعید و وسیع مُلک صدیوں تک انھی کے اخلاف کی میراث رہا۔ اگر کوئی مانے تو ملّت پر یہ اسی تغلق بادشاہ کا احسان ہے جس کا اکثر اہلِ تاریخ مضحکہ بلکہ تضحیک کرتے اور اسے دیوانہ و ظالم بتاتے ہیں۔

سکّہ مس

ہم عصر مورّخ نے سب سے زیادہ تنقید و تضحیک "سکّہ مس"

---

[1] 'فتوح' ص۴۲۲ ومابعد۔ عصامی لکھتا ہے کہ جو لوگ جانے میں سستی کر رہے تھے ان کے گھروں میں آگ لگادی گئی۔ ایک روایت ابنِ بطوطہ نے لکھی ہے کہ کوئی اندھا فقیر چھپا رہ گیا تھا۔ اسے ہاتھی کی دُم سے باندھ کر بھیجا گھسٹتے گھسٹتے صرف اس کا پاؤں دولت آباد پہنچا!

جاری کرنے پر کی ہے۔ لیکن شمالی ہند کے سب سے بڑے شہر کی آبادی منتقل کرنا، دولت آباد کو وسیع پیمانے پر تعمیر کرنا، پھر بادشاہ کی دریا دلی اور کئی سال کی خشک سالی سے رعایا کی محتاجی؛ خزانے کا خالی ہو جانا . . . اِن اسباب کو ذہن نشین رکھیے تو محمد تغلق کے اِس اجتہادی اقدام کا محرک سمجھ میں آ جاتا ہے۔ خود برنی کا بیان ہے کہ اُن دنوں ہندُستان میں چاندی سونے کے سکے کا ایسا قحط ہو گیا تھا کہ زراعت و تجارت میں بڑی رُکاوٹ پڑنے لگی تھی۔ بیرونی مہمات اور مُلکی مصارف کے واسطے حکومت کو زرِ خالص کی ضرورت تھی۔ پس محمد تغلق نے تانبے کا وہ سکہ یا اشرفی جاری کی جس کی قانونی قیمت آج کل کے زرِ کاغذی کی طرح اصل قیمت سے کہیں زیادہ تھی۔ ممالکِ چین میں کاغذی سکے کے رواج کا بہت قدیم زمانے سے پتا چلتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے اخیر میں وہاں، نیز ایران میں مغل بادشاہوں نے اسی قسم کے کاغذی سکے جاری کیے تھے جن پر شاہی مُہر چھاپ دی جاتی تھی۔ یہ سلطان محمد تغلق کے زمانے سے چند سال پہلے تک رائج رہے اور بہت ممکن ہے انھی کو دیکھ کر اسے اپنا مصنوعی سکہ رس چلانے کا خیال آیا ہو۔ وہ یہ حقیقت خوب سمجھتا تھا کہ سکے کا منشا محض مبادلۂ اجناس میں سہولت پیدا کرنا ہے۔ اور تانبے کو اس لیے کاغذ پر ترجیح دی کہ تانبا زیادہ پائے دار چیز تھی۔ لیکن چوں کہ اُسے ضرب کرنے کی پوری نگرانی اور تحدید نہ ہو سکی اور زرگروں نے چوری سے ہزاروں مسی سکے خود

بنا کر چلا دیے، اِس وجہ سے یہ جدت کامیاب نہ ہوئی۔ بادشاہ نے رعایا کی ایمان داری پر بھروسہ کیا تھا۔ رعایا نے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ بایں ہمہ محمد تغلق نے جب یہ سکہ منسوخ کیا تو کمال دیانت داری سے حکم دیا کہ جو لوگ مسی سکہ واپس کریں انھیں مقرر کردہ (سرکاری) قیمت کے برابر چاندی یا سونا ادا کر دیا جائے۔ یہ تانبے کی اشرفی دو سال تک شاہی ٹکسال میں ضرب ہوئی اور ۷۳۲ھ، م ۱۳۳۲ء میں منسوخ ہوئی۔ منسوخی کے وقت ہزاروں جعلی "اشرفیوں" کا مبادلہ خزانے سے ادا کرنا پڑا۔ [1]

قحط اور عجیب منصوبے

بدقسمتی سے انھی دنوں ممالکِ ہند میں خشک سالی سے جابجا قحط پڑ گیا اور بادشاہ کو دُور دُور سے قحط زدہ علاقوں میں غلّہ پہنچانے، رعایا کو بسانے تقاوی وغیرہ تقسیم کرانے میں بڑی محنت اور زیر باری اُٹھانی پڑی۔ "خراسان" کی فتح کے واسطے ایک خاص اور کثیر فوج تیار کی گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے موجودہ سرحد اور وادئ کابل کے خشک اور پتھریلے خطے کو مغلوں کی پیہم تاراجی نے بالکل ویران و بے حاصل بنا دیا تھا۔ بادشاہ نے اس طرف کا خیال چھوڑ کر سرحدِ چین فتح کرنے کا دشوار تر منصوبہ باندھا۔ غالباً اسے صحیح علم

---

[1] برنی ص ۴۷۵ و ۷۶۔ جعلی مسی اشرفیوں کے چند نمونے ابھی تک برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ ماہر سکیات ایڈورڈ ٹامس نے ان پر مفصل بحث کی اور محمد تغلق کی جدت پسندی اور نیک نیتی کی بہت تعریف کی ہے۔ "کرانیکلز... کنگز" ص ۲۳۹ تا ص ۲۵۲۔

نہ تھا کہ زرخیز چین کے راستے خراسان سے زیادہ طویل و غیر آباد ہیں ۔ اُمرا نے اس ارادے سے روکنا چاہا تھا مگر محمد تغلق نہ مانا ۔ ۷۳۸ھ / ۱۳۳۷ء میں اپنے بھانجے خسرو ملک کی سپہ سالاری میں ایک لاکھ سوار کا لشکر نیپال پر بڑھایا اور وہ نیپال کی بستیوں کو پامال کرتا ہُوا ، شاید تبت کی سرحد تک پہنچ گیا ۔ لیکن راستے کی دُشواری اور دُوری ، پھر مقامی آبادی کی دُشمنی سے اُس کا تعلق ہندوستان کے مرکز سے منقطع ہوگیا اُدھر اُن غیر آباد پہاڑی علاقوں میں رسد میسّر نہ آئی اور بارش و برف باری نے ہندُستانی فوج کی ہمّت پست کر دی ۔ خسرو ملک سخت نقصان اُٹھا کر واپس آیا تو بادشاہ کے غضب کا شکار ہُوا ۔ فوجِ ردیف کے ہر سردار و سپاہی کو جو آگے بڑھنے والوں کو کمک نہ پہنچا سکے تھے ، نافرمانی اور نمک حرامی کے جُرم میں سزائیں دی گئیں ؎

سلطان کی ایسی سخت گیری اور جلّادی نے حکّام و رعایا کو بےزار کر دیا ۔ دُوسرے یہی زمانہ ہے کہ شمالی ہند میں کئی سال بارش نہ ہونے سے ایک اور قحط ایسا پڑا کہ ضلعے کے ضلعے ویران ہوگئے ۔[1] حوالیٔ دہلی میں غلّہ میسّر نہ آتا تھا ۔ بہت سے فاقہ کش کسان لقمۂ اجل بنے ۔ ہزاروں رہزنی کرنے لگے ۔ مغربی دوآب اور جنوبی پنجاب کے زرخیز و گنجان اضلاع

---

[1] 'منتخب التواریخ' میں قحط کے حالات کو ہم عصر تاریخوں سے جمع کیا ہے ۔ صفحہ ۲۲۸ ؎

میں سب سے زیادہ مصیبت آئی ۔ سلطان محمد تغلق نے کمال تن دہی سے ان مشکلات کا مقابلہ کیا اور کئی سال تک موجودہ فرخ آباد کے ضلع میں رہ کر پایۂ تخت اور نواحی علاقوں میں رسد رسانی اور ازسرِ نو زراعت و آب پاشی کے وسائل مہیا کرنے کا انتظام کرتا رہا ۔ اُس کی بلند ہمتی اور بلند خیالی پر آفریں ہو کہ فلاحت و خوش حالی کا ایک نیا اور عجیب منصوبہ تیار کیا ۔ وہ گنگ و جمن دوآب کے تمام رقبے کو ایک باغ بنانا چاہتا تھا ۔ جس کی "کیاریاں" کم و بیش ہزار ہزار مربع میل کی تجویز کیں اور ہر کیاری میں صرف ایک جنس بونے کا ضابطہ بنایا ۔ مگر یہ منصوبہ عمال اور زمیں داروں کے پُورے تعاون کا محتاج تھا ۔ وہ لوگ عالی خیال بادشاہ کے مقاصد کو سمجھتے نہ تھے ، عمل کیا کرتے ؟ بے شبہ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا ۔ لوگ ساتھ نہ دے سکتے تھے اور بعض تجویزیں بھی تکلیف دہ یا ناقابلِ عمل تھیں ۔ مثلاً جو "کیاری" گیہوں کی کاشت کے لیے مخصوص کی گئی تھی ، اس کے بیسیوں باغ اور باڑیاں اکھاڑنے کا حکم دیا گیا ۔ یہ مالکان زمین کو سخت ناگوار ہُوا ۔ دُوسرے ، اِن تجاویز کو عمل میں لانے اور قحط زدہ اضلاع کی امداد کے لیے مزید روپے کی ضرورت پڑی ۔ بادشاہ نے دُوسرے صوبوں کے مالیے میں اتنا اضافہ کیا کہ صوبہ دار یا حکام فراہم نہ کر سکے ۔ صدرِ حکومت کی طرف سے سختی ہوئی تو علانیہ منحرف ہو گئے ۔

فسادات ۔ محمد تغلق کی وفات

یہ خیال کہ رعایا خستہ حال، سپاہ بددِل اور خزانہ خالی ہے ۔ بغاوت پسند صوبہ داروں کو ہمّت دلاتا تھا اور جب ایک نے سرکشی کی تو دُوسروں کو بھی تحریک ہوتی رہی ۔ چناں چہ محمد تغلق کے عہدِ حکومت میں بار بار شورشیں بپا ہوئیں ۔ دوآب اور پنجاب میں رعایا اور کاشت کاروں نے عمّال کے خلاف بلوے کیے کھیتیاں جلاکر دیہات سے نکل نکل گئے ۔ شاہی افواج کی مدد سے انھیں قابو میں لانا پڑا ۔ مُلتان میں صوبہ دار کشلی خاں کی بغاوت کے علاوہ اہلِ سیوستان (سہوان) کی سرکشی اور سخت سرکوبی کا ذِکر آتا ہے ۔ ۷۳۴ھ میں ابنِ بطوطہ اس شہر میں آیا تو دیکھا کہ بہت سے باغیوں کو مارکر کھال میں بُھس بھرا اور فصیلوں پر لٹکایا گیا تھا ؎

۷۴۱ھ میں بنگال اور پھر دکن کے جدید مقبوضات میں شاہی حکّام نے سرکشی کی ۔ محمد تغلق پہلے دولت آباد آیا پھر آگے بڑھ کر تلنگانہ اور ملے یار کا دَورہ کیا ۔ نافرمانوں کو سخت سزائیں دیں ۔ نالائقوں کو معزول اور نئے عمّال کو جابجا مقرر کیا ۔ ورنگل کے قریب شاہی فوج میں وبا پھیلی ۔ بہت سے سپاہی اور سردار ضائع ہوگئے ۔ خود بادشاہ بیمار ہوکر دولت آباد آیا ۔ اسی مراجعت میں ایک دانت ٹوٹا تو بیٹر کے قریب اُسے دفن کرا کے اُوپر گنبد بنوایا جو اب تک قائم ہے ۔ دہلی روانہ ہوتے وقت یہ بھی منادی کردی کہ چودہ سال پہلے جو لوگ وہاں سے دولت آباد آئے تھے

اب چاہیں تو واپس دہلی چلے جائیں۔ (۷۴۲ھ، م ۱۳۴۱ء)

بادشاہ کی مستعدی میں کلام نہیں لیکن آخر زمانے میں جب دکن کے اکثر مسلمان حکام متحد ہو گئے تو شاہی فوجیں اُن پر قابو نہ پا سکیں۔ بلکہ بادشاہ کا داماد اور مشہور سپہ سالار عماد الملک (سرتیز) مقابلے میں کام آیا۔ دکن میں ایک آزاد حکومت قائم ہو گئی۔ باغی امیروں نے پہلے امیر اسمٰعیل، پھر حسن ظفر خاں گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ (۷۴۸ھ، م ۱۳۴۷ء)؛ محمد تغلق گجرات میں ایک باغی امیر کی سرکوبی کرنے گیا تھا۔ دو تین سال تک وہیں مختلف شہروں میں مقیم اور انتظامات کی درستی میں مصروف رہا پھر یہ سُن کر کہ اس باغی امیر نے سندھ کے سومروں میں پناہ لی ہے۔ بحری راستے سے ٹھٹھہ آیا۔ یہاں عاشورہ محرّم کا روزہ مچھلی سے افطار کیا جس سے طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ ۲۱ر محرّم ۷۵۲ھ کے دن دُنیا سے گزر گیا۔ کہتے ہیں مرضِ موت میں خود یہ شعر کہے تھے: ؎

بسیار دریں جہاں چریدیم — بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم — ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر — چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

۲۷ برس حکومت کی اور بنگال و دکن کے انحراف سے قبل ممالکِ پاکستان و ہند کے اتنے وسیع رقبے کا بادشاہ رہا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے سوا کسی مسلمان بادشاہ کو اس سے پہلے یا بعد اتنی بڑی سلطنت نصیب نہیں ہوئی جس کے اُتھ سے سنار گاؤں اور لاہور سے

دوار سمدر تک ۲۳ صوبے اور سالانہ مال گزاری تقریباً ۱۴ کروڑ تھی رقبے کا اندازہ بھی ۱۵ لاکھ مربع میل ہوتا ہے۔

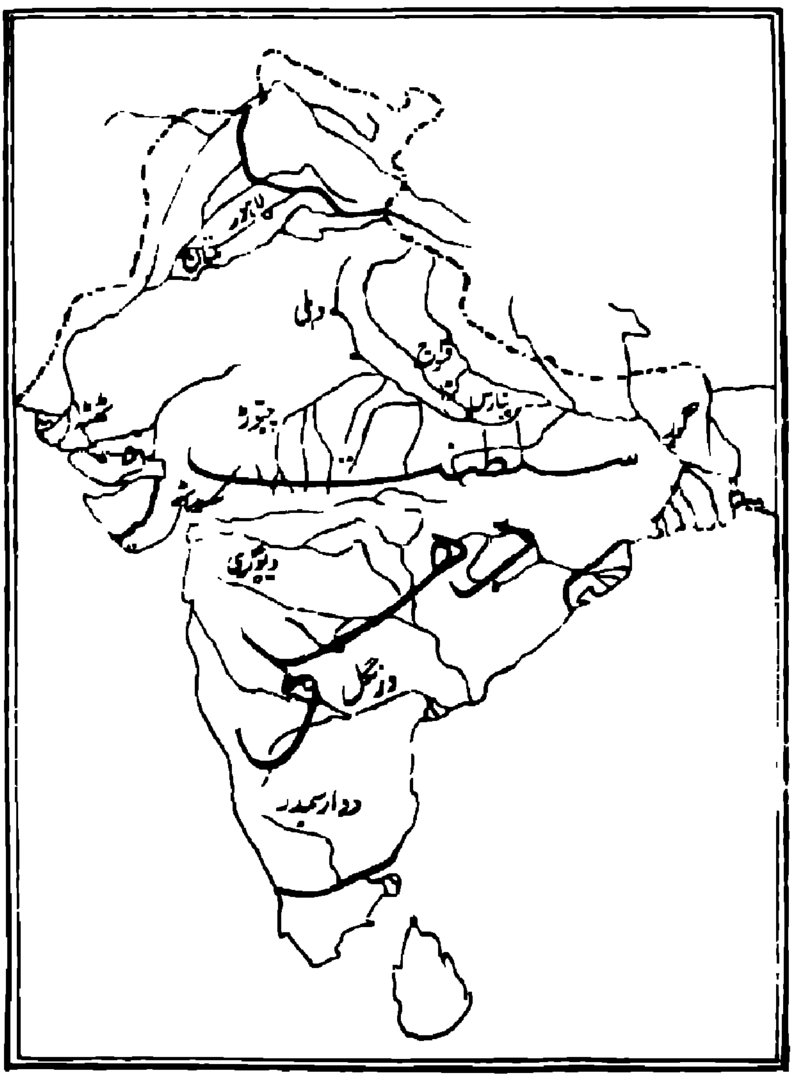
عہدِ فیروزی

برنی نے محمد تغلق سے اپنا ایک مکالمہ نقل کیا ہے (ص۵۲۱) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عماد الملک سرتیز کی وفات سے زیادہ بادشاہ کو دکن کے آزاد ہو جانے کا غم تھا۔ غالباً یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی کہ دکن میں مسلمانوں کو جبراً بسانا، ملی خدمت ہو تو ہو، سلطنتِ دہلی کے حق میں سازگار نہ تھا۔ ان جنوبی علاقوں کو فتح کرنے میں اسے بڑی جاں فشانی اور عرق ریزی کرنی پڑی تھی۔ اسی نسبت سے یہ جدید مفتوحات و مقبوضات اُسے بہت عزیز تھے مگر تجربے نے بتا دیا کہ دکن کی ہندو ریاستوں کو فتح کرنا اس قدر دشوار نہ تھا جتنا نو آباد مسلمانوں کو مطیع رکھنا مشکل ہُوا۔ اسی لیے محمد تغلق نے قصد کیا کہ گجرات وسندھ کے معاملات سے فرصت پا کر خود ہی ایک بڑی مہم دکن پر لے جائے۔ قضائے الٰہی نے یہ فرصت نہ دی اور پھر اس کے جانشین فیروز تغلق کو ہمت نہ ہوئی کہ مرحوم بادشاہ کے اس ارادے کی تکمیل کرتا۔ ظفر خاں نے سلطان علاءُ الدّین حسن گنگو بہمنی کے لقب سے بہت جلد دکن میں اپنی نئی حکومت مضبوط کرلی۔ (احسن آباد) گلبرگہ کو پایۂ تخت قرار دیا۔ ہم ایک آیندہ باب میں اپنی تاریخ کی گنجایش کے مناسب اس نئی بہمنی سلطنت کا حال پڑھیں گے۔ سردست سلطنتِ دہلی کی کیفیت سُنیے :-

نقشہ سلطنت دہلی

عہد عروج خلجی و تغلق

۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۵ء



محمد تغلق کے نرینہ اولاد نہ تھی ۔ شرعی حق دار چچا کا بیٹا فیروز تغلق تھا ، اسی کو اپنا وارث بنا گیا ۔ وہ بہت نیک نہاد مسکین مزاج شخص تھا ۔ سندھ میں رسم تخت نشینی ادا کر کے دہلی آیا ۔ حکام و رعایا سے نرمی کا برتاؤ کیا تو وہ عام شورش جو محمد تغلق کے آخری زمانے میں زور پکڑ رہی تھی ، بہت جلد فرد ہوگئی ۔ دکن اور بنگال کے سوا سب صوبوں نے بادشاہ کی اطاعت قبول کرلی ۔ فیروز تغلق نے دو مرتبہ بنگال پر فوج کشی کی لیکن وہاں کی خود مختار حکومت کو پوری طرح مطیع نہ بنا سکا اور آخر وہاں کے بادشاہ سلطان سکندر سے تحفے تحائف لے کر صلح کر لی (۷۵۸ھ م ۱۳۵۷ء) دراصل یہ بادشاہ جنگ سے زیادہ امن و رفاہ کا دلدادہ تھا ۔ سندھ میں جام بانہ بنیہ کی سرکشی سن کر ٹھٹھے پر لشکر لے گیا تو وہاں بھی دُوسرے کام یاب محاصرے میں جام کی خطا معاف کر دی ۔ اپنے ساتھ دہلی تو ضرور لے آیا (۷۶۲ و ۷۶۳ھ م ۱۳۶۱ء) لیکن بزرگانہ عنایت سے پیش آیا اور محل کے قریب بسنے کی جگہ دی جو کچھ روز بعد "سرائے تتہ" کہلانے لگی تھی۔

بادشاہ کا اصلی شوق عمارتیں بنوانا ، نئے شہر بسانا ، نہریں کھدوانا ، نیشکر اور پھلوں کے باغ لگانا تھا ۔ کلوکھری سے جنوب میں اتر کر فیروز آباد کے نام سے چھٹی "نئی دہلی" اسی نے آباد کی ۔ شاہ جہاں کی دہلی بننے تک وہی اس نام (دہلی) سے موسوم ہوتی رہی ۔ اس کا قلعہ (: کوٹلہ) بعض بڑی مسجدیں اور سرائیں ابھی تک باقی ہیں ؛ [۱] ہانسی کے آگے ایک نیا شہر

[۱] یہ نئی دہلی ، فیروز شاہ کے کوٹلے سے موجودہ سرائے روح اللہ خاں (دہلی دروازہ) تک تھی

حصار فیروز تعمیر کیا اور جمنا سے وہاں تک ڈیڑھ سو میل لمبی نہر کھدوائی جس نے اس ریگستان کو سبزہ زار میں تبدیل کر دیا تھا۔ جوناؔ یعنی مرحوم بادشاہ کے نام پر ایک اور شہر دوآب کے علاقے میں "جون پور" بسایا کہ آیندہ سلطنتِ شرقی کا پایۂ تخت بن کر اس نے بڑی رونق پائی۔ تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) اور قریب العصر تاریخوں میں دُوسرے کئی شہروں اور قلعوں کا ذکر آتا ہے جن کی اِس نیک بادشاہ نے تعمیر یا تجدید کی۔ الگ الگ مقامات پر جو مسجدیں، سرائیں، پُل، تالاب، حمّام وغیرہ بنے ان کی فہرست طولانی ہے۔ اس میں ایک بڑے دارالشفا اور دُوسرے شفاخانوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان سے ہر خاص و عام فائدہ اُٹھاتا تھا اور تمام مصارف شاہی اوقاف سے ادا ہوتے تھے۔

محمد تغلق سارے "ہندستان" کو جبرًا ایک باغ بنانا چاہتا تھا اسی سلسلے میں پھلوں کو وسیع پیمانے پر کاشت کرنے کا منصوبہ باندھا اور "امیر کوہی" کا خاص محکمہ قائم کیا تھا۔ فیروز شاہ نے جبر کا عنصر حذف کر کے اس محکمے کو بحال اور مصروفِ کار رکھا۔ اور صرف دہلی کی نواح میں بارہ سو نئے باغ اور تاکستان تیار کرائے جن میں بہترین قسم کا انگور پیدا ہوتا تھا؛[1] کم سے کم دوآب اور گجرات کے صوبوں میں باغوں کی ایسی فراوانی ہوئی کہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تک چھ میل لمبی اور جانبِ شمال دو میل چوڑی تھی۔ اس میں آٹھ جامع مسجدیں تھیں کہ ہر ایک میں دس ہزار نمازیوں کی گنجایش رکھی تھی۔

[1] فیروز شاہی، سراج عفیف۔ ص۲۹۵

فیروز شاہ کے کچھ مدت بعد اطالوی سیاح نکولو (دی کونتی) ان علاقوں میں آیا تو آبادی کی کثرت، اور عام خوش حالی سے بڑھ کر ملک کی سرسبزی اور باغ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لکھتا ہے کہ گنگا کے دونوں کناروں پر (سہارن پور سے) بنارس تک مسلسل آبادی، ہر طرف سے باغوں اور تاکستانوں میں گھری چلی جاتی ہے۔[1]

لامرکزیت اور حملۂ تیمور

مگر عام فراغت و آسودگی، سلطان کی رعایا پروری، اور ہر دل عزیزی کے باوجود اس کی عمر کے ساتھ حکومت میں ضعف آتا گیا۔ دکن اور بنگال کے بڑے صوبے پہلے ہی آزاد ہو چکے تھے۔ اب دوسرے اقطاع میں موروثی امیروں اور حاکموں نے زور پکڑا۔ غالبًا محمد تغلق کے عہد ہی میں تنخواہ کی بجائے جاگیریں دینے کا طریقہ جاری ہو گیا تھا۔ مگر وہ ذہین و سخت گیر بادشاہ شرائطِ جاگیر پر عمل کراتا اور انھیں موروثی ہونے نہ دیتا تھا۔ فیروز شاہ بڑے بڑے امیروں اور سرداروں کے عہدے عمومًا انھی کی اولاد کو دے دیتا تھا۔ اس طرح وہی اپنے بزرگوں کی جاگیر کے وارث ہو جاتے اور موروثی ریاستیں قائم کرنے لگے تھے دربارِ شاہی میں خان جہاں وزیرِ سلطنت کے کاروبار پر حاوی ہو گیا تھا مگر اس کی قابلیت و تجربہ کاری سلطان کی اولاد اور دوسرے امیروں کی رقابت کا انسداد نہ کر سکتی تھی۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے بوڑھا بادشاہ تنگ آ گیا۔ جبر و تشدد سے اسے نفرت

---

[1] یہ سیاح ۸۲۳ھ ، م ۱۴۲۰ء میں گجرات اور ہندستان آیا تھا۔ دیکھو ایلفنسٹن ص ۴۱۸

تھی۔ وعظ و نصیحت سے کام نہ چلتا تھا۔ آخر وہ از خود اپنے پوتے تغلق شاہ (ثالث) ابن فتح خاں کے حق میں بادشاہی سے دستکش ہوگیا۔ پھر چند مہینے کے بعد ۷۹۰ھ کے رمضان (مطابق ۱۳۸۸ء) میں وفات پائی۔ "وفاتِ فیروز" ہی تاریخِ وفات ہے۔

بادشاہ کے مرتے ہی کئی خاندانی دعوے دار میدان میں نکل آئے اور حکومت کے لیے تیغ آزمائی کرتے رہے۔ ۷۹۲ھ میں فیروز شاہ کا چھوٹا بیٹا محمد شاہ لڑ جھگڑ کر بادشاہ ہوگیا اور اُمید تھی کہ ایک مضبوط حکومت بنالے گا مگر اجل نے مہلت نہ دی۔ چند ہفتے کی خانہ جنگیوں کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ ۷۹۵ھ، م ۱۳۹۳ء میں تخت نشین ہُوا اور اُسی کے دَور میں خاندانِ تغلق کی سطوت کا آفتاب غروب ہوگیا۔ وزیر خان جہاں شہزادوں کی باہمی جنگ و جدال دیکھ کر جون پور چلا آیا اور وہاں ایک آزاد حکومت (: سلطنت شرقیہ) کی بنیاد ڈالی۔ وزارت پر (ملّو) اقبال خاں قابض تھا مگر دہلی کی بادشاہی گرد و نواح کے چند اضلاع پر مشتمل رہ گئی تھی۔ دُوسرے قطاع کا ذِکر کیا، پاس کے میوات ہی میں بادشاہ کا حکم نہ چلتا تھا[1] پہلے بعض شہزادوں کی رفاقت میں، پھر خود لُوٹ مار کرنے کے لیے میواتی چودھری پائے تخت کے بیرونی محلّوں پر چھاپے

---

[1] "منتخب التواریخ" میں لکھا ہو (صفحہ ۲۶۶) کہ یہ مثل اسی بادشاہ کے زمانے میں زبان زد ہوئی کہ "بادشاہی خداوندِ عالم از دہلی تا پالم" بعض کتابوں میں اسے خاندانِ سادات کے آخری بادشاہ علاءالدین شاہ عالم سے منسوب کرتے ہیں۔

مارے جاتے تھے۔

یہی زمانہ ہے جب کہ مغلوں کا لشکرِ کثیر امیر تیموؔر کی قیادت میں پاکستان کی سرحد پر نمودار ہوا اور مُلتان و پنجاب کو پامال کرتا ہوا پانی پت کے قریب جمنا کے پار اُترا۔ پھر میرٹھ کے اضلاع سے پلٹ کر دوبارہ دریا اُتر کے دہلی پر حملہ کیا۔ محموؔد اور اقباؔل خاں شہر سے نکل کر لڑنے آئے اور تیموؔر کو اعتراف ہے کہ ہندستانی سپاہی جان توڑ کر لڑے لیکن مغلوں کی کثرت اور اپنے سپہ سالاروں کی کم ہمتی سے شکست کھائی۔ محمود اور اس کا وزیر گجرات کی طرف بھاگے شہر پر تیموؔر کا قبضہ ہو گیا۔ (جمادی الاول ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۹ء)

یہ مغل حملہ آور چنگیز خانی مغول کی طرح کافر و وحشی نہ تھے بلکہ اسلامی ممالک میں رہ کر مسلمان ہو گئے تھے اور ایران کی اسلامی تہذیب و معاشرت اختیار کر لی تھی۔ امیر تیمور کا مادری نسب چنگیز کی پروتی تک پہنچتا ہے لیکن باپ کی طرف سے وہ اپنے آپ کو ترک خاندانِ برلاس سے منسوب کرتا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت بھی پایۂ تخت سمرقند میں ہوئی۔ وہ عقائد و عادات کے اعتبار سے ایک مہذب مسلمان امیر تھا مگر حق یہ ہے کہ جتنے مسلمانوں کا اُس کی تلوار نے خون بہایا، ان کی تعداد کافر چنگیز خاں کے مقتولوں سے کچھ بہت کم نہ ہوگی۔ پاکستان بھارت میں بھی اس نے جا بجا قتلِ عام کرائے۔ خوشامدی مورخوں نے مارے جانے والوں کو ہندو، کفار اور اسی طرح کے

ناموں سے یاد کیا ہے حال آں کہ ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی ۔ خصوصاً ملتان ، پایۂ تخت دہلی اور لاہور کی فوجی یا شہری اور اوسط و اعلا طبقے کی آبادی بیش تر اسلامی تھی جسے قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا گیا ۔ دہلی اور لاہور کے شہریوں کو امیر تیمور نے امان دی تھی مگر قبضہ ہونے کے بعد عہد شکنی کی اور ان سے "کفّار حربی" کا سلوک کیا ۔ مُغل فوجیں قتل و غارت کرتے کرتے تھک گئیں تو عالی شان قصور و محلّات کو آگ لگا کر برباد کر دیا ؂[1]

پاکستان سے رخصت ہوتے وقت تیمور ملتان کے حاکم خضر خاں کو پنجاب اور دہلی "بخش" گیا تھا ۔ وہ کئی سال مقامی امیروں سے لڑ جھگڑ کر ۸۱۷ھ ، م ۱۴۱۴ء میں شکستہ حال دارالسلطنت پر قابض ہُوا ۔ اگرچہ سلطنت پہلے ہی پارہ پارہ ہو چکی تھی ۔ تاریخوں میں خضر خاں کو " خاندانِ سادات " کا بانی قرار دیا جاتا ہے ۔ اُس کا سیّد ہونا پُوری طرح ثابت نہیں ۔ اور ان نام کے سیّدوں کی برائے نام بادشاہی بھی ۳۶ سال سے زیادہ نہیں چلی ۔ آخری بادشاہ علاءُ الدّین "شاہ عالم" کا پُر شکوہ لقب رکھتا تھا ۔ مگر وہ " عالم " دہلی اور آس پاس کے چند پرگنوں میں سمٹ آیا ، اور اسی پر یہ مَثَل مشہور

---

[1] بے حساب مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے علاوہ ، تیمور دہلی کے صدہا کاری گروں اور سنگ تراشوں کو پکڑ کر سمرقند لے گیا کہ وہاں محمّد تغلق کی جامع مسجد کے نمونے اور تراشیدہ پتھروں کی مسجد بنوائے ۔ (فرشتہ ص ۱۵۸) ؂

ہوئی کہ "بادشاہی شاہ عالم، از دہلی تا پالم"۔ لاہور کے صوبہ دار بہلول لودھی نے کئی مرتبہ اُسے جون پور اور مالوہ کے مسلمان بادشاہوں سے بچایا اور آخر میں خود حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

لودھی خاندان

خلجی اور تغلق خاندان کے زمانے میں افغانی سپاہیوں کی بڑی تعداد آ آ کر سلطنت دہلی کی فوجوں میں بھرتی ہوئی اور جنوبی پنجاب اور مغربی دوآب کے اضلاع میں بس گئی تھی۔ ان میں لودھی قبیلہ اپنی کثرتِ تعداد اور سپاہیانہ اوصاف میں ممتاز تھا۔ لیکن بہلول کے دادا نے تجارت میں نام پایا اور اس کی اولاد کو آخری تغلقوں نے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا تھا۔ دہلی پر قبضہ ہونے کے بعد بہلول کی جون پور کے "ملوکِ شرق" سے لڑائیاں ہوتی رہیں حتیٰ کہ سلطنت شرقی کا آخری فرماں روا شکستیں کھا کر بنگالہ چلا گیا اور بہار تک یہ علاقے پھر دہلی کے تحت میں آ گئے۔ (۸۸۳ھ، م ۱۴۷۸ء) بہلول نے جہاں تک ممکن تھا، حکومت کے کل پُرزے دوبارہ جمائے اور اس کے جانشین فرزند سکندر لودھی کے زمانے میں ۸۹۴ تا ۹۲۳ھ (م ۱۵۱۷ء) دوبارہ اِن علاقوں میں امن و رفاہ کی صورت نظر آئی۔ پایۂ تخت کی حالت تیمور کے حملے اور خانہ جنگیوں سے بہت خراب ہو گئی تھی۔ سکندر نے اسے چھوڑ کر آگرہ کے قریب سکونت اختیار کی اور وہ مقام اب تک اسی کے نام سے

"سکندرہ" موسوم ہے۔ یہی دَور ہے جس میں ہندوؤں کا مسلمانوں سے میل جول بڑھا اور کھتری، کایستھ، راج پوت قوموں میں فارسی زبان کی تعلیم کا رواج ہُوا۔ ہم اس موضوع پر آیندہ پھر بحث کریں گے۔ یہاں بابر کی آمد اور خاندانِ مغلیہ کے آغاز سے پہلے اتنا اور بیان کرنا ہے کہ سکندر لودھی کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت نشین ہُوا لیکن اپنے پٹھان سرداروں پر پوری طرح قابو نہ پاسکا۔ اسی نااتفاقی سے (امیر تیمور کے پوتے کے پوتے) ظہیرالدین بابر نے جو کابل و قندھار کا حاکم بن گیا تھا، فائدہ اُٹھایا اور اوّلاً پنجاب پر قبضہ جمایا۔ پھر ۹۳۲ھ/م ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم کو سخت شکست دی۔ ابراہیم بہادری سے لڑتا ہُوا مارا گیا۔[1] اسی کے ساتھ لودھیوں کی بادشاہی ختم ہوگئی۔

---

[1] اگرچہ بدآیونی کو پسند نہیں مگر "ہندیوں" کی کہی ہوئی تاریخ وفات "شہید شدن ابراہیم" نقل کردی ہے۔ ص ۳۳۷۔

ضمیمہ باب ہشتم

سلاطین دہلی کے نام اور سنین

۱۔ سلطان قطب الدین ایبک۔ ۶۰۲ تا ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۰۶ تا ۱۲۱۰ء

۲ آرام شاہ چند ماہ

خاندان شمسیہ

۱۔ سلطان شمس الدین اِل تُتمِش ۶۰۷ تا ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۵ء

۲۔ رکن الدین فیروز تا ۶۳۴ھ

۳۔ سلطانہ رضیہ تا ۶۳۷ھ

۴۔ معزالدین بہرام تا ۶۳۹ھ

۵۔ علاء الدین مسعود تا ۶۴۴ھ

۶۔ ناصر الدین محمود تا ۶۶۴ھ

۷۔ غیاث الدین بلبن تا ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۷ء

۸۔ معزالدین کے قباد تا ۶۸۹ھ

خاندان خلجی

۱۔ جلال الدین فیروز ۶۸۹ تا ۶۹۵ھ

۲۔ رکن الدین ابراہیم چند ماہ

۳۔ علاء الدین (محمد) تا ۷۱۵ھ م ۱۳۱۵ء

۴ شہاب الدین عمر چند ماہ

۵۔ قطب الدین مبارک تا ۷۲۰ھ م ۱۳۲۰ء

خسرو خاں غاصب چند ماہ

خاندانِ تغلق

۱۔ غیاث الدین تغلق تا ۷۲۵ھ
۲۔ محمد تغلق تا ۷۵۲ھ
۳۔ فیروز شاہ تغلق تا ۷۹۰ھ
۴۔ تغلق شاہ ثانی تا ۷۹۱ھ
۵۔ ابوبکر تغلق تا ۷۹۲ھ
۶۔ محمد تغلق ثالث تا ۷۹۵ھ
۷۔ سکندر شاہ چند ماہ
۸۔ محمود تغلق تا ۷۹۷ھ
۹۔ نصرت شاہ تا ۸۰۲ھ
۱۰۔ محمود تغلق (مکرر) تا ۸۱۵ھ م ۱۴۱۲ء
(فوجی امرا تا ۸۱۷)

خاندانِ سادات

۱۔ خضر خاں ۸۱۷ تا ۸۲۴ھ
۲۔ معز الدین مبارک تا ۸۳۹ھ
۳۔ محمد شاہ تا ۸۴۷ھ
۴۔ عالم شاہ (برائے نام تا ۸۵۵ھ)

لودھی خاندان

۱۔ بہلول لودھی ۸۵۵ تا ۸۹۴ھ م ۱۴۸۸ء
۲۔ سکندر لودھی تا ۹۲۳ھ
۳۔ ابراہیم لودھی تا ۹۳۴ھ م ۱۵۲۶ء

باب یازدہم

آزاد حکومتیں (۱)

وہ مرکزی سلطنت جسے ایبک و اِل تُتمش نے ساتویں صدی ہجری میں بنایا اور خلجیوں نے ممالکِ دکن تک پھیلایا، دو سو برس تک چلی۔ نویں صدی ہجری کے شروع میں اس کی مرکزیت کا شیرازہ بکھرا اور نہ صرف بنگال و دکن، بلکہ دوآب، مالوہ، گجرات، سندھ تک دہلی کی آقائی سے آزاد ہوگئے۔ سیاسی اعتبار سے یہ نقصان کی بات اور اہلِ بھارت کے زوال کا نشان تھا لیکن ملی نظر سے دیکھیے تو اسی لامرکزیت کے دَور میں مسلمانوں کی سرگرمیاں بڑھیں، اور اسلامی تہذیب ہندستان کے گوشے گوشے میں روشناس ہوئی۔ مشرق میں اسام (کام روپ) تک ان کا کلمہ پڑھا گیا۔ خاندیس و دکن کے ویرانوں میں ان کی بستیاں بسیں۔ گجرات و مغرب میں ان کی خانقاہیں آباد ہوئیں۔ کشمیر کے پہاڑوں سے ان کی اذان بلند ہوئی؛

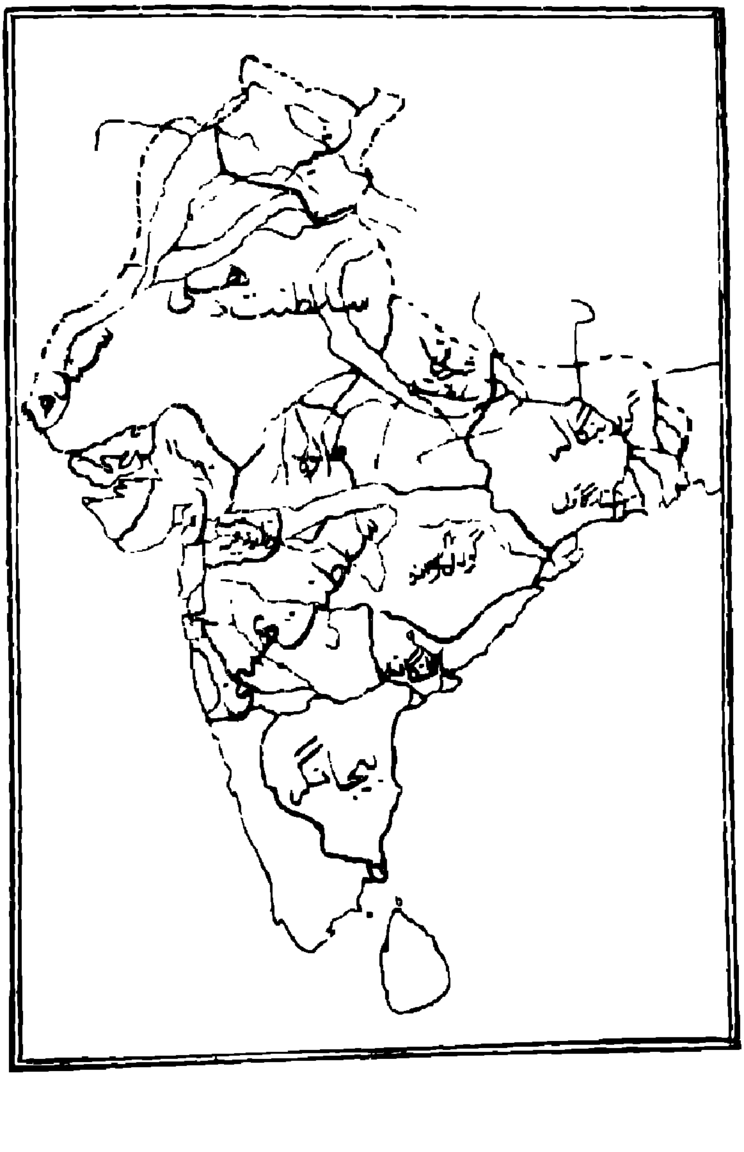
یہ آزاد حکومتیں کوئی دو سو برس (کہیں زیادہ، کہیں کم، زمانے) تک بادشاہی کا ڈنکا بجاتی اور اپنے اپنے نام کا سکہ چلاتی رہیں۔ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے وہ چند بڑی سلطنتوں کے سوا، یورپ و ایشیا کے دُوسرے خودمختار مُلکوں سے کم نہ تھیں۔ ان کے سیاسی اور معاشی مسائل ہر جگہ یکساں نہ تھے اور باہمی رقابت و عداوت سے آپس میں لڑائیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر طرزِ حکومت سب کا ایک تھا۔ جو شخص شمشیر یا سازش و تدبیر کے زور سے تختِ شاہی تک پہنچ جاتا، وہی مطلق العنان بادشاہ ہو جاتا تھا۔ بادشاہی اسی کی اولاد کا ورثہ بن جاتی تھی۔ دربار کے امیر اور فوجوں کے بڑے سردار بھی، جب تک متفق یا جان پر کھیلنے کے لیے تیار نہ ہو جائیں اس موروثی حکومت میں ردّ و بدل نہ کر سکتے تھے۔ عام رعایا کا مُلکی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ تھا۔

لوازم بادشاہی اور عمرانی ترقی

جو حکومتیں آزاد ہوئیں، انھیں اپنے اپنے علاقے میں خودمختار بادشاہی کے وہ سب لوازم جمع کرنے پڑے جن کا پہلے صرف سلطنت دہلی کو امتیاز حاصل تھا۔ یعنی عالی شان محلات، درباری آرایش و تجمل کے بیش قیمت سامان، گراں بہا لباس و زیورات، بہتر سے بہتر سواریاں، بڑی بڑی فوجیں، بادشاہی کارخانے اور محکمے اور اسی طرح شاہانہ تزک و احتشام کے صدہا اسباب جن کی ماتحت ولایات و اقطاع میں ضرورت نہ تھی لیکن جب یہ آزاد

نقشہ حکومت ہائے آزاد

سنہ ۸۰۰ھ مطابق سنہ ۱۳۹۸ء



مملکت بنے، تو نئے بادشاہوں کی بڑی خواہش اور کوشش یہی ہوتی تھی کہ جاہ و جلال کے اعتبار سے ان کا دربار بلبن و علاءُ الدین کے درباروں کا نمونہ بن جائے۔ ان اغراض کے واسطے ضرور تھا کہ پہلے سے زیادہ روپیہ فراہم کیا جائے اور اس طرح یہ نوخیز بادشاہ گویا مجبور تھے کہ مُلکی دولت و ثروت کو ہر ممکن طریق سے بڑھائیں تاکہ انھیں اپنے دل کے حوصلے نکالنے کا موقع رہے۔ چناں چہ اُن کے دَور میں ہم قریب قریب ہر جگہ زراعت و باغ بانی، صنعت و تجارت میں ترقی دیکھتے ہیں، اور کچھ شک نہیں کہ ممالکِ ہند کی مجموعی دولت میں پہلے کی نسبت بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے؛ یہی زمانہ ہے جس میں جابہ جا نئے شہر تعمیر ہوئے اور اسلامی تمدّن اور علم و فن کا مرکز بنے۔ ان میں سے اکثر بستیاں پہلے سے موجود تھیں لیکن مسلمانوں نے وہاں وسیع شہر پناہیں، عالی شان قلعے، قصور و محلّات، مساجد و مدارس اور بڑے بڑے بازار بنا کر انھیں کچھ سے کچھ کر دیا۔ بنگالہ میں لکھنوتی یا گور[۱] اکدالہ، پنڈوہ، سُنارگام، سات گام اسی قسم کے شہر تھے جنھیں مسلمان بادشاہوں نے ازسرِ نو تعمیر کیا اور ان کی آبادی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی؛ دکن میں

---

[۱] مُلّا عبدالقادر بدایونی کے بہ قول، لکھنوتی کو محمد بن بختیار خلجی نے اپنے خراسانی وطن "غور" کی یاد میں یہ نام دیا تھا۔ (ص۵۳) مگر تکی رغ بنگالی گ سے بدل گیا؛ رونق کے زمانے میں اس شہر کی آبادی کا تخمینہ پرتگیزوں نے دس لاکھ کیا تھا۔ (راورٹی، ترجمہ طبقات ص۵۸۳)

دولت آباد، گُل برگہ اور بیدر نے عروج پایا۔ یہ پہلے محض جنگی قلعے تھے۔ سلاطین بہمنی کے عہد میں وسیع شہر بن گئے۔ خود ان بادشاہوں نے اَوسہ اور پریندہ میں جو قلعے تعمیر کیے، وہ فنِ حرب میں ان کی مہارت کی یادگار ہیں۔ گاوِل گڑھ اور نرنالہ کو دیکھ کر میڈوز ٹیلر کو اقرار کرنا پڑا کہ ممالکِ یورپ اس زمانے میں ایسی پُرشکوہ عمارات کا جواب پیش کرنے سے عاجز تھے۔[1] ان کے قریب ہی خاندیس میں فاروقی بادشاہ نصیر خاں نے برہان پور کو نویں صدی ہجری کے آغاز میں آباد کیا۔ زین آباد اور سلطان پور بھی نئے اسلامی شہر تھے جو اب ویران ہو گئے۔ مانڈو، سارنگ پور وغیرہ کئی شہروں کا یہی حال ہُوا جنھیں مالوہ کے اسلامی سلاطین نے تعمیر کیا تھا۔ مگر اس عمرانی ترقی اور تمدنی سرگرمی میں شاید گجرات سب سے بڑھ گیا تھا، جہاں کی بہت سی گُم نام پُرانی بستیاں مسلمان بادشاہوں نے از سرِ نو آباد کیں۔ نئے شہر اور ساحلی بندر بنائے جن کی تجارت و مصنوعات دُور دُور کے مُلکوں میں مشہور تھیں۔ نویں صدی ہجری (چودھویں عیسوی) کے اخیر میں یورپ کے سیّاح و تاجر روز افزوں تعداد میں ہندستان آنے لگے تھے، ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ گجرات ہی کی کثرتِ آبادی اور خوش حالی کی شہادتیں ملتی ہیں۔ ونسنٹ اِسمتھ بھی جس کی تاریخ نویسی کا ایک مقصد مسلمانوں کی تنقیص و مذمت معلوم ہوتا ہے، یہ لکھے بغیر نہ رہ سکا کہ شہر

---

[1] آوکسفورڈ ہسٹری، صفحہ ۲۸۴

احمد آباد اپنے عروج کے وقت "بے شک وشبہ دُنیا کے سب سے خوب صورت شہروں میں داخل تھا۔ اُس کی (اُن دنوں کی) آبادی نو لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ وہاں کے تاجروں میں کروڑپتی سوداگر موجود تھے"؛ لہ

سندھ سے مُلتان کا علاقہ جُدا ہُوا تو حکومت کے ساتھ آبادی کا میلان جنوب مغرب کی طرف پھر گیا۔ کئی دارالحکومت بدلے۔ پُرانے شہر اُجڑے، نئے آباد ہوئے۔ بھکّر، سکھر، سیہوان، شکار پُور، خاصی رونق پر تھے۔ آخر کو (نویں صدی ہجری) میں ٹھٹہ (= تتّہ) پائے تخت بنا، آس پاس کے کئی شہروں کے باشندے اُٹھ اُٹھ کر یہیں آبسے اور ایک روایت کے بموجب انھی کے "ٹھٹ" لگ جانے کی وجہ سے یہ شہر ٹھٹہ مشہور ہوگیا؛ ٢ہ شمال میں کشمیر کو مسلمان بادشاہوں نے آراستہ کیا۔ علاءُ الدّین پُور، شہاب الدّین (یا شادی) پُور جیسے شان دار محلات نے سری نگر کو واقعی قابلِ دید شہر بنا دیا؛ دوآب میں شرقی سلطنت کی آزادی سو برس بھی نہیں رہی، لیکن دو تین ہی بادشاہوں کی سعی اور حُسنِ مذاق کی بدولت جون پور ایسا چمکا کہ مشرق و مغرب میں اس کا نام روشن ہوگیا؛

لہ اوکس فورڈ ہسٹری، صفحہ ۳۷۱۔ "کروڑپتی" سوداگر اُن دنوں بہت نایاب جنس سمجھی جاتی تھی؛

٢ہ۔ تحفۃ الکرام، ج سوم صفحہ ۱۸۵؛

علما اور مشائخ

مگر عمرانی ترقی سے بڑھ کر سلاطینِ شرقی کا بڑا کارنامہ یہ ہو کہ سارے مُلک میں بیسیوں مدرسے بنا دیئے۔ تعلیم کا بڑا مرکز شہر جون پور تھا لیکن صدہا علما اور مشائخ کو دیہات جاگیر میں دیے گئے تھے کہ وہ اور ان کے شاگرد اطمینان سے وہاں رہ کر علمی مشاغل میں زندگی بسر کریں۔ اہلِ علم کی یہی "نو آبادیاں" تھیں کہ شاہ جہاں جیسا عالی نظر بادشاہ فخریہ کہا کرتا تھا کہ "پُورب شیراز ماست!" انگریزوں کے دَور تک سلطنت شرقی کے یہ اسلامی قصبات مردُم خیزی اور علمی مذاق میں امتیاز رکھتے تھے۔

ٹھٹھہ سے پنڈوہ اور دہلی سے بیدر تک صدہا درس گاہیں اور خانقاہیں قائم ہوگئی تھیں۔ بہت سے اہلِ تصنیف علما اور صدہا صاحبِ ارشاد صوفیہ کے نام تذکروں میں آتے ہیں۔ ملک العلما قاضی شہاب الدّین (دولت آبادی ثم جون پوری) شیخ علی (مہائمی) اور شیخ علی متقی (برہان پوری) کی فاضلانہ تصنیفات اسی دَورِ لامرکزیت میں شائع ہوئیں، اور بعض اب تک اسلامی دُنیا میں مقبول ہیں۔[1] مشائخ صوفیہ پر نظر

---

[1] ان کی "کنز العمال" بہت مشہور ہو جس میں سیوطی کی "جمع الجوامع" کو اربابِ فقہیہ میں ترتیب دیا ہو۔ اسی علمی خدمت کی بنا پر یہ قول مقبول عام ہُوا۔ للسیوطی منۃٌ علی العالمین وللمتقی منۃٌ علیہ!

یکھیے تو بنگالہ میں شیخ علاءُ الحق، بہار میں شرف الدین یحییٰ منیری، دوآب میں سیّد بدیع الدین مدار صاحب، بہار میں سیّد جہاں گیر اشرف سمنانی، دکن میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، گجرات میں قطب عالم، کشمیر میں امیر سیّد علی ہمدانی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) جیسے نامی گرامی حضرات اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جو اہلِ ہند کا مسلمانوں سے رابطہ بڑھانے اور دینِ اسلام پھیلانے کا مؤثر ذریعہ بن گئے۔ تذکروں میں ان کے کشف و کرامات اور کہیں کہیں تبلیغ و دعوت کے قصّے تحریر ہیں۔ خود ان صاحبوں کی بہت سی تصانیف ابھی تک محفوظ ہیں۔ یہ رُوحانی مکاشفات اور ذاتی مشاہدات کے علاوہ تصوّف کے اسرار و معارف بیان کرتی ہیں۔ اکثر حضرات پر فلسفۂ وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا رنگ چڑھتا نظر آتا ہی۔ سخت مجاہدات اور ترکِ تعلقات کی تعلیم رُہبانیت کا میلان دکھاتی اور ضمناً شریعتِ ظاہر کا وزن و وقار گھٹاتی ہی۔ قلندر، مجاذیب، ملامتیہ وغیرہ چند صوفی فرقے، علانیہ قیودِ شرعی سے آزادی کے طلب گار معلوم ہوتے ہیں۔

ممکن ہی فلسفۂ تصوّف ہی کا یہ اثر ہُوا ہو کہ نویں صدی ہجری کے علمائے ظاہر میں تفسیر و حدیث کی بجائے منطق و فلسفہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ عملی زندگی کے مسائل کی طرف توجّہ نہ رہی، علمِ کلام کی باریکیاں اور فقہی مُوشگافیاں دلچسپی کا سامان بن گئیں۔ اچھے اچھے مولوی اس قسم کی بحثوں میں وقت ضائع کرنے لگے کہ کالی بلی کے جھاگ پاک

ہیں ، یا ناپاک ؟ [1] صوفیہ کی آزاد روی ، علما کی ظاہر پرستی اور عوام کے بدعات اور فاسد عقائد کا قوی ردِّ عمل سیّد محمد جون پوریؒ کی تحریکِ مہدویت کو سمجھنا چاہیئے جس نے نویں صدی ہجری کے نصف آخر میں اسلامی ہند کے اکثر اقطاع میں خاصی ہل چل ڈال دی تھی ۔ سیّد موصوف (ولادت ۸۴۷ھ وفات ۹۰۵ھ) مہدی آخر الزماں ہونے کا دعوا کرتے تھے ۔ اس سے علما کو اُن کے خلاف بھڑکنے بھڑکانے کا اچھا حربہ مل گیا اور اپنے وطن (دو آب) میں ان کی تحریک سرسبز نہ ہو سکی ، ورنہ ان کی تعلیم و تلقین کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بدعت و کج روی سے روکا جائے اور سنّتِ نبوی ؐ کے راستے پر واپس لایا جائے ۔ [2]

فارسی شاعری

کسی دِل جلے نے تصوّف کو طعنہ دیا تھا کہ " برائے شعر

---

[1] دیکھو' اخبار الاخیار' ص۱۶۵ ، مناظرہ قاضی شہاب الدّین و شیخ ابوالفتح جون پوری ۔

[2] گجرات ، مالوہ اور دکن میں چند ملوک و امرا ، نیز علما نے سیّد صاحبؒ کی دعوت کو قبول کیا ، اور ان ممالک میں اب تک اُن کے " مہدوی " پیرو موجود ہیں ۔ آخر وہ سندھ کے راستے بلوچستان و خراسان گئے ۔ بہ مقام فراہ انتقال کیا اور وہیں آپ کا مزار ہے ۔ گجرات میں کسی نے " لیس ذٰلك مهدیا " سے ۹۱۰ھ تاریخِ وفات نکالی تھی (مراۃِ سکندری ، ص۱۳۶)

گفتن خوب ست "، لیکن ہندُستان میں تصوّف کا فروغ، کم سے کم آٹھویں، نویں صدی ہجری میں شعر گوئی کے حق میں کچھ بہت سازگار نہ تھا، صوفیہ شعر سے کام لینے لگے ہوں[1] تو بھی شعرا، (امیر خسرو کے بعد) تصوّف سے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ ہندُستان کی بزمِ ادبیات پر اوس پڑ جانے کا ایک سبب یہ ہوگا کہ مغلوں کے استیلا نے ایران و خراسان سے ان کے روابط منقطع کردیئے تھے۔ پاکستان و ہند میں جن مسلمان خاندانوں کی کئی پُشتیں گزر گئیں اور وہ نومسلم ہندی جن سے اسلامی آبادی میں روز افزوں اضافہ ہُوا، فارسیت سے طبعی مناسبت نہ رکھتے تھے۔ تاہم قوم کی ادبی زبان فارسی ہی تھی اور لکھنے والے اس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ آٹھویں صدی میں خاندانِ تغلق کے ایک شہزادے (مسعود بک) کہ دولتِ دُنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے، نثری تصانیف کے علاوہ ایک دیوانِ شعر یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ انھی کے ہم عصر مطہر تھے جن کا وطن کڑہ اور تربیت گاہ دہلی تھی۔ ایک اور شاعر ظہیر دہلوی کو مُلّا عبدالقادر ماقبل مُغل زمانے کا "خاتم الشعرا" لکھتے ہیں۔ جمالی کنبوہی دہلوی کی شہرت کا سبب یہ تھا کہ حضرت جامی رح کے شاگرد (؟) اور سلطان سکندر لودھی کے اُستاد تھے۔ خود یہ لودھی بادشاہ گُل رُخ تخلّص کرتا اور شعر

---

[1] بوعلی شاہ قلندر رح کی مثنویاں اور ضیاے نخشبی صاحبِ "سلک السلوک" وغیرہ کے مسلسل قطعات اس کی مثال ہیں۔ (اخبار الاخیار، ص ۱۰۵)

کہتا تھا۔ پُر تصنّع شاعری کی مثال میں، مُلّا صاحب نے اس کا یہ مطلع نقل کیا ہے: ؎

سروے کہ سخن پیرہن و گل بدنستش
روحے ست مجسّم کہ دراں پیرہنستش

لیکن اس عمومی تبصرے کو ختم کر کے، مناسب ہوگا کہ ہم زیرِ نظر عہد کی آزاد حکومتوں کی سیاسی تاریخ کا خلاصہ ناظرین کے سامنے پیش کریں۔

سندھ

پاکستان میں تقدم سندھ کو حاصل ہے، دہلی کی سلطنت میں زوال آیا تو یہ مُلک بھی نویں صدی ہجری (پندرھویں عیسوی) کے شروع سے آزاد ہوگیا۔ یہ ہم دُوسرے باب کے آخر میں بتا چکے ہیں کہ پانچویں صدی ہجری کے وسط سے یہاں عرب نژاد سومرہ خاندان کے امیر حکومت کرتے تھے۔ 'تحفۃ الکرام' نے ان کی تعداد انیس اور تاریخِ دولتِ علویہ میں اکیس بتائی گئی ہے۔ یہ سب، پہلے غزنوی اور غوری بادشاہوں کے، اور آخر میں سلطنت دہلی کے تابع تھے۔ نویں صدی ہجری کے شروع یا وسط میں سمہ خاندان ان پر غالب آیا۔ ان میں سردار یا امیر کے واسطے "جام" کا لفظ عام تھا۔ شاہانِ دہلی کی ماتحتی، پھر آزادی کے زمانے میں بھی اسی لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ پہلا شخص جس نے سومروں سے حکومت چھین کر اپنے خاندان کو جمایا، انڑ یا انیرا (فیروز) تھا۔ (۷۵۲ھ، م ۱۳۵۱ء)۔ مگر آزاد حکمرانی

کا آغاز جام بانبھیہ بن خیرالدّین کے وقت سے سمجھنا چاہیے جسے فیروز شاہ تغلق کے جانشین پوتے تغلق (بن فتح خاں) نے ۷۹۰ھ (م ۱۳۸۸ء) میں چترِ شاہی عنایت کیا۔ اسی زمانے سے سلطنتِ دہلی آپس کے جھگڑوں سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ گیارہ سال بعد تیموری بھونچال نے اس بوسیدہ قصر کو ڈھا دیا۔ ممالکِ ہند میں ہر طرف خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔

بانبھیہ، سَمہ خاندان میں چھٹا اور ایک روایت سے چوتھا، جام تھا۔ اس کے باقی جانشینوں کے میر معصوم بھکری نے اپنی تاریخِ سندھ میں یہ نام تحریر کیے ہیں:-

۷۔ تماچی ابن خیرالدّین

۸۔ صلاح الدّین ابن تماچی

۹۔ نظام الدّین ابن صلاح الدّین

۱۰۔ علی شیر بن تماچی

(۱۱۔ جام کرن۔ ڈیڑھ دِن صِرف)

۱۲۔ فتح خاں بن سکندر بن تماچی

۱۳۔ تغلق بن " "

۱۴۔ سکندر بن فتح خاں

۱۵۔ رائے دن } یا رادھن عرف سنجر
۱۶۔ سنجر

۱۷۔ نظام الدّین ننداؔ (ع ۵ کا پروتا)

۱۸۔ فیروز بن نظام الدّین۔

چند ناموں میں اختلاف ہے۔ واقعات اور سنینِ حکومت میں کئی جگہ التباس ہوگیا ہے۔ سب سے کام یاب و نام یاب جام نظام الدین ننڈا تھا کہ کم و بیش پچاس برس فرماں روائی کرتا رہا۔ اس کا سال جلوس ۸۶۶ھ اور سالِ وفات ۹۲۳ھ مسلّم نہیں۔ بہرحال، ٹھٹھ اُسی کے زمانے میں عروج کو پہنچا۔ سارے مُلک میں عدل و انتظام کی بدولت آبادی اور خوش حالی بڑھی۔ علم دوستی اور علما نوازی نے بہت سے اربابِ فضیلت کو ٹھٹھ میں جمع کر دیا۔ فرائضِ حکومت کی بجاآوری کے ساتھ، جام نظام الدّین کا تقوا اور دین داری مشہور ہے کہ ایک وقت جماعت کی نماز چھوٹ جاتی تو کئی کئی دن تک استغفار کرتا اور شرم سار رہتا تھا۔

میر علی شیر قانع (ساکن احمد آباد) نے بارہویں صدی ہجری میں "تحفۃ الکرام" لکھی اور سندھ کے بہت سے حالات ذخیرہ کردیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کی آزادی کا یہ دَور (آٹھویں، نویں صدی ہجری) خاصے عیش و آسایش کا دَور تھا۔ حسن و عشق کے کئی قصّے اسی زمانے سے منسوب ہیں۔[1]

---

[1] اُن میں سے کئی قصّے فارسی میں نظم ہوئے۔ جیسے:
حسن و نیاز
ناز و نیاز
قصہ ماروئی و عمر
قصہ دخترے از قوم تمیم مسماۃ گنگا
ترنم عشق قصہ مومل و میدرہ
قصہ جیسر و لیلیٰ

ایسی ترنگیں فراغت ہی میں سوجھا کرتی ہیں۔ دُوسرے یہی زمانہ ہے جس میں صدہا صوفیہ اور سادات و شیوخ کے خاندان کوہستانِ مکلی اور سندھ کے کنارے آباد ہوئے اور گاؤں گاؤں میں ان کی شاخیں پھیل گئیں۔[1] روحانی کرامت و عظمت سے انکار نہیں، لیکن معاشی آسودگی اور وسائلِ فلاح کے بغیر ان کا سرسبز و بارور ہونا محال تھا۔

جام نظام الدّین کے آخر زمانے میں قندھار و ہزارہ (مغربی افغانستان) پر ارغونی مُغل قابض ہوئے۔ یہ چنگیز خاں کی اولاد میں تھے مگر اولادِ تیمور کے مطیع و رفیق ہوگئے۔ اسی رفاقت میں امیر ذوالنّون (ارغون) اُزبکوں کی جنگ (۹۱۳ھ) میں مارا گیا۔ قندھار میں اس کا فرزند شاہ بیگ ارغون جانشین ہُوا۔ ایک بھائی (محمّد مقیم ارغون) نے کابل پر قبضہ کر لیا تھا مگر بابر وہاں پہنچا تو کابل چھوڑ قندھار کی حفاظت کرنی مشکل ہوگئی۔ ارغونیوں نے بلوچستان و سندھ میں اپنی ریاست بنانے کا منصوبہ باندھا۔ سیوی اور فتح پُور کے قلعے سندھی قلعہ داروں سے چھین لیے مگر جام نظام الدّین اور اس کے سپہ سالار دریا خاں نے سندھ خاص

---

[1] 'تحفۃ الکرام' جلد سوم میں ملتان و سندھ کے ایسے صدہا بزرگوں اور خاندانوں کا موضع وار تذکرہ لکھا ہے۔ مشہور تھا کہ صرف کوہ مکلی کی بستیوں میں سوا لاکھ اولیا کی قبریں ہیں! (ص۱۸۴)

میں نہ گھسنے دیا۔ قندھار بابر نے خالی کرا لیا۔ ارغونیوں کو ایک سال بلوچستان میں شلغم اور آلو بخارے کھا کر پیٹ بھرنا پڑا۔[1] لیکن ۹۲۳ھ میں بزرگ جام کا شیشۂ حیات ٹوٹا، ناتجربہ کار فیروز دریا خاں سے اُلجھ پڑا۔ ۹۲۶ھ میں شاہ بیگ نے پھر سندھ پر چڑھائی کی اور لڑتا بھڑتا ٹھٹہ تک پہنچ گیا۔ جام فیروز نے دریا خاں کی منت سماجت کی۔ وہ حبِ وطن کے جوش سے خوب لڑا اور شہادت سے سُرخ رُو ہُوا۔ لیکن فتح حملہ آوروں نے پائی اور شہر ٹھٹہ میں قتل و غارت گری سے حرص و انتقام کی آگ بُجھائی۔ "خرابیٔ سندھ" اِس واقعے کی تاریخ ہی (۹۲۷ھ)

جام فیروز نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور کوہستانِ مکلی تک شمالی سندھ کا علاقہ ارغونیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ مگر شاہ بیگ ارغون کے انتقال (۹۳۳) کے بعد اُس کے بیٹے شاہ حسن بیگ ارغون سے دوبارہ لڑائی چھڑ گئی۔ ناکامیوں کے صدمے اُٹھا کر جام فیروز کو وطن چھوڑنا پڑا (۹۳۵ھ م ۱۵۲۵ء) گجرات کے بادشاہ سلطان بہادر شاہ نے اسے پناہ دی۔ بیٹی سے شادی کی اور امید دلائی تھی کہ اس کا مُلک واپس دلائے گا مگر خود ہی سلطنت دہلی کے نئے وارث (ہمایوں بادشاہ) سے اپنی مدافعت نہ کرسکا۔ مغلوں کے گجرات پر ابتدائی حملوں میں جام فیروز کی جان گئی۔ (۹۴۲ھ، م ۱۵۳۲ء) سندھی حکمرانوں کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

---

[1] تاریخ سندھ، معصومی ص ۱۱۲

شاہ حسن بیگ ارغون ، رسمی طور پر مغل بادشاہوں کے تابع تھا۔ انھی کے نام کا خُطبہ پڑھواتا تھا لیکن جب ہمایوں شیر شاہ سُوری سے شکست کھا کر سندھ آیا ، تو اس نے اپنے بڑے قلعوں یا شہروں میں مُغل بادشاہ کا آنا گوارا نہ کیا۔ روہڑی میں جہاں آج کل ریل کا بڑا جنکشن ہے ، ہمایوں کئی مہینے مقیم رہا مگر قلعۂ بھکر فتح نہ کرسکا۔ پھر بیکانیر و جودھ پور کے راجوں کے وعدوں پر راج پوتانہ چلا گیا۔ یہ وعدے غلط نکلے تو دوبارہ سندھ سے براہِ قندھار ایران روانہ ہُوا۔ اسی گردش میں جنوبی سندھ کے قلعے عمر کوٹ میں اکبر کی ولادت ہوئی (رجب ۹۴۹ھ ، م ۱۵۴۲ء) روانگی کی خبر سُن کر شاہ حسن بیگ نے بہت سا روپیہ اور سامانِ سفر فراہم کر دیا تھا ، پھر بھی کہتے ہیں ہمایوں اس کی بے مروّتی سے رنجیدہ اور بد دُعائیں دیتا ہُوا[1] سندھ سے ایران گیا۔

شاہ حسن ارغون مفلوج ہو کر ۹۶۲ھ میں لاولد فوت ہُوا تو شمالی سندھ اس کے سردار محمود سلطان کے ، اور جنوبی عیسیٰ ترخان کے حصّے میں آیا۔ یہ امیر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ یہاں تک کہ عہدِ اکبری میں اُن تمام علاقوں کو مغل سرداروں نے فتح کر لیا جانی بیگ ترخان امرائے شاہی میں داخل کیا گیا (۱۰۰۰ھ/م ۱۵۹۱ء) چند سال بعد اس کا فرزند غازی بیگ پھر والی بن کر ٹھٹھہ آیا تھا۔ لیکن سندھ کی رہی سہی خود مختاری جانی بیگ ہی کی اطاعت پر

---

[1] تحفۃ الکرام ، ج سوم ص ۶۳۔

ختم ہوگئی ہے

کشمیر

کشمیر میں اسلام کی اشاعت درویشوں نے کی ۔ بادشاہی خدمت و تدبیر سے ہاتھ آئی ، تلوار چلانے ، فوج لانے کی ضرورت نہ پڑی۔ جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں اشارۃً بیان ہُوا ، یہ ملک مدّت سے بدنظمی کا شکار تھا ۔ جو راجا قوت حاصل کر لیتا وہ اسے رعایا پر ظلم و تعدّی کے کام میں لاتا ۔ بلند اور برفانی پہاڑ کشمیر کی قدرتی فصیل ہیں ، لیکن جب کبھی کوئی حملہ آور یہ کڑیاں جھیلنے پر تیار ہو جاتا ، یہاں کے راجا اور پرجا زیادہ مزاحمت نہ کرتے تھے ۔ قتل و غارت گری سے اکثر تباہی پھیل جاتی تھی ۔ آٹھویں صدی ہجری (چودھویں عیسوی) کے آغاز میں اسی قسم کی ہل چل ذُل جُو نے ڈالی ۔ سارے مُلک میں لُوٹ مار مچا کر چل دیا ۔ یہ بھی ٹھیک پتا نہیں چلتا کہ وہ کون ، کس قوم کا آدمی تھا ۔ اسی افراتفری میں ایک آفاقی لدّاخی نے حکومت پر قبضہ کر لیا ۔ اس کی قومیت مشکوک مگر نام "رنچن" یا "رِن تن" معلوم ہے ۔ وہ ایک مسلمان درویش بابا بلال رح کے ہاتھ پر ایمان لایا (۷۲۰ھ ، م ۱۳۲۰ء) اور صدرالدّین کے اسلامی نام سے کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ مانا جاتا ہے ۔ اپنے پیر کے لیے ، جنھیں کشمیری عوام "بلبل شاہ" کہنے لگے ہیں ، ایک بڑی خانقاہ اور کشمیر کی پہلی جامع مسجد اسی نے تعمیر کرائی جس سے اسلام کی تیز اشاعت کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

---

[1] "کشمیر" از ڈاکٹر جی ایم صوفی ۔ صفحہ ۱۲۵

صدر الدّین کے عہدِ حکومت میں ایک اور آفاقی مسمّی "شاہ میر" یا "شاہ میرزا" حسنِ خدمت سے وزارت کے درجے پر پہنچا۔ اس کے وطن کے متعلق اختلاف ہے۔ ممکن ہے کہ وہ صوات سے آیا ہو اور نیم تاتاری یا مخلوط مغل نسل سے ہو۔ فارسی تاریخوں میں اُس کے باپ، دادا کے جو دو تین نام مروی ہیں[1] وہ تُرکی زبان کے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک روایت کی رُو سے خود شاہ میر اپنا نسب قدیم پانڈو راجا ارجن سے منسوب کرتا تھا۔ بہر تقدیر یہی خوش قسمت شخص ہے جس نے صدرالدّین (رنچن) کے بعد اُس کی ہندو رانی سے حکومت چھینی اور شاہ میری خاندان کا آغاز کیا جو تقریباً دو صدی تک کشمیر پر فرماں روائی کرتا رہا۔

ان بادشاہوں کے نام اور سنینِ حکومت، ڈاکٹر صوفی کی تحقیق کے مطابق حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ شاہ میر ملقب بہ شمس الدّین :	۷۴۰ھ تا ۷۴۳ھ / م ۱۳۴۲ء	
۲۔ جمشید بن شمس الدّین ۔	چند ماہ	
۳۔ علی شیر علاءُ الدّین بن شمس الدّین	تا ۷۵۵ھ / م ۱۳۵۴ء	
۴۔ شہاب الدّین فرزند ع۳	تا ۷۷۵ھ / م ۱۳۷۳ء	
۵۔ (ہندال) قطب الدّین "	تا ۷۹۱ھ / م ۱۳۸۹ء	
۶۔ سلطان سکندر فرزند ع۵	تا ۸۱۶ھ / م ۱۴۱۳ء	

[1] کئی تاریخوں میں اسے "شاہ میر بن طاہر آل بن قور شاہ" اور "طبقاتِ اکبری" (ص۵۹۶) میں دادا کا نام "گرشاشپ (؟) بن نیک روز" لکھا ہے۔

۷۔ علی شاہ بن سکندر تا ۸۲۳ھ
۸۔ سلطان زین العابدین بن سکندر تا ۸۷۴ھ، م ۱۴۷۰ء
۹۔ حیدر شاہ فرزند ع۸ تا ۸۷۷ھ
۱۰۔ حسن شاہ فرزند ع۹ تا ۸۸۹ھ
۱۱۔ محمد شاہ فرزند ع۱۰ (پانچ بار بادشاہ ہُوا)
۱۲۔ فتح شاہ بن آدم بن زین العابدین۔ (تین بار بادشاہ ہُوا)
۱۳۔ ابراہیم شاہ فرزند ع۱۱
۱۴۔ نازک شاہ فرزند ع۱۲ دو بار تا ۹۵۸ھ
۱۵۔ شمس شاہ فرزند ع۱۱
۱۶۔ اسمٰعیل شاہ ،، ،، (یہ برائے نام بادشاہ ہو گئے تھے)
۱۷۔ ابراہیم شاہ ثانی ،، ع۱۶
۱۸۔ اسمٰعیل شاہ ثانی ،، ع۱۳
۱۹۔ حبیب شاہ فرزند ع۱۷ تا ۹۵۵ھ، م ۱۵۵۵ء

شاہ میر نے جو اقتدار پایا، اسے دانائی سے کام میں لایا۔ مدّت کے بعد کشمیر کی رعایا نے ایسا راعی دیکھا کہ جبر و جور کی بجائے نرمی اور مہربانی سے حکومت کرتا تھا۔ بہت سے محصول معاف کیے۔ پیداوار کا ایک چھٹا حصّہ مال گزاری مقرّر کی۔ امن و انتظام قائم کر دیا۔ اندرونی حالت درست ہو گئی تو شاہ میر کے پوتے سلطان شہاب الدّین کو لشکر آرائی اور بیرونی فتوحات کا موقع مِلا۔ کشمیر میں اس کی جنگ جوئی اور کامیابیوں کے عجیب قصّے مشہور

ہیں۔ کہتے ہیں اس نے تبت و کاشغر کو فتح کیا۔ سندھ کے جام کو شکست دی۔ قندھار و غزنی، کابل و بدخشاں تک سب حریفوں کو زیر کیا ،، جس دن فتح کی خبر نہ آتی، وہ دِن اپنی عمر میں شمار نہ کرتا تھا"۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سلطان ابوسعید کی وفات (۱۳۳۵ء) کے بعد ایران و خراسان کئی مُلکوں میں بٹ گئے تھے۔ موجودہ صوبہ سرحد، کابل اور بدخشاں میں کوئی بڑی قوّتِ مزاحمہ موجود نہ تھی۔ تختِ دہلی کا وارث فیروز تغلق ہُوا اور انھی سنین میں بنگالہ کی پہلی مہم سے واپس آیا تھا۔ کم سے کم چناب تک لاہور، دیپال پُور، ملتان کے صوبہ داروں کی عمل داری تھی۔ سندھ میں جاموں کی حکومت دہلی کے توابع میں داخل تھی۔ شہاب الدّین کا شمالی علاقوں میں تاخت کر جانا ممکن ہے، لیکن ان سب مُلکوں پر اپنی حکومت قائم کرنا، جس کا مؤلفِ "کشمیر" نے نقشہ چھاپ دیا ہے، لائقِ یقین نہیں[1]۔ ہند کی ہم عصر فارسی تاریخیں اس کشمیری "امیر حمزہ" کے کارناموں سے بے خبر نظر آتی ہیں۔ بہرحال، جب یہ جنگ جُو بادشاہ مرا، تو اس کے جانشین بھائی (قطب الدّین) کے عہد میں یہ عسکری روایات قائم نہ رہیں[2]۔

---

[1] "کشمیر" جلد اوّل، مقابل صفحہ ۱۳۵۔ ڈاکٹر صوفی کا ماخذ جونراج پنڈت ہے جس نے "راج ترن گنی" کا تکملہ لکھا تھا۔ یہ سنسکرت نویس اپنے مسلمان بادشاہوں کا نام تک صحیح نہیں لکھتا، بیرونی مُلکوں سے کیا واقف ہوگا؟

[2] سرحدی قوم لوہارا نے بغاوت کی۔ کشمیر کی شاہی فوجوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ "کشمیر" جلد دوم صفحہ ۱۴۲۔

اور اُسے ہم زیادہ تر شعر شاعری یا صوفیانہ مراقبات میں مصروف دیکھتے ہیں۔ قطب الدّین کے فرزند سکندر شاہ کے عہد (۷۹۱ھ تا ۸۱۶ھ/م ۱۴۱۳ء) میں امیر تیمور کی آندھی آئی۔ سکندر نے سفیروں کے ذریعے اطاعت کا اقرار کیا۔ قیمتی تحفے تحائف ارسال کیے۔ اس کی علم دوستی، شرع پرستی مشہور ہے۔ شاہ ہمدان رح کے چلّہ خانے پر "خانقاہِ معلّیٰ" تعمیر کی۔ بہت سے مدرسے جاری کیے۔ ایک شان دار جامع مسجد بنائی جس میں ۳۷۲ ستون، بیس بیس گز بلند تھے۔ میناکاری کا کام ایران و خراسان کے دو نامی کاری گروں نے بلا معاوضہ انجام دیا تھا۔ یہ دونوں حضرت ہمدانی رح کے مرید تھے۔ بدکاری، شراب خواری، قمار بازی کو اس بادشاہ نے بڑی سختی سے روکا۔ پھر نو وارد علما کی تحریک سے وطن کو بُت پرستی کی بلا سے نجات دِلانے کی کوشش کی۔ کہتے ہیں ایک نَومسلم وزیر نے بادشاہ کا یہ رجحان دیکھ کر بہت سے بُت اور بُت خانے تُڑوا دیے اور سکندر کو "بُت شکن" کا لقب دِلوایا۔ انگریز تاریخ نویسوں نے یہ واقعات بہت مبالغے سے بیان کیے اور اُن کے ہندو شاگردوں نے مزید حاشیے چڑھائے ہیں۔ مولّفِ "کشمیر" نے سکندر کی وکالت میں لکھا ہے کہ اُن دنوں یورپ میں اختلافِ مذہب، بلکہ محض آزاد خیالی کی بنا پر لوگ زندہ جلائے جاتے، پھانسیوں پر چڑھائے جاتے تھے۔ مندروں پر جو آفت آئی، اس سے کہیں زیادہ بدھ مت کے معبدوں پر ہندوؤں نے توڑی تھی۔ ہزاروں "وِہاروں" کو

بے نشان کر چکے تھے ۔ . . . . . . مگر اصل جواب یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی ایسے جبر و اکراہ کو جائز نہیں رکھتی ۔ اگر سکندر نے ظلم و تعدّی کی، تو یہ اس کا ذاتی فعل تھا؛ چنانچہ چند ہی سال بعد جب اس کا دُوسرا فرزند شاہی خاں، سلطان زین العابدین کے نام سے زینت آرائے سلطنت ہوا، تو نہ صرف پچھلی زیادتی کی تلافی کی بلکہ ہندو پروری میں سب سے بڑھ گیا ۔ مذہبی جبر سے ڈر کر جو بھاگ نکلے تھے، واپس بُلائے گئے ۔ جو مندر ٹوٹے تھے، پھر بنوائے گئے ۔ کامل مذہبی آزادی کے قانون جاری ہوئے ۔ بادشاہ نے جزیہ معاف اور گاؤکُشی تک ممنوع کر دی ! انگریز تاریخ نویس بھی اِس غیر معمولی رواداری کو تسلیم و تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکے کہ ایسی رعائتیں خود اُن کے دَور میں ہندو رعایا کو میسّر نہ تھیں ؛

اس بادشاہ نے پچاس اکاون سال (سنہ ۸۲۳ تا سنہ ۸۷۴ھ) حکمرانی کی جو بجائے خود اقبال مندی کی دلیل ہے[1] بہت سی عالی شان عمارتیں بنوائیں جن میں ایک محل بارہ منزل کا تھا، اور ہر منزل میں پچاس کمرے تھے[2] یہ عمارتیں عموماً چوبی تھیں کہ بعد میں جل کر یا ٹوٹ پھوٹ کر ضائع ہوگئیں البتہ وُلر جھیل کے ایک زیرِ آب ٹاپو پر بادشاہ نے جو نفیس محل اور مسجد بنائی اس کے کھنڈر باقی ہیں ؛

---

[1] کشمیری اسے "بڈشاہ" یعنی بزرگ بادشاہ کہتے ہیں ؛
[2] کشمیر ۔ ج اوّل صفحہ ۱۶۱ بحوالہ لفٹنٹ نیول ؛

نوشہر کے دارالعلوم کے ساتھ ایک وسیع کتب خانہ اور ایک دارالترجمہ علم پروری کی یادگار تھا۔ درباری شاعر مُلا احمد کشمیری نے کشمیر کی تاریخ "راج ترن گنی" کا پہلا فارسی ترجمہ اسی بادشاہ کے حکم سے کیا۔ اور "بحرالاسمار" موسوم ہوا۔ خود "راج ترن گنی" کا تکملہ جُنراج پنڈت نے تکمیل کو پہنچایا اور بادشاہ سے انعام پایا۔ کئی اور ممتاز مسلمان، ہندو اہلِ علم و فن اُس کی قدردانی کے ہاتھوں پرورش پاتے رہے۔ مجموعی طور پر یہ آزاد کشمیر کا بہترین زمانہ تھا جو زین العابدین کی زندگی کے ساتھ ختم ہوگیا (سنہ ۸۷۴ھ م سنہ ۱۴۷۰ء) اولاد میں تن پروری، عیش پرستی، ناعاقبت اندیشی کے وہ سب اوصاف آگئے جو موروثی دولت و بادشاہی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بار بار خانہ جنگی، کشت و خون کی نوبت آئی۔ دو بادشاہ جو رشتے میں چچا بھتیجے تھے، کئی کئی دفعہ تخت پر چڑھے، اُترے۔ ان جھونٹوں میں حکومت کا نظم تہ و بالا ہوتا رہا۔ اُدھر انھی دنوں تیموری خاندان کے مُغل بادشاہ خراسان و کاشغر، کابل و قندھار کے وارث بنے تھے۔ انھوں نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح کشمیر پر جھپٹے مارے۔ اور کئی مرتبہ اسے تاراج و خراب کیا۔[1]

میرزا حیدر دوغلات

مگر مغلوں کا سب سے کارگر حملہ کاشغر کی طرف سے ہوا

---

[1] ان میں دو یورشیں بابر نے کیں۔ ایک بڑا حملہ ہمایوں کے بھائی کامران نے کیا اور سری نگر تک بڑھ کر واپس گیا۔ (۹۳۷ھ م ۱۵۳۱ء)

جہاں اُن دنوں سعید خاں حاکم تھا۔ اس کا بیٹا اسکندر سلطان بارہ ہزار سوار کا لشکر لے کر تبت و لار کے راستے کشمیر میں گھس آیا۔ کشمیر کے امیر و وزیر جو آپس میں لڑتے رہتے تھے، دشمن کے سامنے نہ آئے، اور پہاڑوں میں جا چھپے۔ مُغلوں نے دِل کھول کر سری نگر کو لُوٹا۔ بہت سی عالی شان عمارتوں کو آگ لگا دی۔ دفینوں کی تلاش میں محلّات کھود ڈالے۔ ہزاروں کو مارا، گرفتار کیا۔ آخر چک اور ماگرے متحد ہوکر ان سے لڑے ہرچند لڑائی میں شکست کھائی مگر مُغلوں نے بہت سا روپیہ اور اطاعت کا رسمی اقرار لے کر مُلک چھوڑ دیا[1] (سنہ ۹۳۹ھ م ۱۵۳۳ء)۔ انھوں نے تباہی پھیلانے میں کسر نہ چھوڑی تھی کہ قحط سالی نے مُوے پر سو دُرّے لگائے۔ کشمیر بالکل نڈھال ہوگیا۔

اسکندر سلطان کی مہم کا مشیر ایک نوجوان مُغل امیرزادہ مرزا حیدر دوغلات تھا۔ وہ لڑکپن میں اپنے خالہ زاد بھائی بابر کے پاس رہا مگر نوجوانی میں کاشغر آیا اور بڑے بڑے معرکوں میں سعید خاں کی رفاقت کا حق ادا کرتا رہا۔ سعید خاں کی وفات پر ہندستان آیا اور کئی سال ہمایوں کے ساتھ گزارے۔ ۹۴۷ھ (م

---

[1] کاشغر کے درباری شاعر نے کشمیر کی اس فتح کی بڑی عمدہ تاریخ بہم پہنچائی ہے:

تاریخ فتحش الحق ہمیں است — روزِ چہارم از ماہِ شعبان
۹ ۳ ۹ ھ

۱۵۴۰ء) میں جب کہ شیر شاہ سوری کے مقابلے میں ہمایوں کا نصیب واژگوں ہو رہا تھا، امرائے کشمیر نے مرزا حیدر کو وہاں آنے اور مغل فوج کی مدد سے نظم بحال کرنے کی دعوت دی۔ چناں چہ وہ معمولی جمعیت لے کر آیا اور بلا مزاحمت سری نگر پر قابض ہوگیا۔ (۹۴۷ھ، م ۱۵۴۰ء)۔ اختیار حاصل کر لینے کے باوجود مرزا نے شاہ میری خاندان کے وارث (سلطان نازک شاہ) کو برائے نام بادشاہ رہنے دیا اور ملک میں دوبارہ معقول حکومت قائم کرلی۔ اسی ایالتِ کشمیر کے زمانے میں "تاریخِ رشیدی" تالیف کی جو مغل خاندانوں کی مقبول و مستند تاریخ ہی اور شہرت میں مرزا کے سارے جنگی کارناموں سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئی ؛

کشمیر کے مفسد امیر جنھیں مرزا نے نکال باہر کیا تھا، فتنہ و فساد برپا کرتے رہے۔ باہمی رقابت کو فرقہ واری تعصب نے اور ہوا دی کیوں کہ چک سردار مذہبًا شیعہ ہو گئے تھے [۱]۔ جب کشمیر میں ان کا زور نہ چلا تو سوری بادشاہ (سلیم شاہ) کی مدد لائے۔ مرزا نے کئی بار سخت شکستیں دے کر دشمنوں کو پسپا کیا۔ لیکن اسی قسم کی ایک آویزش میں اپنے ہی کسی سردار کے تیر سے اندھیری رات میں سہوًا زخمی ہوا اور ۵۳ سال کی

---

[۱] کہتے ہیں ایک عراقی فاضل نے چکوں کو نوربخشی عقائد کا پیرو بنایا تھا، جو شیعوں کا ایک معتدل فرقہ تھا۔ لیکن کشمیری مرید اپنے عراقی پیر سے آگے بڑھ گئے۔ یہ شعر ان کے مذہبی غلو کی یاد دلاتا ہے :

دو گروہ اند در جہاں بے پیر   سنیِ بلخ و شیعیِ کشمیر!

عمر میں وفات پائی۔ "قضائے الٰہی" انتقال کی تاریخ ہے (۹۵۸ھ م ۱۵۵۱ء)۔

چک شاہی خاندان

مرزا حیدر کی وفات سے چک برادری کی بن آئی اور وہ حکومت کے جز و کل پر حاوی ہو گئے۔ اِن شاطروں نے وارثِ تخت کو شطرنج کا بادشاہ بنا دیا اور آخر چند ہی سال میں سلطنت اُچک لی۔ تاریخوں میں اُن کے یہ نام درج ہیں:

۱۔ غازی چک۔ ۹۵۵ تا ۹۷۰ھ/م ۱۵۶۳ء

۲۔ حسین شاہ

۳۔ علی شاہ

۴۔ یوسف شاہ (دو بار)

۵۔ بدیع الدین لوہر شاہ

۶۔ یعقوب شاہ تا ۹۹۵ھ م ۱۵۸۶ء

کشمیر کے اندرونی فساد اور کمزوری کے علاوہ، یہ وہ زمانہ ہے کہ جب کہ مُغلوں کی دوبارہ حکومت جمی اور شمالی ہند کے ممالک رفتہ رفتہ اکبری صوبے بن گئے۔ کشمیر زیادہ دن تک مامون نہ رہ سکتا تھا اور علی شاہ چک نے ۹۸۳ھ ہی سے خطبے میں اکبر بادشاہ کا نام اور مُلک میں اکبری سکہ چلانا قبول کر لیا تھا۔[1] چک شاہی کی بے توقیری کا یہ حال ہوگیا تھا کہ وزیر سید مبارک (بیہقی) نے یوسف شاہ کو شکست دے کر تخت پر خود قبضہ

---

[1] کشمیر، ج اوّل، ص ۲۲۶

کیا تو تاجِ شاہی کو توڑ ڈالا اور اس کے جواہرات فقیروں میں تقسیم کر دیے! پھر، چند ماہ بعد خود ہی چک خاندان کے ایک مدعی (لوہر یا گوہر شاہ) کے حق میں یہ شعر پڑھ کر دست بردار ہوگیا کہ ؎

شہا فقر و غنا از ما و مُلک و عزّ و جاہ از تو
کہ دُنیا را وفلے نیست خواہ از ما و خواہ از تو!

آخری بادشاہ، یعقوب چک، دُنیاوی معاملات میں بے اثر، لیکن دین میں بہت غلو رکھتا تھا۔ قاضی موسیٰ کو بُلا کر حکم دیا کہ آیندہ خطبوں میں حضرت علیؓ کو خلیفۂ بلا فصل کہا جائے۔ قاضی نے کہا بادشاہوں کو مذہبی امور میں دخل نہ دینا چاہیئے یعقوب نے بگڑ کر قاضی موسیٰ کو جلّاد کے حوالے کیا اور ان کا گھر بار لُٹوا دیا[1] اس حرکت نے سنّیوں کو پریشاں و ہراساں کر دیا۔ مشہور فاضل شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی نے اکبر بادشاہ کے حضور میں عرضی گزرانی جس میں امن و انصاف کی حکومت قائم کرنے کی یہ یادگار شرطیں تحریر کی گئی تھیں:

"۱۔ فرماں روا کو لوگوں کے مذہبی معاملات، اجناس کی خرید و فروخت یا قیمتوں میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

۲۔ عمائد و حکّام کسی کشمیری ہندو مسلمان عورت یا مرد کو غلام نہ بنائیں گے۔

۳۔ ظلم و تعدّی نہ کی جائے گی نہ بے گار لی جائے گی۔

---

[1] کشمیر، ج اوّل۔ ص ۲۴۲

۴۔ اُمرائے کشمیر فتنہ و فساد برپا کرتے رہے ہیں، انھیں فی الحال حکومت میں کوئی حصّہ نہ دیا جائے گا۔"

عرضی پہنچنے پر اکبر نے قاسم خاں کو کشمیر پر فوج کشی کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ راجوری کے راستے بڑھ کر سری نگر پر قابض ہو گیا۔ کشمیر کی نیم آزاد بادشاہی ختم کر دی گئی[1] اور یہ مُلک مُغلیہ سلطنت کا ماتحت صوبہ بن گیا۔ (۹۹۵ھ، م ۱۵۸۶ء)۔

---

[1] یعقوب چک نے ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر شاہی فوجوں کے سامنے کچھ پیش نہ گئی اور شکست کھا کے رو پوش ہونا پڑا۔ اسی پر کسی بےدرد ظریف نے یہ شعر کہا ہے؎

نہ از یوسف نشاں دیدم نہ از یعقوب آثارے
عزیزاں یوسف از گم شد چہ شد یعقوب را بارے؟

بابِ دہم

آزاد حکومتیں (۲)

بنگالہ

آٹھویں صدی ہجری (چودھویں عیسوی) کے وسط میں بنگالہ آزاد اسلامی بادشاہی بن گیا۔ اس کے عہد عروج میں موجودہ مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کے علاوہ مشرقی بہار، غربی آسام اور شمالی اڑیسہ کے اضلاع بھی شامل رہے۔ جنوب کی طرف، چاٹگام سے آگے (ارکان کے پہاڑوں تک) مسلمانوں کی عمل داری ہوگئی۔ اس کا رقبہ روس کے سوا موجودہ یورپ کے ہر آزاد ملک سے زیادہ اور آبادی بھی اُن دنوں یقیناً بیش ہوگی۔ بنگالے کی سرسبزی، سیرابی مشہور رہی۔ مسلمانوں کے عہد میں یہ زرعی دولت ترقی کر گئی۔ تاریخ ریاض السلاطین[1] کے فاضل

[1] یہ بنگالے کی فارسی تاریخ غلام حسین سلیم نے ایک انگریز جورج اُڈنی (
بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۱)

مترجم انگریزی کی سنجیدہ راے لائق اقتباس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"آزاد مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بنگال نے بڑی آسودگی پائی۔ ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری عمارات، قلعے، مسجدیں، مدرسے، اقامت خانے، سرائیں، خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔ تالاب کھودے گئے۔ سڑکیں تیار کر دی گئیں۔ اس عہد میں دو شاہی خاندان حکم راں رہے۔ ایک حاجی الیاس کا۔ دوسرا علاءالدین حسین کا۔ درمیان میں راجہ کانس اور اس کے جانشینوں نے حکومت غصب کر لی تو کئی سال کا وقفہ ضرور پڑ گیا۔ بنگالے کی مملکت کو مسلمان بادشاہوں نے یہ وسعت دی کہ مغربی آسام (یا کام روپ) کوچ بہار و جاج نگر (= اڑیسہ) کے اقطاع، شمالی بہار اور جنوبی بہار کا علاقہ پٹنے تک عموماً ان کے زیر حکومت رہے۔ اسلامی فوجوں نے دریائے میگھنا کو عبور کیا، جو پہلے ان کی پیش قدمی میں سدِ سکندری بن جاتا تھا، اور سلہٹ، مغربی تپرہ،

(بقیہ صفحہ ۳۶۰) کی فرمائش سے تالیف کی تھی۔ نام سے تاریخ ۱۲۰۲ھ (م ۸۸-۱۷۸۷ء) نکلتی ہے۔ سلیم زید پور (اودھ) کے رہنے والے، بنگالے میں ڈاک منشی ہو گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔ "منشی زعالم رفتہ" تاریخ وفات ہے (۱۲۳۳ھ)

سلاطین بنگال کی ہم عصر تاریخیں ناپید ہیں، اس لئے ریاض السلاطین بہت غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ متن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے چھپوایا۔ پھر عبدالسلام صاحب ایم اے، (ڈپٹی کلکٹر؟) سے انگریزی ترجمہ کرایا۔ لائق مترجم کے حواشی سے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

نوا کھلی (بہ شمول چاٹ گام) تک مسلط ہو گئیں ....." (صفحہ ۹۰)
اس مملکت کے مرکزی شہر تین تھے: اوّل غور یا گور، جو قدیم لکھنوتی کا نیا نام تھا۔ یہ وسط بنگال (موجودہ ضلع مالدہ) میں گنگا کے کنارے واقع اور چند وقفوں کے ساتھ بہت دن تک پائے تخت رہا۔ اس کے قریب پنڈوہ اور اِکدالہ کے شان دار قلعے کی تعمیر ہوئی۔ مشرق میں سنار گاؤں کو مسلمانوں نے وسیع شہر بنا دیا۔ یہ موجودہ ڈھاکے سے قریب تھا۔ ڈھاکہ بسا تو اُجڑ گیا۔ تیسرا تجارتی اور انتظامی مرکز سات گاؤں، ہگلی پر واقع تھا۔ ندی کے اٹ جانے سے آمد و رفت مشکل ہو گئی اور ہگلی بندر نے اس کی جگہ لے لی۔"

پائے تخت دہلی سے بنگالے کی دُوری، بار بار اُسے سرکشی کی تحریک دیتی تھی۔ صوبے کی وسعت اور خوش حالی کے علاوہ یہاں ایک ہی صدی میں مسلمانوں کی آبادی بہت ترقی کر گئی تھی۔ باہر سے جو ترک، سیّد، مغل پٹھان آتا، پھر کر واپس نہ جاتا تھا۔ اشاعت اسلام کی رفتار غالباً دوسرے ملکوں سے تیز تر تھی اور اس میں مخدوم شاہ جلال الدین تبریزی، شیخ علاء الحق اور نور قطب عالم[1] (رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہم) جیسے

[1] شیخ جلال الدین تبریزیؒ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے فیض یافتہ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ہم عصر ہیں۔ دہلی آئے تو قاضی وقت سے مخالفت ہو گئی۔ شہر بدر ہو کر بنگالے (بقیہ حاشیہ ۳۶۳ پر)

بزرگانِ صوفیہ کی تبلیغ و تلقین کا بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا ؛
غرض آٹھویں صدی ہجری میں جب محمد تغلق کے خلاف صوبوں میں شورش پھیلی تو انتہائے مشرق میں سُنارگاؤں نے بھی آزادی کا علم بلند کیا۔ یہ اُن دنوں گوڑ سے الگ چھوٹا صوبہ بنایا گیا تھا، اور بہرام خاں صوبہ دار کے انتقال پر یہاں ملک فخرالدین حاکم ہوگیا تھا۔ اُسی نے گوڑ کے بڑے صوبہ دار قدرخاں کو قبر میں اتارا اور اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کرایا۔ مگر یہ بادشاہی مشرقی پاکستان تک ہی محدود رہی۔ مغربی بنگال میں مرحوم قدرخاں کے فوجی سردار لڑتے جھگڑتے رہے اور آخر میں حکومت کے لیے ملک الیاس (حاجی) کا انتخاب ہوا، جسے براونی اپنے قبیلے کا رئیس لکھتا ہے۔ الیاس نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا (۷۴۶ھ) اور کچھ عرصے بعد سنارگاؤں کو دوبارہ زیرِ نگیں لایا۔ سو برس کے قریب بادشاہی اُس کی اولاد میں متوارث ہوتی رہی۔ پورے بنگالے کا پہلا خود مختار بادشاہ اسی کو قرار

(بقیہ ص۳۶۲) چلے گئے۔ صاحب جلال و کمال بزرگ تھے۔ پنڈوے میں آپ کی قبر پر سلاطین بنگالہ نے عالی شان درگاہ بنوائی تھی ؛

شیخ علاءالحق رحؒ، لاہور سے بنگالے گئے اور وہاں بڑی شہرت و عزّت حاصل کی۔ اُن کے فرزند اور خلیفہ نور قطب عالمؒ نے ان کا نام اور زیادہ منوّر کیا۔ یہ دونوں بزرگ نویں صدی ہجری کے آغاز میں گزرے ہیں۔ (اخبار الاخیار ص۱۴۳ و ۱۴۴)

دینا چاہیے۔ اگرچہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں وہ اور اس کا بیٹا سکندر شاہ دربار دہلی کو خراج ادا کرتے رہے۔

ان بادشاہوں کی فہرست یہ ہے:

۱۔ شمس الدین ۷۴۶ تا ۷۵۹ھ = ۱۳۵۸ء

(سنارگاؤں میں: فخر الدین مبارک اور اس کا بیٹا اختیار الدین غازی، تا ۷۵۳ھ)

۲۔ سکندر شاہ تا ۷۶۸ھ

۳۔ غیاث الدین اعظم تا ۷۷۵ھ

۴۔ سیف الدین حمزہ تا ۷۹۹ھ

۵۔ شمس الدین ثانی تا ۸۰۹ھ

۶۔ بایزید زیر اتالیقی راجہ کانس

۷۔ جلال الدین محمد بن راجہ کانس

۸۔ شمس الدین احمد بن محمد تا ۸۳۰ھ

۹۔ ناصر الدین محمود (نبیرۂ ۵)

۱۰۔ رکن الدین باربک

۱۳۔ شمس الدین یوسف

۱۴۔ سکندر شاہ دوم

۱۵۔ جلال الدین فتح شاہ تا ۸۹۲ھ

۱۶۔ سیف الدین فیروز شاہ (حبشی)

۱۰۔ محمود شاہ بن فتح شاہ ۱۵

۱۔ مظفر شاہ (حبشی) تا ۸۹۹ھ

۱۹- علاء الدین حسین شاہ (مکی) تا ۹۲۷ ھ

۲۰- نصرت شاہ بن حسین تا ۹۳۹ ھ

۲۱- علاء الدین فیروز بن نصرت شاہ

۲۲- غیاث الدین محمود بن حسین تا ۹۴۴ ھ م ۱۵۳۷ ء

پانچویں بادشاہ کے زمانے میں بتھوریہ (ضلع راج شاہی) کا جاگیردار راجہ کانس حکومت پر ایسا حاوی ہوا کہ بادشاہ کو قتل کرا کے پہلے بایزید کو برائے نام تخت پر بٹھایا، پھر خود اپنے فرزند کو کلمہ پڑھوا کے مسلمان بنوایا اور وہ جلال الدین کے نام سے کئی سال حکومت کرتا رہا بلکہ نئے مذہب کے جوش میں ہندوؤں پر بڑے ظلم توڑتا اور جبراً مسلمان بناتا تھا۔ کچھ مدت بعد محل میں خواجہ سرا اور باہر حبشی سپاہی بہت قوی ہو گئے انھوں نے کئی بادشاہ قتل کیے اور دو تین دفعہ خود تخت پر بیٹھ کر حکومت کا لطف اٹھایا۔ ایک بار باربک خواجہ سرا بھی اسی طرح تخت نشین ہو گیا تھا۔ بارے چند ماہ بعد مارا گیا اور مارنے والے نے اس کی جگہ لے لی۔ اسی پر مشہور ہو گیا تھا کہ بنگالے میں لوگ تخت کی اطاعت کرتے ہیں، تخت نشین سے بحث نہیں رکھتے، بلکہ بقول فرشتہ، بادشاہ کے قاتل اور غاصب کا حق فائق سمجھتے ہیں![1] دسویں صدی ہجری میں مغل بادشاہ ہمایوں نے بنگالے کی آزاد بادشاہی کا

---

[1] بابر نے بھی یہ ذکر کیا ہے۔ دیکھو ضمیمہ باب ہذا۔

خاتمہ کیا لیکن اُس کے ہندوستان سے اخراج کے بعد بہال پھر افغان خودمختار ہو گئے ان کی لڑائیاں اور مغلوب ہونے کا حال ہم اکبری فتوحات کی ذیل میں مطالعہ کریں گے ؛

دکن کی بہمنی سلطنت

بنگالے سے بھی زیادہ طاقت ور آزاد حکومت مسلمانوں نے دکن میں قائم کی تھی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک برابر توسیع اور ترقی کرتی رہی۔ یہ اپنے بانی علاءالدین حسن ظفر خاں بہمنی کے نام پر "بہمنی سلطنت" کہلاتی ہے۔ ظفر خاں دہلی کا ایک غریب سپاہی زادہ تھا۔ بڑھتے بڑھتے سرداری کے درجے تک پہنچا اور جب سلطان محمد تغلق کے خلاف دکن میں شورش ہوئی تو باغی امیروں نے پہلے اسماعیل مُخ اور پھر علاءالدین ظفر خاں کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ (۷۴۸ = ۴۷-۱۳۴۶ء) دوسرے علاءالدین یعنی خاندان کے دسویں بادشاہ تک یہ بہمنی سلاطین ان جنوبی ممالک میں پیہم تیغ زنی اور ایسی فتوحات حاصل کرتے رہے[1] جو قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ انہی جاں بازیوں اور سرفروشیوں کا پھل تھا کہ موجودہ ریاست حیدرآباد سے

---

[1] و، اسمتھ نے ان بادشاہوں کی جنگ و جدال پر بہت نفرت ظاہر کی ہے اور انھیں خوں ریز و خوں خوار، جلاد و سفاک وغیرہ بدترین ناموں سے یاد کیا ہے۔ مگر یورپ کی گزشتہ دو جنگوں کے بعد جن میں کروڑوں مرد و زن فریقین کی شیطانی بہیمیت اور خوف ناک ہتیاروں کا شکار ہوئے، کسی فرنگی کو ایسی رحم دلی اور خدا ترسی کی نمائش کرنا کچھ زیب نہیں دیتا ؛

تقریباً سہ گنا ملک تسخیر کیا اور بین گنگا سے کرشنا اور ساحل کوکن سے کورومنڈل تک اپنا ڈنکا بجایا۔

شاہان دکن کی تاریخ کے متعدد ماخذ سلامت ہیں قریب زمانے میں اُردو اور انگریزی میں بہت سی کتابیں، رسالے، مقالے، اس موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ ہم ان کے اسما، سنین حکومت اور چند مجمل تاثرات لکھنے پر قناعت کریں گے۔

١- علاء الدین حسن ظفر خاں۔ ٧٤٨ تا ٧٥٩ھ م ١٣٥٨ء

٢- محمد شاہ تا ٧٧٦ھ

٣- مجاہد شاہ تا ٧٨٠ھ

٤- داؤد شاہ

٥- محمود شاہ بن ع١ تا ٧٩٩ھ

٦- غیاث الدین } بن ع٥

٧- شمس الدین تا ٨٠٠ھ

٨- فیروز شاہ تا ٨٢٥ھ

٩- احمد شاہ بن ع٤ تا ٨٣٨ھ

١٠- علاء الدین (ثانی) تا ٨٦٢ھ

١١- ہمایوں شاہ تا ٨٦٥ھ

١٢- نظام شاہ تا ٨٦٧ھ

١٣- محمد شاہ ثانی بن ع١١ تا ٨٨٧ھ

١٤- محمود شاہ ثانی تا ٩٢٤ھ

١٥- احمد شاہ ثالث تا ٩٢٧ھ

۱۶- علاءالدین
۱۷- ولی اللہ
۱۸- کلیم اللہ
تا ۹۳۴ھ م ۱۵۲۶ء

دکن میں مسلمانوں کی پہلی نوآبادی دولت آباد تھی۔ محمد تغلق کے عہد میں اس کے جبرًا بسانے کا حال ہم پڑھ چکے ہیں۔ بغاوت کا مرکز بھی یہی شہر بنا لیکن علاء الدین حسن کا بادشاہی پر انتخاب ہوا تو وہ دارالحکومت کو اپنے مستقر گل برگہ میں لے آیا۔ اور اس چھوٹی سی گندی بستی کو صاف کرا کے ایک بڑا شہر تعمیر کیا۔ یہ اسی کے نام پر حسن آباد (یا احسن آباد) موسوم کیا گیا تھا مگر پرانے نام (گل یا کل برگا) کی تجدید نے اس میں شعریت پیدا کر دی اور مسلمانوں کا فارسی ذوق اس کی سلامتی کا ضامن بن گیا[1]۔ پھر اسی نوے سال بعد نویں بادشاہ نے بیدر میں نیا پایۂ تخت بنایا۔ جس کی شاہی عمارتیں، منظر کی دل ربائی اور طرز تعمیر کی خوش نمائی میں ممتاز ہیں ؛

یہ جنگ جو بادشاہ، لازمًا بڑے عالی حوصلہ تھے۔ علاؤالدین ظفر خاں نے بیٹے کی شادی میں مہینوں تک جشن منایا۔ شہر والوں پر منجنیقوں سے مٹھائیاں برسائیں۔ بیٹے نے اپنی ماں کے حج پر جانے کے وقت پورا خزانہ اُس کے حوالے کر دیا کہ اس

---

[1] شاہی عمارات میں سب سے مشہور بڑی مسجد ہے۔ یہ پوری مسقف بنائی گئی تھی اور اس لحاظ سے ہندوستان میں اپنا مثل نہیں رکھتی ؛

مبارک سفر میں خرچ کر دیا جائے! ان اقبال مندوں کو امیر وزیر بھی اچھے ملے اور دو، یعنی سیف الدین غوری، پھر خواجہ محمود گاواں، تاریخ میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ محمود گاواں کا شکستہ مدرسہ آج بھی اس کی اولوالعزمی، نفاست ذوق اور علم پروری کا فسانہ سناتا ہے۔ شاہی قدردانی اور دریا دلی بہت سے اہل علم وفضل کو دکن میں کھینچ لاتی تھی، حالاں کہ بری اور بحری دونوں راستے دشوار و دراز تھے۔ ادیبوں، شاعروں میں جو بہمنی سلاطین کے اکرام سے بہرہ مند ہوئے، فضل اللہ شیرازی، آذری اسفرائنی، ملا داؤد بیدری (صاحب تاریخ "تحفۃ السلاطین") محمد سراج (صاحب "سراج التواریخ") عین الدین بیجاپوری، لائق ذکر ہیں۔ محمود شاہ بہمنی کی دریا دلی نے خواجہ حافظ شیرازی جیسے بزرگ شاعر کو دکن آنے پر تیار کر لیا تھا مگر بندرگاہ ہرمز پر سمندر کا تلاطم دیکھ کر خواجہ کو سلامتی اس میں معلوم ہوئی کہ ساحل سے آگے نہ جائیں۔ خود نہ آئے، البتہ ایک پرکیف غزل دربار بہمنی کو لکھ بھیجی۔ چند شعر دلی کیفیات کا بھید سناتے ہیں:-

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درجست
کلاہ دل کش است اما بہ دردِ سر نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوئے سود
غلط گفتم کہ یک موجش بہ صد گوہر نمی ارزد

بِرو گنجِ قناعت جُو، بہ کُنجِ عافیت بنشیں
کہ یک دم تنگ دل بودن بہ بحر و بِر نمی ارزد
چو حافظ در قناعت کوش وا ز دنیائے دوں بگذر
کہ یک جَو مِنتِ دوناں بہ صدمن زر نمی ارزد

دکن میں شروع سے مسلمان صوفیہ کا بڑا زور رہا۔ دولت آباد کے بساتے وقت صدہا درویش و مشائخ دہلی سے آئے اور ان میں خواجہ برہان الدین غریبؒ بھر شیخ زین الدینؒ ایسے مرجع خلائق اور باا ثر تھے کہ وہ بادشاہ بھی جو معتقد نہ ہوتے، اُن سے دبتے تھے۔ نویں صدی کے اوائل میں خواجہ بندہ نوازؒ نے اپنے قیام سے گلبرگہ کو نوازا۔ آج تک ان کی اولاد و معتقدین اور ان کے فیوض و برکات سارے دکن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں کی کثیر غیر مسلم آبادی میں مٹھی بھر مسلمان دور دراز ملک سے آکر بسے تھے۔ بیجانگر، تلنگانہ، کرناٹک، گونڈوانہ، اڑیسہ کے ہندو راجاؤں سے آئے دن لڑائیاں رہتی تھیں۔ خصوصاً بیجانگر کی قوی ریاست مستقل خطرہ بن گئی تھی لہذا بیرونی مسلمانوں کو لانے کی برابر احتیاج رہتی۔ بہمنی فوجوں میں کثرت سے ممالک عرب کے سپاہی اور افریقہ کے حبشی بھرتی کئے جاتے تھے اور ان دنوں یہی فوجی خدمات امارت و وزارت کا زینہ ہوتی تھیں۔ لیکن دکن کی یہ عجیب خصوصیت ایک ہی صدی میں نمایاں ہونے لگی تھی کہ پہلے کے مسلمان نئے آنے والوں سے تعصب رکھتے تھے۔ اور انس رقابت و

دشمنی سے کئی بار خوں ریزی کی نوبت پہنچی۔ نو وارد اُن دنوں (" غیر ملکی" کی بجائے) " غریب" کہلاتے تھے۔ دو تین دفعہ دکنی مسلمانوں نے موقع پاکر انھیں گھیر لیا اور صدہا افراد کو، جن میں عورتیں بچے شامل تھے، ہلاک کیا۔[1] محمود گاواں جیسا لائق اور جاں نثار وزیر بھی اسی قسم کی مجنونانہ سازش کا شکار ہوا اور اس خون ناحق نے سلطنت ہی کی جڑیں ہلا دیں۔ خود غرض امیروں نے اُسے پانچ حصوں میں بانٹ دیا اور بیجاپور، احمدنگر، برار، گول کنڈہ، بیدر میں الگ الگ آزاد ریاستیں بنالیں۔ ان نئی شاہیوں کا حال آیندہ ہماری نظر سے گزرے گا۔

خان دیس و مالوہ

فیروز شاہ تغلق کے انتقال پر مُلک مالوہ، اور چند سال قبل (نربدا اور تاپتی کے مابین) خان دیس خود مختار ہو گئے تھے۔ یہاں کے بادشاہ حضرت فاروق اعظمؓ سے نسب ملاتے تھے۔ برہان پور ان کا دارالحکومت اور اسیر گڑھ جنگی مرکز تھا۔ گجرات و مالوہ اور دکن میں گھرے ہونے کے باوجود دو صدی سے زیادہ اپنی آزادی قائم رکھنا ہی ان کی بہادری کا صریحی ثبوت ہے۔ برار و گونڈوانہ کے ہندو رجواڑوں سے بھی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ خان دیس میں اِنہی کی بدولت دہلی کا اسلامی تمدن پھیلا اور آج بھی وہاں کے مسلمان باشندوں کے خال و خط،

---

[1] فرشتہ نے ۸۵۰ھ کے واقعات میں ایک ایسے قتل عام کا ذکر کیا ہے جس میں "ایک برس کے بچے سے سو برس کے بوڑھے تک" مارے گئے اور "کربلا کا واقعہ تازہ ہو گیا"۔

زبان اور معاشرت میں وہ قدیم اثرات پائے جاتے ہیں۔ آخر مغل بادشاہوں نے اس حکومت کا خاتمہ کیا۔ (۱۰۰۸ھ م ۱۵۹۹ء)

شاہان فاروقیہ (خان دیس)

۱۔ ملک راجہ ۷۷۲ تا ۸۰۱ھ = ۱۳۹۹

۲۔ ناصر خاں تا ۸۴۱ھ

۳۔ میران عادل

۴۔ میراں مبارک

۵۔ عادل خاں ثانی

۶۔ داؤد خاں

۷۔ عادل خاں، ثالث

۸۔ میران محمد شاہ

۹۔ میران مبارک ثانی

۱۰۔ میران محمد ثانی

۱۱۔ علی خاں

۱۲۔ بہادر شاہ تا ۱۰۰۸ھ م ۱۵۹۹ء

مالوے کا صوبہ دار دلاور خاں غوری، فیروز شاہ تغلق کے انتقال، بلکہ تیمور کے تباہ کن حملے کے بعد آزاد ہوا۔ اس کے جانشین (ہوشنگ) کے عہد میں حکومت نے قوت حاصل کی۔ شہر ہوشنگ آباد اسی کی یادگار ہے۔ پھر یہاں ایک خلجی خاندان سریر آرا ہوا جس کی ترک تاز دہلی، دوآب، راج پوتانہ، اور

گجرات کے علاقوں تک ہوتی تھی۔ محمود خلجی نے بہمنیوں کو کئی شکستیں دیں اور ایک مرتبہ بڑھ کر پائے تخت بیدر آن سے چھین لیا۔ (۸۶۶ و ۸۶۷ھ) مشہور تھا کہ بہمنی خاندان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر محمود گاواں وزیر نے اپنے بادشاہ کو بچا لیا اور حملہ آوروں پر دور سے چھاپے مارتا رہا یہاں تک کہ وہ عاجز آکر واپس گئے۔ یہ طرز جنگ جو سبک پا دکنیوں کے مزاج کے بہت مناسب نکلا، "چپاولی" کہلاتا تھا۔ فرنگیوں نے اسے "گوریلا" بندر سے منسوب کیا ہے ؛

سلاطین مالوا کو جنگ سے بڑھ کر فن تعمیر میں امتیاز حاصل ہے۔ ان کا پرانا پائے تخت شادی آباد منڈو ویران ہو گیا مگر اس کے محلات و قصور آج بھی بنانے والوں کی حیرت انگیز بلند خیالی اور حسن ذوق کی یاد دلاتے ہیں۔ دسویں صدی میں یہ بادشاہ عیش و طرب کے دل دادہ ہو گئے، مملکت شاہان گجرات کے ہاتھوں ختم ہوئی ؛ (۹۳۷ھ = ۱۵۳۰ء)

سلاطین مالوا

۱۔ دلاور خاں غوری ۸۰۴ تا ۸۰۸ھ = ۱۴۰۱ء

۲۔ ہوشنگ الپ خاں

۳۔ غزنی خاں

۴۔ محمود شاہ خلجی ۸۳۹ تا ۸۸۰ھ = ۱۴۷۵ء

۵۔ غیاث شاہ

۶۔ ناصر شاہ

۷- محمود شاہ ثانی تا ۹۳۷ = ۱۵۳۰ء

گجرات

راجستان اور تھر کے بے آب ریگستانوں کے مغرب میں گجرات کا ہرا بھرا جزیرہ نما واقع ہے۔ گجراتی زبان اس کی حدود کو ممیز کرتی ہے لیکن مسلمان سلاطین کے عہد میں "سورٹھ" کا جنوبی علاقہ نربدا تک پھیلا اور شمال مشرق میں کچھ بھی گجرات کا جز بن گیا۔ حال آں کہ آب و ہوا اور زبان کے لحاظ سے وہ سندھ سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتا ہے۔

سلطنت دہلی کے انحطاط اور تیمور کے ہاتھوں تاراجی کے بعد یہاں کا صوبہ دار ظفر خاں آزاد ہو گیا (۸۰۶ھ) لیکن بادشاہی کی اصلی شان پوتے نے دکھائی جو سلطان احمد شاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ تیس برس کی حکومت میں کئی علاقے فتح کیے۔ راج پوتانہ، مالوہ، سورٹھ کے حاکموں سے برابر لڑتا رہا اور کبھی شکست نہیں کھائی۔ اسی اقبال مند بادشاہ کے دل میں یہ لہر آئی تھی (۸۱۶ھ) کہ سابرمتی کے کنارے شہر احمد آباد آباد کرے۔

"بنا سے برآورد چو کاخ فلک کہ در وے شود خیرہ چشم فلک

چو ترتیب آں شہر عالی مقام شد از ناصرالدین احمد تمام

ورا نام ہم احمد آباد شد دراں ملت احمد آباد شد

الٰہی تو ایں شہر عالی بنا

مدہ تا بہ حشرش زوال و فنا!"

(اقتباس از مثنوی علوی شیرازی)

احمد کا پوتا محمود شاہ گزرا ہے جس کی مونچھیں اتنی بڑی تھیں کہ بل دے کر سر پہ باندھ لیتا تھا۔ چنانچہ "بیگڑہ" کے عرف عام سے مشہور ہے۔ (بیگڑہ ایسے بیل کو کہتے ہیں جس کے سینگ اوپر جا کر مل جائیں) بادشاہ کی خوراک بھی بیل سے کم نہ تھی[1]۔ چودہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا، لیکن سرکش امرا کا ایسا قلع قمع کیا کہ شروع ہی سے ملک بھر میں ہیبت طاری ہو گئی۔ تقریباً ۵۴ برس بڑے جاہ و جلال سے بادشاہی کی۔ جونا گڑھ۔ کچھ اور جنوب میں موجودہ بڑودہ کا علاقہ تسخیر کیا۔ سلطنت عثمانیہ (ترکی) کی مدد سے پرتگیزوں کو، جن کی بحری قزاقی کا دائرہ بہت وسیع اور مخدوش ہوتا جاتا تھا، بحری شکست دی اور اس کی زندگی میں یہ فرنگی ڈکیت ساحل گجرات پر کہیں نہ ٹک سکے۔ یہ عنایت محمود شاہ کے چوتھے جانشین سلطان بہادر شاہ نے کی تھی کہ انھیں دیو میں قلعہ بنانے کی اجازت دی۔ بدل میں

---

[1] مراۃ سکندری (صـ) میں لکھا ہے کہ سلطان کی روزانہ خوراک ایک من گجراتی یعنی کوئی بارہ سیر مروجہ تھی۔ رات کو بھی جب آنکھ کھلتی تو دونوں طرف بڑے بڑے سموسے رکھے رہتے تھے، دو چار لقمے کھا لیتا تھا۔ صبح کو نماز پڑھ کر ایک قدح شہد اور اسی کے برابر گھی پیتا اور ڈھائی سو کیلے نوش فرماتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ اگر میں بادشاہ نہ ہوتا تو پیٹ کیوں کر بھرتا؟

"مراۃ سکندری" عہد اکبری میں تالیف ہوئی تھی۔ مولف، سکندر بن محمد ایک ممتاز گجراتی ادیب ہے جس کا باپ سلطنت گجرات کے آخر زمانے میں سید مبارک وزیر کا ندیم و رفیق تھا، پھر ہمایوں بادشاہ کی سرکار میں کتاب دار مقرر ہوا۔ کتاب گجرات کی سابقہ تاریخوں کی مدد سے بے لاگ طریقے پر لکھی گئی ہے۔ اور سب سے پہلے ۱۲۴۴ھ میں بمبئی میں طبع ہوئی تھی۔

انھوں نے اپنے محسن کو دغا سے قتل کر دیا (۹۴۳ھ) ؎

زہے سگ بانیٔ چرخِ زبوں گیر
کہ شیراں را سگاں سازند نخچیر!

بہادر شاہ کے عہد ہی میں تیموری مغل گجرات پہنچ گئے تھے۔ ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا تو اہل گجرات کو مہلت مل گئی مگر کوئی ایسا طاقت ور بادشاہ نہ پیدا ہوا جو اپنے امیروں کی سازش و فساد کا انسداد کر سکتا حتیٰ کہ اکبر کے عہد میں یہ ملک اپنی آزاد بادشاہی سے محروم ہو کر مغلیہ صوبہ بنا لیا گیا۔

سلاطین گجرات کی فہرست ذیل میں آتی ہے لیکن تہذیب و تمدن کے اعتبار سے یہ ملک زیر نظر عہد کی خودمختار حکومتوں میں نہایت ممتاز اور اپنی تجارت و آسودگی میں غالباً سب سے فائق تھا۔ بہلول لودھی بادشاہ دہلی کا یہ قول تاریخوں میں منقول ہے کہ "دہلی کی بادشاہی کا مدار گندم و جو پر ہے اور گجرات کی بادشاہی کا، مروارید و مرجان پر کہ ۸۴ بندر اس کے تخت میں ہیں"۔

فن تعمیر کی ترقی میں بھی گجرات کے اسلامی سلاطین کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔ بلکہ تزئین و آرائش کی نئی اوضاع ایجاد کرنے میں وہ فوقیت رکھتے ہیں۔ احمد آباد، سرکھیج، پٹوہ، محمد آباد (چنپانیر) کھمبائت میں اُن کے عہد کی مساجد و مقابر حسن تعمیر کے نمونے ہیں جنھیں اکبر آباد و دہلی کی لاجواب مغل عمارات کے پہلے

نقوش سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ بقول فرگسن، سنگ تراشی کی نفاست و باریکی میں وہ عمارتیں بھی گجرات کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔[۱]

سلاطین گجرات

۱۔ (ظفر خاں) مظفر شاہ اول ۲۔ محمد شاہ اول (تتار خاں)	۸۰۶ تا ۸۱۳ = ۱۴۱۰ء
۳۔ احمد شاہ	تا ۸۴۴
۴۔ محمد شاہ بن ع۳	تا ۸۵۵
۵۔ قطب الدین	تا ۸۶۳
۶۔ داؤد شاہ بن ع۴	ہفت روز
۷۔ محمود شاہ بیگڑہ	تا ۹۱۷
۸۔ مظفر شاہ ثانی	تا ۹۳۴
۹۔ سکندر شاہ ۱۰۔ نصیر خاں	چند ماہ
۱۱۔ بہادر شاہ بن ع۸	تا ۹۴۳
۱۲۔ میران شاہ نبیرہ ع۸	چند ماہ
۱۳۔ محمود شاہ نبیرہ ع۸	تا ۹۶۱
۱۴۔ احمد شاہ ثانی بن لطیف خاں نبیرہ ع۳	تا ۹۶۸
۱۵۔ مظفر شاہ نبیرہ ع۱۳	(دوبار) تا ۱۰۰۰ = ۱۵۹۲ء

۱؎ اسلامی فن تعمیر، ہندوستان میں ص۳۶

شرقی سلاطین جون پور

خواجہ جہاں (وزیر فیروز شاہ تغلق) کے جون پور آنے اور بساط شاہی بچھانے کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ سلطنت اگرچہ چھوٹی تھی اور زیادہ دن زندہ نہ رہی لیکن علم دوستی اور عمرانی ترقی میں بڑی حکومتوں کے برابر حصہ رکھتی تھی۔ سکندر بن بہلول لودھی نے اس کا خاتمہ کیا۔

شاہان شرقی

۱۔ خواجہ جہاں	۷۹۶ تا ۸۰۲ھ
۲۔ مبارک شاہ	ایک سال
۳۔ ابراہیم	تا ۸۴۴ھ
۴۔ محمود شاہ و محمد شاہ	تا ۸۶۳ھ
۵۔ حسین شاہ	تا ۸۸۱ وفات (۹۰۵ھ = ۱۵۰۰ء)

ضمیمہ

بابر کا تبصرہ

تاریخ کی کوشش یہ ہے کہ ہو سکے تو گزرے ہوئے زمانے کو دیکھنے والوں کی آنکھ سے دیکھے اور دکھا دے۔ اگر وہ دیکھنے والے بے لاگ، صاحب نظر ہوں تو پھر عہد ماضی کا صدیوں کے فاصلے سے مشاہدہ کرنا ممکن ہے۔ دسویں صدی ہجری کا ایک ایسا مبصّر ظہیر الدین بابر تھا جس کی قلم نے تلوار سے بھی گہرا نقش جریدۂ روزگار پر کھینچ دیا ہے۔ سیزر سے لے کر جہاں گیر و نپولین تک بہت سے بادشاہ اور کشور کشا اپنے احوال و واقعات کو تحریر کر گئے ہیں مگر بیان کی یہ خوبی اور دل کشی کسی "خود نوشت" میں مشکل سے ملے گی جو "تزک بابری" کا وصف ہے۔ اصل کتاب ترکی (چغتائی) زبان میں تھی۔ پہلے فارسی ترجمہ مقبول و متداول رہا۔ اب اکثر بڑی زبانوں میں منتقل ہو کر مطبوع ہو گیا ہے[1]۔ دہلی اور آگرہ فتح کرنے اور ہندوستان میں مستقل سکونت کا فیصلہ کرنے کے بعد بابر نے تزک میں "ہندوستان" پر ایک اجمالی تبصرہ لکھا تھا۔ اس کے مشاہدات

---

[1] انگریزی میں بی ورج کا محشّی ترجمہ مشہور ہے۔ اردو میں مرزا نصیر الدین حیدر (گورگانی) نے جس حد تک کیا، اچھا ترجمہ کیا اور چھپ چکا ہے۔

پنجاب و دوآب اور شمالی مالوہ، مشرقی راج پوتانہ تک محدود تھے تاثرات و آرا میں کہیں کہیں غیریت کی جھلک پائی جاتی ہے مگر یہ ذاتی تعلق بھی انھیں صداقت و تازگی بخشتا، اور زیرنظر عہد کی تاریخ کا نہایت واضح ماخذ بنا دیتا ہے۔ ہم یہ ضمیمہ اسی کے اقتباسات کے لئے وقف کریں گے ؛

"ہندوستان" کا بیان

"سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سے فیروزشاہ کے آخر زمانے تک ہندوستان کا تقریباً سارا ملک سلاطین دہلی کے زیرنگیں رہا ہے۔ اب جب کہ میں نے اسے فتح کیا تو پانچ مسلمان بادشاہ اور دو ہندو راجہ یہاں حکومت کرتے تھے۔ گو چھوٹے رئیس و راجہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بہتیرے ہیں مگر صاحبِ اقتدار و استقلال یہی پانچ ہیں : ایک پٹھان جو پنجاب سے بہار تک قابض تھے ..... دوسرا سلطان مظفر گجرات میں تھا۔ بڑا عالم فاضل، شرع کا پابند۔ ہمیشہ قرآن کی کتابت کرتا تھا ... تیسرا دکن میں بہمنی خاندان کہ اب اس کی سلطنت میں زور نہیں رہا۔ سارا ملک امرا میں تقسیم اور بادشاہِ وقت انہی کا محتاج ہوگیا۔ چوتھے، مالوے میں جسے مندو بھی کہتے ہیں، سلطان محمود خلجی، کہ اس کے چند حصے بھی رانا سانگا نے چھین لئے اور یہ سلطنت کم زور ہوگئی .... پانچویں نصرت شاہ بنگالے میں۔ اس کی قوم سید اور سلطنت باپ سے ورثے میں ملی ورنہ بنگالے میں یہ عجیب

رسم ہے کہ بادشاہی بہت کم موروثی ہوتی ہے۔ وہاں کا بادشاہ "تخت" ہے، اور دوسرے امیروں، وزیروں کی بھی ایک ایک کرسی مقرر ہوتی ہے۔ جس امیر یا عہدہ دار کا بادشاہ عزل ونصب کرنا چاہتا ہے، اُن کی جگہ بدل دی جاتی ہے اور اس جاے یا کرسی کے ساتھ خدم وحشم ہوتے ہیں، وہ دوسرے شخص سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت بادشاہی تخت کی ہے جو کوئی بادشاہ حال کو مار کر فوراً تخت پر بیٹھ جائے، اسی کو تمام امرا، وزرا، فوج و رعایا بادشاہ سمجھنے لگتی ہے۔ بنگالیوں کا قول ہے کہ ہم تو تخت کے نوکر ہیں ..... چنانچہ نصرت شاہ کے باپ علاء الدین سے پہلے ایک حبشی نے بادشاہ وقت کو مار ڈالا اور خود تخت پر ہو بیٹھا تھا۔ مدتوں اس نے حکومت کی۔ حبشی کو مار کر سلطان علاء الدین تخت پر بیٹھا اور بادشاہ ہو گیا۔ البتہ علاء الدین کے بعد اب اُس کا بیٹا نصرت شاہ بہ طور وراثت بادشاہ ہوا ہے؛ بنگالے میں یہ بھی دستور ہے کہ ہر بادشاہ کو نیا خزانہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ خزانہ جمع کرنا ان لوگوں میں بڑے فخر کی بات ہے۔ ایک قاعدہ یہ ہے کہ تمام عہدوں اور بادشاہ کے ذاتی نوکروں کے واسطے تنخواہ میں جاگیریں مقرر ہیں۔ ان کی آمدنی اور کسی کام میں خرچ نہیں کی جاتی ...... یہ تو پانچ بادشاہوں کا حال تھا۔ ان کے علاوہ بہت سے مسلمان اپنی جگہ آزاد اور صاحب ملک ولشکر ہیں؛ ہندوؤں میں سب سے بڑا آج کل بیجانگر کا راجہ ہے۔ دوسرا رانا سانگا ہے جس نے اپنی

جرأت اور چالاکی سے اقتدار بڑھا لیا۔ اس کا اصلی ملک چتوڑ ہے۔ سلاطین مالوہ کی کمزوری کے زمانے میں رن تھنبور بھیلسا، چندیری اس کے قبضے میں آ گئے ....

پہاڑ، دریا

"ہندوستان اقلیم اول، دوم، سوم میں واقع ہے.... ہماری ولائت سے بالکل اجنبی، دوسری ہی دنیا ہے۔ پہاڑ، دریا، جنگل، جانور، نباتات، آدمی، زبان، آب و ہوا سب مختلف ہیں.... کابل سے آئیں تو دریائے سندھ کے پار ہوتے ہی (شمال میں) پہاڑ خوب آباد ہیں۔ ان میں صدہا بستیاں، بے شمار قومیں بھری ہیں۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ سمندر کے کنارے پر ختم ہوتا ہے.... ہندو اس کو سوالک پربت بھی کہتے ہیں۔ یعنی سوالاکھ پہاڑ۔ اس پہاڑ پر ہمیشہ برف رہتی ہے۔ .... کابل کے علاقے میں اسی کا نام ہندوکش ہے۔ اس کے جنوب میں ہندوستان، دوسری جانب شمال میں تبت ہے۔ اسی پہاڑ میں سے متعدد دریا نکلتے ہیں۔ سرہند کے شمال میں چھ: سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاج اور ستلج ہیں۔ کہ ملتان کے آگے جمع ہو کر سندھ دریا میں ملتے اور ٹھٹھہ کے علاقے سے گزر کر دریائے عمان میں جا گرتے ہیں۔ ان کے علاوہ گنگا، جمنا، سرو، گنڈک اور بہت سی ندیاں اسی پہاڑ سے نکل کر گنگا میں ملی اور مشرق کی طرف بہتی ہوئی سمندر تک چلی گئی ہیں۔ ان سب کا مخرج سوالک ہی ہے۔

اور کئی دریا وسطِ ہند سے نکلتے ہیں، جیسے چنبل، بناس، سون وغیرہ۔ یہ بھی گنگا سے جا ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے پہاڑ ہیں۔ ایک شمال سے جنوب کی طرف جاتا ہے۔ یہ دلّی کے علاقے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی کی ایک پہاڑی پر سلطان فیروز شاہ کا محل "جہاں نما" نامی بنا ہوا ہے۔ پھر یہ پہاڑ میوات سے بیانہ جاتا ہے۔ سیکری، دھول پور، باڑی کے پہاڑ اسی کی شاخیں ہیں مگر مسلسل نہیں ہیں۔ . . . . یہ پہاڑ نیچے نیچے، درخت دار ہیں۔ مگر ان میں برف نہیں پڑتی . . . . .

میدان، زراعت، آب پاشی

"ہندوستان کے اکثر قطعات میدانوں اور ہموار زمینوں میں واقع ہیں۔ اتنے شہر اور مختلف ملک جتنے ہندوستان میں ہیں اور کہیں نہیں۔ یہاں نہریں جاری نہیں ہاں دریا بہتے ہیں۔ بعض دریا بہت بڑے ہیں . . . . . بڑی بات یہ ہے کہ مینھ نہ بھی برسے تو بھی ربیع کی فصل ہو جاتی ہے۔ بڑے درختوں کے پودوں کو برس دو برس رہٹ یا چرس سے پانی دیا جاتا ہے۔ جہاں ذرا بڑے ہوئے پھر ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ ترکاریوں، پھل پھول کے درختوں کو پانی دیتے ہیں۔ لاہور، دیپال پور، سرہند وغیرہ کی نواح میں رہٹ سے پانی دینے کا دستور ہے . . . . . دلّی، آگرہ اور بیانہ کی طرف چرس سے پانی دیتے ہیں۔ اس میں بہت محنت پڑتی ہے اور یہ طریقہ بھی گندا ہے . . . . . کنوئیں کی چرخی پر ایک ڈول، یعنی چرس اور دوسری طرف رسّا بیل کے

جوے میں اٹکا دیتے ہیں .... بیل چرس کھینچتا اور دور تک جاکر واپس لایا جاتا ہے۔ اکثر آنے جانے میں پیشاب اور گوبر کرتا، رستا ان میں لتھڑتا اور کوئیں میں ڈالنے سے بول و براز اس کے ساتھ اندر گرتا رہتا ہے .... ایسی بھی کھیتیاں ہیں جنھیں پانی دینے کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ عورت مرد ڈھیکلی سے پانی دیتے ہیں .... ہندوستان کی بستیاں بہت غلیظ اور چپٹی زمین پر بنالیتے ہیں۔ اکثر برسات میں کیچڑ سے آمد رفت مشکل ہوجاتی ہے .... یہ بستیاں بہت جلد بستی اور اُجڑ بھی جاتی ہیں۔ بڑی بستیوں تک کے لوگ بھاگنے پر آئیں تو چند پہر میں ایسے غائب ہوجاتے ہیں کہ نشان تک نہیں ملتا۔ بسنا چاہیں تو کہیں بھی جمع ہوکر تالاب کھود لیا یا کواں بنالیا اور پھوس کی جھونپڑیاں ڈال لیں ذرا دیر میں گاؤں بلکہ خاصا شہر آباد ہوگیا۔ در دیوار کھڑے کرنے اور مکان چننے کی انھیں پروا نہیں"....

جانور، نباتات، پھل پھول

بابر نے ہندوستان کے حیوانات، چرند، پرند اور مچھلیوں کا، خصوصًا وہ قسمیں جو خراسان و کابل میں نہیں ہوتیں، خاصی صراحت سے ذکر لکھا ہے۔ پھر نباتات کا، جن میں پھلوں اور پھولوں کی نسبت اس کی رائے پڑھنے کے قابل ہے۔ ہم خلاصہ پیش کرتے ہیں:

"ہندوستان کے خاص میووں میں سے ایک آنبہ ہے۔ اکثر ہندوستانی ب کو ساکن بولتے ہیں۔ وہ ایک واہیات لفظ بن

جاتا ہے اس لئے اسے "نغزک" کہنے لگے۔ چنانچہ امیر خسروؒ فرماتے ہیں:

نغزکِ ما نغز کُن بوستاں

نغز ترین میوۂ ہندوستاں

اس میں خوش بو ہوتی ہے۔ خودرو بھی ہوتا ہے مگر خودرو اچھا نہیں ہوتا۔ اکثر کچی کیریاں توڑ کر پال میں تیار کرتے ہیں۔ ٹپکے میں ترشی پائی جاتی ہے۔ ٹپکے کی کیریوں کا مربہ خوب بنتا ہے۔ آم ہندوستان کے عمدہ پھلوں میں ہے۔ بعض تو اتنا پسند کرتے ہیں کہ سوائے خربوزوں کے سب میووں سے بہتر بتاتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہاں بڑے آڑو سے ملتا جلتا ہے..... بنگالے اور گجرات میں اس کی کثرت ہے۔ چوس کر یا چھیل کر کھاتے ہیں........

یہاں کا ایک پھل کیلا ہے جسے اہلِ عرب مَوز کہتے ہیں۔ اس کا درخت اتنا اونچا نہیں ہوتا کہ درخت کہا جائے..... مگر پتہ کوئی دو گز لمبا اور ایک گز چوڑا ہوتا ہے۔ بیچ میں سے ایک شاخ دل کی شکل کی نکلتی ہے۔ شاخ کے سرے پر غنچہ ہوتا ہے جس کی پنکھڑیاں کھل کر کیلے کی گیل بن جاتی ہے..... کیلے میں دو لطافتیں ہیں۔ ایک یہ کہ چھلکا آسانی سے اتر جاتا ہے۔ دوسرے اندر کوئی گٹھلی یا بیج نہیں ہوتے۔ خوب میٹھا ہوتا ہے۔ خاص کر بنگالے کا۔ ....

ایک املی ہے جسے تمر ہندی کہتے ہیں۔ اس کی پتیاں چھوٹی، درخت خوب صورت گھنیرا اور بہت اونچا بڑھتا ہے۔ ایک مَہوہ ہے۔ اس کے پھولوں کا عرق کھینچتے اور سکھا کر کھاتے ہیں۔ کشمش جیسا ہو جاتا ہے۔ بو گوارا، اور مزا بھی برا نہیں۔ ایسا کہ کھا سکتے ہیں....

جنگلی اور بستانی دونوں طرح کا ہوتا ہے ٭ ایک کھرنی ہے ..... پھل زرد اور مزا کچھ انگور سے ملتا ہے آخر میں ذرا کسیلا۔ غرض برا نہیں۔ کھا سکتے ہیں ..... ایک میوہ جامن ہے۔ اس کے پتے گول اور سبز۔ درخت بدشکل نہیں اور پھل ایسا جیسا کالا انگور، کسی قدر ترشی لئے ہوئے۔ مزے میں کچھ بہت اچھا نہیں ہوتا۔ ..... ایک کرک ہے جس کے پانچ پہلو ہوتے ہیں ..... پکنے کے بعد زرد ہوجاتی ہے۔ کچی توڑو تو کڑوی، پک کر ذرا ترش ہوجاتی ہے۔ خاصا لطیف پھل ہے ٭ ایک کٹھل ہے۔ بدصورت، بدمزا۔ صورت بالکل جیسے بکری کی اوجھڑی ..... اندر گول گول دانے۔ ان میں کھجور سے زیادہ نرم گودا ہوتا ہے۔ اسی کو کھاتے ہیں۔ چپ چپا ایسا کہ اکثر ہاتھ اور منہ کو چکنائی مل کر کھاتے ہیں۔ یہ درخت کی شاخ میں بھی لگتا ہے اور تنے میں بھی۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے درخت میں کپیاں لٹکی ہوئی ہیں ..... ایک بڑھل ہے۔ سیب کے برابر۔ بو اچھی ہوتی ہے۔ عجب بے مزا چیز ہے ٭ ایک بیر ہے فارسی میں اسے "کنار" کہتے ہیں۔ یہاں کئی قسم کا ہوتا ہے۔ ایک آلوچے سے ذرا بڑا "حسینی" انگور کے برابر۔ مگر یہ مزے میں اچھا نہیں۔ ہاں باندے میں ایک قسم میں نے دیکھی، وہ اچھی تھی۔ ..... ایک گولر ہے۔ اس کا پھل درخت کی شاخ میں لگتا ہے۔ یہ انجیر سے بہت مشابہت رکھتا ہے مگر عجب بدمزا پھل ہے ..... ایک آملہ ہے ..... بہت سخت اور بے مزا مگر مربہ برا نہیں ہوتا۔ مفید پھل ہے۔ اس کا درخت خوب صورت ہوتا ہے ..... ٭

آخر میں لیمو، کھٹے، میٹھے، نارنج کا ذکر ہے۔ حاجی پور (پٹنے) کی نارنگی کی تعریف کی ہے کہ اس کی ترشی مٹھاس لیے ہوتی ہے بلکہ دونوں بالکل برابر ہوتی ہیں۔

پھولوں میں بابر کو کریل کے درخت اور پھول کی صورت پسند آئی۔ کیوڑے، کیتکی، اور ہندوستان کی چنبیلی، چمپا کی خوشبو کی بھی تعریف کرتا ہے۔ پھر موسم، دن کے اوقات کی تقسیم، اوزان، اعداد کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں باشندوں کے متعلق یہ مجمل رائے لکھی ہے:-

عام باشندے

اہل ہند اکثر بت پرست ہیں۔ ہندو کہلاتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ تناسخ کے قائل ہیں۔ ہندو نوکری پیشہ اچھے کارگزار ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں صحرائی لوگوں کے قبیلے الگ الگ ہیں یہاں دیہات میں یہی صورت ہے اور ہر پیشے والا اپنا جدّی پیشہ کرتا ہے.... ہندوستان میں لطافت کم ہے۔ لوگ نہ حسین ہیں نہ میل جول کے اچھے ہیں۔ نہ ان کا شعور اچھا، نہ ان میں مروت، مہربانی نہ ادب.... گھوڑا یہاں عمدہ نہیں ہوتا۔ گوشت اچھا نہیں۔ انگور، خربوزے اور میوے اچھے نہیں۔ برف نہیں ٹھنڈا پانی نہیں۔ روٹی اور کھانے جو بازاروں میں بکتے ہیں، سب خراب۔ حمام، مدرسہ، شمع، شمع دان، مشعل کا نام نہیں۔ ان کی بجائے چیکٹ اکٹھا کرکے جلاتے ہیں۔ ڈیوٹ چراغ کو کہتے ہیں۔ اس کے فلیتے پر ایک خشک کدو سے تیل ٹپکاتے ہیں....

مقدور والوں کے ہاں ایسے ڈیوٹ سو دوسو ہوتے ہیں۔ اِنہی سے شمع اور مشعل کا کام لیا جاتا ہے۔ راجہ مہاراجہ، امیروں کے سامنے بھی یہی ڈیوٹ لاکر کھڑے ہوجاتے ہیں... سوائے ندیوں یا بڑے دریاؤں کے نالوں وغیرہ میں پانی ہمیشہ جاری نہیں رہتا۔ باغوں اور مکانوں میں نہریں نہیں ہوتیں۔ عمارتیں ہوا دار مصفا اور خوش نما نہیں۔ عوام لنگوٹے باندھے، ننگے پاؤں پھرتے ہیں...... عورتیں ایک لنگی، آدھی کمر میں باندھتی آدھی سر پر اوڑھ لیتی ہیں....

"ہندوستان کی بڑی خوبی یہ کہ وسیع، دولت مند ملک ہے۔ برسات میں خوب بارشیں برستی اور پھر مزے کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں...... مگر یہ موسم مرطوب بہت ہوتا ہے۔ کمان کھچنے سے رہ جاتی ہے...... کمان ہی پر کیا موقوف ہے۔ جُبّہ، جغہ، کُرتا پاجامہ کتابیں اور اسباب سب میں سیل دوڑ جاتی ہے۔ مکان تک پیلے ہوجاتے ہیں... ہندوستان کی ایک عمدگی یہ ہے کہ ہر پیشے اور حرفت کا آدمی کثرت سے ہے۔ جن کے ہاں باپ دادا کے وقت سے وہی کام ہوتا گیا ہے.... ظفرنامے میں مُلّا شرف الدین یزدی نے لکھا ہے کہ حضرت امیر تیمور نے جب مسجد بنوائی تو آذربی جان، فارس اور ہندوستان وغیرہ ملکوں کے دوسو سنگ تراش کام کرتے تھے۔ (یزدی) اسے بڑی تعداد خیال کرتے تھے۔ میں نے جو عمارتیں آگرے میں بنوائیں، ان میں صرف آگرے کے چھ سو اسی سنگ تراش کام کر رہے ہیں.... اس پر قیاس کرنا چاہیئے کہ ہر کام اور پیشے کا آدمی ہندوستان میں کس قدر زیادہ ہے"۔

باب یازدہم

مغلوں کا ابتدائی تسلط ہند پر

بابر کی فتوحات

ظہیر الدین بابر، جس نے ابراہیم لودھی کو شکست دی، عمر شیخ میرزا کا بڑا بیٹا تھا۔ ۸۸۸ ہجری (مطابق ۱۴۸۳ء) ۶ محرم کے دن پیدا ہوا۔ "شش محرم" ولادت کی یادگار تاریخ ہے[1]۔ عمر شیخ میرزا، امیر تیمور کے دوسرے فرزند حسین میرزا (حاکم عراق) کا پوتا تھا۔ تیمور کی میراث کے لیے اولاد میں چھینا جھپٹی ہوتی رہتی تھی۔ اسی میں ولایتِ فرغانہ عمر شیخ کے ہاتھ آگئی۔ ۸۹۹ ہجری میں اس کا انتقال ہُوا تو بابر کی عمر پورے بارہ برس کی بھی نہ تھی اور زورِ بازو کے بغیر

---

[1] بابر کی ماں یونس خاں کی بیٹی تھی اور یہ مُغل رئیس چنگیز خاں کی گیارھویں پشت میں تھا۔ اُس وقت تک لفظِ "مغل" سے خوں خواری کا رنگ ٹپکتا تھا اور کفر کی بو پھوٹتی تھی اسی لئے بابر اپنے آپ کو تُرک کہتا تھا اور مغل کہوانا پسند نہ کرتا تھا۔

حکومت کا حق کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ بابر کا سارا لڑکپن گویا جنگ کے کھیلوں میں گزرا۔ قوی تر حریفوں نے اُسے مار مار کر سیحوں کے پار اُتار دیا اور ایک زمانے تک وہ خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر قسمت آزمائی کرتا پھرا۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ ۹۱۰ھ (مطابق ۱۵۰۴ء) میں کابل پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ ماوراءُالنہر کے لئے اُزبکوں سے جنگ جاری رہی۔ ایرانیوں کی مدد سے وہ دو تین مرتبہ تیمور کے پائے تخت سمرقند میں پہنچا اور ہر دفعہ شکست کھا کے اُسے چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ آخری مرتبہ غجدوان میں بہت خوں ریز معرکہ پڑا۔ ازبکوں نے نمایاں فتح حاصل کی۔ بابر اور ایرانی حلیفوں کی ہمتیں شکست، حوصلے پست ہوگئے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ پھر "الہامِ غیبی" سے ماوراءالنہر کا ارادہ ترک اور ممالک ہند کی تسخیر کا قصد کیا[۱] مگر یہ الہامِ غیبی، حقیقت میں اس کشفِ حقیقت پر مبنی تھا کہ جنگ جو ازبکوں پر غلبہ پانے کا کوئی قرینہ نہیں۔

ہندوستان پر حملے کی ایک بڑی تحریص، وہاں کی کمزوری اور بدنظمی تھی۔ بادشاہِ دہلی کے خلاف جا بجا بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ مشرقی دوآب میں بہادر خاں (لوہانی) نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا تھا۔ پنجاب کا صوبہ دار دولت خاں علانیہ ابراہیم لودھی سے منحرف اور بابر سے ساز باز میں مصروف تھا۔ ابراہیم کا عم زاد بھائی، علاءالدین بھاگ کر کابل آگیا اور ہندوستان پر حملہ کرنے

---

[۱] اکبر نامہ۔ صفحہ ۹۱۔

کی تحریک کر رہا تھا۔ ان خرابیوں سے قطع نظر، اہل ہند کی بڑی کم زوری یہ تھی کہ فن حرب میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ بلبن اور علاء الدین خلجی کی جن فوجوں نے مغلوں سے جنگ کی، ان کے اسلحہ اور حربی مہارت حریفوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ برخلاف اس کے ابراہیم لودھی جس لشکر کو میدان میں لایا، وہ توپ و تفنگ کے مقابلے میں خالی تیر و خدنگ سے لڑنے آیا تھا اور مغل سواروں کی قواعد دانی کے جواب میں شاید اپنی کثرتِ تعداد پر مغرور تھا۔ مگر یہ تعداد نظم وضبط سے عاری تھی اور جنگ کے وقت اُلٹی وبالِ جان ثابت ہوئی۔

بابر کی فوج تعداد میں پوری بارہ ہزار بھی نہ تھی۔ مگر سب چیدہ، آزمودہ کار سوار تھے۔ توپ خانے کی مدد سے ان کی قوت میں بے شبہ اضافہ ہوا۔ پنجاب میں افغان سرداروں سے جو معرکے پیش آئے اُن سے ہمت بڑھی اور وہ ہندیوں کے مقابلے میں زیادہ دلیر ہوتے گئے۔ لاہور، دیپال پور اور قریب کے قلعوں کو لیتا ہوا، بابر بے روک ستلج کے پار اُترا اور انبالے، شاہ آباد کے راستے جمنا کے کنارے آگے بڑھا۔ پانی پت

۱؎ بابر ابتدائی تین حملوں میں پنجاب سے آگے نہیں بڑھا۔ چوتھی دفعہ دشمن دولت، صوبہ دار دولت خاں کے اشارے سے لاہور پر قابض ہوا (۹۳۰ھ م ۱۵۲۴ء) تو اسے بھی علاء الدین لودھی کے حوالے کر گیا تھا۔ مغلوں کی پشت پناہی سے علاء الدین دہلی پر چڑھا مگر سرنگوں واپس ہوا۔ تب بابر نے خود سلطان دہلی سے تیغ آزمائی کا قصد کیا اگرچہ اس کے ساتھی آخر تک اس مہم سے بچ کچاتے تھے۔ (ملاحظہ ہو تزک بابری۔ وقائع ۹۳۲ھ)

پہنچ کر سنا کہ ابراہیم لودھی بڑا لاؤ لشکر لئے ہوئے آرہا ہے، لہٰذا اسی بستی کے قریب پڑاؤ کیا اور مضبوط مورچے بنا کے وہ فیصلہ کن معرکہ جیتا جو تاریخ میں "پانی پت کی پہلی لڑائی" مشہور ہے ؛ (۷ رجب ۹۳۲ مطابق ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء)

تاریخ ہند کی یہ مشہور لڑائی چند گھنٹے میں ختم ہوگئی۔ اس کی تیاری میں بابر نے جتنی دردسری اٹھائی تھی، جیتنے میں آدھی بھی اٹھانی نہیں پڑی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ فتح کی تکمیل ابراہیم لودھی کی موت سے ہوئی اور فتح کی عظمت کا سبب یہ ہوا کہ بابر کا پایۂ تخت دہلی اور آگرہ، بلکہ پوری سلطنت پر قبضہ ہوگیا۔ فخریہ لکھتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی اور معزالدین غوری بہت بڑے بادشاہ تھے اور بڑے بڑے لشکر لے کر ہندوستان پر چڑھے تھے۔ میری حکومت کابل، قندہار اور شمال میں بدخشاں تک محدود اور وہ بھی مخدوش تھی ...... میں تو محض خدا کے بھروسے پر لڑا اور اسی کی مدد سے ابراہیم جیسے صاحبِ مال و لشکر بادشاہ پر غالب آیا ہوں ؛

فتح دہلی نے دل میں نئے نئے ولولے پیدا کر دئیے - اس نے ہندوستان میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کیا بلکہ بعض مغل سرداروں نے واپسی کی گفتگو چھیڑی تو بہت خفا ہوا کہ اتنا وسیع ملک چھوڑ کر کابل کی گڑھیا میں مقید ہونا، کونسی عقل مندی ہے؟ پھر بھی اجازت دی کہ جو لوگ یہاں کے فوائد اور میری رفاقت چھوڑ کر کابل جانا چاہتے ہیں، وہ جا سکتے ہیں ؛ بادشاہ کی یہ تقریر سن کر سب چپ ہوگئے مگر ایک امیر خواجہ کلاں کا دل ہندوستان کی

ایک ہی گرمی دیکھ کر سرد ہو گیا تھا، وہ نہ رکا اور چلتے چلتے پرانی دلّی کی فصیل پر یہ شعر لکھ کر کابل کی راہ لی کہ ؎

اگر بخیر و سلامت گزارِ سندھ کنم
سیاہ رُوئے شوم گر ہوائے ہند کنم! [1]

جنگ کنواہہ

مستقل سکونت سے بابر کے حملے کی نوعیت بدل گئی۔ مُغل سپاہیوں نے مار دھاڑ کا خیال چھوڑ دیا اور یہ سمجھ کر کہ آیندہ انہی ہندیوں میں زندگی گزارنی ہوگی، تالیفِ قلوب اور میل جول پر مائل ہو گئے۔ اُدھر بہت سے کسان، زمیں دار جو گھروں سے فرار ہو گئے تھے کہ مُغل چلے جائیں گے تو واپس آ جائیں گے، چار و ناچار پلٹ کر آئے اور مُغل حکّام کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ عام بدامنی اور بے اطمینانی دفع ہوئی۔ رسدرسانی اور آمدورفت کی مشکلات جن کی بابر نے تزک میں شکایت لکھی ہے، رفع ہونے لگیں ؛ دوسری طرف بہت سے افغان امیر جو آپس میں لڑتے رہتے تھے، مغلوں کے مستقل قبضہ کرنے سے بہت گھبرائے۔ باہمی نفاق پر پچھتائے۔ دوآب اور بہار میں جگہ جگہ مشورہ کرنے جمع ہوئے کہ مغلوں کے سیلاب کو پنجاب کے پار کس طرح

---

[1] خواجہ کلاں، بابر کا قدیم اور عزیز امیر تھا۔ علاقہ بجور فتح ہوا۔ اور اُسے حکومت سپرد ہوئی تو بابر نے یہ لطیف رباعی لکھ کر بھجوائی تھی :-

قرار و عہد بہ یار ایں چنیں نہ بود مرا ۔۔۔ گزید ہجر و مرا کرد بے قرار آخر
بہ عشوہ ہائے زمانہ چہ چارہ سازد کس ۔۔۔ بجور کرد جُدا یار را ز یار آخر!

ڈھکیلا جائے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ نوجوان ہمایوں آگرے سے چلا اور دشمنوں سے ملک صاف کرتا ہوا، جون پور تک پہنچ گیا۔ وہ آگے بڑھنے کی فکر میں تھا کہ اتنے میں راج پوتانے سے فتنے کا نیا غبار بلند ہوا۔ خبر ملی کہ چتوڑ کا رانا سنگ رام جس کا عرف عام رانا سانگا ہے، گھٹا کی طرح اٹھا اور آندھی کی طرح آگرے کی طرف چلا آتا ہے۔ ایک سو بیس رئیس و راجہ ہم رکاب ہیں۔ سلطان سکندر لودھی کا بیٹا محمود خاں دس ہزار پٹھانوں کے ساتھ جا ملا ہے کہ شاید سانگا، ساکھا کرے اور گیا ملک پھر ہاتھ آجائے۔ حسن خاں میواتی اطاعت کے قول قرار کر کے پلٹ گیا اور بارہ ہزار جمعیت کے ساتھ اب رانا کی طرف سے لڑنے آرہا ہے۔ ایک اور مسلمان حلیف صلاح الدین تیس ہزار فوج سے رانا کا معاون ہوا ہے۔ اگرچہ خود چتوڑ کا راج پوتی لشکر ہی جس میں اسّی ہزار سوار اور پانچ سو جنگی ہاتھی تھے، مغلوں سے کئی گنا زیادہ تھا[۱] کثرتِ سپاہ کے علاوہ رانا کی جنگی شہرت، ہیبت کے ڈھول پیٹتی چلی آتی تھی۔ وہ بڑا سورما سپاہی، آزمودہ کار سپہ سالار مانا جاتا تھا۔ مالوے اور گجرات کے مسلمان بادشاہوں سے بارہا زور آزمائے تھے۔ کرنل ٹاڈ کے بقول، اس کے جسم پر شجاعت کی اسّی مُہریں ثبت تھیں یعنی نیزے اور کٹار کے اتنے زخموں کا نشان موجود تھا۔ ایک آنکھ، ایک ہاتھ ایک پاؤں جنگ کی دیوی کو بھینٹ چڑھا چکا تھا۔

---

[۱] اکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۳۲۳۔ تزکِ بابری میں اس کی اور حلیفوں کی فوجی تعداد دو لاکھ سے کچھ اوپر بتائی ہے۔ نیز دیکھو اکبر نامہ صفحہ ۱۰۱ فرشتہ صفحہ ۲۰۱ وغیرہ۔

رانا کے لاؤ لشکر سے مغل ڈرنے والے نہ تھے لیکن ملک میں ضرور کھلبلی پڑ گئی۔ سوئے فتنے جاگ اُٹھے اور دبے ہوئے سرکشوں نے جگہ جگہ سر اُبھارا۔ کول، سنبھل، قنوج وغیرہ کئی مقامات کے نئے قلعہ داروں کو ہٹ کر آگرے آنا، اور کہیں کہیں سمٹ کر قلعہ بند ہونا پڑا۔ ہندوستانی سپاہی اور سردار مغلوں کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے اور جیسا کہ بابر نے لکھا ہے، روزانہ بُری بُری خبریں آنے سے لشکر میں اداسی چھا گئی۔ اسی زمانے میں کابل سے ایک دستہ فوج کا آگرے آیا۔ انہی میں خاندان شاہی کا قدیم نجومی محمد شریف بھی تھا۔ اس نے حکم لگایا کہ مریخ آج کل مغرب میں ہے۔ مغرب والوں کا ساتھ دے گا۔ مغل امیروں میں کہ اکثر نجوم و رمل کے قائل تھے، ان بدفالیوں سے اور بددلی پھیلی۔ بابر نے فوجی تیاریوں کے علاوہ، اوّل تو اس جنگ کو اسلامی جہاد کا نام دیا۔ شراب خواری سے توبہ کی شراب کے قیمتی برتن تڑوا کر سونا چاندی فقیروں کو بانٹ دیا۔ غزنی سے کئی اونٹ، شراب کے بھرے مشکیزے لائے تھے۔ سب میں نمک ڈال کر سرکہ بنوایا۔ مسلمانوں سے بعض غیر شرعی محصول لئے جاتے تھے، وہ معاف کئے اور یہ شاہی منشور ہر مقام پر نشر کرائے گئے۔ پھر ایک خاص جلسہ منعقد کیا اور امیروں سرداروں کے سامنے خود بادشاہ نے تقریر کی[1]:-

"اے امیرو، اور فوجی سردارو!

؎ ہر کہ آمد بہ جہاں اہلِ فنا خواہد بود

---

[1] منقول از تزک بابری۔

آں کہ پایندہ و باقی ست خدا خواہد بود!

جس نے ماں کا پیٹ دیکھا، ایک دن ضرور قبر کا پیٹ بھرے گا۔ جو دُنیا میں آیا، ضرور دُنیا سے جائے گا۔ بدنام ہوکر جینے سے نیک نام ہوکر مرنا ہزار درجہ بہتر ہے ؎

بنام نکو گر بمیرم رواست   مرا نام باید کہ تن مرگ راست

اللہ تعالےٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا کی اور بڑی نعمت بخشی کہ (اس جنگ میں) جو مرا وہ شہید ہوا اور جس نے مارا وہ غازی کہلایا۔ سب حلف اُٹھاؤ کہ کوئی موت سے نہیں بھاگے گا اور جب تک زندہ ہے لڑائی سے منہ نہ پھیرے گا ....!"

بابر کے یہ جوش انگیز فقرے کام کر گئے۔ حاضرین اور پھر فوج کے ہر چھوٹے بڑے نے قرآن ہاتھ میں لے کر لڑنے کی قسم کھائی۔ سرفروشی کے جوش نے موت کے خوف کو پھونک مار کر اُڑا دیا۔ آگرے سے کوئی تیس میل مغرب میں دشمن کے قریب پڑاؤ پڑا۔ میدان کے قریب کنواہہ گاؤں واقع تھا جسے فارسی تاریخوں میں خانوَہ لکھا ہے اور اب تک ریاست بھرت پور کی سرحد کے اندر آباد ہے۔ اسی کے نام سے یہ جنگ موسوم اور بابر کی سپہ سالاری کی شاندار یادگار ہوئی۔ استاد علی قلی کے تفنگ اندازوں نے اور استاد مصطفےٰ رومی کی ضرب زن (توپوں) نے راج پوت تلوریوں کے دھوئیں بکھیر دئے۔ مغل سوار بڑی چستی سے دشمن کو دھکیل کر زد میں لاتے اور توپ و تفنگ کا لقمہ بنواتے رہے ہندی فوجوں کے پاس ان خوف ناک کلوں کی آتش باری کا نہ جواب

تھا نہ کوئی دفاع کی تدبیر سوجھتی تھی۔ آخر ہمت ٹوٹ گئی اور سب سے پہلے راج پوت فرار ہوئے۔" اتنی زخم کا سورما رانا سانگا اگر آگے آگے نہ تھا۔ تو بھاگنے والوں کے ساتھ ساتھ ضرور تھا.....[1]"

مغلوں کو کامل فتح حاصل ہوئی (۹۳۳ھ = ۱۵۲۷ء) اور ایک فرنگی مُبصر کی رائے ہیں، اگر بابر تعاقب کرتا چلا جاتا تو اسی ایک لڑائی میں راج پوتوں کی قوت کا خاتمہ ہوگیا تھا.....[2]"

چندیری اور مشرقی ممالک

لیکن بابر کو وقت کے وقت میوات اور دوآب کی فکر ہوئی۔ کنواہہ میں مقتول دشمنوں کے سروں سے "کلہ منار" بنوایا اور یہ چنگیزخانی سنت ادا کرکے واپس آگرے آیا۔ کئی مہینے کی محنت میں نواحی اضلاع کا انتظام درست کرکے ممالک مشرقی کی طرف لشکر بھیجا اور خود چندیری کے مستحکم قلعے پر فوج کشی کی۔ اس پہاڑی قلعے کی دوہری فصیل اتنی اونچی تھی کہ استاد قلی کی توپیں کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ مغل سپاہی کمندیں ڈال کر چڑھ گئے۔ قلعے والوں نے مایوس ہوکر بیوی بچوں کو خود مار ڈالا اور ننگے ہوکے لڑنے بلکہ مرنے آئے۔ دو تین سو، میدنی رائے حاکم قلعہ کے محل میں گھس گئے اور بابر کا بیان ہے کہ خود اپنے ساتھیوں سے اپنی گردنیں کٹوائیں؛ قلعہ فتح کرکے بابر نے مسلمان قلعہ دار کے سپرد کیا اور چندیری سے باگیں اٹھائیں

---

[1] کین، تاریخ ہند صفحہ ۹۵۔ میوات میں جو روایتیں آج تک زباں زد ہیں، اُن میں رانا سانگا کو بھاگنوں کے آگے ہونے کا الزام دیا جاتا ہے اور حسن خاں میواتی کی بہادری کے گیت گائے جاتے ہیں کہ وہ آخر تک لڑا اور اسی میدان میں مارا گیا۔

[2] لین پول: "بابر" صفحہ ۱۸۱

تو سید سے کڑے پہنچ کر آرام لیا۔ بہار کے شمال میں پٹھان سردار جمع ہو رہے تھے۔ محمود لودھی ان کا سرغنہ تھا اور اس کا بہنوئی یعنی بنگالے کا بادشاہ نصرت شاہ اپنے توپ خانے سے ان کی پشت گرمی کر رہا تھا۔ چنانچہ گاگرا اور گنگا کے سنگم پر جو لڑائی ہوئی اس میں پہلی دفعہ دونوں فریق ان آلاتِ آتشیں سے مسلح ہو کر لڑے۔ مغلوں نے لڑ کر دریا عبور کیا۔ غنیم دو دن کی لڑائی کے بعد شکست کھا کے ہٹ گیا اور خود شاہ بنگال کو اطاعت اور سالانہ پیش کش دینے کا اقرار کرنا پڑا۔ بابر کی طبیعت ناساز تھی۔ اسی کامیابی پر اکتفا کی اور آگرے واپس آیا کہ ولایت بدخشاں کی مدافعت کا انتظام کرے کیوں کہ دوری مہجوری کے باوجود دل وہیں پڑا تھا۔ پھر کئی مہینے علیل رہ کر ۹۳۷ ہجری (مطابق دسمبر ۱۵۳۰ء) میں وفات پائی۔ وصیت کے بموجب نعش کابل بھیجی گئی جہاں بابر کا مقبرہ اور باغ آج تک اہلِ شہر کی سیرگاہ ہے۔[۱]

ہمایوں کا پہلا دَور بادشاہی

بابر کی ہمت پر آفریں ہے کہ اتنی تھوڑی جمعیت سے اتنے بڑے ملک پر قبضہ جمایا اور پاکستان و ہند میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی اولاد بھی کچھ کم تعریف کی مستحق نہیں جس نے ایک کم زور بنیاد پر اتنی پُر شکوہ عمارت چنی کہ ہندوستان کی طویل تاریخ میں اس کی نظیر نہیں

---

[۱] اسی خواجہ کلاں نے جو ہندوستان کی رفاقت چھوڑ کر کابل چلا گیا تھا، بادشاہ کا مرثیہ لکھا جس کا یہ شعر خلوص کے اثر میں ڈوبا ہوا نکلا ہے: ؎

بے تو زمانہ و فلکِ بے مدار، حیف — باشد زمانہ و تو نہ باشی، ہزار حیف!

ملتی۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ملی اعتبار سے مغلوں کی فتح ایک اندرونی انقلاب کی نوعیت رکھتی ہے جیسے ترکوں سے خلجیوں نے سلطنت چھین لی یا خلجیوں کے جانشین تغلق ہو گئے تھے۔ اسی لئے بابری فتوحات کا غزنوی اور غوریوں سے مقابلہ کرنا مغالطے سے خالی نہیں۔ نہ یہ فتوحات اسلامی تاریخ میں وہ اہمیت رکھتی ہیں جو محمود کی ترک تازی اور ملوکِ معزی کی کشور کشائی کو حاصل ہے۔ فتح کی سرخ روئی انہی خوں فشانی کرنے والے ترکوں کا حصّہ تھی۔ دسویں صدی ہجری کے مغل پٹھان محض اُن کی جیتی جتائی میراث کے دعوے دار تھے اور دعوے کا فیصلہ، زمانے کے آئین کے مطابق، تلوار سے کرنا چاہتے تھے۔

فارسی مورخین، خصوصاً ابوالفضل کے مبالغہ آمیز بیان سے طالب علم دھوکے میں پڑ جاتا ہے اور گاگرا کی جنگ کو افغانوں کی آخری شکست سمجھنے لگتا ہے[1]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو اِن پٹھان امیروں میں نفاق و نفسانیت کا زور تھا اور مل کر کام کرنے کی قوت سلب ہو گئی تھی، تاہم سرفروشوں کی کمی نہ تھی اور مغلوں کا تسلط بھی سخت ناگوار تھا۔ وہ سپہ گری میں اپنے آپ کو مغل سپاہیوں سے کم نہیں سمجھتے تھے اور شیر خاں سوری نے بہت دن پہلے پیش گوئی کی تھی کہ میں تھوڑے عرصے میں مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا، حال آں کہ وہ اس وقت بابر کی فوج میں ملازم اور معمولی سردار تھا[2]۔

---

[1] مثلاً دیکھو ارسکن ص۵۰ اور لین پول ص۱۹۲ دونوں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گاگرا کے معرکے نے افغانوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

[2] دیکھو تاریخ شیر شاہی از عباس خاں سروانی (ترجمہ انگریزی) ایلیٹ ج ۴ ص۳۳۰

شیر خاں نے اپنا دعویٰ صحیح کر دکھایا لیکن ماننا پڑتا ہے کہ تدبیر سے زیادہ تقدیر نے اس کی مساعدت کی۔ بابر کا ملک پر قبضہ پوری طرح جما نہ تھا کہ بیماری نے جسم کی سلطنت کو آ دبایا اور جب وہ مرا تو کابل و پنجاب کو کامران میرزا نے ہتیا لیا۔ وہ ہمایوں کا سوتیلا بھائی اور باپ کی زندگی میں کابل کا حاکم تھا۔ بڑے بھائی کو تخت نشینی کی مبارک باد دینے کے بہانے سے پنجاب آیا اور جا بجا اپنے عمال مقرر کر دئے۔ بامروت ہمایوں نے رعایتِ برادرانہ سے کام لیا ولایت کابل کے ساتھ اقطاع پنجاب (تا ستلج) کی سندِ حکمرانی بھی اُسی کو بھجوا دی ؛ اس داد و دہش نے نئے بادشاہ کی قوت کا ایک خزانہ خالی کر دیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ ممالکِ مشرقی کے افغان امیروں کی شورش دفع کر سکے، گجرات اور مالوے میں طول طویل جنگ چھڑ گئی جس میں وہ چار پانچ سال تک اُلجھا رہا اور یہاں کی ساری کامیابیاں بھی رفیقوں کی کوتاہی اور بھائیوں کی بے وفائی سے خاک میں مل گئیں ؛

گجرات اور وسط ہند کی لڑائیاں

جب رانا سانگا کا جتھا تتر بتر ہوا تو محمود خاں لودھی بھاگ کر بہار چلا گیا لیکن کئی لودھی امیروں نے گجرات میں پناہ لی۔ ایک مغل امیرزادہ بغاوت کا ملزم تھا، وہ بھی گوالیار کے قید خانے سے فرار ہو کر اِدھر چلا آیا۔ بہادر شاہِ گجرات نے اُسے اپنا مہمان بنایا بڑی خاطر مدارات کی۔ ہمایوں نے اُسے طلب کیا تو سخت لہجے میں انکاری جواب دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ علاؤالدین لودھی کی پشت پناہی

کی۔ اس کے بیٹے تاتار خاں کو فوج دے کر آگرے پر چڑھایا جو علانیہ مغلوں سے جنگ کا اعلان تھا۔ یہ وہی علاء الدین ہے جو شروع میں بابر کو کابل سے پنجاب پر چڑھا کر لایا تھا۔ اسی مہم کے سلسلے میں مغلوں نے دلّی تک قدم بڑھائے تھے۔ ابراہیم لودھی کی جان اور بادشاہی گئی مگر علاء الدین کے ہاتھ کچھ نہ آیا بلکہ بابر نے مشتبہ ہو کر اسے بدخشاں میں نظر بند کر دیا تھا۔ اب وہ بھی کسی نہ کسی طرح مغلوں کی قید سے نکلا اور گجرات پہنچ گیا۔ بہادر شاہ کی عنایت کے چھینٹوں سے افسردہ اُمید کی کھیتی پھر ہری ہو گئی۔ اپنے فرزند تاتار خاں کو سپہ سالار بنایا اور تیس چالیس ہزار[1] پٹھان سپاہیوں کا لشکر جمع کر کے آگرے پر فوج کشی کرائی۔ تاتار خاں نے اچانک بیانہ کو جا لیا لیکن مغلوں کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکا اور اسی نواح میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ ہمایوں نے خود بہادر شاہ سے لڑنے کی ٹھانی۔ مگر جواں مردی یہ دکھائی کہ جب تک بہادر شاہ چتوڑ گڑھ کا محاصرہ کئے رہا، اس پر حملہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ بہادر شاہ نے راجپوتوں کا یہ معظم و مستحکم قلعہ فتح کر لیا۔ (رمضان ۹۴۱ھ)۔ ہمایوں سے اس کا مقابلہ منڈسور کی نواح میں ہوا۔ گجرات والوں کے پاس توپوں کی کثرت تھی۔ یہ نئے آلاتِ جنگ فرنگی تاجروں کے ذریعے گجرات پہنچے تھے۔ لیکن ابھی تک توپ چلانے میں کافی دیر لگتی تھی اور اس

---

[1] اکبر نامہ ص ۱۲۹۔ فرشتہ ص ۲۱۴۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں پٹھان سپاہیوں کی بڑی تعداد اور مغلوں سے تیغ آزمائی کا کافی جوش موجود تھا۔ لیکن ابھی قیادت اور نظم کی کمی تھی۔

کی مار غالباً دو تین میل سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ گجراتیوں نے اپنے پڑاؤ کے گرد خندقیں کھود کر توپیں لگادی تھیں مگر مغل اُن کی زد میں نہ آئے بلکہ باہر سے اُن کی ایسی ناکہ بندی کی کہ وہی مورچہ بندی گجراتیوں کا قید خانہ بن گئی۔ لشکر میں اجناس خوردنی کا قحط پڑ گیا گھوڑے اور بیل بھوکے مرنے لگے۔ سپاہی چھپ چھپ کر بھاگنے لگے۔ توپیں اپنے دمدموں میں منہ کھولے بےکار پڑی رہیں۔ بہادر شاہ کو سلامتی اسی میں نظر آئی کہ اندھیرے کی آڑ میں لشکر سے فرار ہوگیا۔ ہمایوں کو خون گرائے اور تلوار چلائے بغیر اتنی بڑی کامیابی اور بہادر شاہ کو سخت ذلّت و ناکامی نصیب ہوئی۔ یہ قطعہ اس واقعہ کی تاریخی یادگار ہے:

ہمایوں شاہ غازی آں کہ او راست
ہزاراں بندہ چوں جمشید در خور
بہ فیروزی چو آمد سوئے گجرات
مظفر گشت فخرِ آلِ تیمور
بہادر چوں ذلیل و خوار گردید
شدہ تاریخ آں " ذلِ بہادر " (= ۹۴۲ ھ)

اب مغلوں کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ مالوے کو لے کر گجرات پامال کرنے چلے اور محمود آباد (چمپانیر) کے وسیع قلعے کو گھیر لیا جو گجرات کا جنگی مرکز بلکہ پایۂ تخت تھا۔ بہادر شاہ کے نکل جانے کے باوجود ایک بڑی فوج یہاں حفاظت کو موجود تھی۔ ہمایوں نے کمال کیا کہ صرف تین سو جاں بازوں کے ساتھ فصیل میں راتوں

رات میخیں گاڑکر اوپر چڑھ گیا اور دربانوں کو مار کر پھاٹک کھول دیئے۔ قلعے کی فوج کے اکثر سپاہی مارے گئے۔ شہر پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا؛ بہادر شاہ نے پرتگیزوں کے پاس پناہ لی۔ اسی نے انھیں ڈیب کی بندرگاہ عطا کی اور وہاں آباد کرایا۔ اپنا احسان مند بنایا تھا۔ ان دغا بازوں نے اپنی فطرت کا مظاہرہ یہ کیا کہ بے یار و مددگار بادشاہ کو دھوکے سے ہلاک کردیا؛ (۹۴۳ھ)

گجرات کو مغلوں سے بچانے والا کوئی نہ رہا تھا مگر انتظام کرنے، قبضہ قائم رکھنے کے لئے ہمایوں کو اچھے قائم مقام نہ ملے۔ وہ خود کھنبائت کو کھوندتا ہوا مالوے چلا آیا اور بہت دن یہاں کی افیون آمیز ہوا میں مست، پُر فضا مناظر کا لطف اُٹھاتا رہا؛ اُدھر انہی دنوں بنگالے کے نصرت شاہ اور جون پور کے مغل صوبہ دار جنید برلاس نے وفات پائی۔ بہار میں شیرخاں سُور نے بڑی قوت بہم پہنچائی۔ ہمایوں کو مالوے سے آگرے آنا پڑا۔ گجرات، اپنے چھوٹے (علاتی) بھائی عسکری میرزا کے حوالے کر آیا تھا، وہ وہاں کا کام نہ سنبھال سکا۔ اور کچھ مغل سرداروں کی مخالفت اور کچھ گجراتیوں کی شورش سے تنگ آکر احمد آباد چھوڑ دیا، آگرے کی راہ لی۔ یہ زرخیز ملک جسے بادشاہ نے اتنی جاں فشانی اور محنت سے فتح کیا تھا، عسکری کی طفلانہ مزاجی کی بہ دولت ہاتھ سے نکل گیا؛

شیر شاہ کا خروج

مگر یہ محض اُن مصائب اور شومیوں کے آثار تھے جو عن قریب

ہمایوں کے سر پر ٹوٹنے والی تھیں۔ کیوں کہ بہار کا فرید خاں اب بنگالے کا شیر بن کر پھر رہا تھا اور جب ہمایوں ایک سال سے زیادہ مدت میں راستہ صاف کرتا ہوا بنگالے پہنچا تو شیر خاں پلٹ کر پھر بہار آیا اور شاہی راستے پر گھات لگا کر بیٹھ گیا؛

شیر شاہ کا اصلی نام فرید خاں اور یہ دعویٰ بھی بے بنیاد نہ تھا کہ اس کا "سور" قبیلہ، غوری سلاطین کی ایک شاخ ہے[۱] دہلی کے لودھی بادشاہوں کے زمانے میں اس کا دادا ابراہیم سور ہندوستان آیا اس کے بیٹے حسن نے گھوڑوں کی تجارت چھوڑ کر فوجی ملازمت اختیار کی۔ سہسرام کے ضلعے میں اسے جاگیر مل گئی تھی کہ اس زمانے کے دستور کے مطابق فوجی مصارف کی کفالت کرے۔ فرید حسن سور کا سب سے بڑا اور لائق بیٹا تھا لیکن سوتیلی ماں نے تنگ کیا اور باپ اس "ہندی باندی" کا ایسا غلام ہوا کہ فرید گھر چھوڑ کر جون پور چلا آیا اور کئی سال وہاں کے مدرسوں میں غریب طلبہ کے ساتھ عربی فارسی پڑھتا رہا۔ جوانی میں ابراہیم لودھی کے ایک درباری امیر نے اس کی پشت پناہی کی۔ موروثی جاگیر دلوائی مگر جب سلطنت دہلی کی بساط الٹی اور پٹھان امیروں نے بہار میں چند روزہ بادشاہی کی مسند بچھائی تو سوتیلے بھائیوں نے پھر اسے مجبور کیا کہ مغل صوبہ دار جنید برلاس کا سہارا لے۔ یہی زمانہ تھا کہ وہ اپنا رسالہ بھرتی کر کے بابر کی چندیری کی مہم میں شریک ہوا اور قریب سے مغل امیروں کے طور طریق دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ ایسے عیش پسند

---

[۱] تاریخ شیر شاہی۔ منتخب التواریخ ص ۳۵۶۔ فرشتہ ص ۲۲ وغیرہ۔

نفس پرور گروہ کی نئی حکومت کو اکھاڑ دینا کچھ دشوار نہیں ہے؛

واپسی پر، محمود خاں لوہانی (والئی بہار) کے دربار میں اُس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اسی پٹھان بادشاہ کے ساتھ ایک مرتبہ شکار میں شیر مارنے پر شیر خاں کا خطاب، پھر اس کے بیٹے کی اتالیقی کا عہدہ حاصل کیا۔ نصرت شاہِ بنگالہ کی وفات پر وہ ملک بھی بے وارثا سا ہو گیا تھا۔ اقتدار کی کش مکش میں شیر نے غالب حصہ لیا اور آخر میں محمود شاہ والئی بنگال کو اتنا زچ کیا کہ اس نے بھاگ کر ہمایوں کی پناہ لی اور مغلوں سے بنگالے پر چڑھائی کرائی۔ ۹۴۵ ہجری (م ۱۵۳۸ء) میں ہمایوں ایک بڑا لشکر لے کر بڑھا۔ راستے کی معمولی مزاحمت کو ہٹاتا ہوا پائے تخت گَور پہنچ گیا۔ شیر خاں نے یہاں کوئی مدافعت نہ کی بلکہ چکر دے کر بہار میں آگیا اور سرحد کی پہاڑیوں میں ایک وسیع قلعے رُہتاس کو اپنا جنگی مرکز و مامن بنایا جہاں سے بنگالے کی شاہ راہ اُس کی زد میں تھی؛[۱]

ہمایوں کی شکستیں اور اخراج

مغل بادشاہ نے گَور کو لقمۂ چرب سمجھا۔ بنگالے کے الحاق اور جزوِ سلطنت بنانے کا اعلان کیا۔ شہر کا نام بدل کر "جنت آباد" بنایا اور کئی ہفتے عیش و کام رانی کا جشن منایا۔ لیکن ادھر تو میگھ راجہ سارا ملک اپنے زیرِ نگیں یعنی تہِ آب لے آئے۔ آمد و رفت کے راستے مسدود ہو گئے، وبائی امراض کے حملوں نے صدہا جواں مردوں کو

---

[۱] ابوالفضل کا بیان ہے کہ رہتاس کا مالک ایک برہمن راجہ تھا۔ شیر خاں نے بنگالے سے واپسی پر اسے چکمہ دیا اور اس باموقع قلعے پر قبضہ کر لیا۔ (اکبر نامہ صہ ۱۵۳)

مُردوں سے بدتر کردیا اُدھر بھائیوں نے آگرے اور دوآب میں اپنی بادشاہی کے ڈول ڈالے۔ مقامی حکام اور اُمرا میں انتشار پیدا ہوگیا۔ کم سے کم اُدھر سے فوجی کمک آنے کی اُمید نہ رہی۔ شیر خاں نے بہار سے نکل کے قنوج تک، راستے کے سارے قلعوں میں اپنی فوج بٹھا دی اور ہمایوں بنگالے سے آگرے چلا تو قدم قدم پر بیار سپاہیوں کو لڑکر راستہ بنانا پڑا یہ خستہ تن، شکستہ ہمت لشکر آرے سے چند منزل آگے چلا تھا کہ شیر خاں پوری فوج کے ساتھ مقابلے میں آڈٹا۔ اور صلح کے پیام سلام کرتے کرتے دوطرف سے اُن پر آپڑا۔ مغلوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ہزاروں سپاہی گنگا میں کود پڑے کہ پار نکل جانے کے سوا سلامتی کی صورت نظر نہ آتی تھی اور تختوں کا پُل تیار نہ ہوسکا تھا۔ اس فرار و اضطرار میں بہت سے ڈوب کر مرے بہت سے پٹھانوں کی تیر باری کا شکار ہوے۔ خود ہمایوں کا گھوڑا دریا میں بہ چلا اور بادشاہ غرق ہوچلا تھا کہ ایک سقے نے جان بچائی اور اپنی مشک کے سہارے سلامتی کے کنارے لے آیا۔ یہ لڑائی اوائل سن ۹۴۶ (مطابق ۱۵۳۹ء) میں چوسہ (ضلع شاہ آباد) کے نام سے موسوم ہوئی ہے۔ ملّا عبد القادر لکھتے ہیں کہ اُستاد کا شعر ہی: ؎

یکے را براری و شاہی دہی ۔۔۔ دگر را ز شاہی بہ ماہی دہی!

شیر خاں نے اس میں حسبِ حال تصرف کیا اور بار بار اس طرح پڑھتا تھا کہ ؎

فرید حسن را تو شاہی دہی ۔۔۔ سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی!

اتنی بڑی فتح پانے کے بعد بنگال کے مغل صوبہ دار کا خاتمہ

کرنا کیا مال تھا۔ یہ خلش دور ہوگئی تو سوری سورما نے شیر شاہ کے لقب سے باضابطہ اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور فتح کے نقارے بجاتا ہوا آگرے روانہ ہوا کہ تمام ہندوستان کو مغلوں سے پاک کرے جو ایک مدت سے اس کا نصب العین تھا۔ مغل امیروں کی بد دلی اور شہزادوں کی نا اتفاقی نے پٹھانوں کو اور بھی دلیر کر دیا تھا اور اپنی تعداد اور سامان جنگ کی کمی کے باوجود[1] انھوں نے قنوج کے قریب دوبارہ مغلوں کو سخت شکست دی۔ (محرم ۹۴۷ھ = ۱۵۴۰ء) ہمایوں کے پاؤں ایسے اکھڑے کہ پھر بھارت میں کہیں نہ ٹکے۔ لاہور آکر دم لیا۔ مغل حکام اور سردار بھی ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر یہیں آنے لگے۔ شہر میں پناہ گزینوں کی وہ کثرت ہوئی کہ سر چھپانے کے لیے مکان نہ ملتا تھا[2] مگر باہمی نفاق کی بدولت یہاں بھی مقابلے کی تیاری نہ ہو سکی۔ شیر شاہ نے شکست خوردہ مغلوں کا تعاقب نہ چھوڑا اور اس کی آمد آمد کا غل غلہ سن کر مغل فوجیں کابل و کشمیر کی طرف چھٹنے لگیں۔ کامران میرزا جس نے بھائی کی مروت سے فائدہ اٹھا کر پنجاب پر قبضہ کیا تھا، کمال بے حمیتی سے اب اپنے دعوے سے دست بردار ہو کر کابل چل دیا۔ دوسرے

---

[1] مرزا حیدر دوغلات (صاحب تاریخ رشیدی) اس معرکے میں ہمایوں کے ساتھ تھا۔ اس کا بیان ہے کہ پچاس ہزار پٹھانوں کے مقابلے میں شاہی فوج کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی اور اس کے پاس سات سو چھوٹی اور اکیس بڑی توپیں تھیں۔ ان بڑی توپوں کا گولہ وزن میں تقریباً ۵ سیر اور ایک فرسخ یعنی تین میل سے زیادہ دور تک مار کر سکتا تھا (ایلیٹ ج ۵ ص ۱۳۱۔ نیز دیکھو منتخب التواریخ ص ۳۵۴)

[2] تاریخ رشیدی۔ (مرتبہ ایلیٹ ج ۵۔ ص ۱۳۲)

بھائیوں نے بھی اسی کی پیروی کی۔ میرزا حیدر نے بادشاہ کو کشمیر چلنے کی رائے دی تھی مگر وہ جنوبی سندھ کی طرف روانہ ہوا کہ وہاں کے حاکم شاہ حسین ارغون سے مدد لے کر گجرات پر حملہ کرے اور دوبارہ بھارت کے علاقے میں مقابلے کا دم بھرے۔ ارغون، ہمایوں کی سیادت تسلیم کرتا تھا مگر ملک و لشکر تسلیم کرنے پر تیار، بلکہ اپنے شہروں میں مغلوں کے داخل ہونے تک کا روادار نہ ہوا۔ مارواڑ کے راجہ نے جاں نثاری کے وعدے اور منت کے بلاوے بھیجے تھے لیکن شکستہ حال بادشاہ اس کی ریاست میں گیا، تو آنکھیں پھیر لیں۔ ہمایوں کو دوبارہ سندھ آنا اور بالآخر ملک سے مایوس نکل جانا پڑا۔ کابل میں کامران اور قندھار میں عسکری حکمراں تھے اور ہمایوں کے اُن پر اتنے احسان تھے کہ غیر بھی ہوتا تو وہ غلام ہو جاتا۔ مگر یہ ظالم برادرانِ یوسف سے بدتر ثابت ہوئے۔ سندھ و راجستان کی سرگردانی اور اسی انتہائی بے دست و پائی میں خدا نے اولاد کی دولت عطا کی، یعنی عمر کوٹ میں فرزند اکبر پیدا ہوا (رجب ۹۴۹ھ) اس جان کی راحت کو بھی نوکروں کے سپرد کرنا اور خدا کی حفاظت میں چھوڑنا پڑا۔ معدودے چند رفیقوں کے ساتھ سیستان کے راستے شاہ ایران کی پناہ لی۔ وہاں صفویوں کی شاہانہ مہمانی اور کبھی مذہبی بدگمانی کے تماشے دیکھے۔ بارے دو سال کی کوشش کاوش سے دس ہزار ایرانی قزلباش ساتھ لے کر آیا اور کئی مہینے کے محاصرے کے بعد پہلے قندھار لیا پھر کابل و بدخشاں کا

علاقہ صاف کیا۔ بے غیرت بھائی ہر دفعہ معافی مانگتے اور جب موقع پاتے پھر دغا کھیلتے تھے۔ آخر ایک مارا گیا۔ دو حج کے لئے رخصت ہوئے اور انہی ملکوں میں دنیا سے گئے۔ ہمایوں کو کابل میں استقلال حاصل ہوا اور جب سوری خاندان کا شیرازہ بکھرا تو چودہ برس بعد پھر پاکستان و بھارت آنے کی ہمت پڑی؛

باب دوازدہم

سوری خاندان اور مغلوں کا دوبارہ غلبہ

شیر شاہ

ایک غریب الوطن طالب علم، ایک معمولی سپاہی زیادہ ترقی کرتے کرتے اقتدار کے سب سے اونچے مقام تک پہنچ گیا۔ اس اعتبار سے یہ فرد فرید ہماری تاریخ میں اس سلسلۂ ذہب کی آخری کڑی ہے جس کا سرحلقہ قطب الدین ایبک تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد پھر کسی غیر شاہی خاندان کے آدمی کو تمام ہندوستان کی فرماں روائی کرنی نصیب نہ ہوئی۔ اس لحاظ سے کہ ڈوبی کشتی کو تِرایا، گری قوم کو اُٹھایا اور مغلوں کے چڑھتے دریا کو اُلٹا دھکیل دیا، وہ اور بھی قابلِ عظمت شخص تھا اگرچہ مغلوں کے طرف دار مؤرخ، اس پر ناقدری کی خاک ڈالتے رہے اور ابوالفضل نے یہاں تک لکھ دیا کہ وہ ایک "فتنہ سرشت، خداع منش" لٹیرا تھا! لیکن جنگی تنظیم اور سپہ سالاری کی بے مثل قابلیت سے قطع نظر، جب ہم اس کے ذاتی اوصاف پر

نظر ڈالتے ہیں تو فرض شناسی، ضبطِ نفس اور قوم کی خدمت گزاری میں مشکل سے کوئی مغل بادشاہ شیر شاہ کا ہم پلہ ٹھہرتا ہے۔ وہ نسلاً غوری تُرک سہی، وطنی اور لسانی اعتبار سے افغان یا روہیلا، یعنی "روہ" کا رہنے والا تھا۔ یہ علاقہ وادئ سندھ سے وزیرستان و چترال تک وسیع ہے اور اس کا بیشتر حصّہ اب پاکستان کے صوبہ سرحدی میں داخل ہے۔ یہاں والوں کو پہلی دفعہ لودھیوں نے اونچے مدارج پر پہنچایا اور پنجاب کے آگے بھارت کے علاقوں میں پھیلایا تھا۔ شیر شاہ کو قدرت نے جس نسبت سے وسیع تر سلطنت عطا کی، قوم پروری کا جذبہ بھی قوی تر عنایت کیا۔ تاریخ شیر شاہی میں لکھا ہے کہ ہر افغان زادے کو جو روہ کی پشتو میں بادشاہ سے بے تکلف بات کرسکتا تھا۔ بڑی بڑی نوکریاں اور جاگیریں مل جاتی تھیں اور "اس کے عہد حکومت میں روہ یا ہندوستان کا کوئی افغان بچہ نادار نہیں رہا بلکہ سب خوش حال ہو گئے تھے"[1]۔ یہ فیاضی اور قوم پروری مصلحت سے خالی نہ تھی کیوں کہ پہاڑوں کے پار کابل و قندھار میں دشمن مغلوں کا قبضہ تھا اور وہ پاکستان و ہند پر چڑھ دوڑنے کے برابر منصوبے باندھتے اور تیاریاں کرتے رہتے تھے۔

اندرونی حفاظت کے لیے شیر شاہ نے بڑی زبردست فوج تیار کی تھی۔ ڈیڑھ لاکھ سوار، پانچ ہزار جنگی ہاتھی کے علاوہ کئی جیوش توپ و تفنگ سے مسلح تھے۔ تاریخ شیر شاہی نے صرف تفنگ چیوں کی تعداد ۲۴ ہزار بتائی ہے جو مختلف چھاونیوں اور قلعوں میں

---

[1] ایلیٹ، ج ۴ ص ۴۲۳ (تاریخ شیر شاہی)

متعین تھے؎۱ شمال مغربی سرحد کی حفاظت طبعًا مقدم تھی۔ شیرشاہ نے لاہور و دیال پور کی چھاؤنیوں سے بہت آگے جہلم کے پار، ایک نیا قلعہ تعمیر کیا جس کی دس گز آثار کی فصیل ۱۵، ۱۶ گز بلند تھی۔ اس کا دَور ڈھائی میل اور ۶۸ برجوں سے استحکام بڑھایا تھا؎۲ بہار کے عزیز و مُبارک قلعے کے نام پر اسے "رہتاس نو" موسوم کیا اور اپنے لائق ترین سپہ سالار ہیبت خاں کو ہمایوں اعظم کا پُرمعنی خطاب دے کر یہاں کا حاکم اعلیٰ بنادیا تھا۔ پھر امدادی قلعوں کا سلسلہ شمالی پنجاب میں سیالکوٹ کے قریب مان کوٹ تک اور وہاں سے پہاڑوں پہاڑوں نگرکوٹ تک جال کی طرح بچھادیا تھا۔ اگرچہ مان کوٹ کی تکمیل شیرشاہ کے بعد سلیم شاہ کے عہد میں ہوئی اور اسے یہ چہار گوشہ حصار اتنا پسند آیا کہ لاہور کی بجائے اسی کو پنجاب کا پایۂ تخت بنانا چاہتا تھا؎۳ جنوب مغرب میں سرحدی چھاؤنی ملتان میں بنائی تھی جسے شیرشاہ نے بلوچوں سے چھین کر ہیبت خاں کی عمل داری میں شامل کردیا تھا؛

مالوے میں بعض مقامی رئیسوں امیروں سے شیرشاہ کو جنگ کرنی پڑی۔ گوالیار میں مُغل سردار بہت دن قلعہ بند ہو کے لڑتے رہے

؎۱ ایلیٹ، ج ۴ ص ۴۳۰

؎۲ دیکھو: امپی ریئل گزیٹیئر ج ۲۱ ص ۳۲۲۔ اس میں مصارفِ تعمیر کا تخمینہ چالیس لاکھ روپیہ (انگریزی) لکھا ہے۔ تاریخ داؤدی میں "آٹھ کرور پانچ لاکھ درم" درج ہیں جو اُس زمانے کے ۱۳½ لاکھ روپے دادر ہمارے زمانے کے ۶، ۷ کرور) کے برابر ہوئے؛

؎۳ دیکھو اکبرنامہ ص ۳۳۴۔ ج ۲ ص ۵ وغیرہ؛

لیکن ہمایوں بادشاہ کی واپسی کی اُمید باقی نہ رہی تو قلعہ حوالے کر دیا۔ وسط ہند میں رائے سین کے راجہ سلہڑی نے بہت سر اُٹھایا اور چندیری تک قدم بڑھایا تھا۔ اس کو بیس کر بے نشان کر دیا۔ اِدھر اپنی سرحد مانڈو قرار دی۔ بندھیاچل کے آگے جانا پسند نہ کیا۔ مغربی راج پوتانے میں مارواڑ کے راجہ مال دیو نے بڑی قوت اکٹھی کی تھی۔ اس کا راج پوتی جتھا شیر شاہ کے صرف سیاسی توڑ جوڑ سے ٹکرا کے بکھر گیا۔ البتہ ایک راج پوت سردار (کنھیا ؟) جس پر مال دیو کو سازش کا شبہ تھا، صفائی کے لئے جان پر کھیل گیا۔ اس کا سرفروش گروہ برچھے تان کر شاہی لشکر پر جھپٹا تو شیر شاہ بھی حیرت زدہ ہو گیا کہتے ہیں یہ تین چار ہزار آدمی تھے اور شانے سے شانہ ملا کر جان دینے آئے تھے۔ چنانچہ جنگی ہاتھیوں نے سب کو کچل ڈالا۔ اسلامی سپاہ کا ایک آدمی بھی ضائع نہ ہوا۔ تاہم شیر شاہ بعد میں کہا کرتا تھا کہ ہم نے (راج پوتانے، مارواڑ کے) ایک مٹھی باجرے پر دولت ہندوستان کی بازی لگا دی تھی![1] شیر شاہ کی آخری جنگی مہم قلعہ کالنجر کی فتح تھی۔ (۹۵۲ھ = ۱۵۴۵ء) لیکن محصور قلعے کے گرد دیواریں بنا کر جب یورش کی جا رہی تھی، آتش بازی کا ایک لٹو فصیل سے ٹکرا کر پلٹا اور شیر شاہ کے قریب آتش بازی کے ٹوکروں میں آ گرا۔ ان میں ایک دم آگ لگی اور بادشاہ کو سر سے پیر تک جلا دیا۔ وہ

---

[1] (اجمیر) بسا در کے ایک شاعر فیضی تخلص نے اس واقعے کی یادگار میں قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر ملا عبدالقادر نے نقل کیا ہے۔ اس میں راجہ کا نام بل دیو یا مل دیو پڑھا جاتا ہے: ؎ ناگہاں کشتِ شہی بر سر مل دیو رسید ٭ مات بود ار نشدے مہرۂ گویای لغز

اپنے خیمے میں دوڑا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس حال میں بھی جب زبان کھلتی، سپاہیوں کو للکارتا اور حملے کی ترغیب دیتا تھا۔ شام ہوتے قلعہ فتح ہونے کی خبر آئی اور الحمدللہ کے ساتھ روح پرواز کرگئی: قطعہ

شیرشاہ آں کہ از مہابتِ او ۔۔۔ شیر و بُز آب را بہم می خورد
از جہاں رفت وگفت پیرِ خرد ۔۔۔ سالِ تاریخ او : ز آتش مُرد!

لاش سہسرام میں لائے اور خاندانی ہڑواڑ میں دفن کی پھر قبر پر وہ متین وسنگین گنبد تعمیر ہوا جو سلاطین مغلیہ کے شاندار مقابر کا نقش اوّل نظر آتا ہے۔

ملکی نظم ونسق

شیرشاہ نے کم وبیش پانچ سال سلطنت کی۔ اس قلیل مدت کو دیکھیے تو جنگی کارناموں سے کہیں زیادہ لائق تعجب اس کے ملکی اور مالی انتظامات ہیں کہ تمام شمالی ہند اور پنجاب کو یکساں قوانین کے بند وبست میں ایسا کسا کہ غالبًا ظالم خلجی اور جابر تغلق کے عہد میں بھی نہ کسے گئے تھے۔ بادشاہ کی باخبری اور مستعدی کی مثال یہ کہ ایک عزیز خضر خاں سروانی کو بنگالے کا صوبہ دار بنایا تھا۔ اس کے سر میں شیخی کی ہوا اور دولت کا نشہ بھرا۔ خضر گمراہی پر مائل ہوا مگر اس وادی میں چند قدم چلنے پایا تھا کہ پنجۂ شیر نے گردن دبائی۔ خضر کو ذلت وگمنامی کی جھیل میں غوطہ دیا۔ ملک کی باگ لشکر کے صدر قاضی مُلّا فضیلت کے سپرد کی گئی۔ قاضی صاحب عدل وفضل میں اسم بامسمّٰی تھے۔ اختیارِ حاکمانہ ملا تو تعزیر وسخت گیری میں بدنام

ہوئے۔ ظریفوں میں قاضی فضیحت کہلانے لگے ؛ بہرحال، شاہی احکام کی ہر علاقے میں اس پابندی سے تعمیل ہوئی کہ زمانۂ حال کا ماہرِ سکیات اڈورڈ ٹامس، ہر گوشے میں شیر شاہی روپیہ دیکھ کر یہ یقین ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس بادشاہ کا چند ہی سال میں رعایا پر غیر معمولی اور ہمہ گیر تسلط جم گیا تھا۔[1] ہر گاؤں کی مزروعہ اراضی کی معیاری جریب سے پیمائش کرائی گئی۔ دورِ لامرکزیت کی مختلف اصلاحات اور ہر صوبے کے کثیر، تجربہ کار عمّال سے بخوبی فائدہ اُٹھایا مگر سب کو یکساں ضوابط کا پابند بنایا گیا۔ اسی لئے تاریخ شیر شاہی کا یہ دعویٰ کہ سلطنت کا ایسا بندوبست پہلے کبھی نہ ہوا تھا، بے بنیاد نہیں ہے۔ اغراضِ مال گزاری کے واسطے ممالک ہند کی "سرکاروں اور پرگنوں" میں تقسیم، اور خزانچی، شق دار، کارکن، قانون گو وغیرہ عمّال کے نام اور کام کا تعین اسی عہد شیر شاہی کی اصلاحات ہیں جنھیں ابوالفضل کی تحریروں سے دھوکا کھا کر اکثر انگریز تاریخ نویسوں نے عہد اکبری سے منسوب کر دیا ہے؛ قرائن اور واقعات گواہی دیتے ہیں کہ شیر شاہ سوری کے تصوّر میں بلبن و التمش کے زمانے کے نقشے کھنچے ہوئے تھے۔ ممالک ہندوستان پر قبضہ پانے کے بعد اس نے مال گزاری، عدالت، ڈاک، حفاظتِ راہ، اندرونی امن و انتظام، بیرونی دشمنوں سے دفاع کے جو آئین مرتب اور نافذ کئے وہ اسی دَورِ ماضی کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ یہ کہنا ذرا بھی غلط نہ ہوگا کہ قواعدِ ملک داری میں یہ رہزن پہلا اکبر و جہاں گیر کا اُستاد تھا، بابر و ہمایوں کا اصلاً شاگرد نہ تھا؛

---

[1] "کرانکلز .... کنگز" صفحہ ۴۰۳

اکبری آئین کے بیان میں شیر شاہ کی مالی اور انتظامی اصلاحات کا ذکر آئندہ اوراق میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ یہاں اس اجمالی تبصرہ کرنے سے یہ تاریخی نتیجہ نکالنا منظور ہے کہ شیر شاہ سُوری کا ہمایوں پر غلبہ پانا' ہندی مسلمانوں کی محض اتفاقی، ہنگامی کام یابی نہیں، بلکہ ایک سیاسی انقلاب کا سرآغاز ثابت ہوا۔ اسی نے ایک نئی 'باضابطہ سلطنت کی بساط بچھائی جو آئندہ مغل بادشاہوں سے انتساب اور مزید رونق و ترقی حاصل کرنے والی تھی۔ پس اکبری عہد کی سطوت و شان اور جہاں گیری دربار کے تزک و احتشام کے قصّے پڑھتے وقت ہمیں یہ نکتہ نہ بھولنا چاہیے کہ بابر و ہمایوں، بہ آں ہمہ اوصاف وقابلیت تیرہ چودہ برس کے عرصے میں وہ استقلال و انتظام نہ پیدا کرسکے تھے جو سہسرام کے ایک افغانی ترک سپاہی زادے نے پانچ سال کے اندر قائم کر دکھایا۔ دوسرے یہ کہ اقبال مند اکبر کی آئندہ شہرت و کام یابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ وہ دَور لامرکزیت کے لودھیوں کے بعد نہیں آیا، بلکہ "تجدیدِ شہنشاہی" کے شیر شاہی سلاطین کا جانشین ہوا +

سلیم شاہ سوری

شیر شاہ کے ناگہانی انتقال کے وقت بڑا بیٹا عادل جو ذرا کاہل تھا، رن تھنبور میں زیادہ دُور تھا۔ چھوٹا، جلال خاں نزدیک تر تھا۔ پٹھان امیروں نے اسی کو بُلاکر تخت پر بٹھایا۔ اوّل اوّل بڑے بھائی نے بھی اس کی بادشاہی تسلیم کرلی تھی بعد میں اختلاف ہوا اور وہ اپنے رفیقوں سمیت جبرًا و قہرًا راستے سے ہٹا دیا

گیا۔ جلال نے اسلام شاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ عرف عام نے سلیم شاہ کر دیا۔ مستعدی اور انتظامی قابلیت میں بے شک وہ باپ کا سچا جانشین تھا۔ ایک دن دلی میں حکیم جونکیں لگا رہے تھے کہ شاہی ہرکارے نے اطلاع دی کہ ہمایوں بادشاہ کابل سے چلا اور دریائے سندھ کے پار اتر آیا ہے۔ سلیم شاہ اسی حال میں کھڑا ہو گیا اور لشکر لے کر لاہور کی طرف چل پڑا۔ مغلوں کو جہلم تک آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُلٹے پاؤں واپس گئے۔ سلیم شاہ نے باپ کے آئین و انتظام قائم رکھے۔ سرکاری ضوابط کی ایک خاص بڑی کتاب مرتب کرائی جو ہر ضلع (یا سرکار) میں جمعے کے دن تمام حکام و عمائد کو پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ جب حکومت کا نشہ چڑھا اور اقتدار کی شراب نے بدمست کیا تو قاعدہ بنایا کہ جمعے کے ان جلسوں میں ایک بلند چبوترے پر کرسی بچھاتے اس پر سلیم شاہی جوتی رکھی جاتی اور جملہ حاضرین اسی جوتی کو آداب بجالاتے تھے۔ مُلّا عبدالقادر جنھوں نے لڑکپن میں ایک ایسا جلسہ دیکھا تھا، لکھتے ہیں کہ آخر میں اس بادشاہ کے (شاید ڈھیٹ) پھوڑا نکل آیا تھا جس نے سخت تکلیف دی اس بے قراری میں بار بار کہتا تھا کہ میں خدا کو اتنا زبردست نہ جانتا تھا![1]

سلیم نے بہت سے قلعوں کی ترمیم کی۔ گور سے رہتاس تک عالی حوصلہ باپ نے ایک بڑی سڑک اور دو دو کوس پر سرائیں بنوا دی تھیں۔ سلیم نے ان کی تعداد دُگنی کرا دی۔ ہر مذہب

---

[1] منتخب التواریخ ص ۳۸۳ و ۳۸۴

وقت کے مسافروں کو ٹھیرانے. محتاجوں کو سرکاری طور پر کھانا کھلانے کا انتظام کیا۔ اس کی رعایا پروری، داد رسی میں شک نہیں مگر حکام و عمال کے ساتھ بڑی سختی کرتا تھا۔ اسی لاہور کی طرف کوچ کے موقع پر سرداروں نے عرض کیا کہ توپ خانہ موجود ہے مگر بہت سی بیل گاڑیاں گوالیار میں چھوٹ گئی ہیں۔ بادشاہ نے کہا یہ ہزاروں پیادہ سپاہی مفت کی تنخواہیں کھاتے ہیں، انھیں چھکڑوں میں جوت دیا جائے چنانچہ بیلوں کی بجائے ان غریبوں نے توپیں کھینچ کھینچ کر لاہور پہنچائیں اور اس شعر کے مصداق بنے کہ ؎

ایں کہ تو بینی نہ ہمہ مردم اند   بیشترے گاؤ و خرِ بے دُم اند!

اس کی روز افزوں رعونت اور سختی کے اور بھی قصے تاریخوں میں درج ہیں جن سے پٹھان امیر بہت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ کئی سازشیں، بغاوتیں ہوئیں۔ بادشاہ پر قاتلانہ حملے کئے گئے۔ ان میں کامیابی نہ ہوئی۔ سلیم شاہ نے اہل سازش کو سخت سزائیں دیں اور پٹھانوں سے نہایت بدگمان بلکہ دشمن ہو گیا۔ کہتے ہیں کسی امیر کی امارت، آبرو دار کی آبرو بادشاہ کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہی۔ اکثر امرائے کبار خاک و خون میں سرنگوں ہوئے۔ ادنیٰ درجے کے لوگ خوشامد کی سیڑھیاں لگاکر اونچے اونچے عہدوں پر جا چڑھے دربار میں نئی نئی فرقہ بندیاں، نااتفاقیاں پیدا ہونے لگیں حتیٰ کہ ۹۶۱ ہجری (مطابق ۱۵۵۴ء) میں اسلام شاہ کا انتقال ہوا[1] تو گویا افغانی قوت کا قصر ہی گر پڑا۔ جگہ جگہ بادشاہی کے مدعی خروج کرنے

---

[1] اسی سال محمود شاہ گجرات اور نظام الملک شاہ احمد نگر نے وفات پائی (بقیہ ص ۴۱۹ پر)

اور آپس میں لڑنے لگے۔ شیر شاہ نے شمال مغرب کی سرحد پر مستحکم قلعوں کا زنجیرا بنایا تھا۔ مگر جب محافظ و پاسبان ہی نہ رہے تو اینٹ پتھر کی خالی عمارتیں کیا حفاظت کرتیں۔ ہمایوں مختصر فوج لے کر چلا اور معمولی آویزش کے بعد قلعہ رہتاس پر قابض ہو گیا (۹۶۲ھ) پنجاب کا افغان صوبہ دار احمد خاں خانہ جنگی میں حصہ لینے اور بادشاہی پر ہاتھ مارنے کے لیے ساری فوج کے ساتھ دہلی چلا گیا تھا۔ مغلوں نے بڑھ کر لاہور پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا؛

پانی پت کی دوسری جنگ

دہلی میں اسلام شاہ کے بیٹے کو اس کے ماموں نے قتل کر دیا اور بے حیائی سے عادل شاہ کا لقب اختیار کیا تھا۔ عوام نے عدلی، پھر "اندھلی" بنا دیا۔ بہار و دوآب کے امیر اُمرا منحرف ہو گئے۔ عادل اُن سے لڑنے اُدھر گیا تھا کہ آگرے میں ایک اور مدعی آدھمکا۔ یہ عادل کا بہنوئی ابراہیم سُوری تھا۔ ابراہیم کا سر خود اسی کے ہم زلف احمد خاں نے توڑا اور سکندر شاہ سُوری کے لقب سے چند روز دارائی کی۔ وہ بڑے ساز و یراق اور شاہانہ طُمطراق کے ساتھ مغلوں سے لڑنے گیا تھا مگر سرہند کے میدان میں پیٹھ دکھائی اور پنجاب کے پہاڑوں میں مُنہ چھپایا۔ دہلی آگرے میں دوبارہ مغلوں کی نوبت بجنے لگی۔ ایک فوج سکندر کے تعاقب میں پنجاب بھیجی گئی۔ شہزادہ اکبر بھی اس لشکرکشی میں سپہ سالار بیرم خاں

(بقیہ ص۴۱۸) میر نعمت اللہ رشوقی نے قطعۂ تاریخ کہا جس کا آخری شعر مشہور ہے:

زمن تاریخ فوتِ ایں سہ خسرو ؛ چہ می پرسی "زوالِ خسرواں" بود

کے ساتھ تھا کہ دہلی میں ہمایوں بادشاہ نے زینے سے گر کر وفات پائی

ع۔ "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد"

اس حادثے کی مشہور تاریخ ہے (۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۶ء) اکبر کی تاج پوشی منزل کلانور (ضلع گورداس پور) میں ہوئی۔ بیرم خاں اتالیق اور وکیل سلطنت مقرر ہوا کیوں کہ نوعمر بادشاہ ابھی پورے چودہ سال کا بھی نہیں تھا؛

مغلوں نے سکندر کو دھکے دے کر مان کوٹ میں قلعہ بند کر دیا تھا یکایک عادل شاہ کے وزیر ہیمو کے دوآب سے سر نکالنے کی خبر پہنچی۔ دہلی کے مغل حاکم تردی بیگ نے اس بنئے کے ہاتھ سے مار کھائی اور آگرہ دہلی چھوڑ کر ستلج کے کنارے پسپا ہوا۔ بیرم خاں کو ایسی غیرت آئی کہ تردی بیگ کو موت کی سزا دی اور سکندر کا پیچھا چھوڑ کر ہیمو کا سامنا کرنے روانہ ہوا۔ کہتے ہیں دلی کی فتح سے یہ بقال اتنا پھول گیا تھا کہ اپنے لئے "راجہ بکرماجیت" کا خطاب تجویز کیا اور چھچھوری حرکتوں سے پٹھان سپاہیوں کو بے زار و بددل کر دیا مغلوں سے فیصلہ کن لڑائی بھی پانی پت کے میدان میں ہوئی جہاں بابر نے ہندوستان کی بازی جیتی تھی۔ ہیمو توپ و تفنگ کے علاوہ حلقہ

سلہ ہیمو ریواڑی (نواح دہلی) کا ایک بدصورت، ڈھوسر ذات کا بنیا تھا ابوالفضل اور دوسرے مسلمان مورخوں نے اس پر تذلیل و ملامت کے تیر چلائے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ اسلام شاہ کے آخری ایام میں جب کہ خاندانی امیر مارے اور نکالے جا رہے تھے، بادشاہ کا مصاحب خاص بنا تھا۔ لیکن داد دینی چاہیئے کہ بقال کی گدی سے اٹھ کر سرداری کی عماری میں بیٹھا تو بنیوں کی بزدلی بھی دکان کے طاق میں رکھی اور دلاوری کے ہتیار لے کر کئی معرکے لڑا؛

درحلقہ ہاتھی لے کر آیا تھا۔ ان پر اُزبک سوار اس طرح آگرے جیسے بھڑیں لپٹ جاتی ہیں۔ اُن کی تیز پائی اور تیر اندازی نے ہندی لشکر میں ہل چل ڈال دی۔ ہیمو زخم کھا کے بیہوش ہوا۔ زخمی ہاتھی اپنے لشکر پر پلٹ پڑے۔ مذبذب سپاہی جدھر منہ اُٹھا بھاگے۔ بکرماجیت ثانی کی شان شوکت کا طلسم چند گھنٹے میں ٹوٹ گیا۔ افغان سپہ سالار شادی خاں میدان میں کھیت رہا۔ ہیمو کو مغل سپاہی باندھ لائے۔ بنئنی یعنی ہیمو کی بیوی خزانہ ہاتھیوں پر لاد کر بھاگی تھی۔ وہ گنواروں نے لوٹا اور بہت سا بکھر کر جنگلوں میں ضائع ہو گیا؛ محرم ۹۶۴ھ (مطابق ۱۵۵۶ء) میں ہیمو دھوسر کا سر صدقے اُتار کر مغل فاتح پھر دہلی میں داخل ہوئے لیکن پانی پت کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہی معرکہ ہندی افغانوں کی سلطنت کا خاتمہ ثابت ہوا۔ خاندان تیموری کی بادشاہی از سر نو مسلم و مستحکم ہو گئی؛

عہد اکبری کا آغاز

بیرم خاں نے چار برس بادشاہ کی اتالیقی کی۔ جون پور تک دوآب کو پٹھانوں سے صاف کر دیا۔ مالوے میں وہاں کا موروثی حاکم باز بہادر خود مختار ہو گیا تھا اور سارنگ پور میں دن رات سارنگی ستار، گانے بجانے میں محو رہتا تھا۔ اس مقام کے کھنڈر (ریاست دیواس میں) ابھی تک عیش و طرب کے متوالوں کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ مغلوں نے باز کا آشیانہ اُجاڑ دیا مگر پوری طرح بادشاہی انتظام کے جمانے میں دیر لگی۔ کیوں کہ مرکز میں ایک با اثر جماعت اتالیق سلطنت کی جڑیں اکھاڑنے میں مصروف تھی اور وہ تنگ آکر جنگ پر آمادہ

ہوا تو ساری فوج اسے گھیرنے کے لیے سمٹنی پڑی۔ بیرم خاں نے سرِ اطاعت خم کر دیا مگر ذلت کی زندگی پر ہجرت کو ترجیح دی اور حجاز کے ارادے سے گجرات جا رہا تھا کہ راستے میں خونیوں نے ثواب حج کے ساتھ شہادت کو اُس کی زادِ آخرت بنایا۔ ع "شہید شد محمد بیرام" تاریخ وفات ہے ؎ وہ سازشی مشیر جو بیرم خاں کی معزولی کا باعث ہوئے تھے، اس انقلاب سے زیادہ دن تمتع نہ حاصل کر سکے بلکہ دو سال کے اندر باہمی عداوت اور قتل و علالت نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ تب نوجوان اکبر کو صحیح معنی میں بادشاہی کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھانا اور بعض سرکش امیروں کو جبرًا قابو میں لانا پڑا۔ یہ اُزبک سردار تھے جو اس مرتبہ بڑی تعداد میں مغلوں کے ہمراہ ہندوستان آئے اور حق یہ ہے کہ بڑی جواں مردی، جاں فشانی سے مغل حکومت قائم کرنے میں حصہ لیا تھا۔ زیرِ نظر سنین میں مشرق کی سرحدی چھاونیوں میں اسی جنگ جو قوم کے سردار و سپاہی مقرر اور بہار و بنگال کے افغانی امیروں سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ اسی طرح مالوے میں عبداللہ خاں اُزبک ہی کی شمشیر و تیر نے باز بہادر کو دوبارہ اُڑایا اور اکبری پرچم لہرایا تھا ؎ ازبکوں کی شورش کا آغاز اسی عبداللہ خاں سے ہوا۔ الزام یہ تھا کہ مالوے کا مالِ غنیمت آگرے بھیجنے میں لیت و لعل کرتا ہے۔ اکبر نے باز پرس کا نیا طریقہ نکالا کہ بندھیل کھنڈ کی طرف شکار کھیلتے کھیلتے اچانک مالوے میں داخل ہوا۔ عبداللہ خاں یہ سن کر ایسا گھبرایا کہ شاہی ملازمت کو خیرباد کہی اور گجرات چل دیا؎

فوجی حلقوں میں افواہ پھیل گئی کہ بادشاہ نے مغلوں کے پرانے دشمن (ازبکوں) کے استیصال پر کمر باندھی ہے۔ لہٰذا وہ بھی جگہ جگہ لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ تین سال تک بغاوت کی آگ رہ رہ کر بھڑکتی رہی اور اُن کے نامی گرامی سرگروہ صوبہ دار خان زماں خاں کے خون ہی سے فرو ہوئی۔ (۹۷۲ تا ۹۷۴ ہجری مطابق ۱۵۶۶ء) اس دوران میں اکبر کے چھوٹے بھائی عبدالحکیم نے کابُل سے نکل کر پاکستان پر چھاپا مارا تھا مگر کچھ نہ بگاڑ سکا اور اکبر کے آنے کی خبر سُنتے ہی لاہور کا محاصرہ چھوڑ کر اُلٹے پاؤں چلا گیا۔[1]

راج پوتوں سے تعلقات اور فتوحات راج پوتانہ

ممالک ہند میں جنگ و سپاہ گری راج پوت قوم کا پیشہ تھی۔ مسلمان حملہ آوروں نے شروع سے ان کی چال بازی کے تماشے دیکھے، شمشیر زنی کے مزے پائے تھے۔ مگر بادشاہ پرستی اور وفاداری جو ان کی فطرت کے جوہر تھے، ان دفینوں کا اکبر سے پہلے کسی کو بھید نہ کھلا تھا۔ ممکن ہے پچھلی چار صدی کی پیہم تیغ آزمائیوں اور بار بار

---

[1] میرزا عبدالحکیم اکبر کا سوتیلا بھائی تھا۔ ہمایوں کابُل سے دوبارہ لاہور و دہلی کی طرف چلا تو وہاں کی حکومت اس بچے کے نام لکھ دی اور ماں کو اتالیق مقرر کیا۔ ۹۷۳ ہجری میں اس کا دارالحکومت ایک مغل رشتہ دار میرزا سلیمان والئ بدخشاں نے دھوکے سے ہتیا لیا تھا۔ وہ برادر اکبر سے مدد کے لئے پاکستان آیا۔ یہاں بعض اہل غرض نے جنگ پر چڑھایا اور لاہور پر چڑھا لائے۔ بارے سلیمان مرزا کابل سے چلا گیا۔ عبدالحکیم کو دوبارہ یہ شہر مل گیا۔ اکبر سے معافی مانگی اور پھر تا زندگی انحراف نہ کیا۔ اس کے انتقال کے بعد ہی صوبہ کابل سلطنت مغلیہ کا جزبنا (۹۹۴ھ) اور پھر محمد شاہ کے زمانے تک یہاں مغل بادشاہوں کے صوبہ دار مقرر ہوتے رہے۔

کی لڑائیوں نے راج پوتوں کو مسلمانوں کی جواں مردی کا قائل اور سپاہی کو سپاہی کی طرف مائل کر دیا ہو۔ اور اس میلان سے بھی جوہر شناس اکبر نے فائدہ اٹھایا ہو۔ بہرتقدیر، آغازِ بادشاہی میں ہی نئی حکمت عملی کا آغاز ہوا۔ آمبیر (جے پور) کے راجہ بہارامل نے خود تحریک کی اور اکبر نے خوشی سے اس کی بیٹی سے شادی کی (۹۶۹ ہجری = ۱۵۶۲ء) اور وہی آئندہ وارثِ سلطنت یعنی جہاں گیر کی ماں بنی۔ راجہ کا فرزند بھگوان داس اکبری اُمرا میں شامل ہوگیا اور بڑے بڑے معرکوں میں شریک رہا۔ پھر اس کے بھتیجے مان سنگھ نے راج پوتی بہادری اور آقا پرستی کے ایسے نقش جمائے کہ آخر تک مغل بادشاہوں کے دل سے نہ مٹے۔ مذہبی اختلافات کے باوجود، جنگ کی رفاقتوں نے راج پوت اور مغل سپاہیوں کو ایک دوسرے سے اتنا مربوط کر دیا کہ شاید دو غیر قوموں میں ایسی یک دلی یک جہتی کی کہیں مثال نہ ملے گی ۔ اُدھر اکبر نے اُن کی رعایت سے جزیہ موقوف اور ہندو جاتریوں پر جو کریں لگی تھیں، منسوخ کر دیں۔ آہستہ آہستہ بہت سی ہندووانی رسموں کو رواج دیا۔ گائے کے گوشت، اور لہسن پیاز کا محل سرا میں قدغن ہوا اور آگے چل کر علانیہ گاؤکشی کرنے کی ممانعت کر دی ۔

راج پوتانہ، مالوہ، وسطِ ہند کی یورشوں اور اجمیر شریف کے طوافوں میں سبھی بڑے راجہ اکبر کی سلامی کو آتے اور اطاعت کے نذرانے چڑھاتے رہے مگر چتوڑ کا رانا اپنے مقام سے ہل کر نہ آیا۔

اس خاندان کو بھاٹوں نے بہت بانس پر چڑھایا اور پنڈتوں نے خدا معلوم کون کون سے بنسیوں سے شجرہ ملایا تھا۔ حالیہ تحقیقات نے سارے پول کھول دئے ثابت ہوا کہ رام چندرجی کے اولاد احفاد میں ہونا ایک طرف، نسل بھی آریہ نہیں۔ غالباً تاتاری ہونوں کی شاخ سے ہیں[1] تاہم ان کا عزور مدت سے مشہور تھا۔ اکبر نے فیصلہ کیا کہ چتوڑ کی گردن توڑے۔ خود فوج لےکر گیا۔ رانا (اودے سنگھ) نے خلافِ توقع بزدلی دکھائی۔ جنگلوں، پہاڑوں میں جا چھپا لیکن ایک جیوٹ عزیز جے مل نامی نے قلعہ بند ہوکر خوب مقابلہ کیا۔ آس پاس کے علاقے تاراج کرڈالے تھے کہ شاہی لشکر کو رسد میسّر نہ آئے قلعے میں آٹھ ہزار چیدہ سپاہی، کھانے پینے کا وافر سامان اور دفاعی ہتیاروں کے ذخیرے بھر لئے تھے۔ اکبر جیسا ہٹیلا بادشاہ ان مشکلات کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ ناکہ بندی کے ساتھ صدہا نجّار و سنگ تراش کی مدد سے مضبوط ساباط (یعنی پردے کی دیواریں) بنوائیں انھیں اوپر سے پاٹتے جاتے تھے۔ قریب پہنچ کر زمین کے نیچے ہی نیچے نقب لگائی اور دو برجوں کی بنیادوں میں بارود بچھاکر بتی دکھائی کہ ہولناک دھماکے سے پہلے ایک بُرج پاسبانوں سمیت اُڑا۔ بادشاہی سپاہی بےصبری سے دوڑے۔ اتنے میں دوسری سرنگ نے دوسرا بُرج اُڑا دیا۔ اس میں قلعہ والوں سے زیادہ حملہ آور ہلاک

---

[1] ٹاڈ نے بھی راج پوتانے کے ممتاز ترین خاندانوں کو "سیدی" (یعنی تاتاری) نسل سے لکھا ہے لیکن اودے پور کے گھیلوٹ راج پوتوں کے دعاوی کا بھانڈا ڈی آر بھنڈار کر نے خوب پھوڑا ہے۔ دیکھو اوکس فورڈ ہسٹری ص۱۷۳۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوے۔ محصوروں نے جس طرح بن پڑا ان رخنوں کو بھرا۔ تیر و تفنگ، اینٹ پتھر، آگ اور جلتے تیل سے یورش کو روک لیا۔ یہ معرکے کئی مہینے جاری رہے۔ یہاں تک کہ خود جے مل جو مورچے دیکھتا بھالتا پھرتا تھا، ایک رات قضا کی گولی کا نشانہ بنا۔ محصوروں کے جی چھوٹ گئے۔ عورتوں کو سپردِ آتش کیا اور خود لڑکر مارے گئے۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے قلعے میں گھس کر قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ قریب تیس ہزار آدمی قتل یا قید ہوئے[1] (شعبان ۹۷۵ھ م ۱۵۶۷ء)

ریاست میواڑ ضبط اور صوبۂ اجمیر کی ایک سرکار قرار دی گئی۔ شاہی عامل مقرر ہوے۔ تاہم رانا اور اس کے من چلے راج پوت برابر مغل صوبہ داروں سے قزاقانہ جنگ کرتے رہے۔ مگر مغلوں کے مقابلے میں یہ مایوسانہ جدوجہد کام یاب نہ ہوسکتی تھی آخر جہاں گیر کے عہد میں رانا امرسنگھ نے سرِ اطاعت جھکایا، باج گزاری کا اقرار کیا تب اس کی خاندانی ریاست واگزاشت ہوئی۔

خود اکبر کو چتوڑ کے بعد، راج پوتوں کے بچے کھچے آزادی کے گڑھ فتح کرنے میں زیادہ زحمت نہ پیش آئی۔ اگلے سال رن تھنبور کا مشہور قلعہ شاہی توپوں کی مار نہ سہ سکا۔ چند گولے راجہ کے محل پر پڑے تھے کہ وہ گھبرا کر نکل آیا۔ اطاعت قبول کرلی۔ رن تھنبور

---

[1] اکبرنامہ۔ ج ۲ ص ۳۲۳۔ لکھتا ہے کہ علاءالدین خلجی کے زمانے میں یہاں کی رعایا نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ قلعہ فتح ہوا تو عام شہری امین رہے۔ لیکن اس محاصرے میں یہ سب لوگ شریکِ جنگ تھے اس لئے انھیں امان نہیں دی گئی۔ ملا عبدالقادر نے مقتولوں کی تعداد آٹھ ہزار بتائی ہے (ص ۱۲۶) فرشتہ نے دس ہزار (ص ۲۵۸)

کی داستانِ شہرت ہی جدید آلاتِ حرب کے سامنے قصۂ پارینہ ہوگئی؛

دوسری فتوحات

غیرمسلموں سے اکبر کے یہی چند معرکے پڑے۔ باقی فتوحات اُسے مسلمان ملوک و امرا کے مقابلے میں حاصل ہوئیں۔ اِن کی ملّی اہمیت زیادہ نہیں ہو لیکن سیاسی اعتبار سے ممالک ہند کا ایک مرکزی حکومت سے وابستہ ہو جانا، مسلمانوں کے حال و مستقبل پر اثر انداز ہوے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہ اثرات اس لئے اور بھی دیرپا، گہرے اور ہمہ گیر تھے کہ بادشاہی ایک ہی (تیموری) خاندان کی میراث بنی رہی۔ غرض، لازم ہو کہ پہلے ان فتوحات کا مختصر تذکرہ کیا جائے پھر اکبری عہد کے آئین و قوانین کی کیفیت سناکر چند مشاہیر و اکابر کے مرقعے پیش کئے جائیں جو اُس دورِ گذشتہ کے ستارے اور اُس فصلِ رفتہ کے گلِ سرسبد تھے؛

۱۔ **گجرات**۔ راج پوتانے کی فتح کے ساتھ گجرات کا راستہ کھل گیا۔ اس کی بادشاہی کا دعویٰ ہمایوں کی شجاعت قائم کرچکی تھی۔ یہ بادشاہ گردش میں آیا تو گجرات میں کچھ عرصے تک انتشار رہا۔ پھر محمود ثالث نے دوبارہ سلطنت کی مرمت کی۔ اٹھارہ سال کی حکومت میں امن و انتظام کی بوسیدہ عمارت نئی کردکھائی پرتگیز غارت گروں نے بحرِ ہند میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ دو دفعہ حکّام کو غافل پاکر بندرگاہ سورت میں گھس آے اور آگ لگاکر ہوا ہو گئے تھے۔ محمود نے ان کا حتی الامکان سدباب کیا۔ سورت کی حفاظت کے لئے "شاہ قلعہ" بنایا (۹۴۷ھ) جس کے قطعۂ تاریخ

میں تعمیر کی غرض بتائی گئی ہے:-

سدِ اسکندر بود بر روے یاجوجِ فرنگ
کامدہ از غیب و دارد برلب ایں بحر جائے
ایں ندا آمد زغیب از بہر تاریخش بہ گوش
سد بود برسینہ و جانِ فرنگی ایں بنائے![1]

محمود کے لاولد فوت ہونے سے پھر ملک پر لاوارثی چھا گئی۔ جابجا سرکش امیروں نے خود مختاری کے جھنڈے بلند کئے۔ آخر وہاں کے وزیر اعتماد خاں نے اصلاحِ حال سے مایوس ہو کر اکبر بادشاہ کو خود بلایا اور گجرات کا نام نہاد بادشاہ مظفر شاہ ثالث بھی امرائے اکبری میں منسلک کرلیا گیا۔ (۹۸۰ھ = ۷۳-۱۵۷۲ء) نو برس بعد مظفر نے ایک دفعہ اور گجرات آکر تقدیر آزمائی اور دو سال تک ہنگامہ مچاتا رہا۔ انجامِ کار گرفتار ہوا اور خود گلا کاٹ کر قیدِ حیات سے نجات پائی۔ گجرات پہلے ہی اکبری صوبہ بنا لیا گیا تھا؛

۳۔ بنگالہ۔ گجرات سے کہیں زیادہ سخت مقابلہ بنگال نے کیا جہاں سوریوں کے بعد کررانی پٹھان پہاڑ کی طرح جم گئے تھے۔ ان میں سلیمان کررانی بڑا نامدار ہوا ہے کہ دیو نما افغان، پتلیوں کی طرح اشارے پر دوڑتے تھے۔ مغلوں کی طرف سے ممالکِ مشرقی کی ولایت خان خاناں منعم خاں کے سپرد ہوئی تھی۔ وہ جنگ کی بازی میں جیسا ماہر تھا، ویسا ہی سیاست کے میدان کا شاطر تھا۔ سلیمان کو ایسا شیشے میں اتارا کہ اس نے مغلوں کی سیادت مان لی۔ اڑیسہ

---

[1] فرشتہ۔ ج ۲ ص ۲۲۷۔ نیز دیکھو گزیٹیر۔ ج ۲۳ ص ۱۵۲۔

اور کوچ بہار کی فتوحات اور شاہانہ شان و شوکت کے باوجود علانیہ تخت نشینی سے باز رہا۔ لیکن ۹۸۱ ہجری میں اُس نے وفات پائی تو پہلے ایک، پھر دوسرا بیٹا (داؤد) جانشین ہوا اور اُس نے ڈنکے کی چوٹ اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ریاض السلاطین میں لکھا ہے کہ اس وقت بنگال کی فوج میں چالیس ہزار سوار، تین ہزار تین سو ہاتھی، ایک لاکھ سے زیادہ تفنگ چی، برق انداز، اور چھوٹی بڑی بیس ہزار توپیں تھیں[1] کہ غالباً اتنی اکبر کے پاس نہ ہوں گی۔ ایسے حریف کو ابوالفضل کا "بد معاشانِ فتنہ شعار" کے حقارت آمیز القاب سے یاد کرنا[2]، تاریخ کا منہ چڑانا اور اخلاق کی مٹی پلید کرنا ہے، البتہ داؤد نوجوان اور ناتجربہ کار بادشاہ تھا۔ پٹھان امیروں کو نفاق و شقاق کے گڑھوں سے نکال کر کسی مشترک، بڑے مقصد کے راستے پر لے چلنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ مقابلہ منعم خاں جیسے گرگ باران دیدہ سے پڑا۔ داؤد بہار آیا تھا پھر خود ہی ہٹ کر پٹنے میں قلعہ بند ہو گیا۔ منعم خاں نے بغیر لڑے فتح کی دولت کمائی پھر بادشاہ کو لکھا کہ قلعہ جلد سر کرنے کے لئے جنگی کشتیاں اور آپ کے قدموں کی برکت درکار ہے۔ چنانچہ اکبر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ بیڑا بنا کے چلا۔ اسی سفر میں گنگا جمنا کے سنگم پر پریاگ میں الہ آباد کے نام سے نیا قلعہ بنانے کا حکم دیا، پٹنے پر خود بادشاہ کے زیر نگرانی سخت معرکہ ہوا۔ (۹۸۲ھ = ۱۵۷۵ء) داؤد کثیر نقصان اٹھا کر بھاگا اور پھر مغل سپہ سالار منعم خاں کے سامنے کہیں نہ ٹھیرا۔ اکبر یہ مشرقی ممالک

---

[1] صفحہ ۱۰۰۔ [2] اکبر نامہ۔ ج ۳ ص ۴۲

منعم کے حوالے کرکے واپس چلا گیا تھا مگر منعم خاں نے دوسرے سال وفات پائی تو داؤد نے پھر ہاتھ پاؤں نکالے۔ آخر نئے ناظم بنگالہ حسین قلی خاں سے لڑکر گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ (۹۸۴ھ = ۷۶-۱۵۷۶ء)
داود کے قتل سے، بقول صاحب ریاض السلاطین: ؎

شدہ تخت شاہی ز شاہان تہی — ز بنگالہ شد ختم نام شہی۔

تاہم اکثر افغان بہار اور اڑیسے کے دشوار گزار گوشوں میں برابر اڑتے اور لڑتے رہے۔ انہی میں ایک سرفروش سردار عثمان خاں نامی کا ایسا زور بندھا کہ پچیس برس، یعنی اکبر کے انتقال تک مغل حکام کے قابو میں نہ آیا۔ آخر جہاں گیر کے عہد میں صوبہ دار اسلام خاں نے ایک من چلے سردار شجاعت خاں کو مقابلے کے لئے چھانٹا۔ عثمان شیروں کی طرح لڑا ادھر شجاعت، مست ہاتھی کے سامنے سے بھی نہ ہٹتا تھا اسی حیرت انگیز دلاوری پر بادشاہ سے "رستم زماں" کا خطاب پایا اور قضاؤ قدر نے بھی اسی کو جتایا کہ عثمان خاں مہلک زخم کھا کے ہلاک ہوا اور ساتھی سرداروں نے مایوس و مضمحل ہوکر اطاعت قبول کرلی (۱۰۲۱ھ = ۱۲-۱۶۱۲ء)[1]

۳۔ **فتوحات دکن**۔ مالوے کی فتح کا ذکر اسی باب میں آچکا ہے۔ اسی ملک سے خان دیس کی حکومت فاروقیہ کی حدیں ملتی تھیں۔ یہ چھوٹی سی آزاد مملکت ہر طرف قوی تر حریفوں میں گھری ہوئی تھی اور یہ واقعہ کہ دوسو سال سے زیادہ عرصے تک

---

[1] اس قیامت خیز معرکے کے لئے دیکھو اقبال نامہ جہاں گیری صفحہ ۶۱ تا ۶۴۔ ریاض السلاطین صفحہ ۱۶۹ وغیرہ۔

چونکہ لڑتی اور اپنی آزادی کو بچاتی رہی، اہل حکومت کی شجاعت ولیاقت کا بدیہی ثبوت ہے۔ ۹۷۱ ہجری میں اکبر کا ایک مالوے آدھم کا اور صوبہ دار عبداللہ خاں نے نوکری چھوڑکر گجرات کی راہ لی تو بادشاہ کو مالوے میں ٹھیرکر ازسرِنو انتظام کرنا پڑا۔ انہی ایام میں خاندیس کے فاروقی بادشاہ میراں مبارک شاہ نے بہ طور خود اکبر کی سیادت قبول کرلی۔ بیٹی بادشاہ کی زوجیت میں اور ایک بیٹا شاہی ملازمت میں دیا لیکن اندرونی خودمختاری اور شانِ خودداری میں فرق نہ آنے دیا۔ مغلوں کو دکن آنے کی تحریک ایک مدت بعد احمدنگر کے باغی امیروں اور مفرور شہزادوں نے کی۔ راجہ علی خاں فاروقی نے ان بے وقوف غداروں کو وطن فروشی سے بہت روکا، وہ نہ رُکے۔ اکبر نے خانِ اعظم میرزا عزیز کو فوج دے کر احمدنگر پر بھیجا۔(۹۹۴ھ = ۱۵۸۶ء) اس وقت فاروقی نے علانیہ احمدنگر کا ساتھ دیا اور مغلوں کی مہم ناکام واپس گئی۔ مگر ۱۰۰۲ ہجری میں برہان شاہ (ثانی) کے انتقال پر یہ نظام شاہی ریاست دوبارہ سخت بدنظمی اور خانہ جنگی میں مبتلا ہوئی۔ راجہ علی خاں اُس کے مستقبل سے مایوس اور مغلوں کی دوسری مُہم میں ان کے ساتھ ہوگیا۔ یہ مہم شہزادہ مُراد لے کر آیا اور احمدنگر تک اسے کوئی نہ روک سکا تھا لیکن اپنے بزرگوں کا پائے تخت بچانے کے لئے وہاں کی شہزادی چاند سلطان (چاند بی بی) نے جان کی بازی لگادی اور قلعہ بند ہوکر ایسا لڑی کہ مردوں کے مُنہ پھیر دئے۔ مُراد کی اصل مُراد نہ برآئی۔ البتہ ملک برار دبالیا اور آئندہ اقدام کا مرکز مغلوں کے ہاتھ آگیا۔ (۱۰۰۴ھ)

دوسرے سال کے معرکے میں راجہ علی خاں مُراد کی رفاقت میں بھینٹ چڑھا اور اُس کے بیٹے بہادر خاں نے مغلوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ۱۰۰۸ ہجری (م ۱۵۹۹ء) میں خود اکبر نے مالوے آکر خان خاناں عبدالرحیم کو احمدنگر پر چڑھایا۔ دوسری طرف بہادر فاروقی کو اسیرگڑھ میں محصور کرلیا۔ اس مرتبہ چاند بی بی مغلوں سے دب کر صلح کرنے پر مائل تھی۔ شورہ پشت سرداروں نے اسے ہلاک کردیا مگر احمدنگر کو نہ بچا سکے۔ حملہ آوروں نے سرنگ لگاکر شہر پناہ اُڑادی۔ شہر میں گھس کر قتلِ عام کیا[۱]۔ نام نہاد بادشاہ بہادر نظام شاہ کو پکڑ لیا اور تا حیات گوالیار میں محبوس کردیا۔ نظام شاہی حکومت کی شمع گل ہوگئی اور ہر چند اُس کے پروانے برسوں تک آزادی کے لئے پر فشانی کرتے رہے، احمدنگر کے سلطنت مغلیہ میں الحاق کا رسمی اعلان و انتظام اسی سال عمل میں آگیا۔ (۱۰۰۸ ہجری = ۱۶۰۰ء)

بہادر نظام کا فاروقی ہم نام ایک سال تک محصور ہو کے لڑتا رہا۔ آخر شہر کے اندر وبا اور دل میں ایسے اوہام پیدا ہوئے کہ ہتیار ڈال دئے۔ وہ دربار کا حاشیہ نشین اور خان دیس اکبری سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا گیا۔ (۱۰۰۹ھ = ۱۶۰۱ء)

سندھ و کشمیر کے الحاق کا حال ہم نویں باب میں پڑھ چکے ہیں اب وقت ہے کہ اکبری سلطنت کے آئین و انتظام پر نظر دوڑائیں ؛

---

[۱] مورخ فرشتہ نے احمدنگر کی فتح اور قتل عام کا خاصا بھیانک نقشہ دکھایا ہے ج ۲ صفحہ ۱۶۴۔

باب سیزدہم

اکبری آئین و انتظام

اکبری عہد کے آئین، دیوانی اور فوجی محکمے، سلطنت کی انتظامی تقسیم، مال گزاری، پیداوار وغیرہ تمام ضروری موضوعات پر ابوالفضل کی مشہور کتاب "آئین اکبری" معلومات کا لازوال خزانہ اور مصنف علام کی وسعت اور جدتِ نظر، جدتِ فکر کا بے مثال آئینہ ہے۔ یہ زمانۂ حاضرہ کے "شاہی گزیٹیر" کا نقشِ اول ہے کیوں کہ ممالک ہند میں پہلے کوئی کتاب سرکاری طور پر اتنی جامعیت کے ساتھ مدوّن نہیں ہوئی تھی۔ ان سب خوبیوں کے باوصف، یاد رکھنا چاہیئے کہ مصنف اپنے بادشاہ کو بڑھانے کی خاطر دوسروں کو گھٹانے میں کمی نہیں کرتا۔ سلاطین پیشین کے فضائل اکبر کے سر منڈھتا ہے۔ سابقہ آئین و انتظام، نئے بنا کے سامنے لاتا اور کبھی کبھی پرانے نام بدل کر ناظرین کو مغالطے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی کتاب میں سب سے زیادہ تفصیل اُن کارخانوں کی ملتی ہے جن کا بادشاہ کی ذات سے تعلق تھا

ہاتھی گھوڑے، اسلحہ، لباس و طعام سے لے کر شاہی دربار، خلوت جلوت، نشست برخاست تک اکبر کی روز مرہ زندگی کی سبھی جزئیات آئین اکبری میں موجود ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں ملکی انتظامات سے بحث ہے اور اس سلسلے میں ہم سب سے اوّل منصب اور منصب دار کی اصطلاح سنتے ہیں جیسے غالباً ابوالفضل ہی نے ہندوستان میں سرکاری ملازمت اور ملازمین کے لیے رائج کیا تھا ؛

منصب اور منصب دار

خاص جدّت یہ کی تھی کہ تنخواہ کی بجائے ہر عہدہ دار کے لئے ایک فوجی جمعیت کی تعداد مقرّر کر دی جاتی تھی۔ اور اُسی جمعیت کے مطابق اُسے پنج ہزاری، سہ ہزاری، یک ہزاری، منصب دار کہتے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اتنی تعدادِ فوج کا سردار ہے یا اتنی فوج مرتب کرنا اس کا فرض ہے۔ سب سے چھوٹا منصب دار "دہ باشی" (یعنی دس سپاہی کا سردار) کہلاتا تھا اور سب سے بڑا منصب (اکبری دور میں) پنج ہزاری تھا اگرچہ شہزادوں کو اس سے بھی بڑے منصب مل جاتے تھے۔ ہر منصب کی نقد تنخواہ کی شرح الگ مقرر کی تھی۔ بہت سے منصب دار محض دیوانی خدمتیں انجام دیتے تھے نہ فوج بھرتی کرتے نہ اُسے لاکر لڑاتے۔ ان کا منصب دراصل صرف تنخواہ اور مرتبہ ظاہر کرتا تھا۔ پس زمانہ حال کی انگریزی اصطلاح میں ہم "منصب" کو "کیڈر" اور "گریڈ" دونوں کا ہم معنی کہہ سکتے ہیں ؛ اسی کے ساتھ، یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مغل حکومت بھی سابقہ اسلامی حکومتوں کی طرح فوجی نوعیت رکھتی تھی اور زیادہ تر منصب دار

وہی ہوتے تھے جو فوج کی مقررہ تعداد تیار کرتے اور طلبی کے وقت اسے لے کر شاہی لشکر میں حاضر ہو جاتے تھے۔ اس قسم کے منصب داروں کو خزانے سے جو تنخواہ ملتی تھی، اسی میں فوجی جمعیت کے مصارف اسپ و اسلحہ شامل ہوتے تھے۔ جمعیت کی تعداد سرکار مقرر کرتی تھی اور اُس کا پابندی سے معائنہ ہوتا رہتا تھا۔

تنخواہوں کا معیار بہت بلند تھا۔ اتنی بڑی تنخواہیں اُن دنوں شاید کسی اور ملک میں نہ دی جاتی ہوں گی۔ آئین اکبری کے نقشوں کو سامنے رکھ کر انگریزی مترجم بلوخ مین نے حساب لگایا ہے کہ پنج ہزاری منصب دار کو، جسے ماہانہ تیس ہزار روپیہ تنخواہ شاہی خزانے سے وصول ہوتی تھی، تقریباً بیس ہزار روپیہ فوجی مصارف میں خرچ کرنا پڑتا تھا اور دس ہزار سے کچھ زیادہ روپیہ اُس کے ذاتی خرچ کے لئے بچ جاتا تھا[1]۔ مگر مورلینڈ کے حساب سے وہ فوج پر صرف دس ہزار خرچ کرتا اور بیس ہزار اپنے لئے بچا لیتا تھا[2]۔ ہم بلوخ مین کا تخمینہ صحیح تسلیم کریں

---

[1] ترجمہ آئین اکبری۔ ص ۲۴۱۔ فاضل مترجم نے نمونے کے طور پر تین منصبوں کا حساب اس طرح پیش کیا ہے:

۱۔ پنج ہزاری۔ مشاہرہ، ۳۰ ہزار۔ فوجی مصارف ۲۰ ہزار۔ باقی ۱۰ ہزار
۲۔ یک ہزاری۔ مشاہرہ، ۸۲۰۰۔ " " ۵ ہزار۔ باقی ۳ ہزار
۳۔ یک صدی (یا یوز باشی) مشاہرہ ۷ سو۔ " " ۴ سو۔ باقی ۳۱۳ روپیہ

[2] مورلینڈ: اِن ڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر ص ۶۶۔ اس نے تنخواہ اور فوجی مصارف کا یہ نقشہ دکھایا ہے:

منصب	ماہانہ مشاہرہ	مصارف فوج
۵۰۰۰	۲۸ تا ۳۰ ہزار	۱۰/۶۰۰
۳۰۰۰	۱۷ ہزار	۶،۷۰۰

(بقیہ ص ۴۳۶ پر)

تو بھی کچھ شک نہیں کہ دس ہزار روپیہ مہینہ، جو آج کل کے روپے میں دو لاکھ بن جائے گا، اتنی بڑی تنخواہ تھی کہ ہمارے زمانے میں دولت مند امریکہ بھی سب سے اعلیٰ عہدہ داروں کو ادا نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہزار سے اوپر کے منصب معدودے چند امیروں کو ملتے تھے۔ چہار صدی اور اس سے اعلیٰ منصب دار طبقۂ امرا میں داخل اور خان کے مغلی لقب سے ملقب ہوتے۔ امرائے کبار کو خان اعظم، خان خاناں جیسے خطاب دئے جاتے تھے۔ "میرزا" صرف شاہی خاندان کے افراد استعمال کر سکتے تھے بجز اس کے کہ بادشاہ کمال خصوصیت سے کسی کو یہ شرف عطا فرمائیں ؛

منصب داروں کو اصولاً خزانے سے نقد تنخواہ ادا ہوتی تھی لیکن عملاً وہ عہدہ دار جو مال گزاری یا انتظامی خدمتوں پر مقرر کئے جاتے تھے، انھی علاقوں میں پرگنے یا جاگیریں نامزد کر دی جاتیں کہ وہ اُن کی مال گزاری اپنی تنخواہ میں وصول کر لیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جاگیریں محض سرکاری خدمت سے متعلق تھیں اور منصب دار مال گزاری وصول کرنے میں بھی عام سرکاری شرح اور ضوابط کے

(بقیہ صفحہ ۴۳۵)

۱۰۰۰	۸ ہزار	۳۰۰۰
۵۰۰	۲۱۰۰ تا ۲½ ہزار	۱۱۷۰
۵۰	۲۳۰ تا ۲۵۰	۱۸۵
۱۰	۷۵ تا ۱۰۰	۴۴

مگر مصارف فوج کا یہ اندازہ صریحاً کم ہے۔ بڑے منصب داروں کو نہ صرف گھوڑے بلکہ جنگی اور باربرداری کے ہاتھی اور اونٹ بھی مقررہ تعداد میں رکھنے لازمی تھے۔ چنانچہ پنج ہزاری کو ڈیڑھ سو سے زیادہ، اور یک صدی (= یوز باشی) تک کو تین ہاتھی رکھنے پڑتے تھے ؛

پابند ہوتے تھے۔ عہدہ دار کے تبادلے پر، ورنہ وفات پانے پر ایسی جاگیریں بحق سرکار ضبط ہو جاتی تھیں ÷

انتظامی تقسیم اور عہدے

پوری سلطنت (اکبر کے آخر زمانے میں) پندرہ صوبوں پر تقسیم تھی:

(۱) کابل۔ (۲) لاہور (پنجاب بہ شمول کشمیر)

(۳) ملتان (بہ شمول سندھ) (۴) دہلی۔

(۵) آگرہ۔ (۶) اودھ۔

(۷) الہ آباد۔ (۸) اجمیر۔

(۹) احمد آباد (گجرات) (۱۰) مالوہ۔

(۱۱) بہار۔ (۱۲) بنگالہ (بہ شمول اڑیسہ)

(۱۳) خان دیس۔ (۱۴) برار۔

(۱۵) احمد نگر۔

ہر صوبے میں آٹھ دس سرکاریں ہوتی تھیں۔ یہ ہمارے زمانے کے اضلاع سے بڑی اور کمشنری (یا قسمت) سے ذرا چھوٹی ہوتی تھیں ہر سرکار عموماً ۲۵ پرگنے یا محال میں بٹی ہوئی تھی۔ یہی پرگنے آگے چل کر تحصیل اور تعلقہ کہلائے۔ مگر اُس زمانے کے پرگنے میں عموماً ایک سو سے زیادہ گاؤں شامل نہ ہوتے تھے۔ پہلے بارہ صوبوں میں سرکاروں کی کل تعداد ۱۰۵ اور کچھ کم تین ہزار پرگنے بتائی گئی ہے÷ صوبے کے حاکم اعلیٰ کے لئے ابوالفضل "سپہ سالار" کا لفظ لکھتا ہے لیکن یہ جدت قبولِ عام نہ پا سکی اور پھر سرکاری کاغذات میں بھی اسے صوبہ دار، ناظم یا نواب ہی لکھنے لگے۔ نواب، لفظ نائب

کی جمع ہے۔ اسے صوبہ دار کے لئے ازرہِ تعظیم صیغہ واحد میں بولنے لگے اور سچ یہ ہے کہ مغل صوبہ دار نہ صرف بادشاہ کے نائب بلکہ اسی کی طرح اتنے جامع اور وسیع اختیارات کے مالک ہوتے تھے کہ ان کے حق میں یہ مبالغہ کچھ بے جا نہ تھا؛ البتہ یہ تاریخی فرق جتانے کے قابل ہے کہ ترک بادشاہوں کے دَور میں صوبہ دار، عدالتی مقدمات میں بے اختیار ہوتا تھا مگر انتظامی اور مالی معاملات میں اُسے زیادہ آزادی حاصل ہوتی تھی۔ پہلے محمد تغلق نے پھر شیر شاہ سُوری نے مال گزاری کے ہمہ گیر ضابطے بنائے کہ صوبہ دار ان سے تجاوز نہ کرسکتے تھے۔ عہد اکبری میں ضوابط کی یہی یکسانی حکامِ صوبہ کے اختیارات کو محدود کرتی تھی۔ لیکن جب قاضیوں اور مفتیوں سے بادشاہ کی چشمِ التفات پھری تو عدالتی مقدمات بھی مُغل صوبہ دار اپنی عقل و رائے سے فیصلہ کرنے لگے جس نے مسلمان شہریوں پر اُن کا رعب داب اور بڑھا دیا۔ ہندوؤں کے باہمی تنازعے بہ دستورِ سابق برادری یا گاؤں کی پنچایت چکاتی تھی اور مذہبی مسائل میں پنڈت کی رائے قولِ فیصل مانی جاتی تھی؛

سرکار یا بڑے بڑے شہروں میں انتظامی اختیارات فوج دار کے سپرد ہوتے اور انھیں بھی اکثر بادشاہ مقرر کرتا تھا۔ اسے حالیہ اصطلاح میں "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ" کہنا غلط نہ ہوگا لیکن انگریزوں کے زمانے میں جو انتظامی اور فوج داری اختیارات حاکمانِ ضلع کو دئے گئے، مغلیہ عہد میں اُن کے اس طرح مجتمع ہونے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مالی اور دیوانی مقدمات کے واسطے عامل (یا کلکٹر) اور منصف

الگ رکھے جاتے تھے اور غالباً ہر صوبے میں میر عدل کا شاہی عہدہ قائم کیا تھا جہاں ان مقدمات کا مرافعہ (یعنی اپیل) سماعت کیا جاتا تھا جرائم کی تفتیش اور معمولی تعزیر بھی کوتوال شہر کے اختیار میں دی گئی تھی۔ لیکن تھانہ دار، فوج دار یا عامل کے ماتحت ہوتے تھے اور صرف تفتیش اور امن و انتظام قائم رکھنا ان کا کام تھا۔ چوکی دار۔ سپاہی اور سوار کی ایک نیم فوجی جمعیت تھانہ داروں، کوتوالوں کے تحت میں رکھی جاتی تھی جسے ابوالفضل نے "سپاہ زمیں دار" کا نیا نام دیا اور سلطنت میں اُس کی مجموعی تعداد چوالیس لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے؀

آئینِ مال گزاری

مال گزاری کے آئین و ضوابط ایک عرصے کی بے ربطی کے بعد شیر شاہ سُوری کے عہد میں مرتب ہوئے تھے۔ اس کے دربار میں ابوالفضل جیسا کوئی منشی نہ تھا کہ "آئینِ شیر شاہی" یادگار چھوڑ جاتا لیکن بہ صحت کے ساتھ معلوم ہے کہ دسویں صدی ہجری میں اسی افغان بادشاہ نے شمالی ہند اور پنجاب کے تمام دیہات کی یکساں پیمائش کرائی اور مزروعہ اراضی پر اس کی حیثیت اور پیداوار کے مطابق سرکاری مالیہ مقرر کیا جو زیادہ سے زیادہ چوتھائی پیداوار ہوتا تھا۔ چند پرگنوں سے ایک "سرکار" بنانا بھی اسی نے تجویز کیا تاکہ دیہات کے عمّال (یعنی پٹواری، قانون گو اور کارکُن) کے کام کی نگرانی اور مقامی مقدمات سرکار ہی میں طے ہو سکیں۔ صوبہ دار کو براہِ راست ان کی دیکھ بھال نہ کرنی پڑے؎ کم و بیش یہی انتظام

؎ تاریخ شیر شاہی ترجمہ ایلیٹ صفحہ ۴۱۳۔ اسی تاریخ میں شیر شاہی سلطنت (بقیہ صفحہ ۴۴۰ پر)

اکبر کے زمانے میں جاری رہا اور صیغہ مال گزاری کی اصلاح اوّل مظفر خاں تربتی نے کی جو ۹۸۱ ہجری (= ۱۵۷۴ء) میں خطاب جملۃ الملکی سے سرفراز ہوا اور "زمام حل وعقد امورِ چہار دانگ ہندوستان بہ اقتدار ش تفویض یافت" چار سال بعد وہ عتاب میں آیا تو یہ اہم خدمت راجہ ٹوڈرمل کے سپرد ہوئی اور اس کی تیز مزاجی کی اصلاح کے لئے خواجہ شاہ منصور وزیر کو بدرقہ بنایا گیا۔ ان دونوں نے آئین مال گزاری کی تجدید اور "دہ سالہ بندوبست" کی تکمیل کردی جو ٹوڈرمل کے نام سے منسوب ہوا اور وقتی ترمیم و اصلاح کے بعد انگریزوں کے زمانے تک پاکستان و بھارت میں نافذ رہا؂

سکہ اور اس کی قوت خرید

اس بندوبست میں زمین کی پیمائش، مالئے کی تشخیص اور وصول مال گزاری کا اصلی ذمہ دار ہر سرکار میں عامل کو بنایا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اسے بعض انتظامی اختیارات حاصل تھے۔ خزانے کا دفتر اسی کی نگرانی میں رہتا تھا اور یہی عہدہ دار تھا جو آگے چل کر انگریزی میں کلکٹر کہلایا۔ تشخیص کے مراحل طے ہونے کے بعد اکبری سلطنت کے بارہ صوبوں کی (یعنی شمالی ہند، پاکستان اور کابل کی) مجموعی مال گزاری پونے چار ارب دام یا نو کرور روپے سے کچھ زیادہ قرار پائی جس میں دکن کے تین صوبے شامل ہونے سے آیندہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۹) کے کل مواضع کی تعداد ایک لاکھ تیرہ ہزار بتائی ہے۔ صفحہ ۴۴۴ نیز حاشیہ مترجم۔

؂ دیکھو آئین اکبری صفحہ ۳۴۵۔ مآثر الامرا۔ ج سوم صفحہ ۲۲۳ وغیرہ۔

مزید اضافہ ہوا۔ اس رقم کے بارے میں انگریز تاریخ نویسوں نے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں اور انگریزوں کی زیادہ شائی بہ غلط بیانی اور سلاطین ماضیہ سے بدگمانی کے پردے ڈالے ہیں۔ اس بارے میں ہمیں آیندہ تنقیح اور مقابلہ کرنے کا موقع ملے گا۔ یہاں مقدم یہ ہے کہ اُس زمانے کے سکّے اور اصلی قیمت یا قوت خرید کا صحیح اندازہ لگایا اور یہ دیکھا جائے کہ اُس وقت کا ایک روپیہ ہمارے زمانے کے کتنے روپے کے برابر ہوتا تھا؛

اکبر کے عہد میں بیس بائیس قسم کی اشرفیاں اور چاندی اور تانبے کئی سکّے رائج کئے گئے تھے جن پر طرح طرح نقش و نگار اور دلچسپ اشعار کندہ کئے جاتے تھے اور ضرب سکہ کی صنعت پہلے کی نسبت نمایاں ترقی کر گئی تھی لیکن سکّے کی اصلاح کا فخر بھی شیر شاہ سوری کو حاصل ہے۔ اسی نے دَور لامرکزیت کے اسقام و تناقض کو دُور کر کے تمام شمالی ہند میں چاندی کی اصلی قیمت کے مطابق تقریباً ایک تولے کا سکّہ چلایا اور اس کا نام روپیہ قرار دیا (۹۵۰ ہجری = ۱۵۴۳ء) کہ آج چار سو برس گذرنے کے بعد بھی بھارت اور پاکستان میں یہی نام چلتا ہے۔ ابوالفضل نے اکبری روپے کو (جلال الدین کی نسبت سے جلالہ نام زد کیا تھا۔ دَرب، اٹھنی۔ چَرن، چوتی۔ اشٹ، ددتی کے لئے تجویز ہوئے تھے۔ یہ سب کتابوں کے اوراق میں دب گئے؛

روپے کا وزن ساڑھے گیارہ ماشہ ہوتا تھا اور بازار کی قیمت کے مطابق اس کے چالیس دام (= پیسے) ملتے تھے[۱]؛ روپے کی قوت

---

[۱] سکّے کے متعلق آئین اکبری سے بڑھ کر ہم نے اُڈورڈ ٹامس کی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۲ پر)

خرید کا اندازہ یوں کیجئے کہ ایک روپے میں دو من گیہوں۔ تین من جَو یا چنے۔ پندرہ سیر عمدہ گوشت گوسفند۔ آٹھ سیر گھی۔ من بھر دودھ۔ ۶ سیر مصری ۸ سیر قند سفید[1] اور اسی نسبت سے ترکاریاں، پھل اور دوسری چیزیں مل جاتی تھیں۔ اجناس کی ان شرحوں کو دیکھ کر مورلینڈ نے تخمینہ لگایا ہے کہ قوت خرید میں اکبری عہد کا ایک روپیہ ۱۹۱۲ء کے سات روپیہ کے برابر ہوتا تھا[1] پس یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ وہ ۱۹۵۰ء کے کم و بیش ۲۰ روپے کے ہم قیمت ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اکبر کی ۱۷ کروڑ مال گزاری آج کل کے حساب سے تقریباً سوا ارب روپیہ ہوتی تھی۔ انگریزوں کے عہد میں ان اکبری صوبوں کی آبادی بڑھی۔ مزروعہ زمین بڑھی۔ آب پاشی کے وسائل بڑھے۔ شرح مال گزاری بڑھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ وہ اکبری محاصل کی آدھی رقم بھی کبھی وصول نہ کرسکے! سبب بہ ظاہر یہی ہے کہ ملک دولت مند، عام کسان خوش حال تھے۔ شیر شاہ کو پیداوار کا ایک چوتھائی اور اکبر کو ایک ثلث تک وصول ہوجاتا تھا۔ انگریزوں نے بہترین بندوبست کئے لیکن عام افلاس اور بد حالی کی بہ دولت اُس رقم کی تین چوتھائی بھی ان کے ہاتھ نہ آئی؛

(بقیہ صـ۴۴۱) تحقیقات سے فائدہ اُٹھایا ہے (کرانکلز۔ صـ۲۰۴ تا ۲۱۰)

[1] نرخ اجناس کی تفصیل کے لئے دیکھو آئین اکبری صـ۶۲ وغیرہ۔ مورلینڈ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اُن دنوں "قند" نہ ہوتا تھا۔ یہ لائق مضحکہ ناواقفیت ہے۔ اُس زمانے میں مصری اور قند آج کل سے بھی زیادہ خالص اور شیریں بنتے تھے؛

[1] ۵۲ "انڈیا .... اکبر" صـ۵۶

فوج باقاعدہ

بے قاعدہ، نیم مسلح فوج کا شمار ابوالفضل نے چوالیس لاکھ بتایا ہے لیکن باقاعدہ مستقل فوج کی صحیح تعداد کسی مورخ نے نہیں لکھی۔ شاید معیّن ہی نہیں کی گئی۔ البتہ منصب داروں کی معیّنہ فوجوں کی میزان تقریباً ایک لاکھ سوار جڑتی ہے۔ مزید برآں، بادشاہ کی فوج رکاب میں بارہ ہزار بندوقچی اور برق انداز نوکر تھے۔ تیرانداز، شمشیرباز پیادوں کی تعداد ان سے بھی زیادہ تھی۔ یکّہ سواروں کو احدی کا نیا نام دیا گیا تھا۔ یہ منصب داروں میں شامل نہ تھے مگر کئی کئی گھوڑے رکھتے اور معزز سپاہی مانے جاتے تھے۔ آئین اکبری میں بعض کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار تک مذکور ہے۔

اکبر کو ہاتھیوں کا بہت شوق تھا۔ خود فیل بانی سیکھی تھی مستک پر بیٹھ کر مست ہاتھی لڑاتا تھا۔ اچھے سے اچھے ہاتھی دُور دُور سے منگاتا تھا۔ عبداللہ خاں اُزبک سے ناراضی کی وجہ یہی ہوئی تھی کہ اُس نے مالوے کے مال غنیمت سے کئی بڑے ہاتھی حضور میں نہیں بھیجے تھے۔ پٹنے کی جنگ میں داؤد کررانی بھاگا تو یہ سن کر کہ ایک بنگالی سردار بہت سے عمدہ ہاتھی لے کر نکل گیا، خود بادشاہ سلامت تعاقب میں دوڑ پڑے تھے۔ غرض سواری، شکاری، باربرداری اور لڑائی کے پانچ ہزار سے زیادہ ہاتھی جمع کئے تھے جن کی تربیت اور نگہداشت پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ اسی طرح جدید آتشی اسلحہ کا شوق باپ دادا سے بڑھ کر تھا۔ آئین اکبری میں لوہے کے صاف کرنے، پگھلانے اور توپ بندوق ڈھالنے کی جزئیات تک لکھ دی ہیں۔ یہ جنگی صنعت

شمالی ہند میں بابر نے شروع کی تھی۔ اکبر کے عہد میں اسے حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ بندوقوں، زنبورکوں وغیرہ کا کیا ذکر ہے، توپیں اتنی بڑی بڑی بنائی جانے لگیں جنھیں کھینچنے کے لئے کئی کئی ہاتھی، صدہا بیل درکار ہوتے تھے، اور سات من تک کا گولہ چلایا جا سکتا تھا۔[1] یہ ایجاد بھی ابوالفضل "کار آگہی کشور خدیو" کا نتیجہ بتاتا ہے کہ بغیر فتیلۂ آتش کے صرف گھوڑا گرانے سے چلنے والی بندوق آگرے میں ڈھلنے لگی تھی۔[2] مگر تعجب ہے کہ مختلف اصلاح یافتہ قسموں کے ذکر میں ابوالفضل دونالی بندوق کے متعلق کچھ نہیں لکھتا۔ حال آں کہ ہمیں صحت سے معلوم ہے کہ جنگِ چوسہ (۹۴۶ھ) کے وقت ہی ہمایوں بادشاہ کے پاس ایسی بندوق موجود تھی۔[3]

۱؎ آئینِ اکبری ص ۱۲۴۔ اصل کتاب میں بارہ من لکھا ہے۔ لیکن مورلینڈ کی تازہ ترین تحقیقات کے بہ موجب اکبری من ۵۶ پونڈ یعنی ہمارے ۲۵ سیر کا ہوتا تھا ("انڈیا ..... اکبر ص ۵۳) اس حساب سے وہ ۱۲ من ہمارے ۷½ من کے برابر ہوئے۔

۲؎ دسویں صدی ہجری یعنی سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اس قسم کی بندوقیں بننے لگی تھیں کہ سنگ چقماق کے گھوڑے سے بندوق آگ دکھائے بغیر چل جاتی تھی۔ لیکن ان کا عام رواج نہیں ہوا تھا (ان سائیکلوپیڈیا۔ ج ۲ ص ۹۵۴) اور اس قسم کی کوئی شہادت یا قرینہ بھی ہمارے سامنے نہیں کہ ہم اس ایجاد کو اہلِ یورپ کا آوردہ قیاس کریں۔

۳؎ یہ صاحب "تذکرۃ الواقعات" جوہر آفتابچی کی روایت ہے۔ وہ ہمایوں کا خاص ملازم، بہت باخبر، معتبر راوی ہے۔ (ترجمہ ایلیٹ۔ جلد پنجم ص ۱۳۷ و ۱۴۲)۔

شخصی بادشاہی کا فروغ

سلطنت کا سب سے اعلیٰ اقتدار، سب سے اونچا منصب بادشاہ کو حاصل تھا۔ منصب کا لفظ کہنا بھی اس کی عظمت و شان کو بٹہ لگاتا ہے۔ وہ سارے مُلک اور جملہ اہلِ مُلک کا مالک تھا۔ بادشاہی کیا، خُدائی کے اختیار (نعوذ باللہ) اس کے ہاتھ میں تھے۔ ممالک ہند میں لامرکزیت کا شیر شاہ سُوری نے خاتمہ کیا اور مرکزی شہنشاہی کی تجدید بھی اُسی کے ہاتھ سے ہوئی۔ لیکن حق یہ ہے کہ تیموری بادشاہوں نے ہندوستان میں شہنشاہی کو جس مرتبے پر پہنچایا، شاید اُس کا تصور بھی سُوری سپاہی زادے کے ذہن میں نہ ہوگا۔ شخصی بادشاہی، اُن دنوں دنیا کے سبھی ملکوں میں مروّج اور گویا سب سے مناسب طرزِ حکومت سمجھی جاتی تھی۔ مُغلوں کی نسلی خصوصیات میں ابتدا سے خوں خواری و سفّاکی کے ساتھ آقا پرستی ایک امتیازی وصف مانا گیا ہے[1] اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان میں یہ صفت موجود بلکہ ایمانِ سلطنت کا پایہ بنی رہی۔ اتفاق سے جوانی ہی میں اکبر کو راج پوتوں سے سابقہ پڑا۔ یہاں بادشاہ کی تعظیم ایمان کا جُز تھی۔ ہندو قوم راجہ فرماں روا کو اپنا ان داتا کہتی، زمین پر خدا کا اوتار مانتی تھی، یہ سب اسباب مطلق العنانی کو قوت بخشتے تھے۔ بیرم خاں اور اُزبک امیروں کا معاملہ اکبر کے ذہنی تصورات کی تاریخی تصویر ہے۔ یہ جاں نثار جہاں بادشاہ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون ٹپکاتے تھے۔ انہی کی

---

[1] چنگیز خانی مغول کی مجنونانہ آقا پرستی کی بعض عجیب مثالیں طبقاتِ ناصری میں آتی ہیں۔ (دیکھو آخری طبقہ: "فتنۂ مغول")

سرفروشی نے ہندوستان کی چھنی ہوئی سلطنت کو دوبارہ خریدا تھا۔ لیکن جس وقت یہ بدگمانی ہوئی کہ اپنے اختیار سے کام لیتے ہیں، بادشاہ کی اجارہ داری میں حصّہ لگانا چاہتے ہیں تو ساری خدمت، بغاوت سے اور وفاداری، غدّاری سے بدل گئی۔ مار مار کے ملک سے بلکہ دنیا سے نکال دئے گئے۔ شخصی بادشاہی نے عجب طرح کا فروغ پایا۔ ان تیموریوں نے وراثت تک کا کوئی قانون نہیں بنایا نہ کسی بھائی بیٹے کو ولی عہد نامزد کرتے تھے کہ کہیں وہی رقیب و حریف بادشاہی نہ بن جائے۔ اس لاقانونی کا اتنا فائدہ ضرور تھا کہ شاہی کے امیدواروں کو تدبیر کی لیاقت اور شمشیر کی مہارت بغیر یہ قیمتی ترکہ میسر نہ آتا تھا۔

شخصی اور موروثی بادشاہی کے فوائد اور سخت تر نقصانات کی بحث یہاں بے محل ہوگی۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ جہاں کارخانوں اور ذیلی محکموں کی ایسی تفصیل ابوالفضل نے تحریر کی ہے، وہاں مرکزی حکومت کا کیا نقشہ دکھایا ہے؟ بہت ورق گردانی کی، ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ سارے آئینہ خانے میں جدھر دیکھا صرف حضرت بادشاہ، خدیو خدا آگاہ کی شبیہ جلوہ دکھاتی ہے۔ امیر، وزیر سب چلتے پھرتے سائے ہیں۔ ابھی مسند وزارت پر متمکن تھے۔ پھر جو دیکھا تو کسی دور دست صوبے میں دوڑتے پھرتے تھے! انتہا یہ کہ زمانۂ گذشتہ میں جو حاجب، باربک، وکیل در وغیرہ عہدہ دار ہوتے تھے، وہ بھی چھٹ گئے۔ بادشاہ کی ذاتی خدمت کرنے والے، یا محض مصاحب و ندیم کہلانے والے رہ گئے۔ انہی میں سے وہ جسے چاہتا مرکزی حکومت کے مختلف کاموں پر لگا دیتا تھا۔ اکبر کی اقبال مندی کہ بہت سے لائق افراد اس

دَور میں پیدا ہوے اور اُس کے دربار میں کھنچ آئے۔ اور مردم شناسی یہ کہ اکثر ضروری کاموں کے لئے مناسب آدمی کا انتخاب ہوا؛
مال گزاری اور خزانے کے وزیر، نائب وزیر اور آگے چل کر دیوان کا نام آتا ہے۔ یہ عہدے فی الجملہ استقلال اور کچھ نہ کچھ مقررہ فرائض رکھتے تھے۔ شروع میں قاضی القضاۃ اور صدر صدور کے عہدے بڑی عزّت و احترام کے حامل تھے۔ ائمہ اور قضاۃ کا تقرر، مدد معاش کا تعیّن انہی کے ہاتھ میں تھا۔ شرعی مقدّمات میں ان کا فیصلہ آخری مانا جاتا تھا۔ لیکن ان عہدوں کی نوعیت مذہبی تھی۔ مذہب کی کساد بازاری کے دن آئے تو یہ عہدہ دار بادشاہ کی نظر سے گر گئے اور اسی کے ساتھ ان کا اقتدار بھی قصّۂ پارینہ ہو گیا؛

ضمیمہ

باب کو ختم کرتے وقت مناسب معلوم ہوا کہ مورلینڈ کی تحقیقات کا خلاصہ بھی ضمیمہ کر دیا جائے جس نے بڑی محنت سے مغل بادشاہوں کے عہد عروج کی معاشی تاریخ مرتب کی ہے اور فارسی تاریخوں (کے تراجم) کے علاوہ قریب العصر فرنگی تاجروں، سیاحوں کے بیانات سے مدد لی ہے، اور وہ قلمی دستاویزیں ہماری دسترس کے باہر ہیں؛ مصنّف قومی تعصّب سے پاک نہیں بلکہ تالیف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انگریزی حکومت پر سے زرکشی اور ہندوستان کو مفلس بنانے کا الزام دور کرے

اور انگریزوں کے آئین و انتظام کی خوبیاں چمکانے کے لئے عہد مغلیہ کی کمزوریاں نمایاں کی جائیں۔ تاہم اسے اسلام یا مسلمانوں سے ذاتی عناد اور وہ دشمنی نہیں معلوم ہوتی جس میں اکثر انگریز تاریخ نویس مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ دوسرے، کتاب کا موضوع معاشیات اور اقتصادی حالات ہیں۔ اس باب میں اُس کی تحقیق کے مندرجہ ذیل نتائج پڑھنا فائدے سے خالی نہیں:

"جن لوگوں کے سپرد خاص خاص عہدے تھے، وہ بھی در اصل شاہی احکام ہی کی تعمیل کرتے تھے۔ البتہ اپنے ماتحتوں پر نگرانی رکھتے تھے۔ عہدہ داروں کی دو قسمیں تھیں: ایک تو وہ جو پابندی سے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ دوسرے وہ منصب دار جو صوبوں میں بڑے چھوٹے عہدوں پر مقرر کئے جاتے یا کسی شاہی کار خانے میں لگا دئے جاتے تھے۔ ملازمت میں کسی قسم کی تخصیص نہ تھی۔ ایک ہی شخص آن واحد میں یہاں سے ہٹاکر بالکل مختلف خدمت پر مامور کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً بیربل برسوں دربار میں مصاحبت کرتا رہا۔ دفعۃً سپہ سالار بناکر سرحد کی طرف گیا اور وہیں کھیت رہا۔ ابوالفضل مشہور فاضل اہل قلم تھا۔ اسے دکن کی فوجی مہم پر بھیج دیا گیا۔ بارے وہ کامیاب رہا۔ مختصر یہ کہ جملہ ملازمین براہ راست بادشاہ کے تابع تھے، وہ جس کو جو کام مناسب سمجھتا تفویض کر دیتا تھا۔ اس عجیب طریقے سے نظم و نسق کو چلا لے جانا اکبر کی مردم شناسی کا ثبوت ہے۔ ان عہدہ داروں کے حال پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کا آج کل کی سرکاری ملازمت سے مقابلہ کرنا درست نہ ہوگا۔ ایسی تدریجی ترقی جس کا اب عام رواج ہے، اُن دنوں کہیں نہ تھی۔ شاہی ملازمت کا حال قمار بازی

جیسا تھا کر پانسہ پڑگیا تو وارے نیارے ہوجاتے تھے۔ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ملازمت میں داخل ہونا اور بادشاہ کی نگاہ کرم کو اپنی طرف پھیر لینا، مشکل مرحلہ ہی تھا لیکن یہ طے ہوگیا تو پھر تیز اور بڑی سے بڑی ترقی کرنا بھی ممکن تھا۔ بلوخ مین نے اس قسم کی بہت سی مثالیں جمع کی ہیں۔ انہی میں حاکم علی کو لیجئے کہ نہایت افلاس کی حالت میں ایران سے ہندوستان پہنچا لیکن اکبر کی التفات ہوتے ہی معمولی نوکری سے دوہزاری منصب پر مقرر ہوگیا؛ پیش رو خاں ہمایوں کا غلام تھا۔ مختلف خدمات انجام دیتا رہا یکایک قسمت نے زور کیا تو چند ہی سال میں لاکھوں کا آدمی بن گیا ...... سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا نظام حکومت جو عمّال اور حکّام تیار کرے گا وہ کیسے ہوں گے؟ کیا وہ ملک و قوم کے بہی خواہ، رعایا کے خدمت گزار ہوں گے، یا محض خود غرض لٹیرے جنھیں اپنی جیب بھرنے سے کام ہوگا؟ ——ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ہوش مند، رعایا پرور فرماں روا ایسے عمّال کی تلاش میں رہتا تھا جو دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیں لیکن ساتھ ہی یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ چالاکی، چرب زبانی، ریاکاری اور ظاہر داری، بادشاہوں کو خوش کرنے کے لئے زیادہ کارگر اوصاف تھے۔ دوسرے فرماں رواؤں کی طرح اکبر کو بھی اسی قسم کے لوگ گھیرے رہتے تھے۔ یہ لوگ دربار میں حاضر رہنے کو ترجیح دیتے۔ جاگیروں سے جیبیں گرم کرنے کا کام لیتے۔ اپنی نوکری پر کہیں جانے اور علاقے کی بہتری کے لئے کام کرنے کی مطلق پروا نہ کرتے تھے ....“

پھر احدیوں اور بے قاعدہ فوج کی کیفیت لکھنے کے بعد، مصنّف

دوبارہ دیوانی محکموں کا ذکر کرتا ہے:

"فوج کو چھوڑ کر جب ہم دیوانی نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوں، تو موجودہ حالات سے نمایاں فرق یہ نظر آئے گا کہ محکمہ تعلیم، طبابت، آب کاری وغیرہ کے جداگانہ سرشتے نہیں بنے تھے..... صدر مقامات کے دفاتر کی نسبت ابوالفضل کچھ نہیں لکھتا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا سرکاری کام جس طرح پہلے چلتے تھے، اسی طرح چلتے رہے۔ البتہ مرکز میں محرروں کا بڑا بھاری عملہ رکھنا پڑتا تھا اور تقررات یا ادائے رقوم کی کارروائی بہت طویل اور پیچیدہ ہوتی تھی منصب کی منظوری خود بادشاہ دیتا تھا۔ اس کا اندراج پہلے شاہی روزنامچے میں ہوتا۔ روزنامچے کی تنقیح اور دوبارہ بادشاہ کی تصدیق کے لئے ایک یادداشت تیار کی جاتی جس پر تین عہدہ داروں کے دستخط ہوتے تھے یہ یادداشت دفتر کتابت میں جاتی اور وہاں اس کا "تعلیقہ" یعنی ضروری خلاصہ مرتب ہوتا۔ اس پر چار وزیروں کی مہریں ثبت ہونے اور محکمہ خزانہ میں رقم کا حساب اور تدحساب تیار کرنے کے بعد تیسری مرتبہ بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی۔ پھر ادائے رقم کی ایک سند یا پروانہ علاحدہ لکھا جاتا جس پر وزیر خزانہ، سپہ سالار، بخشی یا محاسب دستخط کرتے۔ تب کہیں "فرمان" لکھنے کی نوبت آتی اور وہ ان عہدہ داروں کی مکرر تصدیق کے بعد ادائے تنخواہ کے واسطے خزانے میں قبول کیا جاتا تھا"

اس طویل طریق کارروائی کو دیکھنے سے ناظرین کو ہندوستان کے موجودہ دفاتر کے بدترین پہلو یاد آجائیں گے۔ یہ صرف رقم ادا

کرنے والے سرشتوں ہی کا حال نہ تھا بلکہ وصول مال گزاری کے انتظامات بھی ایسے ہی پیچ در پیچ بنائے تھے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ سال میں دونوں فصلوں پر گاؤں کی مال گزاری کی تشخیص کے تختے تیار کئے جاتے اور ان کی صاف نقول لازماً مرکزی حکومت کو روانہ کی جاتی تھیں۔ کاغذات کے اس عظیم انبار کی تنقیح اور مثل بندی بجائے خود اتنا بڑا کام تھا کہ محرروں کی فوج کی فوج ہی اس سے عہدہ برآ ہوسکتی تھی ...... یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل کی طرح اس وقت بھی محرری ہزاروں اشخاص کی معاش کا ذریعہ تھی۔ اور یہ اس عملے کے علاوہ ہیں جو تشخیص و تحصیل مال گزاری کے واسطے ہر گاؤں، ہر پرگنے میں مقرر کیا جاتا تھا ...... اس انتظام میں اکبر نے شیر شاہ سوری کے بنائے ہوئے ضوابط کو بجنسہ جاری رکھا تھا اور عہد شیر شاہی کے "شق دار" "امین" "کارکن" "منصف" (جو ایک انتظامی عہدہ دار ہوتا تھا) وغیرہ بہت سے عہدوں کے نام وہی کے وہی مذکور ہیں جن کے فرائض اور تنخواہوں تک میں بہ ظاہر کوئی ردّ و بدل نہیں کیا گیا تھا"[۱]

---

[۱] مورلینڈ: اِن ڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر۔ باب سوم۔ فصل اوّل و دوم۔

باب چہار دہم ۱۴

مذہبی خیالات اور نئے تاثرات

اکبر بادشاہ کے تاریخی کاموں میں ایک " دین الٰہی اکبر شاہی" کی بدعت بھی اس کے نامۂ اعمال میں تحریر کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں اُن دنوں جو تموج پیدا ہوا، یہ اُسی کی ایک موج تھی مگر جب اتنے بڑے مطلق العنان بادشاہ نے اُچھالی تو ضرور ہو کر قریب سے دیکھنے والوں کو بڑی خوف انگیز، طوفان خیز نظر آئی ہوگی۔ زمانۂ حاضرہ کے انگریز تاریخ نویسوں نے اسے خوب خوب اُچھالا۔ اس کا سبب کچھ نافہمی اور کچھ وہی فتنہ طرازی ہو جس نے اُن کی اچھی اچھی کتابوں کو پھپوند بھری کھیر بنا دیا کہ شکر گزاری سے زیادہ ناگواری کا باعث بن گئی ہیں۔

دسویں صدی کے وسط میں جب اکبر تخت نشین ہوا، مسلمانوں کو سندھ میں آئے ہوئے نوسو، پنجاب میں چھ سو اور بھارت میں چار سو سال سے کچھ کم زمانہ گزر گیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے کہیں اور اشارہ کیا،

ملوکِ طوائف کی آخری دو صدیاں ملّی اور دینی اعتبار سے نہایت نتیجہ خیز اور اثر انگیز تھیں کہ اسلامی حکومت کا پرچم اقالیم ہند کے ہر ہر خطے میں لہرایا۔ جنگل پہاڑ کے دور دست مقامات کے سوا کوئی علاقہ نہ تھا جہاں ان کے قدم نہ پہنچے اور ان کے مذہبی اور تہذیبی اثرات نہ پھیلے ہوں۔ جگہ جگہ فاتحین کی چھاؤنیاں چھائیں۔ بستیاں بسیں اور ہزاروں قطعات میں مسلمان سردار اور سپاہی حاکم یا جاگیردار بن کر آباد ہو گئے۔ مستقل سکونت کے ساتھ ساتھ ان کی مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔ درس و تدریس، وعظ و تذکیر سے ساری فضا معمور ہو گئی۔ حال قال کی محفلوں کی صدا ہر گوشے میں گونجنے لگی۔ سالانہ عرس، مستقل میلے بن گئے۔ میلاد شریف اور محرم کے مقبول عام ہونے کا آغاز اسی دور میں ہوا ؎

مسلمانوں کا اثر ہندوؤں پر اور تاثّر

ممالک ہند کے قدیم باشندوں پر مسلمانوں کی آمد اور طویل اقامت کا لامحالہ گہرا اثر پڑا۔ خصوصاً وہ پیشہ ور یا اہل حرفہ جنھیں برہمنی مذہب نے صدیوں سے ذلیل و خوار، نیچ ذات بنا رکھا تھا، جب مسلمانوں سے واسطہ پڑا تو ان کی دینی مساوات اور نیکی کا برتاؤ دیکھ کر یا حکومت و دولت کے اثر سے بہ تدریج اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔ یہ بے چارے خاندان اور برادری کی زنجیروں میں ایسے بندھے ہوئے تھے کہ فرداً فرداً مسلمان ہونے سے ہچکچاتے رہے۔ لیکن جہاں کہیں یہ پھندے ٹوٹے، وہاں خاندان کے خاندان اور گروہ کے گروہ برہمن کے طلسم سے نکل کر اسلام کے حلقے میں داخل ہوئے۔ مفصّل بحث و دلائل کی اس

کتاب میں گنجائش نہیں مگر یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ بھارت کے ملکوں میں اسلام کی اشاعت جس پیمانے پر ان دو (نویں، دسویں ہجری) صدیوں میں ہوئی۔ نہ پہلے ہوئی تھی نہ غالباً آیندہ ہوئی۔ تاریخ، تذکرے، نظم و نثر کی کتابیں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے گویا آبِ شیریں کا ایک چشمہ کسی بیاباں میں پھوٹ نکلا ہے کہ قطار در قطار پیاسے آتے اور سیراب ہوتے چلے جاتے ہیں؛ بہت سے تشنگانِ حقیقت اگرچہ باقاعدہ اسلام نہیں لائے، توحیدِ الٰہی اور مساواتِ انسانی کی تعلیم سے سرشار ضرور ہوگئے ہندوؤں کے خیالات میں اس ہمہ گیر انقلاب کا اندازہ کرنا ہو تو عہد ہرش کی بُت پرستی کے جوش و خروش کا، وحدانیت کی بے باک تعلیم و تلقین سے مقابلہ کیجیے جس کی کبیر اور گرو نانک نے اسی دور میں دھوم مچا دی تھی؛

اتنے دن کی بھارت میں بود باش، ہندوؤں سے میل جول اور کثرت سے نومسلموں کی آمیزش نے ہندی مسلمانوں پر بھی اثر ڈالا مگر اس کا دائرہ تمدن و معاشرت کے خطوط میں محدود تھا۔ شادی بیاہ کی رسمیں، پھول پان کا شوق، مکانات، لباس و زیور یا کھانے پینے میں ملک و موسم کے اعتبار سے تبدیلیاں ۔۔۔ یہ سب تمدنی تاریخ کے عنوان ہیں۔ مذہبی عقائد و شعائر پر ہندوؤں کا براہِ راست کوئی نمایاں اثر نہیں پڑا۔ ان کا مذہب صدیوں سے جمود کی حالت میں تھا۔ مذہبی علوم پر پنڈتوں کی احتیاط نے سنسکرت کے قفل چڑھا دئے تھے کہ نہ خود پڑھاتے نہ کسی کو پڑھنے دیتے تھے۔ غرض ہندی مسلمانوں کے دینی افکار میں ان دنوں جو تلاطم آیا، اس کے محرکات دوسرے تھے۔ ان میں پہلا مقام تصوف کو دینا چاہیے۔ اور ثانوی درجہ (۱) تحریک مہدویت

(۲) معقولات و شیعیت کو فروغ

تصوف

پہلے دَور کے خواجگانِ چشت، بزرگانِ قادریہ اور سہروردیہ بہت بلند رُتبہ لوگ تھے۔ زیرِ نظر عہد میں ہندوستان کی خاک سے اتنے اونچے درجے کے بزرگ نہیں اٹھے لیکن صوفیوں کی کثرت میں یہ زمانہ ماضی سے بازی لے گیا۔ ریاضت و مجاہدات، کشف و کرامات کی شہرت میں بھی پچھلے، اگلوں سے پیچھے نہیں رہے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ۳۰ برسوں تک جنگل میں کھڑے رہے۔ لیٹنا کیسا، بیٹھ کر بھی آرام نہیں لیا۔ شیخ احمد کھٹو چالیس چالیس دن کا روزہ رکھتے۔ صرف ایک کھجور سے افطار کرتے تھے۔ شاہ میاں جیو ۶، ۶ مہینے تیغہ لگا کر حجرے میں بند رہتے تھے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری نے بارہ برس کوہِ چنار میں بناس پتی کھائی، یادِ خدا میں مصروف رہے[۱]۔ ہمیشہ راتوں کو جاگنا، دن کو روزہ رکھنا، درویشوں کے معمولات میں شمار ہوتا تھا۔ کنوئیں میں اُلٹے لٹک لٹک کر "نمازِ معکوس" پڑھتے تھے۔ سخت مجاہدوں کی ضرب سے نفس کو توڑتے تھے۔ روحانی ترقّی کے لئے ترکِ علائق، ترکِ حیوانات، فقر و فاقہ، گوشہ نشینی، تجرّد اور اسی قسم کے رہبانی اعمال سے کام لیتے تھے۔ اسلام نے رہبانیت اور ترکِ دنیا سے مسلمانوں کو روکا، دنیا کو آخرت کی کھیتی بتایا، انسان کو زمین کی خلافت کا خلعت پہنایا ہے لیکن بزرگان صوفیہ کی تعلیم اور سعی بیش تر روحانیات پر مرکوز تھی۔ دنیا اور امورِ دنیا

[۱] ان بزرگوں کے حالات اخبار الاخیار اور بعد کے تذکروں میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

سے حتی الامکان علاحدہ رہنا چاہتے تھے ۔ ہندوستان میں جوگ سنیاس اور تپسیا کو قدامت کا احترام اور مذہب کی سند حاصل تھی۔ ممکن ہو مسلمان صوفیوں نے ہندو جوگیوں، رشیوں سے بھی معارف کے موتی رولے ہوں اور انھیں اپنے اوراد و اشغال کی تسبیح میں پرویا ہو ۔ قوم کی خوش حالی اور خوش اعتقادی درویشوں کو دنیاوی جدوجہد سے بے نیاز کرنے میں مدد دیتی تھی۔ ریاضت شاقہ سے اور کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو، عوام پر صوفیوں کی بے غرضی، بےنفسی کا سکّہ جمتا تھا اور دُنیا دار علما کی قدر و قیمت گھٹاتا تھا ۔ اِدھر یہی زمانہ ہو جب کہ "وحدت وجود" کے عقیدے نے ایک مفصّل اور ہمہ گیر فلسفے کی شکل اختیار کی۔ ذہین صوفیوں نے اسے خوب پھیلایا۔ فارسی شاعروں نے طرح طرح سے مقبولِ عام اور دلکش بنایا۔ یہاں تک کہ اعمالِ شرعی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ طریقت، شریعت سے اونچی اُڑنے لگی۔ پھر تو لوگ ایسا کھل کھیلے کہ نیک و بد کی تمیز اُٹھا دی۔ ہمہ اوست کے نعرے لگاتے اور کفر و اسلام، عبد و معبود میں فرق کرنے کو جہالت بتاتے تھے!

مسلمانوں کی عملی زندگی کو اس فلسفے نے نقصان پہنچایا۔ اور بہ تدریج جہد و توکل، تقدیر و تدبیر کے تصوّرات کو ایسا مسخ کیا کہ پھر ان کی آرام طلبی، ایک دائمی ضعف اور عیش پسندی، ایک قومی بیماری بن گئی۔ لیکن یہاں ہمیں صرف مذہبی تاثرات سے بحث ہو۔ اور کچھ شک نہیں کہ ہمہ اوست کے نظریات اسلامی عقائد کو کم زور کرنے اور فرائض و عبادات کی پابندی کو کم وزن دکھانے کا مادہ رکھتے تھے ۔

صوفیوں سے مولویوں کا عہدہ برآ ہونا مشکل تھا۔ وہ اللہ کے ولی مانے جاتے تھے۔ عجیب عجیب کراماتیں اور خوارق اُن سے منسوب تھے۔ معلوم ہوتا تھا خدائی قانون کی باگ اُن کے ہاتھ میں ہے، جدھر چاہیں موڑ دیں! بارے نویں صدی (ہجری) کے اواخر میں تحریک، مہدویت نے شریعتِ ظاہر کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ علماے بے عمل کی تنقید میں مہدوی، صوفیوں سے زیادہ سخت واشد تھے، اور زہد و نفس کُشی میں بھی اہل صومعہ سے کم نہ رہے لیکن اسی کے ساتھ قرآن و سنّت سے خفیف ترین تجاوز جائز نہ رکھتے تھے اور جس طرح احکام شرعی کے خود پابند تھے۔ دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کا پابند بنانے میں تشدّد کرتے تھے :-

گذشتہ اوراق میں بانیٔ تحریک سید محمد جون پوریؒ کا مختصر تذکرہ آچکا ہے۔ دسویں صدی ہجری میں اسے عبداللہ خاں نیازی اور شیخ علائی سے تازہ قوت و سربلندی حاصل ہوئی۔ عبداللہ خاں، سُوری سلاطین کے زمانے میں ایک معزز افغان تھے کہ دین داری کے جوش میں مہدوی ہو گئے اور بیانہ میں فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ شیخ علائی، بنگالے کے پیرزادے تھے۔ ان کے باپ حج سے واپس آکر بیانے میں بسے اور یہیں سلوک و طریقت کی بساط جمائی تھی۔ شیخ علائی نے پیری کی گدی باپ سے، علم و فضل اپنی محنت و ذہانت سے اور خوش بیانی حسن تقدیر سے حاصل کی تھی۔ عبداللہ خاں کا خلوص و تقویٰ دیکھ کر شیخ نے مشیخت کا راستہ چھوڑ دیا۔ مہدوی طریقہ اختیار کیا اور چند ہی سال میں بیانے کو نئی تعلیم و تربیت کا

مرکز بنالیا۔ فقر و توکل کے ساتھ یہ لوگ دین کے مستعد سپاہی تھے۔ ہمیشہ ہتیار لگائے رہتے اور اپنے سامنے عام مسلمانوں کو بھی خلافِ شرع کام نہ کرنے دیتے تھے۔ دارالحکومت آگرہ، بیانے سے قریب تھا۔ شیخ کے گروہ میں روز افزوں اضافہ اور امر بالمعروف کے چرچے سنے تو اربابِ حکومت کے کان کھڑے ہوئے۔ سلیم شاہ سوری نے شیخ کو آگرے طلب کیا۔ اُس کی بازپرس کے جواب میں اُنھوں نے آخری بازپرس پر ایسی پرجوش، پرکیف تقریر کی کہ اہلِ دربار کی آنکھوں میں روزِ جزا کا نقشہ پھرنے لگا۔ موت یاد آگئی۔ بادشاہ بھی نہایت متاثر ہوا۔ لیکن شیخ کی بے باکی اور بے رخی سے بڑھ کر، اصل قضیہ مہدویت کا تھا۔ کئی دن مولویوں سے مناظرہ ہوتا رہا۔ شیخ علائی نے ان سب کی کم زوریاں طشت از بام کردیں۔ مگر اس سے اُن کا بنیادی دعویٰ مضبوط نہ ہوسکتا تھا۔ بادشاہ نے بہت سمجھایا کہ (جون پوری) مہدویت کے دعوے سے باز آؤ، پھر شوق سے، بلکہ میرے حکم سے وعظ وہدایت کے نقارے بجاؤ۔ شیخ نے نہ مانا۔ آخر حکم ہوا کہ ملک سے نکل جاؤ۔ شیخ دکن روانہ ہوئے لیکن سرحد ہی پر ٹھیر گئے۔ وہاں کا افغان امیر، اعظم ہمایوں سروانی اور اس کی فوج میں لشکر کا لشکر شیخ کا مرید ہوگیا سلیم شاہ کو درباری مولویوں نے پھر بھڑکایا۔ اس نے پہلے عبداللہ خاں[1] نیازی کو بیانے سے بلواکر خوب پٹوایا پھر شیخ علائی کو پکڑوا منگایا۔

---

[1] عبداللہ خاں نیازی سزا سے مرتے مرتے بچے تھے۔ ہندوستان سے نکل گئے کئی سال بعد دوبارہ آکر سرہند میں سکونت اختیار کی۔ مہدویت سے تائب ہوئے بلکہ ملا عبدالقادر کے سامنے ایک مغل کو پیش کیا جس نے گواہی دی کہ میں سید محمد جون پوری (بقیہ ۴۵۹ پر)

اب کے وہ آسے تو گلے میں زخم تھا۔ گویا تقدیر نے منہ بند کر دیا تھا۔ بادشاہ نے تامّل، تذبذب کے بعد شیخ الاسلام مولانا عبداللہ سلطان پوری کے حوالے کر دیا۔ وہ شیخ کے اصلی دشمن تھے۔ کوڑے مار کر ہلاک کیا اور لاش کی تشہیر کرائی ؛ (۹۵۶ھ)

مہدوی تحریک کو جبرًا دبانے کے سلسلے میں کئی علما اور مشائخ جن پر شبہ تھا کہ مہدویت کے حامی ہیں، احتساب کے شکنجے میں کسے گئے۔ اِنہی میں فیضی، ابوالفضل کے باپ شیخ مبارک ناگوری کا نام آتا ہے جو اسی الزام میں شیخ الاسلام مولانا عبداللہ کا معتوب ہوا اور طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھائیں۔ مہدویت کا قلعہ فتح ہو جانے سے علمائے دربار کے حوصلے بلند ہوے اور وہ دوسرے اہلِ بدعت و فساد سے معرکے ڈالنے لگے۔ آزاد مشرب صوفیوں کے علاوہ اِنہی دنوں ترکستان سے بعض منطقی، سوفسطائی نکالے گئے اور ہندوستان آکر مذہبی موشگافیوں کے سبق سکھاتے تھے۔ اُدھر ایران میں شیعیتؔ نئے ہتیاروں سے مسلح ہوکر میدان میں آئی تھی۔ ہندوستان کے حنفی سنّی علما اس حریف سے اندیشہ مند ہو رہے تھے۔ ان کی زود حسی بدگمانی اور محاسبے کی شدّت کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں مذکورۂ بالا اسباب کا لحاظ رکھنا چاہیے ؛ بہرحال، سُوری بادشاہوں کے دَور میں درباری علما کو جو اقتدار حاصل ہوا، وہ اکبری عہد تک قائم تھا۔ مولانا عبداللہ اور شیخ عبدالنبی ان علما کے نامی سرگروہ تھے اور انہی کے باہمی نفاق و تشدّد نے

(بقیہ ص ۴۵۸) کی وفات کے وقت فراہ میں حاضر تھا۔ سیّد موصوف نے خود اپنے دعوے مہدویت سے رجوع کر لیا تھا۔ (منتخب التواریخ۔ ج ۳ ص ۲۶ و ۲۷)

آگے چل کر بادشاہ کو علما سے بدظن کیا اور آسے دین کے دائرے سے نکال کر آزادی کی وادیوں میں گشت کرایا۔ ان دو بزرگوں کا مختصر حال ذیل میں پیش ہے:۔

مخدوم الملک، شیخ الاسلام مولانا عبداللہ سلطان پوری ان کے بزرگ ملتان سے آئے اور سلطان پور (ضلع جالندھر) میں آباد ہوئے تھے۔ مولانا عبداللہ کے علم و فضل کی شہرت نے ہمایوں بادشاہ کو پہلے دور میں ان کا معتقد بنایا۔ "مخدوم الملک" خطاب اور قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا۔ شیر شاہ سوری کے عہد میں "شیخ الاسلام" کے نام سے اقتدار کا پایہ اور اونچا ہوا۔ غالباً سلیم شاہ ان سے خوش نہ تھا اور حق یہ ہے کہ مطلق العنان بادشاہی دینی یا دنیاوی کسی قسم کی دست اندازی کو پسند نہیں کرتی۔ مخدوم، مذہبی مقدمات میں بادشاہ کو اپنی رائے پر چلاتے تھے۔ ایک مرتبہ سلیم شاہ نے امیروں سے یہاں تک کہا کہ بابر کے چار بیٹوں کو ہم نے ممالک ہند سے نکالا، مگر یہ پانچواں بیٹا باقی رہ گیا ہے! کسی نے پوچھا، پھر تم نے کیوں رکھا؟ کہا اس سے بہتر آدمی نہیں ملتا[1]۔ مخدوم کی اصلی کمزوری یہ تھی کہ اوروں پر تشدد کے باوجود اپنے عمل میں اخلاص نہ تھا۔ روپیہ سمیٹتے اور مختلف حیلوں سے زکوٰۃ تک ادا نہ کرتے تھے۔ نوجوان اکبر نے بیرم خاں کی اتالیقی سے نجات پائی تو مخدوم الملک کا ملک میں دخل کیوں کر گوارا ہوتا۔ یوں بھی وہ اُس وقت بڑا پُرجوش، مخلص

---

[1] کشف الغمہ، عصمت الانبیا، منہاج الدین، مخدوم کی مشہور تصانیف ہیں۔ شرح ملا پر بھی حاشیہ لکھا تھا۔ (دیکھو مآثر الامرا)

مسلمان تھا۔ شاید مخدوم کی بے اخلاصی دیکھ کر بدگمان ہوا اور شیخ عبدالنبی کو صدر صدور بنا کر ائمہ کی تنخواہ، مددمعاش، اوقاف وغیرہ کی نگرانی کا کام شیخ کے حوالے کر دیا۔ یہ ۹۷۲ھ کا واقعہ ہے۔ آٹھ دس برس تک شیخ عبدالنبی کی چڑھ بنی رہی، پھر ان سے بھی بادشاہ کی بگڑ گئی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ مگر ان چند سال میں اہل بدعت کے خلاف یہ دونوں صاحب متفق رہے اور الحاد و شیعیت کی نئی چنگاریوں کو دبانے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ یہاں تک کہ پہلے فیضی نے شعر گوئی کے ذریعے دربار شاہی میں رسائی پائی پھر ۹۸۲ھ میں اس کا بھائی ابوالفضل آیۃ الکرسی کی تفسیر نذر لایا اور حاشیہ نشینوں میں بٹھایا گیا۔ اگلے برس فتح پور سیکری کی نئی عمارتوں میں ایک مکان "عبادت خانہ" موسوم ہوا، جہاں جمعے کی شام کو اہل علم جمع ہوتے اور بادشاہ کے حضور میں مذاکرہ کرتے تھے (۹۸۳ھ = ۱۵۷۵ء) انہی میں فقہ کے اختلافی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ یہ وہ فروعات ہیں جن میں پرانے فقہا نے بال کی کھال نکالی ہے اور مختلف بلکہ متضاد آرا کا ایک طومار جمع کر گئے ہیں کہ اگر کوئی تحقیق کرنا چاہے تو غسل و وضو ہی کے مسائل میں برسوں غوطے کھاتا رہے۔ مولویوں کی کم عقلی ملاحظہ ہو کہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ایسا اُلجھتے تھے کہ گویا دین ایمان کا انحصار ہی ان جزئیات پر ہے۔ عبادت خانے کے مباحثوں میں یہی صورت پیش آئی۔ مخدوم الملک اور صدر صدور ایک ایک دوسرے سے لڑے اور بقول بداونی "اذا تعارضا، تساقطا" آپس میں کٹ مرے۔ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں کو انتقام کا موقع ملا۔ مخدوم اور صدر دونوں کو بادشاہ کی نظر سے گرا دیا۔ ایک محضر تیار

کیا کہ اختلافی مسائل میں بادشاہ عادل خود مجتہد کا رتبہ رکھتا ہے اور اس کی رائے، بشرطیکہ نص (قرآن) کے خلاف نہ ہو، قول فیصل مانی جائے گی۔ مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اسی کے مطابق عمل کریں۔" (تحریر ماہ رجب ۹۸۷ھ م ۱۵۷۹ء)

مخدوم الملک اور صدر الصدور سے جبراً وقہراً محضر پر دستخط لے لئے گئے تھے مگر مخدوم نے سرکار دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے بگڑ کر دونوں صاحبوں کو حجاز روانہ کیا وہاں سے چار سال بعد بغیر اجازت یہ واپس ہندوستان آئے تھے کہ گجرات میں گرفتاری کا حکم پہنچا۔ مخدوم الملک ضعیف العمر بزرگ تھے۔ قید کا صدمہ نہ برداشت کر سکے۔ احمد آباد ہی میں مر گئے۔ نعش وطن میں لائی گئی۔ ساتھ ہی کوتوالی کے فرشتے گھر میں گھسے اور سارا مال و اسباب بحق سرکار ضبط کر لیا۔ کہتے ہیں ان کے قبرستان میں بعض فرضی قبریں بنی ہوئی تھیں مخبروں نے انھیں کھدوایا تو سونے کی اینٹیں گڑی ہوئی برآمد ہوئیں۔ ان واقعات سے مرحوم کا اب کچھ نہ بگڑ سکتا تھا مگر طبقۂ علما کی اور مٹی خراب ہوئی۔

شیخ عبدالنبی صدر الصدور مخدوم الملک مرحوم کے حریف شیخ عبدالنبی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے بیٹے تھے۔ شیخ عبدالقدوس (صاحب انوار العیون) دسویں صدی ہجری کے مشہور فاضل اور صاحب ارشاد بزرگ ہوئے ہیں جن کے انوار کے چشمے دہلی سے دوآب تک جاری تھے۔ انھیں سماع سے رغبت تھی اور اس کے جواز میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ شیخ عبدالنبی نے جوانی میں

کئی حج کیے، علمائے حجاز سے دین کی تعلیم پائی، اور واپس آ کر والد کا رد تحریر کیا۔ والد نہایت ناراض ہوئے مگر یہی تصنیف اُن کے تقشف کی دستاویز اور دربار اکبری میں داخلے کی سند بنی۔ آگرے پہنچے تو نوجوان بادشاہ زہد و تقویٰ کا ایسا گرویدہ ہوا کہ اُن کی مسجد میں خود اذان دیتا اور جاروب کشی کو مباہات کا سرمایہ سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی اُن کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ زعفرانی جوڑا پہن کر آیا تو شیخ نے مارنے کو عصا اُٹھایا!

صدارت کے تخت پر بیٹھ کر شیخ نے شاہانہ داد و دہش سے کام لیا۔ مدارس و مساجد کے اہل استحقاق کو مدد معاش، وظائف، معافیات سے خوب نوازا اور دس گیارہ برس بڑی شان سے یہ خدمت انجام دی۔ معلوم ہوتا ہے عدالتی اختیارات بھی مخدوم الملک سے لے کر انھیں دئے گئے تھے اور وہ اہل بدعت سے محاسبہ کرنے میں کچھ کم تشدد نہ کرتے تھے۔ اسی میں بادشاہ سے ناگواری پیدا ہوئی۔ آخری قضیہ یہ پیش آیا کہ متھرا کے مہنت نے مسجد کے ملبے پر تصرف کیا اور مسلمانوں سے بڑی بدزبانی بلکہ بزرگان دین کی جناب میں گستاخیاں کیں۔ وہ اکبر کی رانی جودھا بائی کا پروہت تھا اور مقامی قاضی کے قبضے میں نہ آتا تھا۔ شیخ نے بہ مشکل بلا کر آگرے میں قید کیا اور اس کے جرائم پر قتل کا فتویٰ دے کر بادشاہ سے اجازت مانگی۔ اکبر بہت دن ٹالتا رہا۔ آخر کہا، دین کے مقدمات میں آپ کو اختیار ہے۔ شیخ نے مہنت جی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بادشاہ کو محل میں رانیوں نے اور باہر ابوالفضل وغیرہ نے شیخ کے خلاف مشتعل کیا کہ جب فقہا کا

اس باب میں اختلاف ہے، ایسی انتہائی سزا ہرگز مناسب نہ تھی۔ اسی سلسلے میں بادشاہ کے امام عادل و مجتہد ہونے کا وہ محضر مرتب ہوا تھا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ شیخ عبدالنبی کا انجام عبرت کی غم ناک تمثیل ہے کہ جب گجرات سے قید ہوکر آئے تو مُرید قدیم یعنی حضرت بادشاہ نے گفتگو کرتے کرتے مُنہ پر مُکّا مارا۔ شیخ نے کہا صاحب، مُکّا کیا چھری چلائیے! پھر اسی کچہری کی کوٹھڑیوں میں بند کیے گئے جہاں صدارت کا دربار لگاکر بیٹھتے تھے۔ ان کا حساب پاک تھا مگر بادشاہ کا دل صاف نہ تھا۔ اقبال نامۂ جہاں گیری کے قول کے مطابق اکبر کے اشارے سے ابوالفضل نے گلا گھونٹ کر مروایا۔ لاش تیسرے پہر تک بے گور و کفن میدان میں پڑی رہی۔ (۹۹۲ھ = ۸۴-۱۵ء)

تورانی منطق اور ایرانی شیعیت

ہندوستان کے اسلامی مدارس میں اُن دنوں معقولات کا زور تھا جس کا ہم کسی گزشتہ باب میں اشارہ کرچکے ہیں۔ دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کے بالکل آغاز میں ایران پر صفوی خاندان کا علم بلند ہوا۔ اسمٰعیل صفوی نے شیبانی خاں ازبک کو سخت شکست دی۔ مقتول حریف کے کاسۂ سر پر سونے کا خول چڑھاکر پیالہ بنوایا۔ سُنّیوں سے اسے سخت تعصب ہوگیا تھا[۱]۔ اس دہشت کے دور میں بہت لوگ

---

[۱] اسمٰعیل ایک صوفی بزرگ شاہ صفی الدین کی اولاد میں تھا۔ ابتدائی فتوحات نے اسے ولی، وارث علیؓ مشہور کردیا تھا۔ مگر عثمانی سلطان سلیم فاتح کے مقابلے میں ولایت و شجاعت کچھ کام نہ آئی اور ایسی شکست ہوئی کہ کہتے ہیں پھر اسمٰعیل جیتے جی کبھی نہ مسکرایا۔

وطن چھوڑ کر بھاگے۔ خانہ برباد اساتذہ کا ایک گروہ جان بچا کر ترکستان چلا آیا۔ زیادہ تر انہی پناہ گزینوں نے یہاں منطق و فلسفہ کی تعلیم پھیلائی اور یہ نئی چیز یہاں کے اہلِ مدرسہ کو بہت پسند آئی۔ پرانے مولویوں کو طرح طرح کے مغالطے دیتے اور خوب مذاق اُڑاتے تھے۔ حتیٰ کہ قدیم علما اور مشائخ نے فتویٰ لکھ کر عبداللہ خاں اُزبک کے سامنے پیش کیا۔ منطق کی تعلیم حکماً موقوف کرائی اور کئی معلّم، ملحد بنا کے شہر بدر کئے گئے۔ یہ جلاوطن ہندستان میں پناہ لینے آئے۔ ان میں تین اُستاد، مُلّا عصام، مُلّا مرزا جان اور قاضی ابوالمعانی، ممتاز ہیں۔ انہی قاضی صاحب سے فیضی، ابوالفضل اور مُلّا عبدالقادر نے درس لیا تھا یہ تعلیم عقل کی قینچی کی دھار بٹھاتی تھی، جو کاٹ میں اپنے پرائے کا کچھ فرق نہیں کرتی ؛

قدیم عقائد میں نئی شیعیت نے الگ اختلال ڈال دیا تھا ؛

جب چنگیز خانی مغلوں نے باطنی حکومت کا قلعہ ایران میں مسمار کیا اور ترکوں نے مصر و شام میں اِن کی ظاہری ریاست خاک میں ملائی تو اصلی تحریک ایک محدود غیر سیاسی جماعت بن کے رہ گئی[1] لیکن زیادہ پُرجوش رفیق، صوفیوں اور شیعوں میں شامل ہو گئے اور اہلِ اسلام کے خلاف لڑائی جاری رکھی۔ پہلے بھی یہ لوگ ہمیشہ چھپ کر لڑتے

---

[1] اس جماعت کا صدر مرکز اب بمبئی ہے ہز ہائی نس آغا خان امامِ وقت ہیں۔ بمبئی میں یہ لوگ خوجے کہلاتے ہیں اور تجارت کی دُنیا میں ممتاز ہیں ؛

اور بے خبری میں وار کرتے تھے۔ صوفی بن کر وحدت وجود کی آڑ لی اور اشعار و اقوال کے شربت میں غیر اسلامی عقائد کا زہر گھول دیا۔ شیعیان علیؓ کے حلقے میں آئے تو سبِ صحابہ کو اولاد فاطمہ کی محبت کا معیار قرار دیا اور ایک جذباتی اختلاف کو اشتعالی خصومت بنا دیا۔ اس آگ پر ایران کی وطنی حمیت تیل کا کام کرتی تھی۔ اسی کی لپٹیں ہندوستان تک پہنچ جاتی تھیں۔ جلاوطن ہمایوں کو صفویوں کی مدد قندھار لائی۔ اور وہ دوبارہ پاکستان و ہند میں داخل ہوا تو صدہا شیعہ سردار و سپاہی ہم رکاب تھے۔ اکبر کی ترقیٔ دولت نے ایرانیوں کی آمد کا سلسلہ بڑھا دیا۔ بہت سے اہل علم و فن ہندوستان آتے اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ ان میں جو لوگ مذہبی غلو رکھتے تھے، انھیں صحابہ رسولؐ ہی کا دینی مراتب نہ تھا۔ بعد کے فقہا اور علماء کی کیا حقیقت سمجھتے تھے۔ غرض، مذہبی خیالات میں تصادم و تلاطم کا یہ ایک اور عنصر انہی دنوں آگرے پہنچ گیا؛

دین الٰہی اکبر شاہی

اکبر کی پیدائش اور ابتدائی پرورش جن پریشانیوں میں ہوئی ان کی وجہ سے وہ کتابی تعلیم سے محروم رہا۔ ۱۴ سال کی عمر میں سلطنت کی وراثت، اور ۱۸ ویں سال اختیارِ مطلق ہاتھ آ گیا۔ بیس برس تک جنگی فتوحات اس کی عمل داری کو برابر بڑھاتی رہیں۔ مذہبی اعتبار سے یہ تمام زمانہ ایسے اخلاص و خوش اعتقادی میں گزرا جس کی بڑے بادشاہوں میں نظیر ملنی دشوار ہے۔ خواجہ معین الدین اجمیری رحؒ سے خاص عقیدت تھی۔ آگرے سے ہر سال درگاہ شریف پر حاضر ہوتا اور بعض

اوقات پورا سفر پیدل چل کر آتا تھا۔ روزے نماز کے ساتھ یا ہادی، یا معین کا وظیفہ پڑھتا۔ ہم بھیجتے وقت حضرت کی روحانیت سے برکت و نصرت کی دعا چاہتا تھا۔ جہاں کہیں کسی درویش باخدا کا حال سنتا، خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اخذ فیض کرتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی رح سے اتنی ارادت تھی کہ اپنی حاملہ بیوی کو شیخ کی درگاہ میں بھیج دیا اور ولادتِ فرزند کو انہی کی دعا کی برکت جانا انہی کے نام پر سلیم نام رکھا جو آگے چل کر جہاں گیر کے لقب سے سلطنت کا وارث ہوا ؛ اسی طرح علمائے دین کی بڑی عزت حرمت کرتا تھا۔ شیخ عبدالنبی کا وہ احترام تھا کہ ادنیٰ درجے کے لوگ بھی اُستاد کی اتنی تعظیم نہ کرتے ہوں گے ؛

علما سے بادشاہ کی کشیدگی اوّل اوّل مُلکی مصالح کی بنا پر ہوئی پھر ان صاحبوں کی باہمی مخالفت نے اس کا دل کھٹا کر دیا۔ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں نے ان علما کے ہاتھ سے بڑی ایذا پائی تھی۔ اب شاہی خیر خواہی کے لباس میں اپنا انتقام لیا اور اکبر کو مذہبی علما کی تقلید سے اسی طرح منحرف کر دیا جس طرح ابتدا میں خود غرض حریفوں نے بیرم خاں کی اتالیقی سے آزادی دلادی تھی۔ پھر مولویوں کی طرف سے جتنی روک تھام ہوئی، اسی قدر بادشاہ کی ضد بڑھتی گئی۔ بہت سے علما اور قضاۃ اکبری سیاست کا شکار ہوئے اور اسی جبر و قہر کا ردِ عمل یہ تھا کہ ۹۹۰ھ (= ۱۵۸۲ء) میں بادشاہ نے تقلیدی مذہب کو خیرباد کہا اور اپنے نزدیک بالکل بے لاگ تحقیقات شروع کی۔ عبادت خانے میں اسلامی فرقوں کے علاوہ، عیسائی، پارسی، ہندو

غرض ہر مذہب کے علما کو شرکت کی دعوت دی اور ہر ایک کے عقائد وشعائر سیکھنے کی کوشش کی۔ یہ بجائے خود قابلِ اعتراض بات نہ تھی لیکن اس کا اعلان ایسے اعمال سے ہوا جو مسلمانوں سے اعلانِ جنگ کی شان رکھتے تھے۔ سب سے پہلے ڈاڑھیوں پر آفت آئی۔ پھر دربار میں سجدہ یا زمین بوس کی رسم لازمی قرار پائی۔ ریشمی لباس اور اعتدال سے شراب نوشی جائز کر دی گئی۔ تخت کے گرد کتے اور سؤر قیمتی جھولیں پہنا کر بٹھائے جانے لگے۔ سرکاری مدارس میں عربی تعلیم موقوف، علوم عقلی پڑھانے کا حکم ہوا۔ شمسی سال اور زرتشتی عیدیں رائج کی گئیں۔ سلام کی بجائے "اللہ اکبر" جواب میں "جلّ جلالہٗ" کی رسم جاری ہوئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ حرکتیں بے لاگ تحقیق میں تو کیا مدد دیتیں، مسلمان علما کے جذبات کو ضرور چرکے لگاتی تھیں۔ وہ چوری چھپے کفر کے فتوے دیتے اور بادشاہ اور اس کے ندیموں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ ملا عبدالقادر بداونی تاریخ نویسی کی طرح تاریخ نکالنے میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر سن کے سوانح اور وقائع کے ساتھ "کفر شائع شد" "فتنہ ہائے امت" "احداث بدعت" کی تاریخیں لکھ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ ملا شیری (سیالکوٹی) نے ایک قطعہ لکھ کر بادشاہی بدعتوں کی تضحیک وتحمیق کی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں:-

"تا بماید ہر زماں، کشور بر انداز، آسفتے
فتنہ در کوئے حوادث کتخدا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلے

کز خلائق رہبر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زیں بیت کز بس طرفگی
نقل بزمِ منعم و وردِ گدا خواہد شدن!
بادشاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن!

یہی نئی آزادی اور جدید تجربات کا زمانہ ہے جب کہ اکبر سُنّیوں کی ضد میں اوّل اوّل شیعوں اور ایسے صوفیوں کی طرف مائل ہوا جو عقائد میں نسبتہً آزاد اور زبان چلانے میں بے باک تھے۔ لیکن جب تعریض کی نوبت ائمہ اربعہ سے گزر کر ائمہ اثنا عشر اور انبیاءؑ تک پہنچی تو یہ بھی گھبرا کر پیچھے ہٹے اور تقلیدِ آبا کے کٹہرے میں کھڑے کر دئیے گئے۔ یہی حشر پنڈتوں، (نوساری کے) پارسی موبدوں، جینیوں اور پرتگیز پادریوں کا ہوا جنھیں باری باری سے یقین ہو گیا تھا کہ بادشاہ اُن کا مذہب قبول کر لے گا۔ خصوصًا عیسائی مبلّغ کئی سال تک مذہبی مباحثوں میں بڑھ بڑھ کر حصّہ لیتے اور پاپائے روما تک یہ اطلاعیں بھیجتے رہے کہ اکبر اسلام سے برگشتہ ہو گیا اور اب دینِ مسیحی کے سوا اُسے کہیں ٹھکانا نہ ملے گا؛[ل] لیکن یہ ان کا محض حُسنِ ظن تھا۔ بادشاہ اور اُس کے مشیر ہر مذہب کو اپنے علم و عقل کی کسوٹی پر کستے

[ل] جیسوائٹ پادریوں کے وفود اور اُن مراسلات کا ترجمہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسائل بابت ۱۸۹۶ و ۹۹ء میں چھپا ہے۔ نیز دیکھو وی اسمتھ کی کتاب "اکبر دی گریٹ مغل"

تھے اور جو چیز ان کی سمجھ میں نہ آتی (جیسے حشر و نشر، وحی و رسالت یا الہیات کے دوسرے مسائل) اسے بے تکلف رد کر دیتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ تحقیق کرنے والا اتنا بڑا صاحب دولت و اقتدار بادشاہ تھا جس کے دامن سے سینکڑوں اشخاص کی اغراض وابستہ تھیں۔ اس کی خوش نودی، خوش حالی کی کفیل تھی۔ لہذا آخر میں خاص مشیر و محرم وہی لوگ رہ گئے جو کمال ذہانت سے اپنی ریاکاری چھپاتے تھے اور درحقیقت محض بادشاہ کے میلان کے مطابق سخن سازی کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے تھے۔ اسی قسم کے خوشامدیوں نے عجیب عجیب دلائل سے یہ بات خاطر نشین کی کہ سب پچھلے مذاہب میں تحریف ہوئی، اور ایک ہزار سال کے دَور نے اسلامی شریعت کی عمر پوری کر دی اب ایک نئے دین اور نئے شارع کی ضرورت ہے، اور اس بزرگ منصب کے سزاوار آپ ہیں! جھوٹی سچی پیش گوئیاں، پنڈتوں کی پوتھیاں، نجومیوں کے احکام، اولیاء اللہ کے اقوال و اشعار تصدیق میں جمع کئے گئے اور کچھ عجب نہیں کہ ان تدلیسات کے پے در پے جال میں یہ زیرک مگر کم علم خود پسند بادشاہ پھنس گیا اور اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھنے لگا ہو۔ بہر تقدیر، خلیفۂ اوّل علامی ابوالفضل کو حکم ہوا کہ نئی شریعت کا خاکہ اور چیلا (یا مُرید) بننے کی ضروری شرطیں مرتب کرے +

غالباً یہ سن ۹۹۱، ۹۹۲ھ (مطابق ۱۵۸۳ء) کے واقعات ہیں۔ ان کی ترتیب اور تاریخ کچھ یقینی نہیں اور نہ "دین الٰہی، اکبر شاہی" کے عقائد و عبادات صحت و وضاحت سے محفوظ رہے۔ ابوالفضل نے اجمال و ابہام سے کام لیا ہے۔ مُلّا عبدالقادر کی تفصیل میں تضحیک

اور پادریوں کے بیانات میں سماعی روایات اور ذاتی قیاسات شامل ہو گئے ہیں۔ اصل میں اکثر مرید با اخلاص ہی جو حضور میں ہاں میں ہاں ملاتے تھے، جب باہر نکلتے تو نئی شریعت کو ہنسی دل لگی کے پیرائے میں پیش کرتے تھے۔ تیس چالیس برس بعد "دبستان مذاہب" کے مولف نے بہت کوشش کی مگر بداونی کی روایات سے کچھ زیادہ حالات فراہم نہ کر سکا اور دینِ الٰہی کا کوئی ماننے والا آسے نہ ملا۔ کہاں سے ملتا؟ خود بانی کے زمانے میں اُس کے چیلے (ابوالفضل کے بقول[1]) کل ۱۸ تھے اور ان میں بھی سچ پوچھیے تو شاید کسی کا اعتقاد بے لوث و بے ریب نہ تھا۔ تاہم اتنا یقینی ہو کہ نئے مذہب میں خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا جاتا تھا۔ سورج کی عظمت، زرتشتیوں سے اور آجک آجک کر یا اُلٹے لٹک کر یادِ الٰہی کے طریقے جوگیوں سے اُڑائے گئے تھے۔ ہر چیلے کو "اخلاص چارگانہ" یعنی ترکِ مال، ترکِ جان، ترکِ ناموس، ترکِ دین، کا اقرار کرنا پڑتا تھا۔ مگر دین سے دین تقلیدی مُراد لی جاتی تھی ؛

دینِ الٰہی کا کئی سال خاصا ہنگامہ برپا رہا۔ پھر بادشاہی سیاست کے خوف سے مخالفوں نے خاموشی اختیار کی، تو بحث مباحثے کا لطف بھی جاتا رہا۔ جدید عقائد و اعمال چند ہی روز میں بے مزا معلوم ہونے لگے۔ زیادہ مایوسی اس لئے ہوئی کہ جاں نثار و خدمت گزار ہندوؤں نے نئے مذہب کی طرف بالکل رُخ نہ کیا۔ ۱۸ چیلوں میں

[1] دیکھو بلوخمن، ترجمہ آئینِ اکبری صفحہ ۲۰۹ ؛ دبستان مذاہب، تعلیم دہم ؛

صرف ایک ہندو بیربر کا نام آتا ہے، سو وہ محض بادشاہ کا خوشامدی مسخرا تھا۔ نئے دین کی ایجاد و ابداع کے اصل محرک شیخ مبارک اور ان کے دونوں بیٹے بتائے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ۱۰۰۱ میں شیخ اور ۱۰۰۴ ہجری میں فیضی کے انتقال سے اس نو ساختہ قصر کے دو ستون گر پڑے۔ ابوالفضل پر اکبر کو نہایت اعتماد تھا اور ذاتی، ملکی، مذہبی، ہر اہم معاملے میں اس سے مشورہ لیتا تھا لیکن ۱۰۰۲ ہجری میں خان اعظم میرزا عزیز کوکہ جو پہلے بادشاہ کی بدمذہبی سے خفا ہو کر حجاز چلا گیا تھا، واپس آیا اور مریدان باا خلاص میں داخل ہوا۔ اکبر اسے بھائیوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ پچھلی نافرمانی، ترش زبانی سب معاف کی اور وکیل مطلق بنا کر شاہی مہر اسی کے سپرد کردی۔ انہی ایام (یعنی ۳ ہجری) میں سید مرتضیٰ (المعروف بہ شیخ فرید) کہ دیانت و لیاقت میں فرد فرید تھے، میر بخشی یعنی فوج کے وزیر مقرر ہوئے۔ ایسے راسخ العقیدہ اور باخدا افراد کا تقرب پانا، کچھ تعجب نہیں کہ بادشاہ کے عقائد میں اعتدال کا وسیلہ بنا ہو۔ ۷ ہجری (مطابق ۹۸ ۱۵ ء) میں دین الٰہی کا خاص داعی ابوالفضل، دربار سے دور، دکن کی مہمات پر بھیج دیا گیا۔ بادشاہ کی مذہبی لن ترانیاں دھیمی پڑ گئیں۔ اور زندگی کے آخری سنین میں وہ علانیہ تائب نہ ہوا ہو تو بھی ممکن ہے دل میں نادم ہو۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ ابوالفضل کے خاتمے (۱۰۱۱ھ) کے ساتھ اکبر کی بداعتقادی کا خاتمہ ہوا اور وہ ایک پاک عقیدہ مسلمان کی طرح دنیا سے خدا کے حضور میں گیا۔[۱]

---

[۱] ابوالفضل نے بادشاہ کی تائید کے پیرائے میں جہانگیر کو اکبر نامے میں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۳ پر)

باب پانزدہم ۱۵

مشاہیر علم و ادب

اکبر کا زمانہ سلطنت کی وسعت و استقامت میں جس قدر ممتاز ہوا، اس سے کہیں زیادہ اہلِ کمال کی کثرت سے تاب ناک ہے۔ ہم عصر تاریخیں ان کے تذکروں سے معمور ہیں۔ انھیں پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ہند نے قدر شناسی کے دربار میں اپنے نادر جواہرات اُگل دیے اور ولایاتِ خارجہ کے چمکتے ہوئے موتی اسی فیض کے دامن میں ڈھلک آئے تھے۔ ان سب کو کتاب کے آئینہ خانے میں سجانا، اکبری مورخ کا کام ہے، مگر بعض ایسے مشاہیر ہیں جن کے نام ہماری تہذیبی تاریخ میں مستقل مقام رکھتے ہیں۔ زمانۂ حاضرہ میں ان پر انگریزی، اردو

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۲) صاف صاف بغاوت اور نا اہلی کے الزام لگائے ہیں۔ ان باتوں نے جہاں گیر کو اتنا مشتعل کیا کہ اس نے ابوالفضل کو جان سے مروا دیا۔ لیکن دربار کے دوسرے مذہبی حلقوں میں مقتول کا نا مقبول ہونا، اُس مصرعۂ تاریخ سے ظاہر ہے جسے خان اعظم سے منسوب کرتے ہیں: ع ۔ تیغِ اعجازِ نبی اللہ سرِ باغی "بُرید!

میں کئی کتابیں اور بہت سے مضامین چھپ چکے ہیں۔ اُن کی شہرت اس تاریخ میں جگہ پانے سے مستغنی ہو لیکن ہماری تاریخ اُن سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔ لازم ہوا کہ چند چیدہ مرقعوں سے اِن اوراق کی تزئین کی جائے ؛

اکبر خود پڑھا لکھا نہ تھا۔ مگر ذوقِ سلیم فطرت کی سرکار سے اور علم دوستی باپ دادا سے وراثت میں پائی تھی۔ دادا کی انشا پردازی کا ایک گذشتہ باب میں ہم نمونہ دیکھ چکے ہیں۔ وہ تُرکی زبان کا اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا۔ اس کا دیوان اور دو ہزار شعر کی مثنوی (مُبیین) کہ مذہبی رنگ میں لکھی تھی، ابھی تک محفوظ ہیں۔ بابر کے حاشیہ نشینوں میں ایک بزرگ شیخ زین الدین وفائی نے اس مثنوی کی شرح اور تُزک بابری کا فارسی ترجمہ کیا تھا ؛ بابر کبھی کبھی فارسی شعر کہتا تھا مگر ہمایوں کو اس زبان میں شعر گوئی کی پوری قدرت حاصل ہوئی۔ اس کا قلمی دیوان چند سال ہوئے بہار کے ایک نجی کتب خانے میں بھی ملا جس پر پٹنہ کالج میں فارسی کے اُستاد حافظ شمس الدین صاحب نے اردو تبصرہ شایع کیا تھا ؛ علم ہیئات و ریاضی میں اُس کی تحقیقات اور اصطرلاب اور کروں کے بنانے میں بعض اختراعات "قانون ہمایونی" میں درج ہیں۔ یہ رسالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے چھپوایا تھا اور اُس عہد کے نامی مؤرخ خواند میر صاحب حبیب السیر کی تصنیف ہے۔ خواند میر آخر زمانے میں ہرات چھوڑ کر ہمایوں کے پاس چلا آیا تھا اور تخت گاہ دہلی ہی میں رحلت کی ؛ اسی عہد میں

قاسم کاہی نے نشوونما پائی۔ اس کا حال آیندہ اوراق میں ہم پڑھیں گے؛ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری بھی صاحب تصنیف بزرگ تھے، جنھیں ہمایوں کی سرپرستی نے مسندِ صدارت پر بٹھایا تھا۔ عہد اکبری میں ان غریب پر جو کچھ بیتی وہ عبرت کی کہانی گزشتہ باب میں ہماری نظر سے گذر چکی ہے؛

شیخ مبارک ناگوری

مولانا عبداللہ کا مشہور حریف شیخ مبارک ناگوری تھا۔ اگرچہ اس کی کوئی کتاب یادگار نہیں رہی مگر فیضی اور ابوالفضل جیسے اہل قلم کا باپ تھا اور شاگردوں میں شیخ عبدالقادر بداونی جیسا نقاد یہ سند دے گیا ہے کہ اس جامعیت کا مُلّا دیکھنے میں نہیں آیا؛ پھر وہ محضر جس کی رو سے اکبر امام عادل اور مجتہد قرار پایا، شیخ مبارک ہی نے تحریر کیا تھا۔ اور نتائج کے اعتبار سے یہ ایک ورق کی تصنیف بہتیری کتابوں پر بھاری ہے! شیخ مبارک ۹۱۱ھ میں بہ مقام ناگور پیدا ہوئے۔ باپ سندھ کے کوئی نو وارد بزرگ تھے کہ چند سال بعد واپس چلے گئے۔ پھر پلٹ کر خبر نہ لی۔ بچّے کی پرورش ماں نے کی۔ وہ غالبًا کوئی باندی یا غریب خادمہ تھی لیکن لڑکے کا شوق اور ذہانت دیکھ کر خود محنت مشقت کرتی اور آسے تعلیم دلواتی رہی۔ ان دنوں اعلیٰ تعلیم کچھ مہنگی نہ تھی۔ شیخ نے ناگور میں علوم رسمی کی تکمیل کے بعد احمد آباد گجرات کا رُخ کیا۔ وہاں معقول و منقول کے بڑے بڑے اُستاد جمع تھے۔ ان علوم کے ساتھ، بزرگانِ صوفیہ سے طریقت کے سبق لئے ۔ فلسفۂ وحدت الوجود کی مشہور کتابیں مطالعہ کیں ۔ حجاز اور اسلامی ممالک کی

سیر کا قصد تھا لیکن ایک بزرگ کے مشورے سے آگرے چلے آئے
اور جمنا پار چار باغ کے محلّے میں قیام کیا (۹۵۰ھ) علم و فضل سے
بڑھ کر زہد و تقویٰ میں مشہور تھے کہ کوئی سونے کی انگوٹھی، ریشمی لباس
یا ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہن کر ملنے آتا تو پائینچے کتروا دیتے۔ انگوٹھی
اتروا دیتے تھے؛

یہ زمانہ وہ تھا کہ مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری امور مذہبی
کے وزیر بلکہ امیر بنے ہوئے تھے۔ مہدویت اور بدعت کی سرکوبی
کرتے کرتے ایسی قوت حاصل کر لی تھی کہ شوری بادشاہ اور امرا تک
ان سے دبتے تھے۔ ہر مقدمے میں جہاں مذہب کی لاگ ہوتی، ان کا
فیصلہ قطعی، اور فتویٰ اٹل مانا جاتا تھا۔ ان کے اقتدار کے سامنے
دوسرے مولوی مُلّا زبان نہ کھول سکتے تھے لیکن مثل مشہور ہے کہ معاصرت
سے رقابت پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ مبارک اپنے حلقے میں سرکاری علما
کے فتاوی پر خفیہ نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ شیخ علائی کے مناظرے میں
دبی زبان سے شیخ کی تائید کرنا بھی مذکور ہے۔ غرض مخدوم الملک ان
سے ناراض اور بدگمان ہو گئے۔ جب شوریوں کا شیرازہ بکھرا اور
دوبارہ مغلوں کا جھنڈا گڑا، تو مخدوم الملک نے ان پر عقائد کے فساد
اور غالباً ہیمو بقال سے ساز باز کا الزام لگایا۔ شیخ مبارک چھپ کر
بھاگے اور مدتوں تک اِدھر اُدھر جان بچاتے پھرے۔ آخر مرزا
عزیز نے اکبر بادشاہ سے سفارش کر کے جان بخشی کرائی۔ پھر وہ ایک
زمانے تک اپنے بچوں سمیت دہلی کی مختلف درگاہوں میں مقیم رہے؛
آخر ۹۷۴ھ میں فرزند اکبر ابوالفیض فیضی نے شاعری کے زینے سے

شہ نشینِ شاہی تک رسائی پائی اور چند سال بعد دار الانشا کی بساط پر ابو الفضل کا قدم ایسا جما کہ سارے قدما لڑکھڑا گئے۔ مولویوں سے بادشاہ دل برداشتہ ہو رہا تھا جب کہ بیٹوں نے شیخ مبارک کو حضور میں پیش کیا اور دل نشین کر دیا کہ وہ مولویت میں مخدوم الملک اور صدر صدور سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ شیخ کو درباری آداب سے آگہی نہ تھی لیکن بادشاہ کو خوش کرنا اور اپنے رقیبوں سے انتقام لینا آتا تھا بادشاہ کے امام عادل ہونے کی دستاویز تیار کی۔ سرکاری مولویوں سے جبرًا دستخط لئے گئے۔ حقیقت میں یہ مولویت کے قتل کا محضر تھا جس نے سرکار دربار میں اُن کے اقتدار کا خاتمہ کرا دیا۔ شیخ مبارک نے بڑھاپے میں بڑا میدان جیتا لیکن اس کے علم و فضل کی شہرت بھی طعن و ملامت کی آندھیوں میں اُڑ گئی اور عجیب واقعہ یہ ہوا کہ زہد اور مجاہدات کی بجائے زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل گئی۔ یا حُرمتِ سماع کے قائل تھے سرودِ ہمسایہ سُن کر کانوں میں اُنگلیاں دیتے تھے، اور یا وقت کا بڑا حصہ ہی موسیقی سے لطف اٹھانے میں گزرنے لگا؟ آخر میں صحت خراب، بصارت کمزور ہوگئی تھی۔ لاہور آ رہے تھے۔ مگر درس تدریس کے ساتھ تصنیف کا شغل جاری رہا۔ ایک ضخیم تفسیر "منبع نفائس العیون" تحریر کی کہ اب اس کا نام تک مشکوک ہے[1] ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ اس میں مجددیت کی ضرورت پر تقریر تھی اور یہ اشارہ بھی نکلتا تھا کہ دسویں صدی ہجری کا مجدد خود مصنف ہے!

[1] منتخب۔ ۲۔ ص۲۷۔ آزاد بلگرامی نے "منبع عیون المعانی" اور محمد حسین آزاد نے "نفائس العلوم" نام لکھا ہے۔ (دیکھو مآثر الکرام ص۱۹۸۔ دربار اکبری ص۳۵۲)

حال آں کہ بادشاہ کو امام عادل اور مجتہد کی کرسی پر بٹھانے کے بعد کسی مجدد کے واسطے جگہ نکالنا، جمع نقیضین کی مثال معلوم ہوتا ہے؛ اواخر ۱۰۰۱ھ میں انتقال کیا۔ لاش کچھ عرصے بعد لاہور سے لاکر چار باغ آگرے میں دفن کی گئی؛ فیضی، ابوالفضل کے علاوہ کئی بچے چھوڑے، جن میں سے دو شیخ کی وفات کے چند روز بعد پیدا ہوئے تھے؛

مصنفین صوفیہ

جیساکہ پہلے بیان ہوا، دسویں صدی ہجری میں ممالک ہند و پاکستان میں بزرگان صوفیہ کا ہر طرف ہجوم تھا۔ مختلف اقطاع اور تمام بڑے بڑے شہروں میں حال و قال کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ تذکروں میں صدہا بزرگوں کے حالات مذکور ہیں۔ ان میں بھی زیادہ نمایاں میاں حاتم سنبھلی، شیخ محمد غوث گوالیری، شیخ سلیم چشتی، شیخ نظام الدین امیٹھی وال، شیخ الہدیہ خیرآبادی، شیخ داود جہنی وال، (رحمہم اللہ تعالےٰ) کے نام نامی ہیں۔ ان میں کئی صاحب تصنیف تھے جن کا ترکہ ناخلف اولاد نے تلف کر دیا۔ انہی اہل قلم صوفیہ میں ایک بزرگ شیخ امان پانی پتی تھے کہ فلسفے کے ٹھوس مسئلوں کو بیان کی لطافت سے پانی کر دیتے تھے۔ ان کا رسالہ "اثبات الاحدیہ" جو "ورائیہ" بھی کہلاتا تھا، شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریات پر نہایت صاف اور دلنشین تحریر ہے جس کی اشاعت نے اہل صومعہ میں خاصی ہل چل ڈال دی تھی۔ کئی رد لکھے گئے لیکن اس کی قبولیت میں فرق نہ آیا۔ ایک ضخیم شرح ملا جامی کی سوانح پر لکھی تھی۔ ۹۵۰ھ میں انتقال ہوا اور معتقدین کا ایک بڑا گروہ وارث چھوڑ گئے جن میں

شیخ تاج الدین، مولانا رکن الدین اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد شیخ سیف الدین جیسے فضلا کے نام شامل ہیں۔

اسی دور کی ایک اور کتاب جو اب تک سرسبز ہے، "سبع سنابل" سید عبدالواحد بلگرامی کی یادگار ہے۔ اس میں مسائل اخلاق و تصوف کو بزرگانِ دین کی تمثیلات سے روشن کیا ہے۔ مصنف بڑے عالی خاندان، صاحب حال و قال بزرگ تھے۔ شاعری اور موسیقی میں ماہرانہ دخل تھا۔ ایک ضخیم کتاب "شرح نزہتہ الارواح" لکھی تھی علم و فضل کی تعریف سن کر اکبر بادشاہ نے مشتاقانہ طلب کیا اور آگرے میں ملاقات کی۔ سو سال سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔ مزار بلگرام میں ہے۔ ایک اور جامع کمالات شیخ یعقوب کشمیری صرفی گزرے ہیں کہ کشمیر کے چک رئیسوں کے خلاف محضر لکھنے اور مغل بادشاہوں کو فتح کشمیر کی تحریک دلانے میں ان کا نام پیش پیش تھا۔ وہ شیخ حسین خوارزمی رح کے خلیفہ اور شیخ ابن حجر جیسے نامور اُستادِ حدیث کے شاگرد تھے۔ اسلامی ممالک میں دُور دُور سفر کیا اور مشاہیر علم سے مستفید ہوئے۔ ان کی خانقاہ مرجع خاص و عام تھی۔ ہمایوں اور پھر اکبر بادشاہ کمال عزت سے پیش آتے تھے اور آگرے کے علمی حلقوں میں ان کی شرکت نعمت سمجھی جاتی تھی۔ تفسیر، حدیث اور تصوف پر کئی اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھیں۔ اور فارسی شعر و معما گوئی میں بھی امتیاز رکھتے تھے شیخ عبدالقادر بداونی کی تعریف میں ان کا قطعہ فاضل موصوف کی فضیلت پر مُہر کا مرتبہ رکھتا ہے[۵]۔ ۱۰۰۳ھ میں وفات پائی۔

---

۵ یہ قطعہ جس میں بداونی کو علامہ جلال الدین دوانی رح پر ترجیح دی گئی ہے [منتخب، بقیہ حاشیہ]

بداونی نے "شیخ اُمم بود" سے تاریخ نکالی اور اس شعر سے ماتم کا حق ادا کیا : ؎

سلامٌ علی الدنیا و طیب نعیمھا
کان لم یکن یعقوب فیھا یجالس!

درباری شعرا

اکبر جیسے فیاض اور بلند اقبال بادشاہ کے دربار میں شاعروں کی کثرت ہونا لازمی بات تھی۔ مُلّا عبدالقادر اور شیخ ابوالفضل ہی نے ایسے بیسیوں ستائش گروں کے نام اور نمونۂ کلام اپنی تاریخوں میں درج کئے ہیں۔ ہم صرف چند منتخب درباری شعرا کے اجمالی تذکرے پر قناعت کریں گے :

غزالی مشہدی :۔ غالبًا پہلا شخص ہے جسے ہندوستان کے مغلیہ دربار سے "ملک الشعرا" کا خطاب ملا۔ کئی دیوان، اعلیٰ درجے کی مثنویاں اور قصائد لکھے تھے کہ اب ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ ایک قصیدے میں پہلے ہندسے سے سوتک جملہ اعداد کو نادر ترین تشبیہات سے سجایا ہے۔ مطلع یہ تھا ؎

بہ یک سخن ز دو لعلت سہ فیض یافت مسیحا
حیات باقی و نطق فصیح و نشارۃ احیا

آزاد خیالی کی بنا پر وطن سے بھاگ کر دکن آیا تھا، وہاں سے

(بقیہ حاشیہ ص۴۷۹) ایک رقعے میں لکھا تھا :۔

از دو آلی، بداونی بے شک — در فنون فضیلت ہست فزوں
بس دلیل زیادت معنیش — کہ بنائش بہ صورت است فزوں!

خان زماں خاں نے خلعت و سفر خرچ بھیج کر جون پور بلایا پھر دربار اکبری میں مزید انعام اکرام سے نوازا گیا۔ شعرا ے ہم عصر میں قاسم کاہی اور قاسم ارسلاں وغیرہ سے خوب نوک جھوک رہتی تھی۔ ۹۸۰ھ میں بہ مقام احمدآباد گجرات انتقال ہوا۔ الحاد میں بدنام ہونے کے باوجود یہ مشہور عارفانہ شعر اسی سے منسوب ہے ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ، غنودیم

مُلّا قاسم کاہی۔ ہمایوں بادشاہ کے ہم رکاب کابل سے آیا تھا۔ وطن کی تعریف میں ہندوستان کی مذمت کرتا ہے: ؎

کاہی تو بلبلِ چمن آرا ے کابلی
زاغ و زغن شُدہ کہ بہ ہندوستاں شوی

لیکن یہیں رہا اور غالباً عہد اکبری میں اسے بھی ملک الشعرای کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ہمایوں کے انتقال کی مشہور تاریخ۔ ع۔

ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد

اسی کا کارنامہ ہے۔ خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ ایک غزل جس میں "فیل" کا تلازمہ ہے، فیل پسند اکبر کو بہت پسند آئی ایک لاکھ تنکہ صلہ عطا کیا۔ مطلع یہ تھا:

تا بہ فیلاں میل دیدم دل ستانِ خویش را
صرفِ راہِ فیل کردم نقد جانِ خویش را

کلام معمولی مگر نغمہ انگیز ہے کہ موسیقی میں کامل دخل رکھتا تھا۔ دو غزلیں جن کا لحن خود نکالا، ہندوستان بھر میں گائی جاتی تھیں ۶۔

۱۔ مُرغ تا بر فرقِ مجنوں پر زدن انگیز کرد
آتش سودائے لیلیٰ برسر او تیز کرد
۲۔ چوں زعکس عارضش آئینہ پُر گل شود
گر دراں آئینہ طوطی بنگرد بُلبل شود

آخری بیماری کی خبر سُن کر ایک دوست دردِپا کے باوجود کاہی کی عیادت کے لئے خیرآباد سے آگرے آئے۔ مُلّا نے اسی حال میں فی البدیہہ ایک غزل کہی اور اس کی خاص راگنی تیار کی :

ماندی قدم زناز بروے نیاز من
دردے مباد پاے ترا سرو نازمن!

شیری سیال کوٹی۔ موضع کوکووالی کا رہنے والا، اور ایک فاضل باپ کا نہایت ذہین بیٹا تھا۔ اسے قدرتِ شعرگوئی پر فخر تھا کہ "چار دیوان لکھ کر چناب میں ڈبو چکا ہوں[1]"۔ حقیقت میں اس کا فارسی کلام کسی اہلِ زبان سے کسی اعتبار سے کم نہ نکلے گا۔ اور "منتخب التواریخ" میں مُلّا عبدالقادر کا قول ہے کہ کوئی ہمعصر اس سے بازی نہ لے جاسکا۔ اکبر کے دعوئے اجتہاد پر اس کا قطعہ انہی دنوں زبان زد ہوگیا تھا اور ہم نے گذشتہ باب میں نقل کیا ہے۔ زمانے کی حالت پر یہ قطعہ منتخب بداونی سے انتخاب کرتے ہیں۔

---

[1] یہ مصرعہ شاعر نے کسی جلسے میں پڑھا۔ "چار دفتر شعر درآب چناب انداختم" ایک صاحب نے سُن کر کہا کاش اسلوشعی کو بھی دریا بُرد کر دیتے!

گذشتگان ہمہ عشرت کنید، کا سودید
ازاں کہ عیش بر افتاد از میانۂ ما
ایا کساں کہ پس از ما رسید، فاتحۂ
بہ شکر آں کہ نبودید در زمانۂ ما!

شیری کا دیوان عہد اکبری میں نہایت مقبول و مروّج تھا۔[1] اب بھی بعض قلمی اجزا ہندوستان اور برطانیہ کے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔

نورالدین ترخاں۔ پاکستان کا ایک اور خوش گفتار شاعر نورالدین محمد ترخاں (سفیدونی، سرہندی) تھا۔ اگرچہ اُس کی شعر گوئی کی شہرت فقط ایک ہجو سے قائم رہی جس میں حکّام دہلی کا خاکہ اُڑایا اور اپنا نام چھپایا تھا۔ مطلع یہ ہے:

آہ ز دہلی و مزاراتش وہ ز خرابیٔ عماراتش

صاحب علم و امتیاز شخص تھا اور ملّا نورالدین جامیؒ کی ہم نامی کے ساتھ ہم مقامی کا ادّعا کرتا تھا۔ اسی شیخی نے لوگوں میں مطعون کیا۔ ایک مرتبہ چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گرا۔ سخت ضرب آئی۔ عیادت کرنے والوں سے کہنے لگا "آپ حضرات گواہ رہیں، میں نے اس تشویش میں کئی باتوں سے توبہ کی"۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کن باتوں سے توبہ کی، اس کا جواب نہ دیا۔ مُلّا عبدالقادر کی ستم ظریفی دیکھیے۔ کہنے لگے: صاحب، مناسب یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ شعر گوئی سے توبہ کریں!

---

[1] منتخب۔ ۳۔ صـ ۲۵۲۔

ملک الشعرا فیضی

لیکن جملہ شعرائے عصر میں خود بادشاہ کا عزیز ترین شاعر و ندیم ابوالفیض فیضی تھا۔ ۹۵۴ھ میں بہ مقام آگرہ پیدا ہوا۔ بیس اکیس برس کی عمر میں دربارشاہی تک پہنچا اور اتنی ہی مدت کے بعد غالباً ۹۹۶ھ میں ملک الشعرای کا خطاب پایا۔ علمی مشاغل کی وجہ سے، دو تین سفارتوں کے علاوہ، کوئی مستقل عہدہ قبول نہیں کیا لیکن بادشاہ کی خلوت و جلوت کا مشیر تھا اور اکثر شہزادوں کی تعلیم اسی کے سپرد کی جاتی تھی۔ فارسی دیوان محفوظ و مشہور ہے۔ حسن بیان میں بعض غزلیں اساتذۂ پیشیں سے ٹکراتی ہیں اور قصائد کی معنویت بھی بہترین کہنے والوں سے کم تر نہیں۔ بادشاہ کی فرمائش سے خمسہ نظامی کا جواب لکھا۔ اس کی سب سے نفیس مثنوی نل و دمن درسیات میں داخل تھی اور ایران کے ادبیات عالیہ میں شمار ہونے کی مستحق ہے۔ فن ریاضی پر سنسکرت کی کتاب "لیلاوتی" اور مہابھارت کے دو جز کا ترجمہ کیا تھا۔ مگر ان سب سے بڑھ کر علمی کارنامہ قرآن مجید کی بے نقط تفسیر "سواطع الالہام" ہے کہ لکھنے والے اور موضوع اور زبان عربی، تینوں کا اعجاز کہئے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک اور کتاب بچوں کی پند و نصیحت کے لئے بے نقط لکھی تھی اس کا تاریخی نام "موارد الکلم سلک دُرر الحکم" ہے اگرچہ اسی سال ۱۰۰۴ھ کے شروع میں مصنف علام نے وفات پائی اس لئے ممکن ہے تاریخ کسی اور نے بعد میں نکالی ہو۔

فیضی کو اپنے علم و دانش پر ناز تھا اور اکبر جیسا جلیل القدر

بادشاہ جس کی ناز برداری کرے، وہ ناز نہ کرے تو کون کرے گا؟
ایک موقع پر لکھتا ہے: (رُباعی)

آنم کہ فنونِ ذو فنوناں دارم
انوارِ چراغِ رہ نموناں دارم
ایں کالبدم ز خاکِ ہند است ولے
در ہر بنِ مو ہزار یوناں دارم!

ملک الشعرا کا خطاب ملنے سے چند روز پہلے اور ممکن ہے بادشاہ کا یہ ارادہ سُن کر ہی ایک قصیدہ تیار کیا جس کی تشبیب یہ تھی:

آں روز کہ فیض عام کردند ۔ مارا ملک الکلام کردند
از بہرِ صنودِ فکرتِ ما ۔ آرائشِ ہفت بام کردند!

کہتے ہیں آخری مرض میں دمے کا سخت دَورہ پڑا تو یہ رباعی لکھی جو عبرت کے احساس کا مرقع ہے:

دیدی کہ فلک بہ من چہ نیرنگی کرد
مرغِ دلم از قفس بد آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے دو روی گنجید
تانیم نفس بر آورم، تنگی کرد!

مُلّا عبدالقادر بداونی

فیضی اور ابوالفضل کے ہم درس و ہم عصر مُلّا عبدالقادر بداونی تھے جن کی تاریخ (منتخب التواریخ) کی ہمہ گیر شہرت نے اُن کی علمی فضیلت کو ماند کردیا ورنہ علوم دین اور فنونِ رائجہ میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں جیسا کہ مُلّا محمد یعقوب کشمیری کے بیان میں ہم اوپر دیکھ آئے

ہیں۔ ۹۴۷ھ میں اجمیر کے ایک موضع میں پیدا ہوئے۔ خاندانی وطن بداوں تھا۔ آخری عمر وہیں گزری۔ وہیں ۱۰۰۴ھ میں تاریخ کی تکمیل کے ساتھ حیات مستعار کی تکمیل ہوئی۔ تیس اکتیس برس کی عمر میں آگرے آئے اور بادشاہ کے سات اماموں میں شامل اور حاشیہ نشینوں میں داخل کئے گئے۔ اکبر کے حکم سے پہلے "سنگھاسن بتیسی" کا ایک پنڈت کی مدد سے ترجمہ کیا جو "نامۂ خرد افزا" کے تاریخی نام سے موسوم و مقبول ہوا۔ پھر مہابھارت، رامائن، راج ترنگنی وغیرہ کئی کتابوں کے ترجمے میں شریک غالب رہے۔ معجم البلدان، کے چند اجزا عربی سے فارسی میں منتقل کئے۔ تاریخ الفی کی ترمیم و تصحیح کی۔ بادشاہ، آزاد خیالی کے دور میں، ملا صاحب سے کھٹک گئے تھے مگر ان کی تالیف اور ترجموں پر اکثر انعام دیتے اور خوش ہوتے تھے[۱] حتیٰ کہ خود ملا صاحب دربار کی فضا سے بےزار اور بادشاہ پرستی کے باوصف، اکبر کی وسعتِ پرواز سے تنگ دل ہوکر خانہ نشین ہوگئے۔ آخری زمانہ اسی تنگی ترشی میں گزار کر ملکِ بقا کی راہ لی۔

ان کی تاریخ کا پہلا حصہ سلاطین دہلی کے احوال میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ قدیم اہل علم اور شعرا کا کلام بڑی تلاش سے جمع کرتے ہیں۔ بابر کی آمد کے وقت سے کتاب اور بھی مشرح ہوگئی ہے۔ اکبری واقعات لکھنے میں زیادہ تر نظام الدین بخشی کی تاریخ طبقات اکبری سے مدد لی تھی لیکن اصلی دلکشی لوگوں کے شخصی احوال و اقوال سے پیدا ہوئی

---

[۱] ملا صاحب کی تالیفات اور تراجم کی تعداد دس بتائی گئی ہے۔ (دیکھو مقدمہ مصحح منتخب التواریخ۔ مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

کہ وہ چار سو برس پہلے کی صحبتیں پڑھنے والے کی آنکھوں میں اس طرح پھرنے لگتی ہیں گویا وہ خود اسی عہد میں موجود اور اکبر کے اُمرا، علما اور شعرا کی باتیں سُن رہا ہے۔ یہ کمال غالباً کسی فارسی تاریخ نویس کے حصّے میں نہیں آیا۔ مُلّا صاحب تبحّرِ علمی کے ساتھ راسخ العقیدہ سُنّی مولوی ہیں اور اپنے زمانے کی بدعات و الحاد کی سخت مذمّت کرتے ہیں۔ فطری ذہانت نے انھیں ایسا بے باک نقّاد بنایا تھا کہ اچھے اچھے مدّعی اُن سے جھینپتے اور جھجکتے تھے مگر اپنے نفاق و تصنّع کو اُن سے چھپا نہ سکتے تھے۔ ایسے ریاکار مشائخ اور دنیا ساز علما کی انھوں نے خوب قلعی کھولی اور سخت مذمّت کی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو ارکان و بزرگانِ دین کی شان میں بے ادبی کرتے تھے، مُلّا صاحب نے ان کے ڈھیلوں کے جواب میں پتھروں کی بارش کردی ہے۔ بایں ہمہ ان کی راست گوئی اور دیانت پر کسی کو حرف زنی کی مجال نہیں ہوئی اور محمد حسین آزادؔ کو بھی عہدِ اکبری کا کوئی ماخذ ان کی کتاب سے بہتر نہیں مل سکا[1]۔

علّامی ابوالفضل

مگر اکبر کا خاص شاہی مورخ فیضی کا بھائی ابوالفضل تھا۔ ۹۵۸ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوا۔ بچپن سے اتنا ذہین تھا کہ لوگ تعجّب کرتے تھے۔ مُلّا مبارک جیسا ذی علم باپ پڑھانے کو ملا۔ چند ہی

---

[1] دیکھو بلوخ مین کا حاشیہ، ترجمہ آئینِ اکبری ص۱۰۴۔ اور مضمون رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بابت ۱۸۶۹ء جس میں مُلّا صاحب کی راست گفتاری کی کامل تصدیق کی گئی ہے۔ علیٰ ہذا، ملاحظہ ہو مراۃ العالم (بختاور خاں عالمگیری) مآثر الکرام (مطبوعہ حیدرآباد ص۲۳۹) وغیرہ۔ مُلّا عبدالقادر کے حال میں

سال میں علوم رسمی کی تکمیل کرلی فیضی کی سفارش سے ۹۸۱ھ میں حاضر دربار ہوا اور بہت جلد بادشاہ کا ایسا تقرب حاصل کیا کہ قدیم امیروں کو رشک آتا تھا۔ بیستی سے چل کر سب سے بڑے منصب پنج ہزاری تک ترقی کی لیکن اس سے بھی بڑھ کر اعتماد و رسوخ کا یہ درجہ ملا کہ اکبر کا کوئی کام بغیر اس کے مشورے سرانجام نہ پاتا تھا۔ میرمنشی یا وزیر خاص کی حیثیت سے جملہ احکام شاہی اسی ملّائے مکتبی کی قلم سے نکلتے تھے۔ تمام نئی اصلاحیں اور جدید آئین اسی کی رائے سے مرتب ہوتے تھے۔ شاہی محکمے اور کارخانے، کیا فوجی کیا دیوانی سب کی نئی تنظیم اور مناصب وغیرہ کی مفصّل تقسیم اور درجہ بندی اسی کے قلم سے ہوئی اور چھوٹے سے بڑے عہدوں کے نام تک اس کی ذہانت نے بدل ڈالے۔ اگرچہ بہت سے رواج عام نہ پا سکے مگر اکبر نامے میں محفوظ ہیں ؛

ابوالفضل عربیت اور شعرگوئی میں فیضی کی مثل نہ تھا لیکن فارسی انشا پردازی میں نظیر نہیں رکھتا اور اس کی تاریخ اکبرنامہ نثر کا ایسا کارنامہ ہے جس کی ممالک ہند و ایران میں کوئی نقل تک نہ کرسکا! انشائے ابوالفضل، جو مکاتیب کا مجموعہ ہے، فارسی کی اعلیٰ درسیات میں اب تک پڑھائی جاتی ہے۔ یہ لفظوں کی دقیق صناعی کا نمونہ ہے۔ مصنف کی نگارش کا اصلی کمال وہی اُس کی تاریخ نگاری ہے کہ واقعات کو ایسی ندرت اور خوبی سے لکھتا ہے جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اسی کتاب (اکبرنامہ) کا تیسرا دفتر "آئین اکبری" عام معلومات کا خزانہ اور ابوالفضل کی عالی دماغی کی لافانی یادگار ہے۔ کلیلہ دمنہ کے فارسی ترجمے

"انوارِ سہیلی" کو بادشاہ کے حکم سے سادہ عبارت میں از سرِ نو لکھا تھا۔ یہ "عیارِ دانش" کے نام سے مشہور ہے۔

ابوالفضل کے دنیاوی اعزاز و جاہ کا بڑا سبب اُس کی بادشاہ پرستی تھی۔ اکبر کی خوش نودی کو اس نے گویا زندگی کا مقصد و مآل بنا لیا تھا۔ اسی سے وہ ہم عصروں میں محسود و مطعون ہوا بلکہ اپنی جان سے گزر گیا۔ بے لاگ نقّادوں نے اس کی سیرت کی بڑی کمزوری یہی بتائی ہے کہ جدھر بادشاہ کا رُخ دیکھتا تھا، اُسی طرف دوڑتا ہوا چلنے لگتا تھا۔ جب اکبر نے تقلید چھوڑ کر مذہبی آزادی کے صحرا میں قدم رکھا تو ابوالفضل ہی اس کا رفیقِ طریق تھا۔ "دینِ الٰہی" کے عقائد اور قواعد اُسی نے قلم بند کئے اور نئے مذہب کا خلیفۂ اوّل قرار پایا۔ حال آں کہ بعض رقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر وہ اُن عقائد کو مہمل یا غلط سمجھتا تھا۔ یہ ثبوت ہے کہ جو لوگ اسے ریاکاری اور دُنیا سازی سے بادشاہ کو غلط راستے پر لے جانے کا الزام دیتے تھے، وہ بے بنیاد نہ تھا۔

مشہور ہے کہ اُمرا نے اسے اکبر سے دور پھینکنے کی خاطر دکن کی مہمات پر بھجوایا تھا (۱۰۰۶ھ) وہاں کا انتظام عبدالرحیم خان خاناں اور شہزادہ مُراد کے ہاتھ میں تھا۔ ابوالفضل نے بعض معرکوں میں بہادری کے جوہر دکھائے اور ثابت کیا کہ یہ مُلّا زادہ قلم کی طرح تلوار چلانی بھی جانتا ہے۔ لیکن خان خاناں نے اُسے بہت زچ کیا اور بادشاہ کے نام مُلّا کی کئی عرضیاں مقامی حکّام کی شکایت سے لبریز ہیں۔ چار سال بعد اکبر نے واپس طلب کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ

جہانگیر کی سرکشی سے اکبر ناراض تھا اور بادشاہ کا یہ رجحان دیکھ کر ابوالفضل نے اس شہزادے کی نسبت اکبرنامے اور بعض رقعات میں ایسے الفاظ لکھے جو اُس عہد کے آداب کے سراسر خلاف نظر آتے ہیں۔ جہانگیر غصے سے بے تاب ہوگیا۔ بندھیل کھنڈ کے راج کمار بیر سنگھ دیو کو جو اُن دنوں قزاقی کرتا پھرتا تھا، پیغام بھیجا کہ اگر ابوالفضل کو واپس آتے میں مارا تو آیندہ راج پاٹ کا تجھی کو وارث بنادوں گا۔ بیر سنگھ گھات میں رہا ابوالفضل کو بھی خبر ہوگئی تھی لیکن بادشاہی تقرب کے بھروسے پہ کسی مشیر کی بات نہ مانی اور مختصر جمعیت سے سفر جاری رکھا۔ گوالیار کے قریب بندیلوں نے چھاپا مارا۔ ابوالفضل بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ (۱۰۱۱ھ = ۱۶۰۲ء) بیر سنگھ دیو نے سر کاٹ کر شہزادے کو الہ آباد بھیجا، جہاں اُس کی اور تذلیل و تشہیر کی گئی ؛ اکبر کو آگرے میں اس سانحے کی اطلاع ملی تو کئی دن تک سخت ماتم کیا اور کئی بار کہا کہ بادشاہی لینی تھی تو مجھے قتل کرنا تھا۔ ابوالفضل کو ناحق مارا ؛

حکیم ابوالفتح اور شاہ فتح اللہ

اکبری دربار کے کئی حاذق حکیموں کا ذکر آتا ہے مگر ان میں حکیم ابوالفتح گیلانی کو امتیاز خاص حاصل تھا۔ یہ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ ایران سے آئے اور بہت جلد بادشاہ کے معزز ندیموں میں داخل ہوگئے۔ شیخ بوعلی سینا کی کتاب "قانون" پر اعلیٰ درجے کی شرح لکھی ہے۔ حدیث اور اخلاق کے چند رسالوں کے علاوہ مکتوبات کا ایک مجموعہ چار باغ، انشا پردازی اور تبحر علمی کی یادگار ہے ؛

ایک اور یگانۂ روزگار شخص فتح اللہ شیرازی تھے کہ علم و فضل

کی شہرت سُن کر بادشاہ نے دربار بیجاپور سے مستعار لیا اور عضدالدولہ امین الملک خطاب دے کر بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا۔ انھیں علوم رسمی کے علاوہ ریاضیات، جرِ ثقیل، طبیعیات و ہیات میں کمال حاصل تھا۔ زیجِ اکبر شاہی تیار کی جو آئینِ اکبری میں شامل ہے۔ بعض کلیں اور نئی قسم کی توپیں، بندوقیں بنائی تھیں۔ ایک مبسوط تفسیر لکھی جس کا صرف نام ملتا ہے، اصل کتاب مفقود ہو گئی ہے ۹۹۷ھ میں انتقال کیا۔ فیضی نے قطعۂ وفات لکھا جس کا مطلع مشہور ہے:۔

شہنشاہِ جہاں را در وفاتش دیدہ پُرنم شد
سکندر اشکِ حسرت ریخت کافلاطوں ز عالم شد

خان خاناں عبدالرحیم خاں

مُغل امرا میں بڑے بڑے صاحبِ ذوق علم دوست امیر گزرے ہیں۔ خان خاناں بیرم خاں فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں صاحبِ دیوان تھا۔ خان زماں خاں والیٔ جون پور جیسا تلوار کا دھنی تھا، ویسا ہی شاعری کا دل دادہ تھا۔ خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کبھی کبھی شعر کہتا، مگر خوب کہتا تھا۔ ان خوش مذاق امیروں میں بھی جو شہرت عبدالرحیم خاں کو حاصل ہوئی وہ کسی کے نصیب میں نہ آئی۔ اور بے شبہ وہ اس کا مستحق تھا۔ اُس کی ذات علم و ادب کا مخزن و مامن تھی جس کے سائے میں اربابِ کمال پرورش پاتے اور علم و فن سرسبز ہوتے تھے۔ ان آثار خیر و برکت کی گواہ مآثرِ رحیمی ہے کہ خان خاناں کی شان میں بہت سے شعرا نے جو قصیدے لکھے، ان کا انتخاب، تقریب و تعارف کے ساتھ جمع کیا ہے؛

وہ بیرم خاں کا فرزند تھا۔ میواتی بیوی سے ۹۶۴ھ میں پیدا ہوا اور نہایت حسین وجمیل نوجوان تھا۔ بہترین تعلیم پائی۔ عربی فارسی ترکی زبانوں کے علاوہ ہندی (اور سنسکرت) سے عمدہ واقفیت بہم پہنچائی چنانچہ ہندی دوہے فارسی اشعار سے زیادہ تعداد میں زباں زد ہوئے۔ تزک بابری کا مکرر فارسی ترجمہ اس کا علمی اور تاریخی کارنامہ تھا، جواب تک مقبول ہے۔ بڑا وصف یہ کہ داد و دہش میں کوئی امیر و بادشاہ اس کا عدیل نہ تھا۔ ایک ایک شعر پر ہزار ہزار اشرفی اور معمولی حسن خدمت پر دولت کے انبار عطا کرنا معمولات میں شامل ہوگیا تھا جس کے عجیب عجیب قصے تاریخوں میں مذکور ہیں۔ بہت سے اہل علم اور شعرا کے من جملہ نظیری نیشاپوری اور آخر میں عرفی شیرازی کی وہ سرپرستی کی جو شاہی درباروں میں بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ یہ ایرانی اساتذہ کی صف اوّل کے شاعر ہیں۔ نظیری رئیس المتغزلین کہلاتا ہے۔ عرفی الوزی اور خاقانی کی ٹکر کا قصیدہ نگار ہے۔ اوّل دربارِ اکبری میں آیا تھا۔ فیضی نے بہت خاطر مدارات کی مگر وہ فیضی ہی کو خاطر میں نہ لاتا تھا، اس کی مدارات کو کیا ماتنا؟ کچھ مدت فتح اللہ شیرازی کا ندیم رہا۔ پھر عبدالرحیم خان خاناں کی سرکار میں وہ عزت و راحت پائی جو اور کہیں میسّر نہ آئی تھی۔

عبدالرحیم خان خاناں نے ہفت ہزاری منصب تک ترقی کی جو پہلے کسی امیر وزیر کو نہ ملا تھا۔ ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) میں انتقال کیا اور دہلی کے قریب ایک مقبرے میں، جو ٹوٹنے کے باوجود عظمت کی خاص شان دکھاتا ہے، مدفون ہوا۔

ہندی شاعری

ادبیات فارسی کی طرح، اسی دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) میں برج بھاشا کی شاعری نے فروغ پایا۔ اسے وسطی ہندی کے دور سے منسوب کرتے ہیں۔ صدی کے آغاز میں اس کا آغاز ولبھ چاری نے کیا۔ یہ دکن سے آیا اور گوکل یعنی متھرا کے قریب چھاؤنی رمائی۔ کرشن و رادھا کے عشق و محبت کا یہی مقام تھا۔ اسی محبت کے فلسفے پر ولبھ چاری نے اپنی مذہبی تعلیمات کی بنیاد رکھی تھی۔ بہت لوگ اس کے مرید ہوئے اور اُن کے بھجن شمالی ہند کے اقطاع میں جگہ جگہ گائے جانے لگے۔ ان کی زبان برج ہی کی بولی تھی بھجن کہنے والوں میں آٹھ اُستاد مشہور ہوئے جن میں سور داس ممتاز تھا۔ وہ اکبری عہد میں گزرا اور ایک بڑی کتاب "سُور ساگر" یادگار چھوڑ گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی برج بھاشا کی شاعری کا سب سے بہتر نمونہ تھا۔ اس پر کسی شاعر کو فضیلت حاصل ہوئی تو وہ تلسی داس ہے جسے ہندی کا بہترین شاعر مانا جاتا ہے۔ وہ بھی اکبر کے زمانے میں پھُولا پھلا اور عہد جہاں گیر میں اس کا کلام نہایت مقبول ہوا۔ ۱۰۳۲ھ میں وفات پائی۔ "رام چرت مانس" جسے عرفِ عام نے "رامائن تلسی داس" معروف کیا، اسی کا شاہ کار تھا جس میں والمیکی رامائن کو مروجہ زبان کا لباس پہنایا اور ایسے دل کش انداز میں رام چندر جی کے حالات سُنائے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دُنیا کی مشہور نظم کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

بابِ شانزدہم

سلطنت مغلیہ کا عروج (۱)

اکبری وفات اور صفات

خوشامدی جوتشی اور جھوٹے نجومی حکم لگاتے تھے کہ اکبر دو سو برس جئے گا لیکن شمسی حساب سے تریسٹھ سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ قضا کا پیام آیا اور چند ہفتے علالت کے بعد اس بزرگ بادشاہ نے جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ (مطابق اکتوبر ۱۶۰۵ء) میں عالم آخرت کی راہ لی۔ ع:

الف کشیدہ ملائک زفوتِ اکبر شاہ

وفات کی مشہور تاریخ ہے۔ آگرے کے قریب سکندرے کے خوش نما مقبرے میں دفن ہوا۔ کچھ کم پچاس برس حکومت کی اور ترکے میں اتنی بڑی اور دولت مند سلطنت چھوڑی کہ سلطنت چین یا دولت عثمانیہ کے سوا کوئی ہم عصر سلطنت اُس کے برابر نہ تھی۔

اکبر کی اقبال مندی ضرب المثل ہے کہ آغاز بادشاہی سے جس

معرکے میں قدم رکھا، کام یاب ہوا۔ جس مہم کا بیڑا اُٹھایا، جیت کر ہی واپس آیا۔ لیکن تقدیر کی یاوری کے ساتھ اس کی چند صفات جریدۂ روزگار پر نقش ہیں جنھیں فتح یابی کا ظاہری سبب قرار دینا چاہیے۔ اوّل، سپہ گری اور مردانگی کہ ایسے خانوادے میں جس کا ہر فرد دلیر و جنگ جُو گزرا ہے، اکبر کی بے جھجک بہادری کی مثالیں بہت کم نظر آئیں گی۔ لڑکپن سے مصائب نے جسم و دل کو مضبوط کر دیا تھا۔ تیغ و خدنگ، توپ و تفنگ سے کھلونوں کی طرح کھیلا تھا۔ حرب و ضرب کے ایک ایک گُر کا مشّاق ماہر تھا۔ مست ہاتھیوں کو ستک پہ بیٹھ کر لڑاتا، بھاگتے گھوڑوں سے جست لگاتا اور بندوق چلاتا تھا جنگلی درندوں کا شکار ایسی بے باکی سے کھیلتا کہ پیشہ ور شکاری دم بخود رہ جاتے تھے۔ میدان کارزار میں اس طرح بے دھڑک جا پڑتا گویا مارنے سے زیادہ مرنے کا آرزومند ہے۔ دشمن اس کا مُنہ دیکھ کر پیٹھ دکھاتے تھے۔ آمد آمد کی خبر سن کر دہل جاتے تھے۔ عام خیال تھا کہ تسخیر کواکب کا عامل ہے، اس کے مقابلے میں کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔

دوسری بڑی صفت قدر شناسی اور فیاضی تھی کہ جوہر قابل کی تلاش میں سرگرم رہتا۔ جس میں ذرا اہلیت نظر آتی اس کے حوصلے سے بڑھ کر مرتبہ بڑھاتا تھا۔ خطا بخش و جرم پوش ایسا، کہ اہلِ خدمت سے بار بار درگزر کرتا تھا۔ ان اوصاف نے لازماً ہر سپاہی کو اُس کا فدائی اور ایک ایک سردار کو سچا جاں نثار بنا دیا تھا۔ یہی اکبر کی کام یابی اور مُراد مندی کا بڑا راز ہے۔ آگے چل کر آزاد خیالی نے اسے مسلمانوں کے مذہبی طبقے میں بہت مطعون کیا ورنہ مِلّت اسلامی کے

بہترین بادشاہوں میں شمار ہوتا اور شاید سلطان محمود غازی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے پہلو میں اس کی کرسی بچھائی جاتی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب اپنی خوش اعتقادی بلکہ ضعیف الاعتقادی کی زنجیریں توڑیں تو دین دار مسلمانوں سے اسے کدسی ہوگئی تھی۔ بعض علما کو قتل وجلاوطنی کی ظالمانہ سزائیں دیں اور اپنے نام نیک پر ایسا رسوائی کا داغ لگایا کہ کبھی نہ مٹ سکا۔ خالص تاریخی نظر سے دیکھیے تو یہ جور وجبر، یہ خودرائی، خود پرستی ایک موروثی بلکہ عصری بیماری تھی جو شخصی حکومت کا لازمی عارضہ ہے۔ اقتدارِ مطلق کے تخت پر بیٹھنا اور نفس کو قابو میں رکھنا، اللہ والوں کا کام ہے، معمولی انسانوں سے اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ وہ آئین حکومت ہی ناقص و فاسد تھا، اس کا الزام کسی اکبر و جہاں گیر کے سر تھوپنا، غلط ہے، اسی طرح اگر ہم افکار حاضرہ یا خلافتِ اسلامی کی کسوٹی پر ان بادشاہوں کو پرکھیں گے، تو اکبر کی کیا تخصیص ہے، اکثر پرانے سکّے کھوٹے نکلیں گے۔

جہاں گیر کی تخت نشینی

اکبر کے دو بیٹے مُراد و دانیال اس کی زندگی میں جوان مرگئے تھے ان مُغل شہزادوں کو شراب کی ایسی دھت تھی، جیسے آج کل مدرسے کے لڑکوں کو سگرٹ کی لت ہو جاتی ہے۔ مگر شراب بڑی بیماری ہے کہ اندر ہی اندر جسم کو گھلاتی اور پینے والوں کو جلد موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ دانیال اور مُراد دونوں اسی موذی عادت کا شکار ہوئے۔ بڑا بیٹا سلیم آیندہ جہاں گیر کے لقب سے وارثِ تاج ہوا، لیکن اسی مے خواری کی بہ دولت ایسی بے اعتدالی اور نافرمانی کی حرکتیں کرتا تھا

کہ اکبر کی زندگی کے آخری سال بڑی تلخی اور اذیت میں بسر ہوئے۔ وہ بیٹے سے سخت ناراض اور بیٹا علانیہ باپ سے سرکشی پر آمادہ تھا جب کہ بادشاہ کو مرضِ موت لاحق ہوا۔ اس کی مخدوش حالت دیکھ کر محل کی بیگمات نے سلیم کو الہ آباد سے بہ مشکل بلایا۔ باپ کے قدموں پر ڈال کر خطا معاف کرائی۔ ایک ساعت کے آنسوؤں نے کئی سال کے غبار دھو دئے اور اکبر کے انتقال پر جہاں گیر کی بادشاہی کا اعلان ہوگیا ÷ بھائی تو مرچکے تھے لیکن جہاں گیر خود اپنے فرزند خسرو سے مشکوک تھا۔ یہ نوجوان دادا کے پاس رہتا تھا۔ راجہ مان سنگھ کا بھانجا اور مرزا عزیز کا داماد تھا۔ یہ دونوں سلطنت کے سب سے بااثر امیر تھے۔ لہذا سلیم سے اکبر ناراض ہوا تو بعض حلقوں میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں کہ ممکن ہے بادشاہ ناخلف بیٹے کی بجائے پوتے کو اپنا جانشین مقرر کردے ÷ جب سلیم کی خطا معاف اور بادشاہی کا معاملہ صاف ہوگیا، تو اکبر کے انتقال کے وقت خسرو غالبًا خوف زدہ ہوکر آگرے سے بھاگا۔ جہاں گیر نے فورًا شیخ فرید کو فوج دے کر تعقب میں بھیجا اور وہ اُسے پنجاب سے سونے کی بیڑیاں پہنا کر پکڑ لائے خسرو کی عمر کے باقی پندرہ سال قید ہی میں ایڑیاں رگڑتے گزر گئے ۱۰۳۰ھ میں وفات اور زندگی کی قید سے نجات پائی ÷

اودے پور اور کانگڑے کی فتح

اکبر کے آخری زمانے سے عالمگیر کے آخری سنین تک مغل بادشاہوں کی فتوحات اور جنگی سرگرمیوں کا میدان دکن کے پہاڑی ملک رہے۔ ان جنوبی حکومتوں کی جدوجہد کا ذکر آئندہ اوراق میں

ہماری نظر سے گزرے گا یہاں عہد جہاں گیر کی دو مہمات کا مختصر حال بیان کرنا مقصود ہے کہ گو ان کا دائرہ تنگ تھا، اہمیت کے خاصے وسیع پہلو رکھتی ہیں۔ اوّل میواڑ جس کے دار الحکومت چتوڑ کا غرور خود اکبر نے توڑا تھا۔ ریاست ایک بادشاہی سرکار بنائی گئی تھی۔ لیکن وہاں کے راجہ چھپ چھپ کے لڑتے اور جاں باز راج پوتوں کو برابر لڑائے جاتے تھے۔ جب مقامی فوجوں سے کام نہ چلا تو جلوس جہاں گیری کے نویں سال شہزادہ خرم کو مامور کیا گیا کہ اس فتنے کا سدباب کرے۔ وہ بیس ہزار فوج لے کر چلا اور خاص اودے پور کی نئی راج دھانی میں پڑاو ڈالا۔ رانا، حسب معمول جنگلوں پہاڑوں میں جا چھپا تھا۔ خرم نے ایک ایک درے کا ناکہ روکا اور اس خوبی سے باغیوں کو گھیرا کہ چند روز کی حرکاتِ مذبوحی کے بعد ہتیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ گدی کا وارث رانا امر سنگھ تھا۔ اس نے مغل بادشاہ کی اطاعت و باج گزاری قبول کی۔ اپنے بڑے بیٹے کرن سنگھ کو دربار میں بھیجا۔ جہاں گیر شاہانہ فیاضی اور عنایت سے پیش آیا۔ پنج ہزاری منصب عطا کیا۔ دکن کے آئندہ معرکوں میں وہ بھی ایک ہزار سوار کے ساتھ ماتحت سردار کی حیثیت سے مغلوں کے ہم رکاب تھا[1]۔ اس فتح کی خاص طور پر خوشی منائی گئی۔ شہزادہ خرم کو "شاہ" کے

---

[1] بعض انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ رانا کی ایک شرط یہ تھی کہ میواڑ کی کوئی بیٹی ڈولے میں نہیں دی جائے گی۔ (آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۳۸۹) یہ من گھڑت بات اس افترا پردازی پر مبنی ہے کہ مغل بادشاہ ہر راج پوت راجہ سے ان کی بیٹیاں ڈولے میں لیتے تھے۔

خطاب اور اضافۂ منصب و جاہ سے نوازا گیا۔ کیوں کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ میواڑ کے رانا نے اپنی گردن جھکائی اور بہ طیبِ خاطر باج گزاروں کی صف میں کھڑا ہوا۔ (۱۰۲۳ھ = ۱۶۱۴ء)

شمالی ہند کی دوسری مہم کانگڑے پر چند سال بعد بھیجی گئی۔ یہ ریاست آبادی اور دولت و قوت میں چھوٹی تھی لیکن راستے کی دشواری اور پہاڑوں کے قدرتی مورچوں نے راجہ کو قوی دل کر دیا تھا اور نگرکوٹ کے قدیم مندر نے مذہبی تقدس کی بزرگی عطا کی تھی۔ اکبر کے عہد میں یہاں کا راجہ باغی ہوا تو سرکوبی کے لئے سپہ سالار حسین قلی خاں لیکن مہم کا نام نہاد حاکم بیربر مقرر کیا گیا کہ قوم کا برہمن اور جنگی نام وری حاصل کرنے کا آرزومند تھا۔ کچھ مدت بعد اس بزمی برہمن کی جان اسی رزمی شوق کے بھینٹ چڑھی لیکن کانگڑے کی جنگ میں حسین قلی پہاڑ کی پگ ڈنڈیوں سے چیونٹیوں کی طرح فوج کو چڑھا لایا اور پہلے ہی دھاوے میں کانگڑا فتح کر لیا۔ مندر میں بہت سی کالی گائیں، تیر و تفنگ سے بچا کر جمع کر دی گئی تھیں۔ حملہ آور، کیا ہندو کیا مسلمان، لڑائی کے جوش میں ٹوٹ کر گرے تو ان مقدس ماتاؤں کا خون بہانے میں بھی دریغ نہ کیا۔ کہتے ہیں خود بیربر انھیں ذبح کرانے میں پیش پیش تھا۔ مُلّا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ اس کی مذہبی بدزبانی سے مسلمان درباری پہلے ہی نفرت کرتے تھے۔ نگرکوٹ کی بے حرمتی سے ہندوؤں میں بھی سخت ملعون و مطعون قرار پایا۔

راجہ فرار ہو گیا تھا اور اِدھر پنجاب میں چند مغل امیر شورش و فساد کر رہے تھے۔ مغل فوج کو فوری واپسی کا حکم پہنچا اور وہ خراج کے

وعدے اور تاوانِ جنگ لے کر واپس چلی آئی۔ راجہ نے دوبارہ اپنی قوت بحال کرلی اور جہانگیر کے زمانے میں غالبًا ادائے خراج میں پھر تساہل سے کام لینے لگا۔ اس بادشاہ نے ملک کشمیر کو اپنی سیرگاہ بنالیا تھا۔ اسی آمدورفت میں کانگڑے کی شکایتیں سنی ہوں گی کہ ریاست ضبط کرنے کا حکم دیا۔ شاید یہ مہم بھی شہزادہ خرم کی نگرانی میں سرانجام ہوئی۔ کانگڑا دوبارہ فتح کرلیا گیا اور خود بادشاہ نے وہاں جاکر قلعے میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔(۱۰۳۰ھ = ۱۶۲۰ء)[۱]

معاملات دکن

ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ اسی زمانے میں جب کہ بابر نے لودھیوں پر فتح پائی اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد جمائی، دکن کی بہمنی سلطنت کا بھی تختہ اُلٹ گیا۔ شروع میں پانچ حریفوں نے اس کے حصے بخرے کرلئے تھے مگر برار کی عمادشاہی جو سب سے چھوٹی تھی۔ احمدنگر کی نظام شاہی کا لقمہ بنی اور بیدر کی برید شاہی کہ اپنے داؤں پیچ کی وجہ سے "دکن کی لومڑی" کہلانے لگی تھی، بیجاپور کے عادل شاہیوں کا شکار ہوگئی۔ باقی کی تین طاقت ور بادشاہیوں نے مغلوں کا ایک صدی تک مقابلہ کیا اور سالہا سال تک اُن کی ساری قوت و قابلیت اِنہی کو جزو سلطنت بنانے میں مصروف رہی۔ ان دکنی بادشاہوں کے نام اور ضروری سنین تخت نشینی ذیل میں درج ہیں:-

---

[۱] ونسنٹ اسمتھ اپنی زہریلی فطرت سے مجبور ہو کر لکھتا ہے کہ جہانگیر کے شرمناک عہد کی سب سے نمایاں جنگی کامیابی کانگڑے کے مضبوط قلعے کی فتح تھی ہے ص ۳۸۴

نظام شاہی (احمد نگر)	عادل شاہی (بیجا پور)	قطب شاہی (گول کنڈہ)
۱- احمد نظام شاہ (بانی خاندان) ۸۹۶ھ = ۱۴۹۰ء	۱- یوسف عادل شاہ ۸۹۵ھ = ۱۴۸۹ء	۱- سلطان قلی قطب شاہ ۹۱۸ھ = ۱۵۱۲ء
۲- برہان نظام شاہ ۹۱۵ھ	۲- اسمٰعیل عادل شاہ ۹۱۵ھ	۲- جمشید قطب شاہ ۹۵۰ھ
۳- حسین نظام شاہ ۹۶۱ھ	۳- ملّو عادل شاہ چند ماہ	۳- سبحان قطب شاہ چند روز
۴- مرتضیٰ نظام شاہ ۹۹۶ھ	۴- ابراہیم عادل شاہ ۹۴۱ھ	۴- ابراہیم قطب شاہ ۹۵۷ھ
۵- میران حسین دو ماہ	۵- علی عادل شاہ ۹۶۵ھ	۵- محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ
۶- اسمٰعیل ۹۹۶ھ	۶- ابراہیم ثانی ۹۸۸ھ	۶- محمد قطب شاہ ۱۰۲۰ھ
۷- برہان (ثانی) ۹۹۹ھ	۷- محمد عادل شاہ ۱۰۶۸ھ	۷- عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ
۸- ابراہیم ۱۰۰۲ھ تا ۱۰۰۳ = ۱۵۹۵ء) حکومت آرا تا ۱۰۴۳ = ۱۶۳۳ء	۸- علی عادل شاہ ۱۰۶۸ھ	۸- ابوالحسن ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ = ۱۶۸۷ء (انتزاع سلطنت تک)
	۹- سکندر عادل شاہ ۱۰۸۲ھ تا ۱۰۹۷ھ = ۱۶۸۶ء (انتزاع سلطنت تک)	

جنگ تالی کوٹ

دسویں صدی ہجری کے وسط میں یہ تین بلکہ پانچوں دکنی سلطنتیں عروج پر تھیں۔ اسی صدی کے دوسرے نصف میں احمد نگر، بیجاپور اور حیدر آباد تعمیر ہوئے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے بڑے مرکز بن گئے۔ علوم و فنون کو ایسی ترقی ہوئی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہر حکومت باہمی رقابت اور ہمسایوں سے آئے دن کی مجادلت کے باعث مجبور تھی کہ ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہے۔ دوسرے یہی زمانہ ہے جب کہ جنوب کی ہندو مملکت وجیانگر نے اسلامی پیش دستی سے فرصت پائی اور ایسی قوت بہم پہنچائی کہ مسلمان بادشاہوں کے لئے دائمی خلش اور خطرے کا موجب بن گئی۔ اس ریاست کا سب سے اقبال مند راجہ کرشن دیو (۹۱۵ھ تا ۹۳۵ھ = ۱۵۲۹ء) سمجھا جاتا ہے جو موجودہ ریاست میسور اور تقریباً تمام جنوبی ہند پر قابض تھا۔ اس نے بیجاپور کے اسمٰعیل عادل شاہ کو شکست فاش دی اس کے پائے تخت اور گل برگہ میں گھس آیا اور یہاں کی عمارتوں کو کافی نقصان پہنچا کر واپس ہوا۔ آخر سیاسی اغراض اور مذہبی حمیت نے ایک مرتبہ اسلامی دکن کو متحد کر دیا اور برار کے عماد شاہیوں کے سوا، باقی چاروں حکومتوں نے ایک بڑی فوج کرشنا ندی کے کنارے تالی کوٹ میں جمع کی۔ اصلی معرکہ ندی کے پار کئی میل فاصلے پر ہوا مگر یہ فیصلہ کن جنگ تاریخ میں اسی موضع کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ مسلمان حلیفوں کی مجموعی تعداد ڈھائی لاکھ بھی نہ تھی اور ان کے مقابلے میں وجیانگر کا رام راجہ پانچ لاکھ سے زیادہ فوج، جنگی ہاتھیوں کی کئی قطاریں اور معقول توپ خانہ

لے کر آیا تھا۔ چناں چہ فرشتہ لکھتا ہے کہ لڑائی سے پہلے جو نامہ و پیام ہوئے ان میں وہ مسلمان سفیروں سے بڑی حقارت سے پیش آتا رہا جس نے اسلامی جتھے کے صلح پسندوں کو بھی مایوس اور تلوار پر قسمت کا انحصار رکھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ندی کے گھاٹ اور مدگل قلعے کے درمیان نہایت خوں ریز لڑائی ہوئی اور دونوں طرف کی توپوں نے ہزاروں سپاہیوں کے ٹکڑے اڑا دئے۔ مگر جنگ کا فیصلہ مسلمان سواروں کے غضب ناک جناحی حملوں نے کیا کہ خود رام راجہ کے حواس جاتے رہے وہ بھاگنا چاہتا تھا کہ گرفتار ہوا اور مرتضیٰ نظام شاہ نے ایک ہی ہاتھ میں دو پارہ کر دیا۔ ہندوؤں کی شکست نے تباہی اور قتل عام کی صورت اختیار کر لی اور جب یہ خبریں پائے تخت بیجانگر میں پہنچیں تو آس پاس کی جنگلی قوموں نے اس دولت مند شہر میں لوٹ مچا دی۔ مسلمان فاتح چند روز کے بعد جبرًا داخل ہوئے اور کئی ہفتے تک اسے لوٹتے، جلاتے، تباہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ عالی شان شہر جس کی دکن میں نظیر نہ تھی، کھنڈر ہو گیا۔ اس کی تاراجی مملکت بیجانگر کے خاتمہ کا پیام تھی لہٰذا اس بدقسمت شہر کو دوبارہ بنانا ایک طرف، کوئی اس پر رونے والا بھی باقی نہ رہا[1]؛ یہ قیامت خیز جنگ جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اور بھی سخت و عبرت ناک ثابت ہوئی، ۹۷۲ھ یعنی ۱۵۶۵ عیسوی کی جنوری میں لڑی گئی۔ اور مملکت بیجانگر کا بڑا علاقہ فتح مند مسلمان بادشاہوں نے آپس میں تقسیم کر لیا؛

[1] وجیانگر کے آغاز و عروج اور اس آخری جنگ کے حالات سویل نے "اے فرگوٹن ایم پائر" میں تفصیل سے لکھے ہیں؛

ملک عنبر حبشی

آیندہ پچاس برس میں دکن کے موروثی بادشاہ عیش و عشرت سے اور ان کے اُمرا باہمی رقابت سے کمزور ہوتے گئے۔ اکبر کے عہد میں پائے تخت احمد نگر فتح ہوگیا تھا۔ (۱۰۰۸ھ = ۱۶۰۰ء) مغلوں نے نظام شاہی سلطنت کو اپنے نزدیک پارہ پارہ کردیا تھا۔ خاندیس کے ساتھ برار و احمد نگر کے دو نئے صوبے بناکر یہ تمام علاقہ مغلیہ سلطنت کا جزو بنالیا تھا۔ سرنگ سے فصیل اُڑاکر شہر احمد نگر میں داخل ہوئے تو ایسا قتل عام کیا کہ ہم عصر مورخ فرشتہ کے بقول، کسی قابلِ جنگ مرد کو زندہ نہیں چھوڑا تھا[۱]۔ یہ دہشت پھیلانے کی تدبیر تھی مگر اسی نے نفرت کی آگ بھڑکائی۔ بچھڑے ہوئے امیروں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ اور انھوں نے مرتضیٰ نظام شاہ کی بادشاہی کے اعلان کے ساتھ ایک حبشی سردار ملک عنبر کی فوجی قیادت کو قبول کرلیا۔ نظام شاہی کے جسد بے جان میں ایک دفعہ پھر نئی روح دوڑ گئی ؛

ملک عنبر غضب کا مستعد، منتظم، مدبّر سردار تھا اور شمالی دکن کے لوگوں، خصوصاً مرہٹہ کسانوں کو ہتیار چلانا اور وہ قزّاقانہ جنگ لڑنا اسی نے سکھایا، جس کے لئے یہ ہلکے پھلکے، گریزپا جوان قدرتاً موزوں تھے۔ میدان میں مغل فوج اور اُس کے اعلیٰ ہتیاروں کا مقابلہ کرنا محال تھا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں چھاپے مارنا، رسد لوٹنا، آمد و رفت مخدوش کردینا، انھیں خوب آتا تھا۔ وطن کے پہاڑی نشیب و فراز

---

[۱] ج ۲ صفحہ ۱۶۳۔ مغلوں نے صرف بادشاہ بہادر نظام شاہ کو زندہ چھوڑا اور گوالیار کے قلعے میں قید کردیا تھا۔

اور چور راستے قدموں کو لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے اضلاع میں یکایک مغل حکام پر جا پڑنا، بے خبری میں حملہ کرنا شروع کیا تو نئے صوبہ داروں کا سارا نظم ونسق درہم برہم ہوگیا۔ احمدنگر کی مغلیہ فوجوں کی رسد بند ہوگئی۔ عبدالرحیم خان خاناں (صوبہ دار) کو ہٹ کر برہان پور آنا پڑا۔ احمدنگر پر پھر ایک مرتبہ نظام شاہیوں کا جھنڈا لہرانے لگا (۱۰۱۸ھ م ۱۶۰۹ء)؛ جہانگیر نہایت غضب ناک ہوا۔ خان خاناں معتوب و معزول کیے گئے۔ شہزادہ پرویز تازہ لشکر لے کر چلا۔ راجہ مان سنگھ برار سے، عبداللہ خاں گجرات سے کمک لے کر دوڑے۔ مگر عنبر کے چھاپہ ماروں نے چھاپے مار مار کر ناطقہ بند کر دیا۔ پرویز کو برہان پور سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ عنبر نے کھڑکی میں مضبوط مستقر بنایا اپنے عمدہ مالی اور ملکی انتظام سے رعایا کو بھی خوش رکھا اور ضروری مصارف کی بھی بخوبی بجا آوری کی۔ کھڑکی جس نے آیندہ اورنگ آباد کے نام سے مزید وسعت اور شہرت پائی، اسی زمانے میں ایک بارونق، مرفہ الحال شہر بن گیا؛

مگر وہ کسان سپاہی جنھیں جنگ چھاپہ ماری سکھائی اور لوٹ مار کا مزا پڑ گیا تھا، زیادہ دن نچلے نہ رہ سکتے تھے۔ مغلوں کے علاقے پر عنبر کے ناگہانی حملے جاری رہے۔ دو تین مرتبہ اس کی "چور فوج" خاندیس بلکہ نربدا پار مالوے کے شہروں کو تاخت تاراج کرگئی۔ یہ گویا اُن ترک تازوں کی ابتدائی مشق تھی، جو ایک صدی بعد مرہٹوں کا قومی شعار بنیں اور اُنھوں نے ممالک ہند میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اودھم مچادی؛ لیکن ابھی مغلوں کی مرکزی حکومت ایسی غافل و کم زور

نہ ہوئی تھی کہ یہ فتنہ ہندوستان میں خلل ڈالتا۔ جہاں گیر خود مالوے تک بڑھا۔ شہزادہ خرم کے ساتھ دوبارہ خان خاناں کو آگے بڑھایا اور اس مرتبہ مغلوں نے وہی داؤں جس میں اہل دکن مشاق تھے، اُن پر اُلٹ دیا یعنی تیز پا نیم مسلح سواروں کے دستے دُور دُور تک پھیلا دئیے کہ ہر گھاٹی اور ناکے پر گھات لگائیں اور جہاں پائیں عنبر کی ٹکڑیوں پر ٹوٹ کر جا پڑیں۔ گویا دکنی کالوں پر شمالی نیولے چھوڑے گئے! اُنھوں نے چند ہی ماہ میں حریفوں کو مار بھگایا اور ایسا ڈرایا کہ ہٹ ہٹ کر اپنے مرکزی قلعوں میں منہ چھپانے لگے۔ ان مقامات پر مغلوں کی بڑی فوجیں قلعہ شکن آلات لے کر چڑھیں اور دو تین معرکوں میں ایسی شکستیں دیں کہ عنبر نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ احمد نگر اور شمالی اضلاع سے ہاتھ اُٹھایا، اطاعت و خراج گزاری کا دوبارہ اقرار کیا۔ تب شہزادہ خرم نے اسے امان دی اور مغل فوجوں کو برار و خان دیس میں ہٹا لیا (۱۰۳۰ھ) ایسی نرم شرطوں پر صلح کر لینے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ مسلسل جنگ اور خشک سالی نے شمالی دکن میں بڑی بڑی فوجوں کی رسد رسانی کو ایک دشوار مسئلہ بنا دیا تھا۔ دوسرے مغلوں کو یقین تھا کہ عنبر میں حرب و ضرب کی صلابت باقی نہیں رہی۔ آیندہ جب چاہیں گے اُسے پیس ڈالیں گے۔

ملک عنبر کے پاس اب صرف دولت آباد، جنیر اور ناسک کے چند ضلعے رہ گئے تھے۔ ناکامیوں نے اُسے تھکا دیا، رفیقوں کے اتحاد میں خلل ڈال دیا تھا اور چار سال بعد جب اس نے وفات پائی (۱۰۳۵ھ) تو مزاحمت کی جان ہی نکل گئی۔ نام نہاد بادشاہ اور اس کے

امیروں میں جھگڑے ہوتے رہے۔ آخر عنبر کے بیٹے فتح خاں نے بادشاہ کو قتل کر دیا اور خود ہی مغلوں کی اطاعت قبول کر لی (۱۰۴۰ھ) دو سال بعد نظام شاہی حکومت کا نام و نشان تاریخ سے ناپید ہو گیا (۱۰۴۳ھ مطابق ۱۶۳۳ء)

ملکہ نور جہاں

شہزادۂ خرم کی جنگی فتوحات اور ذاتی اوصاف نے اُسے بادشاہ ورعایا، ملوک و امرا سب میں مقبول و ممدوح کر دیا تھا۔ انہی دنوں (۱۰۳۰ھ میں) جہاں گیر علیل ہوا تو سب یقین رکھتے تھے کہ خرم ہی باپ کا وارث بنے گا۔ بادشاہ تو تن درست ہو گیا مگر اس کی عزیز و با اثر ملکہ نور جہاں مستقبل کی فکر میں مبتلا ہو گئی اور غالباً اسی وقت سے ایک نیا منصوبہ بنا کر اُسے عمل میں لانے کی ریشہ دوانی کرنے لگی۔

اس ملکہ کا قصہ لیلیٰ مجنوں کی طرح ہندوستان میں مشہور ہے۔ شہرت عام اور نقل در نقل نے لامحالہ مبالغے کے رنگ چڑھائے اور افسانوی حاشئے بڑھائے ہیں۔ اتنی بات تاریخی اور ہمارے مقاصد کے لئے کافی ہے کہ وہ ایک غریب الوطن ایرانی مرزا غیاث کی بیٹی تھی۔ مہرالنسا نام تھا۔ خدا داد حسن و جمال یا مصنوعی عشوہ و ادا سے شہزادہ سلیم اس پر مائل ہوا تھا مگر شاید اسی بنا پر بادشاہ نے مہرالنسا کو ایک سردار علی قلی خاں سے بیاہا اور بردوان کی جاگیر دے کر بنگالے بھیج دیا تھا۔ جہاں گیر کے عہد میں قطب الدین خاں بنگالے کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ کہتے ہیں اس نے بادشاہ کے میلان خاطر کا اشارۃً تذکرہ کیا۔ غیرت مند علی قلی جس نے بہادری سے شیر مار کر شیر افگن خاں کا خطاب پایا تھا، تاب نہ لایا اور

قطب الدین خاں کو مار کر خود بھی شاہی سپاہیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مہرالنسا بیوہ ہوکر آگرے آئی اور دو تین سال کی سوگ واری کے بعد شاہی محل میں داخل ہوئی۔ بادشاہ کے نام (نورالدین) کی مناسبت سے پہلے نور محل خطاب ملا تھا، پھر جہاں گیری نسبت سے نور جہاں کہلائی اور اپنی غیر معمولی ذہانت و مزاج شناسی سے بادشاہ کو ایسا گرویدہ بنایا کہ وہ بغیر ملکہ کی رائے کے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ بعض دفعہ شاہی احکام ملکہ کے دستخطوں سے جاری ہوتے تھے۔ بادشاہی مُہر پہ اس کا نام کندہ کرا دیا گیا تھا۔ ایسے سکے محفوظ ہیں جن پر نور جہاں کا نقش اس نفیس شعر کی صورت میں ثبت ہے کہ ؎

به حکم شاہ جہاں گیر یافت صد زیور
به نام نور جہاں بادشاہ بیگم، زر

شیر افگن خاں سے نور جہاں کی ایک بیٹی تھی۔ دوسری بیوی سے شہریار جہاں گیر کا چھوٹا بیٹا تھا۔ ملکہ نے ان کی شادی کرادی اور تجویز یہ سوچی کہ شہریار جہاں گیر کا جانشین، اور کم سے کم کسی خطۂ ملک میں آزاد بادشاہ ہوجائے کہ خود ملکہ کی شان شوکت قائم رہے۔ اس نقشے کا تاریک گوشہ یہ تھا کہ پہلے بادشاہ کو شہزادہ خرّم سے مشکوک و مکدّر کردیا جائے۔ اتفاق سے انہی دنوں قندہار پر ایرانیوں نے فوج کشی کی۔ ہمایوں کے وقت سے وہ اس کی ملکیت کے مدعی تھے۔ اس دفعہ خود شاہ ایران بڑے ساز و سامان کے ساتھ بڑھا تھا۔ جہاں گیر نے شہزادہ خرّم کو مقابلے کے لئے نام زد کیا۔ وہ دکن سے مالوے تک آگیا تھا کہ اس بدگمانی نے قدم تھام لئے کہ یہ ممالک دکن

سے دور پھینکنے اور اُسے اپنے حق سے محروم کرنے کی سازش ہے۔ پھر کثرت باراں کے عذر پر مالوے میں اتنے دن رُکا رہا کہ قندہار ہاتھ سے نکل گیا۔ ساتھ ہی بادشاہ اتنا ناراض اور مشتبہ ہوا کہ لاہور سے دہلی آکر بیٹے کے خلاف ایک فوج روانہ کی کہ مبادا وہ آگرے پر قابض اور علانیہ منحرف ہو جائے۔ حقیقت میں خرّم آگرے کے قریب آگیا تھا مگر شاہی فوج کا مقابلہ کرنے کی ہمّت نہ ہوئی یا ممکن ہے خود اہل لشکر کے تیور بدلے دیکھے کہ اپنی سپاہ کو یہیں چھوڑ کر مختصر جمعیت کے ساتھ مالوے چلا گیا۔ باپ بیٹے میں ایک دریردہ مخالفت جاری رہی۔ کم سے کم خرّم برابر اندیشہ مند رہا کہ بادشاہی حکّام اسے گرفتار کرنے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ پہلے دکن گیا۔ پھر بنگالے کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے پھر دکن آیا۔ اور گجرات کی راہ لی۔ گجرات سے سندھ اور راج پوتانے کا گشت لگایا۔ تین چار سال اسی پریشانی میں بسر ہوئے۔ اس کھیل میں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ پردے کے پیچھے نورجہاں تار ہلا رہی ہے خرّم برابر باپ کو عذرِ تقصیر اور عفو و کرم کی عرضیاں لکھتا رہا۔ اپنے بیٹے بہ طور یرغمال بادشاہ کے پاس بھیج دئے اور کئی دفعہ معلوم ہوا کہ باپ کا دل صاف ہو گیا مگر پھر کوئی گرہ پڑتی اور معاملہ اُلجھ جاتا تھا۔ ذہین ملکہ کی نازک اُنگلیاں سیاسی کشیدہ کاری میں مصروف تھیں اور باپ بیٹے کو ملنے نہ دیتی تھیں ؛

نورجہاں کا منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آتا تھا۔ لیکن پہلے گھر کے گھر میں ایک رقیب کی روک تھام کرنی پڑی۔ یہ اُس کا بھائی آصف خاں تھا۔ نورجہاں کی بہ دولت اُس کے باپ مرزا غیاث نے اعتمادالدولہ

کا خطاب اور ملکہ کے بھائی نے قلم دان وزارت پایا تھا۔ اسی بھائی کی بیٹی ارجمند بانو شہزادہ خرم سے بیاہی تھی۔ یہ وہ خوش نصیب خاتون ہے جو آئندہ شاہ جہاں جیسے ذی شان بادشاہ کی ہم نشین ملکہ بنی اور دنیا سے رخصت ہوئی تو اس کی قبر پر وہ حسین وجمیل روضہ تعمیر ہوا جس نے "تاج گنج" کے عرفِ عام سے مرحومہ کو بقا کا تاج اُڑھایا اور ایک عالم سے تحسین و تعجب کا خراج دلوایا ہے۔ آصف خاں بہن کی سازش چلنے میں مزاحم ہوا تو نور جہاں نے بنگالے کے صوبہ دار مہابت خاں کو کابل کے لئے نام زد کرکے دربار میں طلب کیا اور وزارت کے اکثر اختیارات بھائی سے لے کر مہابت کے حوالے کر دئے۔ وہ شروع میں ملکہ کا رفیق، شہزادہ خرم کا مخالف تھا لیکن شہریار کے منصوبۂ شہریاری میں شریک نہ ہوا۔ نور جہاں ناراض ہوگئی۔ مہابت خاں نے اس کی خفیہ اور ملائم ریشہ دوانی کا یہ کڑا جواب دیا کہ یکایک خود بادشاہ کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ نور جہاں کو الگ کر دیا۔ جہاں گیر کے پاس آمد رفت تک جبرًا روک دی! (۱۰۳۵ھ) مگر یہ نازک اور دشوار صورت قائم نہ رہ سکتی تھی۔ ملکہ کی فراست مہابت کی ہیکڑی پر غالب آئی۔ چند ہی ہفتے میں اسے بادشاہ اور جابرانہ اختیارات کو چھوڑنا پڑا اور خیریت اسی میں نظر آئی کہ چپکے سے اپنی فوج لے کر نکل جائے۔

تدبیر کے کنکوّے اسی طرح لڑ رہے تھے کہ تقدیر کی مقراض نے اصلی ڈور ہی کاٹ دی۔ ۳۶ھ میں جہاں گیر کشمیر جاتا تھا کہ دمے کا دورہ پڑا اور لاہور واپس آتے ہوئے راجوری کی منزل میں اس کا انتقال ہوگیا۔ (صفر ۱۰۳۷ھ م ۱۶۲۷ء) نعش لاہور لاکر دفن کی گئی۔ وزیر آصف خاں

نے چابک دستی سے ملکہ اور شہریار کو نظر بند کر لیا اور ایک شہزادے (داور بخش خلف خسرو) کو ہنگامی بادشاہ بنا کر ہرکارے دوڑائے کہ شہزادہ خرّم کو جتنی جلد ہو سکے آگرے آنے کا پیام پہنچائیں۔ وہ اُن دنوں جنیر کے قلعے میں پناہ گزیں تھا۔ ایک تیز پا ہرکارا تین ہفتے میں جنوبی کشمیر سے شمالی دکن پہنچ گیا اور شہزادہ خرّم دو دو تین تین منزلیں طے کرتا ہوا چلا۔ پھر بھی اُسے پائے تخت پہنچنے میں چار مہینے لگے۔ شہریار اور دو شہزادے جن سے رقابت کا اندیشہ تھا، قتل کر دئے گئے۔ انہی کے ساتھ غریب داور بخش بھی سیاسی مصالح کے سر صدقہ ہوا اور بے گناہ مارا گیا۔ شہزادہ خرّم جمادی الآخر ۱۰۳۷ھ (م جنوری ۱۶۲۸ء) میں شاہجہاں کے لقب سے وارث تاج و تخت بنا۔ سوگ وار نورجہاں لاہور میں اپنے ناز بردار شوہر کی مجاوری کرتی رہی اور بارہ سال بعد وہیں انتقال کیا۔

ضمیمہ

سرطامس روکی سفارت

دسویں صدی ہجری کے آغاز میں اہل یورپ کو افریقہ کا چکر کھا کے ہندوستان آنے کا راستہ معلوم ہو گیا تھا اور ان کے جہاز روز افزوں تعداد میں قزاقی اور تجارت کے لئے بحر ہند میں آنے لگے تھے۔ان فرنگی تاجروں کے ہندوستان آنے اور تجارت کا جال پھیلانے، پھر یہاں کے علاقوں کو اپنے پنجے میں لانے کی کیفیت ہم کتاب کی دوسری جلد میں وضاحت اور ترتیب سے بیان کریں گے۔ لیکن مناسب معلوم ہوا کہ یہاں طامس رو کی سفارت کا کچھ حال تحریر کریں جو پہلی مرتبہ شاہ انگلستان کی طرف سے دربار مغلیہ میں بھیجی گئی تھی ؛ جہانگیر کے آغازِ حکومت (یعنی ۱۶۰۸ء = ۱۰۱۷ھ) میں پہلے کپتان ہاکنس شاہ انگلستان کا ایک خط اور قیمتی تحائف لایا تھا اور ترکی زبان جاننے کی بہ دولت، دعویٰ کرتا ہے کہ اسے "چار صدی" منصب بھی مل گیا تھا۔لیکن انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ سرطامس رو، پہلا باقاعدہ سفیر ہے جسے جیمس اوّل نے ۱۶۱۵ء (= ۱۰۲۴ھ) میں روانہ کیا اور وہ بندر سورت سے اجمیر گیا جہاں شاہی لشکر مقیم تھا۔ اُسی کے ہمراہ ایک پادری ٹیری تھا جس نے

وطن واپس جانے کے تیس برس بعد اپنا سفرنامہ یا "بیان" شائع کیا تھا۔ اس کے اقوال اِل فنس ٹن تک کو "وحشیانہ اور بے ہودہ جھوٹ" کے انبار نظر آئے تھے[۵۱] مگر عہد حاضرہ کے تازہ محقق ونسنٹ اسمتھ، اپنے پادری کی قدوسیت اور ثقاہت پر پورا ایمان لے آئے۔ کیوں کہ وہ افترا پردازی کے ساتھ دشنام طرازی میں بھی مہارت رکھتا ہے اور اُس نے ہندوستان کے مسلمان ملوک و امرا کو ایسے فحش الفاظ سے یاد کیا ہے جو خود اسمتھ صاحب کے اخلاق اور بازاری مذاق سے خاص مناسبت رکھتے ہیں[۵۲] ٹیری کی گندی ڈھیری تو اس قابل نہیں کہ کوئی شائستہ آدمی ادھر توجہ کرے لیکن خود سفیر صاحب کے روزنامچہ (یا "جرنل") کے مختلف نسخے چھپے ہیں اور انگریزی تاریخوں میں جو اقتباسات دئے گئے ہیں، وہ انجیل مقدس کے انگریزی ترجموں کی طرح، ہر زمانے میں بالکل بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاہِ انگلستان کا مرتبہ شہنشاہ جہاں گیر کی نگاہ میں دکن یا راج پوتانے کے بڑے رئیسوں سے زیادہ نہ ہوسکتا تھا۔ دوسرے سفارت کی غرض تجارتی رعاتیں حاصل کرنا تھی عجب نہیں اس نے سفیر کو اور بھی بے توقیر بنا دیا ہو۔ وہ خود اقرار کرتا ہے کہ مہینوں اسے امیر و وزیر کی دربارداری کرنی پڑی اور غالباً شاہی دربار میں باقاعدہ باریابی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کم سے کم فارسی تاریخیں اور تزک جہاں گیری جن میں ایران، توران کے سفیروں کی آمد اور اعزاز و استقبال خاصی تفصیل سے تحریر ہیں، سفیر انگلستان کا کوئی تذکرہ نہیں کرتیں،

---

۵۱ دیکھو اِل فنس ٹن کی تاریخ ہند۔ ص۵۴۲ وغیرہ۔

۵۲ اوکس فورڈ ہسٹری ص۳۸۳

البتہ انگریزوں کے اپنی ملکی مصنوعات اور تحائف پیش کرنے کا ذکر آتا ہے۔ ان حالات میں یہ یقین کرنا بہت دشوار ہے کہ بادشاہ طامس رو کو خلوت کے جلسوں میں بلاتا اور حریف مےکشی بناتا تھا، جن کی انگریز سفیر نے بہت مزے لے لے کر کیفیت لکھی ہے۔ روزنامچے میں بہت سی باتیں صریحاً غلط اور مصنوعی ہیں۔ اس انبار کو جب تک محنت اور احتیاط سے نہ چھانا جائے، صداقت کے ذرّے جمع کرنا محال ہے۔ اسی لئے خالص تاریخی نظر سے دیکھئے تو سر طامس رو کے بیانات نہایت مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔

باب نوزدہم (۱۹)

سلطنت مغلیہ کا عروج ۔۲

عہدِ فراغت و آسودگی

مورلینڈ نے اپنی کتاب "ہند کے معاشی حالات" جلد دوم میں خاصے تفصیلی اعداد و شمار لکھ کر بتایا ہے کہ شاہجہاں کے زمانے میں سلطنت کی مال گزاری عہدِ اکبری کی نسبت دگنی سے زیادہ ہو گئی تھی ۔ منصب اور مشاہرے جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھے ، اور بڑھا دئے گئے ، حالانکہ اجناس کے نرخ ویسے ہی ارزاں ہیں جیسے پچاس ساٹھ برس پیش تر تھے ۔ یورپ کے بحری تاجروں کی روز افزوں آمد سے تجارت برآمد میں معقول اضافہ ہوا اور ہندوستان کا سوتی کپڑا ، ریشم ، شکر ، مرچ مصالحے ، نیل وغیرہ اشیا دُور دُور کے ملکوں میں وسادر جانے لگیں[1]۔ یہ سب لکھ کر یکایک مصنف نتیجہ نکالتا ہے کہ اس تمام دولت کو ارباب

---

[1] ص ۲۶۹ ۔ اجناس کی قیمتوں کے لئے دیکھو ص ۴۲ و ۱۴۳ ۔

حکومت ہضم کر جاتے تھے، دولت پیدا کرنے والے کسان و کاری گر ننگے بھوکے رہ جاتے تھے اور ان بدنصیبوں میں فاقہ کشی بلکہ خودکشی کی نوبت پہنچ گئی تھی! تعصب اور بے جا پاس داری سے آدمی کی عقل بگڑ جاتی ہے، مورلینڈ کا قول اس کی ایک مثال ہے۔ درحقیقت ہندوستان جو دنیا کا سب سے دولت مند ملک مانا جاتا تھا، انگریزوں کے دورِ حکومت میں دنیا کا سب سے مفلس ملک ہو گیا۔ اس عظیم اور مہیب تغیر کی ذمہ داری ہلکی کرنے کے لئے اکثر انگریز مصنف زمانۂ ماضی پر الزام دھرتے اور افلاس ہند کی بہت سی خیالی وجوہ تصنیف کرتے رہے ہیں۔ ان پر مطلق اعتنا نہ کرنی چاہیے۔ شاہ جہاں کے عہد کی مفصل تاریخیں اور معتبر کتابیں موجود ہیں خود یورپ کے بعض سیاح و تاجر بے لاگ شہادتیں دے گئے ہیں جن سے یہ قول بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری (= سترھویں صدی عیسوی) میں ممالک ہند و پاکستان جس قدر آسودہ اور خوش حال تھے، اتنے نہ کبھی پہلے تھے نہ آئندہ کبھی اتنے مال دار ہوئے۔ ہم یہاں کے باشندوں کے تمدن پر کتاب کے آخری باب میں نظر ڈالیں گے اور ان کی افلاس پذیری کا دوسری جلد میں مطالعہ کریں گے۔ یہاں یہ لکھنا کافی ہوگا کہ لوگوں کی آسودگی زراعت و صناعت، فنون و تجارت کی ترقی سے پیدا ہوئی اور خود یہ ترقی امن و اطمینان اور حکومت کے حسنِ انتظام کا نتیجہ تھی۔ اسی عہد کا مشہور انگریز مبصر ولیم ہاکنس لکھتا ہے کہ ہندوستان چاندی سے مالامال ہے کیوں کہ دنیا کی سب قومیں زر نقد یہاں لاتی ہیں اور عوض میں اجناس خرید کر لے جاتی ہیں۔ یہ سونے چاندی کے سکے ہندوستان ہی

میں رہ جاتے ہیں اور پھر باہر نہیں جانے پاتے ؛[۵۱] فرنگی تاجر و جہازراں ہندوستان کے تاجروں پر بار بار رشک کرتے ہیں جن میں متعدد لکھ پتی، کروڑ پتی تھے۔ یہ بیرونی شاہد خصوصیت سے سورت کے ملک التجار بیرجی (بوہرہ) کا ذکر کرتے ہیں اور اس باب میں اکثر متفق ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں دنیا کا سب سے دولت مند سوداگر تھا ؛[۵۲]

آسودہ حالی کے سلسلے میں، اُمرا کی شان شوکت اور بادشاہی جشن و جلوس کی عینی روایتیں پڑھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ ان دنوں ان ملکوں میں دولت کی کیا لہر بہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا سونے چاندی کی گنگا بہ رہی ہے۔ مغلیہ دربار کے تزک و احتشام نے معاصرین اور قدیم بادشاہوں کے عیش و تجمّل کے قصّے پھیکے کر دئے تھے۔ سال گرہ، یوم جلوس، نوروز، عیدین وغیرہ پر جو مقررہ جشن منائے جاتے تھے، ان میں بلا مبالغہ کروروں خرچ ہو جاتا تھا۔ ایک مثال نقل کرنے، یاد رکھنے کے لائق یہ ہے کہ بادشاہ کی سب سے عزیز و باتمیز بیٹی جہاں آرا ایک خادمہ کے کپڑوں میں آگ بجھانے دوڑی تھی کہ خود اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ کئی مہینے تک بیمار رہی۔ آخر خدا نے صحت دی۔ شاہ جہاں نے شفایابی کا خاص جشن ترتیب دیا۔ شہزادی باپ کے سلام کو اپنے پاؤں چل کر آئی تو سچے موتیوں کے

---

[۵۱] مورلینڈ۔ ج ۲۔ ص ۵۳ ؛

[۵۲] مورلینڈ۔ ج ۲۔ ص ۵۳، ۱۵۳۔ بیرجی کی فیاضانہ دست گیری نے انگریزی کمپنی کو دو تین دفعہ دوالہ نکالنے سے بچایا تھا۔ مگر اس کی عظمت کی دوسری فرنگی قوموں کے تاجر بھی تصدیق کرتے تھے ؛

دو طبق بھر کر صدقہ اُتارا گیا۔ سرکاری تاریخ میں ان کی قیمت تیس لاکھ روپیہ تحریر ہے۔ جو غربا اور مساکین میں تقسیم ہوئے۔ پھر وہ حکیم جس کے مرہم سے خدا نے شفا دی تھی، سونے میں تولا گیا اور یہ سارا سونا اسے انعام ملا۔ ایک فقیر کے لیپ سے فائدہ ہوا تھا۔ اُسے ہم وزن چاندی ملی کہ عمر بھر کے لئے غنی ہو گیا۔ شاہی خاندان کے افراد اور عمائد و امرا نے لاکھوں روپے کے صدقات کے علاوہ شہزادی کو جو تحائف پیش کئے ان کی قیمت چار کرور روپے سے زیادہ تھی۔ بادشاہ نے اسی نسبت سے انھیں بیش بہا خلعت اور انعام اکرام سے نوازا۔ کئی دن تک پائے تخت اور بڑے شہروں میں بادشاہ کی جانب سے عام ضیافت کا انتظام کیا گیا جن میں ہر فقیر و مزدور نے وہ وہ عمدہ کھانے کھائے کہ دولت مندوں کو بھی میسر نہ آتے تھے؛

یہ سب واقعات، بادشاہ نامہ، عمل صالح، شاہجہاں نامہ وغیرہ، نیز کچھ بعد کی تاریخوں میں مفصل مذکور ہیں۔ مگر ان کتابی شہادتوں سے قطع نظر، بادشاہ نے جو نئے شہر، قلعے اور عالی شان عمارتیں تعمیر کیں، وہ سب اس کی عظمت و شان اور بے مثال حسنِ مذاق کے مرقع ہیں کہ سنگ سرخ و رخام اور مرمر و موسیٰ کے خطوط سے بنائے گئے اور دیکھنے والوں کے دل میں آج بھی حیرت و عقیدت کا جوش پیدا کر دیتے ہیں؛

اس تمام داد و دہش اور بے اندازہ خرچ کے باوصف دورِ بادشاہی ختم ہوا تو بیش بہا زیورات و ملبوسات اور تخت طاؤس جیسے گراں بہا سامان زینت کے علاوہ خزانۂ شاہجہانی سے ۲۴ کرور روپیہ نقد اور تقریباً ۱۶ کرور روپے کا غیر مسکوک سونا چاندی اور جواہرات برآمد ہوئے جن کی قیمت

رائج الوقت سکّے میں ارب ۱۱ ارب روپے تک پہنچ جاتی ہے۔[1]

بیرونی مہمات

پائے تخت اور ممالک سلطنت کی تزئین و آرائش کے دوران ہی میں بادشاہ کو تین بڑی مہمات پیش آئیں۔ ان میں دکن کے معرکوں کا سلسلہ ہم اگلی فصل میں یک جائی مرتب کریں گے۔ دوسری، بلخ و بدخشاں اور قندہار کی کشاکشیں تھیں جو اُلٹ اُلٹ کے ۶، ۷ سال تک جاری رہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، جہاں گیر کے زمانے میں قندہار مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اُن دنوں یہ شہر فقط سیب و انار اور گندم سفید ہی کے باعث مشہور نہ تھا، بلکہ وسط ایشیا کے تجارتی راستے یہاں سے گزرتے تھے اور یہ تجارت کی بہت بڑی منڈی بن گیا تھا۔ ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں یہاں کے ایرانی حاکم علی مردان خاں کی اپنی مرکزی حکومت سے ان بن ہو گئی اور وہ خود بھی شاہ جہاں کے دربار میں آیا اور قندہار کو بھی سلطنت مغلیہ میں گھسیٹ لایا تھا۔ آگرے میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نئی دہلی (شاہ جہاں آباد) کی خوش نمائی میں اُس کے حُسنِ ذوق کا، حصہ تھا اور شہر کے بڑے بازار میں وہ نہر اُسی نے نکالی تھی جو موجودہ صدی کے آغاز تک چاندنی چوک کا مایۂ شہرت و امتیاز رہی۔ پھر بُخارا کے بادشاہ نذر محمد نے مقامی رقیبوں سے تنگ آکر مغل بادشاہ سے مدد مانگی تو علی مردان خاں شہزادہ مُراد کے ہم راہ نائب

---

[1] جرجی نے تاریخ قوم عرب میں، ثعلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبّاسی خلیفہ المکتفی فوت ہوا تو نقد اور جواہرات اور اثاثہ جو اس نے چھوڑا، وہ دس کرور دینار قیمت کا تھا۔ ص ۳۲۱ خلفائے عرب میں اور کسی نے جہاں تک معلوم ہے۔ اتنا قیمتی متروکہ نہ چھوڑا تھا۔

سپہ سالار بنا کر بلخ و بدخشاں بھیجا گیا۔ (۱۰۵۵ھ = ۱۶۴۶ء) مراد لڑجھگڑ کر واپس چلا آیا۔ شہزادہ شجاع، سپہ سالار نامزد ہوا۔ وہ چھوٹے بھائی سے زیادہ عیش دوست اور کاہل تھا۔ جانے میں سال بھر تک لیت و لعل کرتا رہا۔ آخر مہم کا انتظام وزیر سعداللہ خاں اور اورنگ زیب کے تفویض کیا گیا اور یہ شہزادہ کابل سے ہندی فوج کو لے کر بدخشاں میں داخل ہو گیا (۱۰۵۷ھ) کئی میدان سر کئے۔ بڑے بڑے قلعوں میں ہندی فوج تعینات کر دی۔ اس شمالی ولایت کے کڑکڑاتے جاڑے اور خوں خوار ازبکوں کی آتشیں حمیت، سب گرم و سرد جھیل گیا اور آگے بڑھنے کے لئے مزید فوج ہندوستان سے طلب کی ÷ واضح رہے کہ مغل بادشاہوں کو ابھی تک بلخ و بدخشاں کی تیموری میراث کا دعویٰ تھا۔ حال آں کہ وہاں ایک صدی سے ازبک قوم قابض و آباد تھی۔ تیمور کا نام بھی لوگ بھول چکے تھے۔ شاہ جہاں مدد کے حیلے سے آبائی ملک دوبارہ چھین لینے کی فکر میں تھا۔ غالبًا قلعوں میں ہندی فوجوں کے قیام سے یہ منصوبہ آشکارا ہو گیا۔ اور اسی پر نذر محمد خاں مغلوں کی مدد منگانے سے پچھتایا بلکہ اُن کا ساتھ چھوڑ کر نکل گیا۔ اس کی علاحدگی نے لڑائی کی نوعیت ہی بدل دی۔ ہندوکش سے بحر خزر تک ازبک قوم کے بے تعداد جنگ آزما کمانیں سنبھال سنبھال کر مغل حملہ آوروں پر اُمنڈ آئے۔ ان خوں ریز معرکوں میں شہزادہ اورنگ زیب نے ذاتی بہادری کے وہ کرشمے دکھائے کہ دشمن و دوست سب کے منہ سے صدائے آفریں بلند ہوئی۔ مگر نذر محمد خاں کے غائب ہو جانے سے شاہ جہاں کو اپنی غلطی نظر آگئی۔ ثابت ہوا کہ دہلی اور آگرے سے بلخ و بخارا پر چڑھائی

کرنا، دریا کے بہاؤ کے خلاف موجوں سے لڑنا ہے۔ لہذا صلح کرنے کا حکم دیا اور بلخ کو دریں کے ایک دعوے دار کے حوالے کر کے مغل فوجیں واپس کابل چلی آئیں۔ آبائی میراث کو لینے کی اس بازی میں شاہ جہاں کا تین کروڑ سے زیادہ روپیہ خرچ ہوا؛ (۱۰۵۸ھ = ۱۶۴۷ء)

اس نقصان و ناکامی کا ملال ابھی باقی ہوگا کہ یکایک ایرانیوں کے قندھار پر فوج کشی کی خبر آئی۔ وہ سخت جاڑے میں لمبی مار کی قلعہ شکن توپیں لے کر آئے تھے۔ اور ان کا اندازہ صحیح نکلا کہ ہندوستان سے بروقت امداد نہ پہنچ سکی۔ قلعہ دار کی نااہلی سے دو مہینے میں یہ مستحکم قلعہ فتح ہو گیا (۱۰۵۸ھ) ایرانیوں نے بہت جلد ایسی مورچہ بندی کی اور دفاعی جنگ کا اتنا بڑا ذخیرہ یہاں جمع کیا کہ پھر مغلوں کے حملے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دو مرتبہ شہزادہ اورنگ زیب نے فوج کشی کی اور ناکام رہا۔ تیسری دفعہ بڑے بھائی نے بڑے سازوسامان اور دعووں کے ساتھ محاصرہ کیا مگر زیادہ نقصان اٹھا کر واپس ہوا۔ قندھار مستقل طور پر مغلوں کی دست رس سے نکل گیا؛ (۱۰۶۳ھ = ۱۶۵۳ء)

دکن کے معاملات اور معرکے

ملک عنبر کی وفات نے رہی سہی نظام شاہی عمارت کو کھنڈر کر دیا تھا۔ مگر دربار بیجاپور کے چھینٹوں سے اس خاکستر میں کبھی کبھی چنگاریاں بھڑک اٹھتی تھیں۔ نظام شاہی اُمرا جب موقع پاتے سرحدی قلعوں میں طوفان اٹھاتے اور نظام شاہی خاندان کے کسی لڑکے کو بادشاہ بنا کے آزادی کا دم بھرنے لگتے تھے۔ ان سرحدی قلعوں پر اہل بیجاپور قدیم سے اپنا حق جتاتے تھے اس لئے یہاں کے مغل قلعہ داروں کو

مفسد نظام شاہیوں کی بجائے بیجاپور کی بڑی بڑی فوجوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ شمالی دکن کی انہی بے قاعدہ لڑائیوں میں پہلی مرتبہ بعض مرہٹہ رئیسوں کا نام آتا ہے جن میں سیواجی کا باپ ساہوجی سب سے تیز نکلا اور ایک زمانے تک کوکن کے پہاڑی علاقوں میں فساد مچاتا رہا۔ ایک اور پیچیدگی یہ پیش آئی کہ دربار شاہجہانی کا امیر کبیر خان جہاں لودھی بادشاہ کے عتاب سے ڈر کر بھاگا اور اپنی فوجی جمعیت کے ساتھ غیر معروف راستوں سے دکن پہنچ گیا۔ وہ ممالک ہند و کابل کے افغانوں کا سرگروہ سمجھا جاتا تھا، اس لئے دکن کے شورہ پشتوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مغلوں سے اُسے لڑانے کے بڑے بڑے منصوبے باندھنے لگے (۱۰۴۰ھ)۔ مگر شاہجہاں خود آگرے سے برہان پور آیا اور شاہی فوجیں مفسدوں کو پامال کرتی ہوئی بیجاپور اور گولکنڈے کی سرحدوں تک بڑھیں، تو اہل شورش کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ خان جہاں چھپ کر شمال کی طرف بھاگا تھا لیکن سلطنت مغلیہ کی سطوت و انتظام دیکھئے کہ اب پہاڑوں، جنگلوں نے بھی اسے پناہ نہ دی۔ اور کالنجر کے قریب گھر کر مارا گیا۔ اُس کی جمعیت منتشر ہو گئی (۱۰۴۰ھ) اسی طرح دولت آباد میں فتح خاں نے ہار مان لی اور مغلوں کی اطاعت قبول کی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ شاہجہاں اور شاہی لشکر واپس چلا گیا اور نظام شاہی کا مُردہ لاشہ بھی حقیقت میں دفن کر گیا تھا۔ مگر ساہو نے پھر قزاقانہ جنگ چھیڑ دی۔ بیجاپور کی پشت پناہی سے ایک بڑے سرحدی قلعے پرنیدہ کو اپنا مضبوط مامن بنالیا۔ شہزادہ شجاع کو دکن کی صوبہ داری سپرد ہوئی تھی، وہ انتظام سنبھالنے اور اس اجڑے ملک کو

بسانے میں ناکام رہا۔ بادشاہ نے متفّض ہوکر دوبارہ دکن کا رُخ کیا اور اس مرتبہ نظام شاہی اضلاع کی لشکرکشی میں مملکت بیجاپور کو بھی پامال کرڈالا۔ ساتھ ہی ایک سفارت گول کنڈہ روانہ کی گئی اور قطب شاہیوں سے مطالبہ کیا کہ مغل بادشاہ کو باقاعدہ خراج دینے کا وعدہ کریں خطبوں میں اس کا نام لیا جائے اور بعض تبرائی کلمات خارج کر دئے جائیں ؛ عبداللہ قطب شاہ نے بے لڑے بھڑے یہ مطالبات تسلیم کرلئے اور تحریری حلف نامے سے عہد وپیمان کی توثیق کی (۱۰۴۵ھ = ۱۶۳۶ء) بیجاپور کی عادل شاہی حکومت نے بھی اپنے مُلک کی پامالی سے پریشان ہوکر امان مانگی۔ شاہ جہاں نے اس حکومت سے جن شرطوں پر صلح کی وہ ظاہر میں نرم تھیں مگر حقیقت میں مغلوں کی گرفت کو اور کڑا کرتی تھیں ان کی رُو سے بیجاپور میں نہ صرف خطبہ بلکہ سکّہ بھی مغل بادشاہ کا جاری کرایا گیا، جو اُس زمانے میں عین تسلّط کا نشان تھا۔ اس کے عوض میں خراج کی رقم نصف کردی اور سرحد کے چند نزاعی اضلاع بھی حکومت بیجاپور کے حوالے کر دئے گئے تھے ؛ صلح نامے کی تکمیل اور دکن کو (خاندیس، برار، دولت آباد اور تلنگانہ) چار صوبوں میں تقسیم کرنے کے بعد بادشاہ نے ماہ صفر ۱۰۴۶ھ (= ۱۶۳۶ء) میں مراجعت کی۔ اس مرتبہ ولایات دکن کی صوبہ داری شہزادہ اورنگ زیب کے تفویض ہوئی تھی مگر وہ شمال میں طلب ہوا اور کئی سال تک بیرونی مہمات میں مصروف رہا۔ ۱۲، ۱۳ برس تک مختلف صوبہ دار آتے رہے اور عموماً بدنام و ناکام واپس گئے۔ دکن کی کَل کسی طرح درست نہ ہوئی یہاں تک کہ اورنگ زیب ہی اس دشوار خدمت کے لئے دوبارہ منتخب کیا گیا (۱۰۶۲ھ = ۱۶۵۲ء)؛

شہزادہ اورنگ زیب اور دکن کی تنظیم

یہ شہزادہ، شاہ جہاں کا تیسرا فرزند، اپنے تینوں بھائیوں سے بہت مختلف مزاج رکھتا تھا۔ ۱۰۲۷ھ (م ۱۶۱۸ء) میں، مالوے کے قریہ دوہد میں پیدا ہوا۔ علوم دین اور فارسی ادبیات کی بہت اچھی تعلیم پائی۔ لڑکپن میں ایک مست ہاتھی کے مقابلے میں ڈٹ گیا اور مرنے سے بال بال بچا (۱۰۳۱ھ) یہ اُس کی عزم و جرأت کا پہلا ثبوت تھا۔ پھر بلخ و بدخشاں کے معرکوں میں سپہ سالاری اور جاں بازی کے جوہر دکھائے۔ ایک مرتبہ عین لڑائی کے گھمسان میں، تیر و تفنگ سے بے پروا ہو کر نماز ظہر ادا کی۔ کہتے ہیں حریف بادشاہ یہ دیکھ کر بے اختیار پکارا کہ ایسے آدمی سے لڑنا، خدا سے جنگ کرنا ہے! اورنگ زیب کی اس مذہبیت کا بڑا بھائی (دارا شکوہ) شروع سے مضحکہ اُڑاتا اور اسے ریاکار، کٹھ ملا وغیرہ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ لیکن فراست و اہلیت برابر بلندی کے زینوں پر چڑھاتی رہی۔ سچ پوچھئے تو تسمیہ کے وقت ہی گویا تقدیر نے اشارہ کر دیا تھا کہ اورنگِ شاہی کی زیب و زینت انہی قدموں سے ہو گی۔

احمد نگر کی مملکت کو گزشتہ ۶۰ برس کی جنگ و جدال نے پامال بلکہ نڈھال کر رکھا تھا۔ ملک عنبر کی چھاپہ مار جنگ آخر میں بڑی مہنگی پڑی تھی۔ ہزاروں جوان حبِ وطن اور حوصلہ مندی کی نذر ہوئے اور اُن سے کہیں زیادہ تعداد مغلوں کے استیلا سے بچ کر دوسرے ملکوں میں نکل گئی۔ کئی بار کی خشک سالی نے الگ زمین کا عرق چوسا اور زراعت کا ناس مار دیا تھا۔ تجارت، صنعت و حرفت کے بازار سنسان پڑے تھے بڑی

بڑی بستیوں میں ویرانی آبسی تھی - خزانہ بادشاہی کو وصولی ایک طرف، سرکاری انتظامات کے لئے گرہ سے خرچ کرنا پڑتا تھا۔ مال گزاری کی تشخیص پونے چار کروڑ روپے کے قریب تھی لیکن کئی سال سے وہ گھٹتے گھٹتے صرف ایک کروڑ روپیہ رہ گئی تھی[1] مالی خسارے کا صوبائی فوج پر لازماً بُرا اثر پڑا اور ان کی تعداد میں اتنی کمی اور تنظیم میں ایسی ابتری واقع ہوئی کہ بیجاپور و گولکنڈہ کی حکومتیں مغلوں سے بے پروائی برتنے اور ادائے خراج میں لیت و لعل کرنے لگیں۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو دکن کی طرف رخصت کیا تو شاہ بیجاپور کے "کفرانِ نعمت" کی خاص طور پر شکایت کی تھی[2]۔

اورنگ زیب دولت آباد کیا آیا شمالی دکن میں خیر و خوبی کا دور آیا۔ دوآب کے صوبوں تک سے بنجاروں کے بڑے بڑے قافلے غلہ لائے۔ قحط زدہ علاقوں میں اجناس کی منڈیاں کھل گئیں۔ کسانوں کو تخم اور تقاوی نے زراعت کے قابل بنا دیا۔ باران رحمت نے بھی مساعدت کی۔ خشک کھیتیاں ہری ہوگئیں۔ بہت سے رقبے بنجر بن گئے تھے۔ دوبارہ سرسبز نظر آنے لگے۔ مزروعہ اراضی کی پیمائش اور نئی جمع بندی تیار ہوئی اور پہلی مرتبہ وہ مال گزاری بندوبست عمل میں آیا جو اورنگ زیب کے لائق دیوان کے نام پر " دھارا مرشد قلی خاں" کہلایا اور ہمارے زمانے تک جنوبی ہند میں اس کی پیروی کی جاتی رہی۔

---

[1] آداب عالمگیری (مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ورق ۵۱۔ مآثر الامرا۔ ج ۳ صفحہ ۴۹۶و۴۹۲
نیز دیکھو جدو ناتھ سرکار کی تاریخ اورنگ زیب۔ ج ۱۔ باب نہم۔

[2] آداب عالمگیری۔ ورق ۳۴۔

زراعت کی بحالی اور امن و انتظام کے استحکام سے ملک میں دوبارہ رونق آگئی۔ اہل حرفہ اور دستکار صنعت و حرفت میں مشغول ہوئے۔ پارچہ بافی، کاغذ سازی کے سرکاری کارخانے بڑے پیمانے پر کھولے گئے۔ راستوں کی حفاظت سے آمدورفت اور تجارت میں از خود ترقی ہونے لگی۔ بھاگے ہوئے لوگ واپس آنے اور اجڑی بستیوں کو بسانے لگے۔ اورنگ آباد نے اسی زمانے میں عالی شان عمارات، آبادی کی کثرت اور صنعتوں کے فروغ سے ایک بڑے بادشاہی شہر کی منزلت حاصل کی؛

گول کنڈے اور بیجاپور پر چڑھائی

تین چار سال میں ولایات دکن کے کل پرزے سب درست ہوگئے۔ آمدنی اتنی بڑھی کہ فوج میں اضافہ اور نئے ہتیاروں سے آراستہ کرنا ممکن ہوا۔ اور اب اورنگ زیب نے ہمسایہ ریاستوں کی جانب توجہ کی باگ موڑی۔ ان "شاہیوں" کو اکبر کے زمانے سے مغل فرماں روا محکوم بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ احمد نگر کے خاتمے کے ساتھ بیجاپور اور گول کنڈے کو شاہ جہاں نے جبراً و قہراً خراج گزار بنالیا اور ان کے الحاق کی بسم اللہ کرگیا تھا۔ قسمت بھی مغلوں سے ساز رکھتی تھی کہ یہ ریاستیں دفاع کی بجائے، امیروں کے نفاق اور بادشاہوں کی غفلت سے اپنی تباہی کا سامان کرتی تھیں اور مغلوں کی جنگی قوت کا مقابلہ شاید صرف اپنے موروثی حقوق یا حیلہ سازیوں سے کرنا چاہتی تھیں۔ یہ ہتیار طاقت ور حریف کے خلاف نہ چل سکتے تھے۔ مغلوں کا پہلا حملہ گول کنڈے پر ہوا جہاں سے مقررہ پیش کش بھیجنے میں لیت و لعل کی جا رہی تھی۔ بادشاہ کے ایما سے اورنگ زیب نے جنگ کا اعلان کر دیا تھا مگر

عیش کے ماتوں نے یقین نہ کیا اور باتوں سے دشمن کو بہلاتے رہے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کا بڑا بیٹا محمد سلطان فوج لے کر اس قدر تیز بڑھا کہ عبداللہ قطب شاہ کو حیدر آباد شہر سے نکل کر گول کنڈے جانے اور قلعہ بندی کرنے کی مشکل سے مہلت ملی (۱۰۶۶ھ) اورنگ زیب تیار تھا کہ اسی ریلے میں قطب شاہی کی کھوکھلی دیوار کو ڈھکیل دے لیکن گول کنڈے سے کہیں زیادہ کارگر مخالفت اُسے آگرے میں پیش آئی۔ یعنی دارا شکوہ کی رقیبانہ کوشش نے بادشاہ کو مجبور کر دیا کہ گول کنڈے کی تسخیر سے بیٹے کو حکماً روک دے اور اطاعت گزاری کے عہد و پیمان کی تجدید اور پیش کش کی کچھ رقوم لے کر مغلیہ فوجیں واپس ہٹا لائے۔

دوسرے سال یہی معاملہ بیجاپور میں پیش آیا۔ اس ریاست سے شاہ جہاں نہایت ناراض تھا۔ ایک بادشاہی فوج صوبہ دار دکن کی مدد کے لئے بھیجی گئی تھی۔ بیدر و کلیانی کے مضبوط قلعے اورنگ زیب کے آہنی شکنجے میں پھنس چکے تھے اور خاص پائے تخت بیجاپور پر اقدام ہونے والا تھا جب کہ شاہی احکام پہنچے کہ مذکورہ بالا قلعے اور ڈیڑھ کرور روپیہ لے کر عادل شاہی حکومت سے صلح کر لی جائے ؛ (۱۰۶۷ھ)

حریف شہزادے

ان فرامین میں اورنگ زیب کی بے توقیری کا پہلو، اور پس پردہ دارا شکوہ کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ عالمگیری مکتوبات میں اس زمانے کے کئی خط بادشاہ اور جہاں آرا بیگم کے نام سلامت اور زیر لب شکایت سے لبریز ہیں۔ یہ مخفی کشاکش جاری تھی کہ اسی سال کے اواخر میں شاہ جہاں سخت بیمار ہوا اور چاروں بھائیوں میں حصول اقتدار کی وہ جنگ علانیہ

چھڑ گئی جس نے کئی مہینے تک ممالک پاکستان و ہند میں زلزلہ ڈال دیا اور انجام کار اورنگ زیب کو تخت سلطنت کا وارث بنا دیا ؛ ۶۸-۱۰۶۷ھ = ۵۸-۱۶۵۷ء۔

شاہ جہاں کے چاروں بیٹے ایک ہی ماں (ممتاز محل بیگم) سے تھے۔ بڑا، دارا شکوہ (ولادت ۱۰۲۴ھ) باپ کا چہیتا، ناز و نعمت کا پروردہ، زیادہ تر باپ کے پاس پائے تخت ہی میں رہا تھا۔ وہ ایک ذہین، فیاض مگر جذباتی، تنک مزاج، ناعاقبت اندیش شہزادہ تھا ؛ دوسرا بھائی شجاع اُن دنوں بنگالے کے سرسبز و وسیع صوبے کا والی، اپنی عیش پسندی میں مشہور تھا۔ بنگالے کی بندرگاہوں سے فرنگی سوداگر یورپ کی مصنوعات لاتے اور شجاع سے منہ مانگی قیمتیں وصول کرتے تھے۔ انہی میں نئی وضع کی توپیں بھی تھیں جن کی خوبی اور کثرت پر اسے بہت گھمنڈ تھا ؛ سب سے چھوٹا بھائی مُرادبخش، صوبہ دار گجرات، تند خو، جنگ جُو، رند مزاج، لاابالی جوان تھا، غالباً اسے بھی دارا شکوہ کی مشیخت پسندی سے خاص نفرت تھی ؛ اورنگ زیب مزاج و عادات میں تینوں بھائیوں سے الگ تھا۔ جنگی معرکوں نے اسے جفاکشی اور دنیا کے نشیب و فراز نے دوربینی سکھائی تھی۔ فطری بہادری کو مذہبی عقائد نے قوت پہنچائی تھی۔ علمی، عملی اور انتظامی قابلیت میں اہل الرائے اسے سب بھائیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ "بقائے اصلح" کی اس جنگ میں اصلی حریف دارا اور اورنگ زیب ہی کو سمجھنا چاہیئے۔ عمر و عادت میں پختگی کے ساتھ ان کے ابتدائی اختلاف بھی قوی تر، نمایاں تر ہو گئے تھے۔ اگرچہ کچھ شک نہیں کہ لڑائی سیاسی اقتدار یا حفاظت خود اختیاری کے لئے ہوئی مگر اس کے خونی

چہرے کو دینی حرارت نے اور سُرخ کر دیا تھا۔ دارا شکوہ جوانی سے وحدت وجود کا قائل اور وسیع المشرب صوفی ہونے کا مدّعی تھا۔ شروع میں حضرت میاں میرؒ (لاہوری) کے سامنے زانوئے ادب تہ کرکے بیٹھتا تھا۔ پھر مجذوب سرمد اور جوگی لال داس جیسے آزادوں کا معتقد ہوا اور چند کتابیں لکھ کر شائع کیں۔ ایک اُپنشد کا فارسی ترجمہ ہے جس میں قرآن مجید کی آیات کا ماخذ اسی سنسکرت کتاب کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی کتابیں کوئی عام صوفی یا فلسفی لکھتا تو اس کی تاویل کی گنجائش نکل آتی۔ مگر ایسے مسلمان شہزادے کی آزادی، جو آیندہ بادشاہی کا اُمید دار تھا، مسلمانوں میں سخت تشویش و ناگواری کا باعث ہوئی۔ خصوصاً اِس زمانے میں جب کہ حضرت مجدّد سرہندیؒ کی طاقت ور تحریک نے تصوّف پر شریعت کی لگام چڑھائی اور بے باک سے بے باک صوفیوں کی مُنہ زوری روک دی تھی۔ علما کو واقعی اندیشہ پیدا ہوگیا کہ دارا کو ممالک ہند کی دارائی ملی تو دین الٰہی اکبر شاہی کا دَور پلٹ آئے گا۔ بخلاف اس کے اورنگ زیب کی دین داری میں کسی کو کلام نہ تھا اور اس کی ہوسِ سلطنت بھی تلی اور مذہبی محرکات سے بالکل خالی نہ تھی۔

خانہ جنگی

ہندوؤں کا ایک فرقہ پہلے بادشاہ کا مُنہ دیکھتا، پھر کوئی دوسرا کام کرتا تھا۔ یہ لوگ درشنی کہلانے لگے تھے اور غالباً ان کی خاطر بھی مغل بادشاہ روزانہ جھروکے میں آکر بیٹھا کرتے تھے کہ عقیدت مند رعایا دُور سے دیکھ کر جی خوش کرلے۔ یہ معمول ناغہ ہوا تو اسی سے لوگ سمجھ گئے کہ بادشاہ کی طبیعت زیادہ ناساز ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ افواہ آندھی کی طرح

ماری اور سلطنت کے گوشے گوشے میں گھوم گئی کہ شاہ جہاں کا انتقال ہو گیا۔ نظم و نسق کا کام داراشکوہ نے ہاتھ میں لیا اور اپنی مصلحت سے بھائیوں کے درباری وکیلوں کو نظر بند کر دیا۔ یہ سنتے ہی شجاع نے بنگالے میں بادشاہی کا اعلان کیا اور یہ کہہ کر کہ دارا نے باپ کو زہر دلوا دیا ہے، بھائی سے لڑنے کے لئے آگرے روانہ ہوا ؛ مراد بخش اور اورنگ زیب سے داراشکوہ نے خود چھیڑ نکالی کہ چھوٹے بھائی کو گجرات کی صوبہ داری سے ہٹا کر برار پر نام زد کیا جو اورنگ زیب کی ولایتِ دکن میں داخل تھا قاسم خاں اور جودھ پور کے راجہ جسونت سنگھ کو فوج دے کے مالوے بھیجا کہ ضرورت ہو تو ان احکام کی جبراً تعمیل کرائیں ؛ مراد بخش اس فرمان سے اور بھی بھڑک اٹھا۔ گجرات میں اپنی بادشاہی کا نقارہ بجوایا۔ "بادشاہ غازی محمد مراد بخش" کے نام کا سکہ ضرب کرایا۔ دارا کو سخت الفاظ میں جواب لکھا اور لڑنے کی تیاریاں کیں۔ اس کی فوجی قوت کم تھی لہذا اورنگ زیب کو پے در پے خط لکھ کر امداد و اتحاد کی درخواست کی ؛

اس خانہ جنگی کا پہلا تصادم بنارس کے میدانوں میں ہوا داراشکوہ کے بڑے بیٹے سلیمان شکوہ نے منجھلے چچا کو شکست فاش دی۔ اور تعقب کرتا ہوا منگھیر تک بڑھا تھا کہ آگرے سے فوری احکام پہنچے کہ جلد واپس آؤ اور دکنی حریفوں سے باپ کے تخت کو بچاؤ۔ کیوں کہ اس عرصے میں اس طرف کا نقشہ بدل گیا تھا ؛ اورنگ زیب کئی ہفتے نہایت مذبذب رہا۔ باپ کے مرنے کی افواہ پر نہ اس نے یقین کیا نہ اسے خود مختاری کا حیلہ بنایا لیکن وہ شاہ جہاں کی زندگی اور صحت مندی کے ساتھ سخت آرزو مند تھا کہ بادشاہ دارا کی دست درازی اور برادر آزاری کا سدباب

کرے۔ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ شاہی فوجیں مالوے پہنچ گئیں اور گجرات کی عازم تھیں کہ پہلے مُراد بخش کا فیصلہ چکائیں پھر اطمینان سے دکن کی خبر لیں مُراد کی التجاؤں میں اضطراب بڑھ رہا تھا۔ اورنگ زیب کو نظر آنے لگا کہ "اگر وہ بادشاہ ہونا، یا محض آزادی سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا غیر ممکن ہے"۔[1]

آخر اُس نے مُراد کی درخواست قبول کرلی اور یہ عہد نامہ لکھ کر بھیج دیا کہ اگر چھوٹا بھائی آخر تک وفاداری سے رفاقت کرے گا تو دارا شکوہ کی شکست اور پوری سلطنت پر تسلط حاصل کرنے کے بعد میں خوشی سے کابل و کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ (یعنی موجودہ مغربی پاکستان) کے صوبے اُسے دے دوں گا۔ اُسے بھی چاہیئے کہ راہِ سعادت پر قائم رہے۔ خود غرض فریبی لوگوں کے کہنے میں نہ آئے اور معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرے[2]

---

[1] یہ بابو جدو ناتھ سرکار کے الفاظ ہیں (ج ۱ صفحہ ۳۶۰) جن کی ضخیم تاریخ اورنگ زیب کا ایک مقصد ہی اُسے مطعون و بدنام کرنا ہے۔ واقعات کی تفصیل کے لئے دیکھو عالمگیر نامہ صفحہ ۴۹ و مابعد۔

[2] اصل معاہدے کی نقل بجنسہ باب کے آخر میں ضمیمہ بنا دی گئی ہے، اس تصریح و طوالت کی ضرورت یہ پیش آئی کہ برنیئر نے اپنے سفرنامے میں صدہا جھوٹی باتوں کے من جملہ یہ بات بھی جو حقیقت کے عین متضاد ہے، لکھی کہ اورنگ زیب نے مُراد بخش کو لڑنے پر اُبھارا اور اُسے یقین دلایا کہ سلطنت کا وارث وہی ہوگا اور خود اورنگ زیب، دارا شکوہ کے دفع ہونے کے بعد گوشہ نشین ہوکر یا مُراد بخش کے ماتحت زندگی بسر کرے گا! الفنسٹن سے لے کر لین پول تک اسی افترا کی بنیاد پر اورنگ زیب کے خلاف بدظنی اور نفرت کی عمارتیں چنتے رہے اور ۶۰، ۷۰ برس تک درسی تاریخوں میں یہی تبلیغ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ بعض ہم عصر تاریخیں ترجمہ ہوئیں اور یہ معاہدہ روشنی میں آیا جس کی صحت میں سرکار سے (بقیہ صفحہ ۵۳۲ پر)

پھر فوج کو شمال کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ یہ گویا دارا کی دعوتِ جنگ قبول کرنے کا اعلان تھا۔ مُرادبخش بھی اپنی جمعیت لے کر دکنی لشکر سے آملا اور وہ بلا مزاحمت نربدا کو اُتر کر مالوے میں داخل ہو گئے۔ بادشاہی سپاہ اجین میں مقیم تھی۔ اورنگ زیب نے اس کے سپہ سالاروں کو اب بھی یہی پیام دیا کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ راستہ چھوڑ کر ہٹ جاؤ یا ہمارے ساتھ چلو۔ ہمیں بادشاہ تک آگرے جانے دو۔ قاسم خاں اور جسونت سنگھ نہ مانے اور سپرا ندی کے گھاٹوں پر پہرا لگا دیا کہ دکنی لشکر کو پار اُترنے سے روکیں۔ اورنگ زیب چند میل کا چکر دے کر ندی سے پار ہوا اور ایک تیز و تند معرکے میں شاہی فوج کو کامل شکست دی۔ (رجب ۱۰۶۸ھ = ۱۶۵۸ء) جسونت سنگھ کے بہت سے سپاہی اور سردار مارے گئے اور خود اُس نے بھاگ کر بہ مشکل جان بچائی۔ فتح کی یادگار میں اورنگ زیب نے اسی میدان میں ایک قصبہ بسایا جو فتح آباد کے نام سے غالباً اب تک موجود ہے۔

اس شکست کی خبر نے آگرے میں کھل بلی ڈال دی۔ شاہ جہاں تبدیلِ آب و ہوا کے لئے دہلی جاتے جاتے رُک گیا اور چاہتا تھا کہ خود جا کر بیٹوں کو بڑھنے سے روک دے۔ مصالحت کی یہی ایک تدبیر باقی تھی۔ شاہی مراسلات کے جواب میں اورنگ زیب نے صاف صاف جتا دیا تھا کہ جب تک بادشاہ دارا شکوہ کے اثر سے بالکل آزاد نہ ہو

(بقیہ حاشیہ ص۵۳۱) کیمبرج ہسٹری تک کسی کو شبہ کی گنجائش نہ ملی۔ البتہ اسمتھ کی بہادری پر آفریں ہے کہ معاہدے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے: معلوم ہوتا ہے بعد میں اورنگ زیب نے یہ حیلہ کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں مراد بخش بادشاہ ہو جائے!۔ (اوکس ص۴۱۲)

وہ شاہی احکام کی تعمیل سے معذور ہو[1] مگر دارا کو اورنگ زیب کی فتح نے نعل در آتش کر دیا تھا۔ وہ مصالحت کے نام سے بھڑکتا تھا۔ شاہجہاں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ دارا نے سلیمان شکوہ کی فوج کی واپسی کا بھی انتظار نہ کیا کیوں کہ خود آگرے میں اس کے لشکر کی تعداد اور جنگی ساز و سامان بھائیوں کی سپاہ سے کہیں زیادہ تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ایک ہی حملے میں انھیں پیس ڈالے گا۔ اس نفسیاتی فرق نے لڑائی پر جتنا اثر ڈالا ہو، وہ کم ہے: یعنی ایک طرف تو ساری عزت اور جان کی بازی لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف طاقت کا غرور اور صرف یہ فکر تھی کہ بھائی زندہ بچ کر نہ جانے پائیں ؛

جنوبی لشکر نے چنبل اتر کر رمضان کا چاند دیکھا۔ شمسی حساب سے یہ مئی کا مہینہ تھا جب کہ ان خطوں میں دھوپ آگ اور ہوا لو بن جاتی ہے۔ مگر شاہی فوج آگرے سے دو منزل ہی بڑھی تھی کہ موضع سموگڑھ کے قریب غنیم نے آ سے آلیا اور چھٹی رمضان (= ۲۹ مئی) کو وہ زبردست معرکہ پڑا جو اس بات کی یادگار مثال ہے کہ ہر چند لڑائی سپاہی لڑتے ہیں، مگر اس کا فیصلہ بہت کچھ سپہ سالار کی جرأت و قابلیت پر منحصر ہے۔ کم و بیش ۳۵ ہزار کے مقابلے میں، دارا ایک لاکھ جنگ آزما لے کر آیا تھا۔ ان میں ساٹھ ہزار سے زیادہ من چلے سوار تھے جو اورنگ زیب اور مراد بخش پر فوج در فوج امنڈ پڑے[2]۔ لیکن رستم خاں سپہ سالار کی وسطی

---

[1] اس زمانے کے کئی خط انشا اور تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مگر ان کا سب سے معقول و مستند مجموعہ "آداب عالمگیری" ہے (ورق ۱۲۴ و ما بعد) ؛

[2] دیکھو واقعات عالمگیری - ورق ۱۰۔ نیز خافی خاں - صفحہ ۱۴ و ما بعد ؛

صفوں کو جن کے عقب میں دارا کی فوج خاصہ انھیں ہولتی، نعرے لگاتی بڑھی تھی، توپ و تفنگ نے تہ و بالا کیا اور بازوؤں پر جنوبی سوار بھال کی کھیوں کی طرح جھٹ پڑے۔ دوسری طرف مراد کو بروقت کمک پہنچ گئی۔ وہ اُزبکوں کی خوفناک یورش میں زخم کھانے پر بھی ڈٹا رہا۔ ایک دفعہ از خود رفتہ راج پوتوں کا رسالہ گجراتی صفوں کو چیرتا ہوا مراد بخش کے قریب تک آگیا بلکہ راجہ رام سنگھ نے گھوڑا کدا کے شہزادے کے برچھا مارا کہ اسی لمحے مراد کے بے خطا تیر سے چھد کر اُلٹا گرا اور ساتھیوں کے بھی دل ٹوٹ گئے ؛ مگر لڑائی کا فیصلہ قلب ہی کے معرکوں نے کیا۔ شہزادہ محمد سلطان کا نرغہ ایسا پڑا تھا کہ دارا کی صفیں بار بار سمٹتیں اور آتش باری کا نشانہ بن جاتی تھیں۔ آتش بازی کے چند لٹو خاص دارا کے ہاتھی پر گر کر زور سے پھٹے اور عام روایت کے بموجب وہ گھبرا کر ہاتھی سے اُتر پڑا۔ مگر کچھ تعجب نہیں کہ زود حس شہزادہ جنگ کے نتیجے سے مایوس ہوگیا ہو کیوں کہ گھوڑا لیتے ہی اس نے باگ آگرے کی طرف موڑ دی ... میدان میں ہلڑ مچ گیا کہ دارا نے پیٹھ دکھائی۔ معمول کے مطابق ساری فوج ہتیار ڈالنے اور امان، امان پکارنے لگی ؛

اورنگ زیب کی تخت نشینی

دارا آگرے میں بھی نہ ٹھیرا اور نہ شرم کی وجہ سے باپ کے سامنے گیا۔ راتوں رات قیمتی جواہرات اور بیوی بچوں کو لے کر براہ دہلی، پنجاب کی طرف روانہ ہوگیا۔ آگرے کے زمین و آسمان ہی بدل گئے دربار کے اکثر عمائد و اُمرا اورنگ زیب کے حضور میں فتح کی مبارک باد اور اطاعت گزاری کی نذریں لے کر دوڑ پڑے۔ خود بادشاہ سلامت نے

تبریک و تحسین کے پیام اور ایک مرصّع تلوار ارسال فرمائی جس پر خطاب "عالم گیر" کندہ کرا دیا تھا۔ ملنے کے لئے مشتاقانہ طلب فرمایا۔ حسبِ قرار داد، اورنگ زیب صبح کو آگرے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک شاہی ہرکارا پکڑا ہوا آیا اور دارا کے نام شاہ جہاں کا دستخطی رقعہ برآمد ہوا جس میں لکھا تھا کہ وہ ابھی دہلی میں ٹھیرے کہ "ہم اس مہم کا یہیں فیصلہ کئے دیتے ہیں"[1] اورنگ زیب مصالحت سے مایوس ہوگیا۔ باپ کو لکھا کہ حضور بڑے بیٹے کی طرف داری میں مجھ سے اتنے بیزار ہیں، تو مجھے حاضری سے معاف رکھا جائے۔" اور اس خطرناک سازش کے جواب میں قلعہ آگرہ پر اپنا پہرا بٹھا دیا۔ یہ گویا شاہ جہاں کی بادشاہی سے معزولی اور نظر بندی کا اعلان تھا؛

(رمضان ۱۰۶۸ھ)

اب وہ دارا شکوہ کے تعقّب میں دہلی چلا تھا کہ مُراد بخش کی طرف سے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوگئے۔ سموگڑھ کی فتح نے اس کے جنگی جوش کو سمو دیا تھا۔ فوری خطرہ ٹل گیا اس لئے وہ زیادہ کھکیڑ اُٹھانے سے جان چُرانے لگا تھا۔ اورنگ زیب نے بار بار سمجھایا، پرچے لکھے کہ ابھی دارا شکوہ اور اس کے شمال مغربی صوبے سلامت ہیں۔ لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے۔ تمھیں کم سے کم اپنے معاہدے ہی کی پابندی کرنی چاہیئے۔ رند مزاج شہزادے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ تب اورنگ زیب نے ایک روز اُسے دعوت دے کر بلایا اور جب وہ کھاپی کے مست و بے خبر سویا

---

[1] اصل رقعہ "واقعات عالمگیری" میں نقل کیا ہے (ورق ۳۹) دوسری تاریخوں سے مذکورہ بالا واقعات کی تائید ہوتی ہے؛

تو گرفتار کر کے پہلے سلیم گڑھ پھر گوالیار کے قلعے میں بھیج دیا۔ وہیں ایک قتل کے قصاص میں اس کی جان گئی ؛ (۱۰۷۲ھ)[1]

دارا کا تعقب جاری رہا مگر اپنے ارادوں سے دنیا کو صاف صاف خبر دینا ضرور تھا۔ چنانچہ دہلی کے قریب لشکرگاہ میں سادگی سے تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی اور عالمگیر کے لقب سے اورنگ زیب کی بادشاہی کا باضابطہ اعلان کیا گیا (یکم ذی قعدہ ۱۰۶۸ھ = جولائی ۵۸ ۱۶ء) ؛ پھر وہ بڑی بڑی منزلیں طے کرتا ہوا پنجاب کی طرف چلا۔ پہلے لاہور سے، چند روز بعد ملتان سے دارا شکوہ کے بھاگنے کی خبر ملی پس لاہور ہوتا ہوا دہلی واپس آیا کہ منجھلے بھائی کی روک تھام کرے جو دوبارہ بنگالے سے تازہ لشکر لے کر بڑھا تھا کہ جب تک وہ بھائی سندھ و پنجاب میں اُلجھتے رہیں، خود آگرے کی مسند پر قدم جما لے۔ مگر ان تھک اورنگ زیب جیسی تیزی سے پنجاب پر بڑھا تھا۔ اسی روانی سے دوآب میں اُترا اور اٹاوے کے قریب موضع کھجواہہ کے میدان میں، بڑی آب و تاب کی فتح حاصل کی۔ عین لڑائی سے قبل۔ جسونت سنگھ نے دغا دی، یعنی شجاع سے ساز باز کر کے لشکر شاہی سے رات کے وقت الگ ہو گیا کچھ لوٹ مار

---

[1] مراد بخش نے ایک آبرو دار شخص علی نقی کو طیش میں آکر مروا دیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے اب قصاص لینے کا موقع پایا اور انہی کے دعوے پر باقاعدہ مقدمے کے بعد عدالت نے سزا تجویز کی تھی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اگرچہ بدگمانی کی گنجائش بیشک ہو، کہ مقدمہ اورنگ زیب کے اشارے سے چلایا گیا۔ کیونکہ مراد بار بار قید سے نکل بھاگنے کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔ ایک ایسی سازش میں مورخ خافی خاں کے باپ نے بڑا حصہ لیا اور وہ کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئی۔ دیکھو منتخب اللباب ج ۲ صفحہ ۱۵ وما بعد ؛

بھی کرتا گیا۔ اس راجہ نے چند روز پہلے معافی مانگی، اطاعت گزاری کے حلف اٹھائے تھے۔ بڑی جمعیت کے ساتھ شجاع کے خلاف لڑنے آیا تھا یا ایکا ایکی یوں منحرف ہوگیا کہ لشکر شاہی کے امیر و سردار گھبرا گئے۔ کوہ وقار بادشاہ نے کچھ پروا نہ کی۔ کہا "غنیمت جانو یہ نمک حرام پہلے ہی کٹ کر الگ ہوگیا۔ ورنہ صبح معرکۂ جنگ میں بھاگتا تو ساری فوج بددل ہو جاتی"۔ اس قیامت کی استقامت پر شجاع کی پرتگیزی توپیں اور ساداتِ بارہہ کی سپہ گری بھلا کیا اثر کرسکتی تھی۔ خود شجاع نے لڑائی میں ہمت ہار دی اور بہت سا ساز و سامان چھوڑ کر فرار ہوگیا (۱۰۶۹ھ) تعقب پر شہزادہ محمد سلطان اور میر جملہ مقرر ہوئے اور انھوں نے شجاع کو دھکے دے دے کر سارا بنگالہ خالی کرالیا۔ محمد سلطان سے شجاع کی بیٹی منسوب تھی اور وہ بیچ میں چچا کے پاس چلا گیا تھا جس کی وجہ سے سخت معتوب ہوا اور گوالیار کے قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔ شجاع نے آسام کے راجہ کی پناہ لی پھر مخالفت ہوگئی تو اراکان آیا۔ غالباً وہیں سرحد کی پہاڑی قوموں کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس عرصے میں داراشکوہ، سندھ سے گجرات پہنچا۔ احمد آباد کا صوبہ دار شاہ نواز خاں، جس کی ایک لڑکی اورنگ زیب سے بیاہی تھی، دارا کی رفاقت سے منہ نہ موڑ سکا۔ مگر جسونت سنگھ (جو کھجوا ہے سے بھاگ کر اپنی ریاست مارواڑ میں پلٹ آیا تھا) وعدے کرکے بدل گیا۔ دارا نے اجمیر میں ایک دفعہ اور بھائی کا مدافعانہ مقابلہ کیا۔ لیکن شاہ نواز خاں مارا گیا اور یہ برگشتہ بخت شہزادہ پھر فرار ہوا کہ سندھ سے ایران چلا جائے۔ اسی کوشش میں، ایک بلوچی سردار نے

پکڑ کر شاہی حکام کے حوالے کیا اور وہ ختم سال (۶۹ ھ) سے پہلے دہلی لایا گیا۔ اورنگ زیب نے اس وقت بھی اپنی دشمنی کی بجائے دین کی دشمنی کا مواخذہ کیا اور اکثر علما نے کفر و الحاد کی بنا پر دارا کے قتل کا فتویٰ دیا۔ اس خطرناک بازی کا انجام یہی ہونے والا تھا۔ وہ جو ہارا، مارا گیا۔ (۱۰۶۹ ھ) مگر دارا کے دونوں بیٹوں سے اورنگ زیب کی دو بیٹیاں بیاہی گئیں وہ عمر بھر گوالیار کے قلعے میں نظر بند رہے؛

ضمیمہ باب نوزدہم (۱۹)

نقل "عہدنامہ کہ بموجب التماس پادشاہزادہ محمد مراد بخش قلمی شد"

(آداب عالمگیری ورق ۱۳۳ و ۱۳۴)

چوں دریں ہنگام خجستہ آغاز فرخندہ انجام کہ آوان طلوع نیّر سعادت و اقبال و زمان سطوح صبح عظمت و اجلال است و شاہباز بلند پرواز ہمت جہاں کشا در ہوائے صید مقصود بال کشادہ اعدائے اعلام دین متین سید المرسلین علیہ من الصلوٰۃ ابہاہا و من التحیات ازکاہا۔ وجہ قصد گردیدہ و تمامی نیت حق طویت مصروف آنست کہ بمساعی غازیان ظفر لوا و زور بازوئے مجاہدان نصرت انتما خار الحاد و زندقہ از گلشن ہمیشہ بہار دیار اسلام برافتد و رئیس الملاحدہ با اتباع و احزاب خویش نیست و نابود شود و گرد تفرقہ بر ساکنان عرصۂ وسعت آباد۔ ہندوستان بہشت نشان کہ از میامن جد و اجتہاد اجداد عظام گردوں مقام و آبائے کرام فلک احتشام جزاہم اللہ تعالیٰ عن المسلمین خیر الجزاء از لوث کفر و شرک مصفا گشتہ، بہ حوزہ در آمدہ بہ نشیند برادر بجاں برابر اعزار شد ارجمند کامگار نامدار عالی تبار بمقتضائے رائے صواب نمائے خرد آرائے

دولت افزا کہ اجل مواہب الٰہی است عمل نمودہ دریں ہم عاقبت محمود توفیق موافقت و مرافقت یافتہ بود مواخات و موالات را کہ بروابط عہود و مواثیق استحکام پذیرفتہ بود مجدداً چنانچہ باید بایمان کثیر الایقان مؤسس ساختہ باخود مقرر کردہ کہ بعد استیصال آں دشمن دین و دولت و استقرار و انتظام امور سلطنت سر بر جادۂ قویم وفاق و اتفاق در زیدہ بہمیں وتیرہ ہمہ وقت و ہمہ جا در ہمہ کار رفیق بودہ شریک باشند و با دوست ما دوست و با دشمن ما دشمن بودہ در ہیچ حال از مرضیات خاطر عاطر بیروں نہ روند از جملہ ممالک محروسہ آں چہ حسب الالتماس آں درۃ التاج حشمت و کامگاری بایشاں واگزاشتہ شود بتابع و خورسند گشتہ افزوں طلبی نہ نمایند بنا براں از روے وفور شفقت و عاطفت و نظر بمراتبے کہ پاس عہد آں نمودہ اند مرقوم قلم والا رقم می گردد کہ انشاء اللہ تعالےٰ تا آں زماں کہ ازاں برادر ارجمند خجستہ اطوار نیکو خصال خلاف اخلاص و یک رنگی و حق شناسی بوقوع نیاید اشفاق و مہربانی ہائے ما در بارۂ ایشاں روز بروز (فزوں؟) خواہد بود و نفع و ضرر جانبین را یکے دانستہ در جمیع اوقات اتحاد را بابلغ وجہے مرعی خواہیم داشت و الطاف و مراحمیکہ امروز نسبت بہ آں عزیز از جاں مبذول است پس از حصول مامول و برافتادن ملحد نا مقبول بہماں نمط بلکہ بہتر ازاں معمول گشتہ دقیقۂ از دقائق آں حمل نخواہیم گزاشت بوفائے وعدہ پرداختہ چنانچہ سابق مقرر شدہ بود صوبۂ لاہور و کابل و کشمیر و ملتان و بھکر تمام آں ضلع را تا ساحل خلیج عمان بآں نامدار والا تبار واگزاشتہ دریں باب مضائقہ را مجال نخواہیم داد و بعد فراغ از استیصال ملحد نکوہیدہ افعال و قمع خاربن شر و فساد از چارچمن دولت خداداد ابد اتصال کہ رفاقت و ہمراہی آں

تازہ نہال بوستان سلطنت و اقبال دراں کار لازم و ناگزیر است بے توقف ایشاں را بدآں حدود روانہ نمودہ اصلا و مطلقاً بتاخیر رخصت راضی نخواہیم شد وشرف عزت محبت و مودت و صداقت وفتوت راازغبار انفاس ارباب غرض کہ اشر الناس اند ازصفا نینداختہ جز بہبود دارین و کامیابی نشاتین آں عین الانسان و انسان العین نخواہیم اندیشید و درصدق ایں دعویٰ خدا و رسول خدا را گواہ گرفتیم و ایں وثیقہ را بجہت مزید اطمینان و استظہار خاطر آں گرامی برادر بمہر و نقش پنجۂ مبارک خاص مزین گردانیدم باید کہ ایشاں نیز منطوق آیۂ کریمہ "اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا" را مطمح نظر سعادت اثر داشتہ در پاس لوازم معاہدت کہ مورث نیک نامی دنیا و آخرت است باقصی الغایۃ کوشیدہ بر نہج صواب مستقیم باشند و اوضاع پسندیدۂ خود را از وصمت بغیر وجہی کہ شاید صیانت نمودہ گفتۂ ناسجزدان کوتہ اندیش را کہ از غایت دنائت ہمت و رکاکت فطرت جلب منافع رو یہ و تحصیل اغراض فاسدۂ خویش بر صلاح حال و مآل ولی نعمت می دارند و از انواع طرق درآمدہ باقاویل باطلۂ مموہہ ہنگامۂ شورش و فساد را گرم می سازند و ازاں دست اشرار دریں جز و زماں بسیار و بے شمار اند بسمع رضا اصغا نکنند و ہمیشہ بنور شمع سعادت افروز خرد دور بین و عقل صلاح گزیں در مسالک معاشرت سلوک نمودہ ایں مشعل خورشید ضیا را از باد و دم سرد آں نگاہدارند وَفَّقَنَا اللّٰہ تَعَالٰی وَاِیَّاکُم بِمَا یُحِبُّ وَیَرْضٰی " وَاللّٰہ یَحِقُ الْحَق وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْل"

باب بستم
۲۰

اصلاحات و فتوحات عالمگیری

مدتِ بادشاہی اور وسعتِ سلطنت، دونوں اعتبار سے تاریخ میں ہند و پاکستان کا بزرگ ترین بادشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر ہوا، جو کہ پچاس سال (شمسی) سے بھی زیادہ فرماں روائی کرتا رہا۔ کابل سے آسام اور کشمیر سے کاویری تک اس کے نام کا سکہ چلا اور ہر مسجد میں خُطبہ پڑھا گیا۔ ذاتی عادات و اوصاف میں بھی وہ اپنے عظیم خانوادۂ شاہی میں سب سے ممتاز نظر آتا ہے کہ اتنی بڑی دولت و حکومت کے باوجود نہایت سادہ بلکہ زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ مذہبی عبادات کی پابندی، وظائف و نوافل کی ادائی میں بادشاہ کیا، مُلّا مات تھے۔ انتہا ہے کہ عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد پورا قرآن مجید حفظ کیا اور آئندہ بھی برابر زبان و دل سے مزاولت اور دست و قلم سے کلام پاک کی کتابت کرتا رہا۔[1] ذوقِ علمی، صفاتِ جہاں داری اور کمالاتِ سپہ گری کے

[1] حفظ کلام اللہ کی یادگار مرزا روشن ضمیر کی ایک رباعی، مراۃ الخیال وغیرہ (بقیہ صفحہ ۵۴۳ پر)

ہم بزرگوں کی میراث کہہ سکتے ہیں لیکن اس کی شجاعت و للّٰہیت کی جداگانہ شان دکھاتی اور اسلام کے قرن اوّل کی یاد دلاتی ہے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ میدان جنگ اور سخت خطروں میں بھی وہ نماز قضا نہ کرتا تھا اور وقت آتے ہی خدا کے حضور میں اس طرح استادہ ہو جاتا تھا کہ پھر ساری دنیا مقابلے میں آجاتی تو اُسے مطلق پروا نہ ہوتی تھی کہ "جو خدا سے دل لگاتا ہے وہ غیر اللہ سے کب خوف کھاتا ہے"۔ پھر تعجب کیا ہے اگر آخر میں لوگ اُسے ولی سمجھے اور "عالمگیر زندہ پیر" کہنے لگے تھے۔

عالمگیر سے مخالفت

اس دین دار و کام گار بادشاہ کو انگریزی عہد میں سب مسلمان بادشاہوں سے زیادہ مطعون کیا گیا۔ اور شاید ہی کوئی انگریز تاریخ نویس ہوگا جس نے ان جھوٹ کے پشتوں پر دو چار ردّے اپنی طرف سے نہ جما دیئے ہوں۔ اوّل اوّل اورنگ زیب کے مذہبی تعصّب، مظالم اور فریب و بد اخلاقی کے قصّے تصنیف کئے گئے۔ بعد میں اُس کی نا اہلی اور ناکامی پر زور دیا جاتا رہا۔ بعض انگریزی تاریخیں پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ لکھنے والوں کو ابھی تک اورنگ زیب ایک زندہ دیو نظر آتا ہے اور وہ دُور سے تیر و تفنگ چلاکر اُسے ہلاک کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں!

(بقیہ حاشیہ ص۵۴۲) تذکروں میں محفوظ ہے جس کا دوسرا شعر یہ تھا:

حامیٔ شرع و حامیٔ تو شارع   تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو!"

قرآن مجید کی کتابت کا قریب قریب سب ہم عصر تاریخوں میں ذکر آتا ہے جیسے مآثر عالمگیری ص۵۲۵ و مابعد۔ خافی خاں ص۵۵۶ وغیرہ بعض نسخے علماء کو ہدیۃً دئے اور حرمین کے کتاب خانوں کو بھیجے گئے تھے۔ ہندوستان یا یورپ کے ذخیروں میں اب بھی اس کے قلم کے نسخے موجود ہوں گے۔ (اور دکن میں اور لاہور میں بھی) ایک دو نسخوں کی نسبت میں نے یہ روایت سنی مگر صحت کا یقین نہ ہو سکا!

لیکن عہد عالمگیر کی تاریخیں، تذکرے، مآثر، مکتوبات، فرامین، دستاویزیں اتنی وافر تعداد میں سلامت ہیں کہ ایک بے لاگ تحقیق کرنے والا کافی صحت و تفصیل سے اصل حالات کا پتہ چلا سکتا ہے۔ لطف یہ کہ بیش تر تاریخیں ایسے لوگوں نے مرتب کیں، جو بادشاہ سے ذاتی طور پر کدورت رکھتے تھے۔ دو ہندو ادیبوں نے اسی عہد میں تاریخ پر قلم اٹھایا۔ انہی کی شعر، تذکرہ، انشا کی کئی کتابیں ابھی تک سلامت ہیں۔ خافی خاں کا باپ مرادبخش کا خاص مصاحب تھا۔ مآثر عالمگیری، وقائع عالمگیری، وقائع نعمت خاں وغیرہ مشہور ہم عصر تاریخیں شیعہ اہل قلم کی تصنیف ہیں، جنھیں بیجاپور اور گول کنڈے کے خاتمے کا سخت ملال تھا۔ دکن پر مغلوں کی یورش اکبر کے وقت سے شروع ہوئی۔ دور شاہ جہانی میں نظام شاہی کی تباہی تکمیل کو پہنچی۔ باقی دو ریاستیں خود مختاری کھو بیٹھیں۔ ان کا انجام بتانے کے لیے کسی نجومی کی ضرورت نہ تھی۔ باایں ہم قطب شاہی، شیعہ امرا اور علما کا آخری مرکز و مامن بنی تھی۔ اس کے بے نشان ہو جانے سے اس فرقے کے لوگوں کو طبعاً صدمہ ہوا۔

فتوحات دکن سے قطع نظر، خود شمال میں عالمگیر کی بادشاہی اور بھائیوں کے مقابلے میں کام یابی نے بہت سے بالواسطہ دشمن پیدا کر دئے۔ خصوصاً دارا کے متوسل ہزاروں کی تعداد میں اس کی تخت نشینی سے، خدا جانے کیا کیا امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ وہ مارا گیا تو یہ سب آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور دلوں میں اس کے حریف غالب کے خلاف عناد کا غبار بن گئیں۔ پھر عالمگیر کے مذہبی احکام اور ملکی اصلاحات نے اوّل اوّل ہندو رعایا کو بدگمان و خوف زدہ

گیا۔ پھر عیش دوست مسلمان امیر احتساب کے شکنجے میں کسے گئے۔ مگر ناخوشی کے ان سب اسباب کے باوجود، بادشاہ کی ذات و صفات پر حرف زنی کی انھیں گنجائش نہ ملتی تھی۔ البتہ اس کی حکمت عملی پر نکتہ چینی کے پہلو تلاش کرتے تھے۔ افغانوں، راجپوتوں کی شورش کو بڑھا چڑھا کے دکھاتے تھے۔ مرہٹوں کی قزاقی کو خطرناک حملے بتاتے تھے۔ بیجاپور، گول کنڈے کے معرکوں میں بادشاہی فوج کی کمزوریوں کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ انہی ریت کی بنیادوں پر انگریز اور ان کے شاگرد دشمنی اور بدظنی کی عمارتیں چنتے رہے ہیں۔ حال آں کہ اِن واقعات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دکن کی پراگندہ حالی ''شاہیاں'' مغلوں کے منظم صوبے بن گئیں۔ مرہٹوں کا کوئی قابل ذکر قلعہ نہ تھا جو منہدم یا بادشاہی تھانہ نہ ہو گیا ہو۔ راجپوتانہ اور مالوے کے راجہ یا راج کمار شاہی منصب داروں میں شامل اور عالمگیری لشکر میں حاضر رہے۔ آخری پچیس برس میں بادشاہ کو ایک دفعہ بھی دکن سے دہلی، آگرے جانے یا شمال میں فوج کشی کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ سلطنت کی کل گھڑی کی طرح باقاعدگی کے ساتھ چلتی رہی ؛

فصل کو ختم کرنے سے قبل انگریزوں کے عام قومی اور مذہبی تعصب کے علاوہ، خاص بغض کی یہ وجہ بھی یاد دلانے کے قابل ہے کہ عالمگیر کے زمانے میں اُن کی ایک تجارتی کوٹھی ہگلی میں قائم تھی اور انگریز گما شتے بلا محصول دئے، چوری سے مال لانے لے جانے میں بدنام تھے۔ پول نے نے کوٹھی کو قلعہ بند کرنا چاہا مگر مغل عمّال نے جبرًا روک دیا۔ تصدیق

جیمس ثانی کی مدد سے دس بارہ جنگی جہاز لے کر آئے کہ چاٹ گام پر یکایک چھاپہ مار کر قبضہ جمالیں۔ یہ اُن دنوں چھوٹی سی مگر بہت باموقع بندرگاہ تھی انگریزوں کا منصوبہ ناکام رہا۔ ان کی یہ "نیم سرکاری جنگ" بحری قزاقی بن کر بھی زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکی۔ بنگالے کے ساتھ شاہی فرمان سے سورت وغیرہ کی دوسری کوٹھیاں ضبط اور تمام انگریز تاجر یا گماشتے جو فرار نہ ہو سکے، گرفتار کر لئے گئے۔ یہ (۱۶۸۵ء سے ۱۶۸۸ء تک) گیارہویں صدی ہجری کے آخری سنین کے واقعات ہیں[۱]۔ پھر مغل امیروں وزیروں کی مہینوں منت خوشامد کے بعد بہ مشکل معافی اور سخت ترشرطوں پر دوبارہ تجارت کی اجازت حاصل ہوئی۔ انگریز کمپنی اور ان کے سرپرست شاہ انگلستان کو اس طفلانہ جنگ میں نقصان اور ذلت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا البتہ یہ سبق ضرور ملا کہ آئندہ نصف صدی تک وہ ہندوستان کے ملکی معاملات میں قدم اڑانے سے باز رہے۔ مگر یہی زمانہ ہے جب ان کے اہل قلم نے مغل سلاطین خصوصاً "اورنگ زیب" کے خلاف انتقامی جذبے سے وہ تحریریں لکھنی شروع کیں جو بازاری دشنام و اتہام کا بے پایاں طومار ہیں۔

اصلاحات: ملکی و مالی

نئے بادشاہ کی باخبری اور باریک نظری نے مرکزی محکموں میں

---

[۱] دیکھو اوکس فورڈ ہسٹری ص۴۴۹ مزید تفصیل انگریزی کی تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی' اور گیبلز" ارلی اے نلز.... بنگال" وغیرہ میں ملے گی۔ فارسی تاریخوں میں ان واقعات میں مجمل ذکر آگیا ہے اُس وقت یہاں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہی حریف جو محصول کی چوری اور سمندر میں ڈکیتی کرتے پھرتے ہیں سو برس کے بعد احکام اور ستان کو بغل میں مار لیں گے!

ازخود ایک نئی روح بھر دی۔ سپاہی سے سالار اور کاتب سے حاجب تک ہر شخص اپنی جگہ چوکس، ادائے فرض میں مستعد ہو گیا۔ صوبوں کے ہر بڑے شہر اور سرکار (یا اضلاع) سے مقامی اطلاعات ہفتہ وار بھیجی جاتی تھیں بادشاہ انھیں خود پڑھتا اور حسب ضرورت احکام تحریر کرتا تھا بعض عجیب مثالیں موجود ہیں کہ کسی معمولی چوکی دار، کاشت کار کی تکلیف کی خبر ملی اور اُس نے فوراً تدارک کیا۔ سلطنت کا سب سے بڑا محکمہ مال گزاری تھا۔ اس میں قانون گو، منشی، متصدی، شق دار تک سارے عملے میں کائستھ اور کھتری قوم کی اجارہ داری تھی۔ یہ لوگ اپنے کام میں جیسے طاق تھے، ویسے ہی رشوت ستانی میں مشاق تھے عالمگیر کی نگرانی میں جتنی کڑی جانچ پڑتال ہوئی اتنی ہی زیادہ چوریاں پکڑی گئیں اور ہزاروں کی تعداد میں خائن عمال برطرف کئے گئے۔ لیکن بادشاہ خیانت کی گرفت میں اگر سخت تھا، عفو و درگزر کرنے میں اسی قدر فیاض تھا۔ جن لوگوں نے معافیاں مانگیں، آئندہ دیانت سے کام کرنے کی قسمیں کھائیں، ضمانتیں دلوائیں وہ بحال کر دئے گئے البتہ حکم ہوا کہ ان کی اجارہ داری نہ جاری رہے اور برابر کی تعداد میں مسلمان یا دوسری قوموں کے لوگ نوکر رکھے جائیں؛ حسابات کی تنقیح، مالئے کی تشخیص اور وصولی کے نئے ضوابط بنائے گئے کہ رشوت ستانی کے راستے بند ہوں یہ مفید اصلاحات "دستورالعمل" (عالمگیری) کے نام سے ابھی تک محفوظ ہیں؛

کُل مال گزاری کے متعلق اہل تاریخ میں اختلاف ہے۔ لین پول نے کافی محنت و تفتیش سے جو نتائج نکالے اور مورلینڈ بھی اُن کی تصدیق

کرتا ہے، وہ قرینِ صحت معلوم ہوتے ہیں[1] ان کا خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ اکبری میں کُل مال گزاری ۲۰ کرور، دورِ شاہجہانی میں ۴۰ کرور اور عالمگیر کے زمانے میں ساٹھ کرور روپے سے کچھ زیادہ تھی۔ دکن کے نئے مقبوضات سے آمدنی میں جو اضافہ ہوا، وہ اس میزان میں شامل ہے۔ لیکن پرانے صوبوں کی آمدنی بھی ایک صدی میں تقریباً دوگنی ہو گئی جس کا سبب آبادی اور مزروعہ رقبے میں بیشی اور کسان کی عام خوش حالی کو قرار دے سکتے ہیں۔

عالمگیری اصلاحات اور نئے انتظامات میں جلد ہی مذہبی اور اخلاقی محرّکات کا ظہور ہوا۔ جشنِ تاج پوشی کے زمانے میں کئی غیر شرعی محاصل موقوف کئے گئے۔ ان میں راہ داری، پان داری (جسے آج کل "نزول" کہتے ہیں) تیرتھ جاترا، غلّے کپڑے اور درآمد کے محصول اہم تھے۔ تمباکو پر کر لگی تھی، وہ اُن دنوں بھی لوگوں کو بہت کڑوی معلوم ہوتی تھی یہ سب منسوخ کئے گئے۔ ان کی تعداد پچاس سے زیادہ اور آمدنی تیس لاکھ کے قریب بتائی گئی ہے[2]۔ شاہی مداخل کی ایک مد نذریں اور تحائف تھے جو سالانہ جشنوں کے موقع پر عہدہ دار و اُمرا حضور میں پیش کرتے تھے۔ یہ رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ محصول بن گئے تھے کہ بروقت وصول نہ ہونے کی صورت میں اہلِ منصب کی تنخواہ سے وضع کر لئے

---

[1] دیکھو لین پول کی کتاب "اورنگ زیب" باب نہم۔ مورلینڈ: معاشی حالات ج ۲ باب نہم و دہم۔

[2] عالمگیر نامہ ص ۱۱۔ مآثر ص ۷۵ و ۵۳۰ خافی خاں نے بظاہر امتیاز نہیں کیا اور دونوں قسم کے محاصل کو خلط ملط کر دیا ہے۔

جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عہدہ دار یہ روپیہ اپنے ماتحت زمیں داروں، مال گزاروں سے بھرواتے ہوں گے۔ اس میں بعض اوقات بڑی سختیاں اور ناانصافیاں ہوتی تھیں۔ بادشاہ نے اس رسم کو بالکل اڑا دیا اور جن امرا پر سابقہ رقوم واجب الادا تھیں، وہ سب معاف کردی گئیں۔

عالم گیر کو ان رسوم کے موقوف کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی جن کا تعلق بادشاہ کی ذات یا دربار کی تکلفات سے تھا۔ کیوں کہ ان کی بدولت صدہا افراد کی پرورش ہوتی تھی۔ اکثر شاہی کارخانوں کو اسی خیال سے بحال رکھنا پڑا۔ تاہم زمیں بوس یا "سری ٹیک" کی بدعت اور درشن کی رسم متروک ہوئی۔ مصوری، موسیقی[1]، شاعری، حتیٰ کہ وہ تاریخ نویسی تک جو ابوالفضل کے زمانے سے بادشاہوں کی مدح خوانی کا پیرایہ بن گئی تھی، دربار سے رخصت کردی گئی اور بادشاہ کے اس انکسار نے ہمیں بھی تاریخ کے ایک عمدہ ماخذ سے محروم کردیا۔

مسلمانوں کے اخلاق و اطوار کی نگرانی اور دین میں فساد و خرابی کے سد باب کے لئے محکمہ احتساب قائم ہوا۔ زکوٰۃ کی باضابطہ وصولی کا انتظام کیا گیا اور غالباً سب سے آخر میں غیر مسلم رعایا پر دوبارہ جزیہ لگایا گیا جو اکبر کے زمانے سے موقوف و معطل تھا۔ انگریز تاریخ نویسوں

---

[1] مغل بادشاہوں کے اسباب عیش و طرب میں ایک بڑا کارخانہ "ارباب نشاط" کا بن گیا تھا۔ صدہا ناچنے گانے والے خزانے سے تنخواہ پاتے اور بادشاہ سلامت کا دل خوش کرنے کے لئے حاضر رہتے تھے۔ عالم گیر نے انھیں برطرف کیا تو مشہور ہے کہ بہت سے ڈوموں نے مل کر آلاتِ موسیقی کا ایک جنازہ تیار کیا اور شہر میں اس کا جلوس نکالا۔ بادشاہ کو بھی اطلاع ہوئی۔ فرمایا ان لوگوں سے کہو اس آفت کو خوب گہرا دفن کریں کہ پھر نہ نکل آئے۔

نے بادشاہ کے مذہبی تعصب کے ثبوت میں اس واقعے کو خوب اچھالا اور اشتعال انگیز بنایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عالم گیر کو اپنی مسلم اور غیر مسلم رعایا میں مذہبی فرق کرنا پڑتا تھا، وہ اس بدیہی حقیقت کو نظر انداز نہ کرسکتا تھا نہ اسلامی شریعت سے اعراض و اغماض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر غیر مسلم ادائے زکوٰۃ سے مستثنیٰ رہے تو اسی قانون کے دوسرے مطالبات سے کیوں کر بچ سکتے تھے؟ جزیہ صرف اہل استطاعت مردوں سے لیا جاتا تھا۔ دیوانی یا فوج کے سرکاری ملازم، مذہبی پیشوا، مہنت پروہت وغیرہ مذہبی اوقاف یا معابد کے خدّام، یہ سب آزاد تھے۔ بہ الفاظ دیگر فقط بیوپاری، سیٹھ، ساہوکار، زمیں دار، خوش حال اہل حرفہ اور کاری گر جزیے کی زد میں آتے تھے اور اُس کے بھی تین درجے مقرّر تھے۔ سب سے کم ۳½ روپیہ اور سب سے زیادہ ۱۳⅓ روپیہ (رائج الوقت) فی کس (مرد بالغ) سالانہ ادا کرنا ہوتا تھا[۱]۔ صحیح میزان مذکور نہیں لیکن غالبًا اس محصول کی مجموعی مقدار کبھی ایک کروڑ تک نہیں پہنچی بعض شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم صوبہ بنگال (مع بہار) میں وہ اس رقم کے برابر نہ تھی جو مد زکوٰۃ میں صرف مسلمانوں کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ بہ ہر حال جزیہ ۱۰۹۲ھ م ۲، ۱۶۷۹ء سے دوبارہ جاری ہوگیا۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں میں شورش و فساد، انگریز اہل قلم کے تخیّل کی پرداز اور فتنہ طرازی کی ایجاد ہیں، سچی تاریخ میں ان کی جگہ نہیں

---

[۱] جزیے کی مذکورہ شرح کے لئے دیکھو لین پول کی "اورنگ زیب" ص۱۱۶۔ سرکار: ج ۳ ص۲۶۳ وغیرہ نیز مولوی شبلی کا رسالہ: اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، جس میں جزیے کی شرائط اور شرح کی تحقیق کی گئی ہے۔

افغان و راج پوت قبائل کی سرکشی

عہد عالمگیر کی مشرقی اور جنوبی فتوحات کا حال ہم علاحدہ یک جا بیان کریں گے۔ پہلے سرحدی افاغنہ کی شورش اور مغربی راج پوتانے کی بغاوت لائق ذکر ہے کہ بادشاہ انھیں فرو کرنے کے لئے خود گیا۔ افغانی قبائل کی جفاکشی اور جنگ جوئی مشہور ہے وہ بابر و اکبر جیسے زبردست بادشاہوں سے ٹکریں لڑے تھے اپنے پہاڑوں میں اپنی آزادی پر جان دیتے تھے۔ مگر موقع ملتا تو میدانی علاقوں پر ہاتھ مار جاتے تھے۔ عالمگیر جیسا منتظم فرماں روا ایسی دست درازی کو روا نہ رکھ سکتا تھا۔ مقامی حکّام سے انسداد نہ ہوا تو شاہی فوج روانہ کی اور خود حسن ابدال میں پڑاؤ ڈالا۔ تادیبی دستے ہر طرف پھیل گئے اور ہر گھاٹی اور درے میں شورہ پشتوں کو ایسا نرغے میں لائے کہ بھاگنے کا راستہ، چھپنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ ان معرکوں میں شاہی سپہ سالار آغر خاں نے بڑی شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ وہ خود پٹھان تھا۔ لوہے نے خوب لوہا کاٹا۔ مثنوی آغر نامہ ان کارناموں کی ستائش میں نظم ہوئی تھی[1] کہتے ہیں ایک مدّت تک سرحدی عورتیں روتے بچّوں کو آغر خاں کے نام سے ڈرا کر چپکا کیا کرتی تھیں۔ غرض چند مہینے میں سرکشوں نے سزا پائی ہر ناکے پر شاہی فوج تعینات ہوئی جنگی چوکیوں کا زنجیرہ تیار کیا گیا کہ پھر زمانۂ دراز تک ہم اس علاقے میں کسی شورش و غارت گری کی شکایت نہیں سنتے ۔ (۱۰۸۱ھ)

---

[1] اس کے مقابلے میں خوش حال خاں خٹک وغیرہ آزادی پسند شاعروں کی نظمیں مغلوں کی ہجو سناتی اور پٹھانوں کو ان سے لڑنے کا جوش دلاتی ہیں۔

مارواڑ کی سرکشی چند سال بعد کا ہنگامہ ہے جسے بعض انگریز مصنف مضحکہ انگیز مبالغے سے ہندو مسلمان کی لڑائی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ مارواڑ کا راجہ جسونت سنگھ سرحدِ کابل کا صوبہ دار تھا۔ اُس کے اورنگ زیب سے لڑنے، پھر مل کر دغا دینے کا احوال گذشتہ اوراق میں ہماری نظر سے گزرا۔ جب تقدیر کی عدالت نے تخت سلطنت کا آخری فیصلہ صادر کیا تو جسونت کو اسی آستانہ عفود اُمید پر جبہ سائی کرنی پڑی اور سیر چشم عالمگیر نے پھر اُسے معاف کر دیا آخر میں منصب بحال اور کابل کے خالص اسلامی علاقے کی حکومت تفویض ہوئی۔ ۱۰۸۹ھ (۷۸-۱۶۷۷ء) میں وہ لاولد فوت ہوا۔ جانشینی کے کئی مدعی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ہندو مورخ کے بقول، ریاست میں فتنہ و فساد بپا کر دیا[۵۱]۔ اسی زمانے میں متوفّی کی دو رانیوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک تو فوت ہو گیا دوسرے کو ایک چالاک ٹھاکر درگ داس نامی شاہی اجازت کے بغیر لے بھاگا۔ بلکہ رانیاں جو اس طرح چوری سے نہ جانا چاہتی تھیں، انھیں کمال بے دردی سے ہلاک کر گیا اور ایک روایت یہ ہے کہ جسونت سنگھ کے اصلی بچّے کو بھی نہیں لے جا سکا بلکہ کسی فرضی بچّے کو لے جا کر گدّی پر بٹھایا اور اس کے نام سے خود ریاست کی باگ سنبھالی۔ صوبائی حکّام نے اس کی سرکوبی کی لیکن وہ بھاگ کر میواڑ پہنچا اور مارواڑ پر سیادت جمانے کے شوق میں اودے پور کا رانا اُس کا سرپرست بن گیا۔ رانا کی اسی بغاوت کو کرنل ٹاڈ نے مذہبی جنگ بنایا اور لڑائیوں کا حال اس جوش خروش سے لکھا ہے گویا وہ خود اُس کی

---

۵۱ سرکار۔ ج ۳ ص ۳۷۲ بحوالۂ ایشور داس ۵

قوم کی صلیبی لڑائیاں تھیں۔ لیکن یہی واقعہ اُن کے "وقائع" کی وقعت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ چند ہی معرکوں کے بعد رانا اور ٹھاکر نے شہزادہ اکبر سے سازش کی۔ اسے بادشاہی کے سبز باغ دکھائے اور خود اُس کی اطاعت اور جاں نثاری کے حلف اُٹھائے۔ (۱۰۹۱ھ = ۱۶۸۰ء) یہ شہزادہ عالمگیر کا تیسرا بیٹا تھا۔ نوجوانی ناتجربہ کاری کے باوجود راجپوت باغیوں کے خلاف سپہ سالار بنا کے بھیجا گیا تھا مغل شہزادوں کی اسی طرح جنگی تربیت کی جاتی تھی۔ خود عالمگیر اس موقع پر اجمیر آگیا تھا۔ یکایک سُنا کہ اکبر منحرف ہو گیا۔ اور جس طرح باپ نے اپنے باپ شاہجہاں کو معزول کیا تھا، وہ بھی عالمگیر کی بجائے خود بادشاہ ہو جانا چاہتا ہے۔ یہ اُس کی حماقت تھی۔ بادشاہی فوج ایک بست سالہ شہزادے کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ چند ہی روز میں بہت سے سردار اور سپاہی اسے چھوڑ کر اجمیر چلے آئے۔ عالمگیر نے از سرِ نو لشکر مرتّب کیا۔ اکبر اپنے راجپوت حلیفوں سمیت شکست کھا کر بھاگا اور چھپ کر مرہٹوں کے علاقے میں پہنچا اور وہاں بھی پناہ نہ ملی تو سمندر کی راہ سے ایران چلا گیا۔ پھر اُسے ہندوستان کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ فساد کا بانی دُرگ داس غالباً اکبر کے ساتھ ہی راجپوتانے سے فرار ہو گیا تھا۔ اودے پور کا رانا پہاڑوں میں چھپا مگر وہاں بھی عالمگیری گرفت سے نہ بچ سکا۔ مجبور ہو کر معافی کی التجا اور شہزادہ محمد اعظم کی شفاعت لایا۔ جزیے کے عوض دو پرگنے سرکار میں پیش کئے۔ بادشاہ نے درگزر سے کام لیا۔ رانا کی ریاست بحال اور پنج ہزاری منصب عطا ہوا۔ (۱۰۹۱ھ = ۱۶۸۱ء) اس کے تین فرزند دکن کی لڑائیوں میں آخر تک

لشکر شاہی میں وفاداری کے جوہر دکھاتے رہے۔ اور پنج ہزاری منصب تک ترقی پائی راج پوتانے میں امن قائم ہوا، حالات معمول پر آ گئے [1] بادشاہ کو فرصت ملی کہ ایک بڑا لشکر لے کر دکن جائے اور جزیرہ نما کے نیم آزاد علاقوں پر پورا تسلط جمائے۔

نئی فتوحات

عالمگیر کے ابتدائی دور میں اس کا مشہور امیر میر جملہ بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا۔ وہی شجاع کو ریلتا ہوا کوچ بہار کی ریاست میں داخل ہوگیا۔ پہاڑوں کے حصار، ندیوں کی کھائیاں کوئی رکاوٹ اس عالی حوصلہ سپہ سالار کو بڑھنے سے نہ روک سکی راجہ نے مغل شہزادوں کی جنگ کے زمانے میں سرکشی اور مشرقی اضلاع میں لوٹ مار مچائی تھی۔ میر جملہ نے اس کی قرار واقعی سرکوبی کی۔ خاص کوچ بہار کا قلعہ حملہ کر کے چھین لیا۔ راجہ نے بھاگ کر بھوٹان میں پناہ لی۔ اس کے محل کی مہتابی پر چڑھ کر قاضی سید صادق نے خود اذان دی۔ تمام ریاست کو فتح کرنے کے بعد میر جملہ نے دریائے برہم پتر کو عبور کیا اور پہلی مرتبہ ملک آسام کو مغل بادشاہ کا باج گزار بنایا۔ وہ اسی راستے چین تک بڑھنے کی آرزو رکھتا تھا لیکن آسام کی دھواں دھار بارش توپ و تفنگ کے گرداب بن گئی۔ میر جملہ نے بہت سا تاوان وصول کیا۔ راجہ سے اطاعت

---

[1] یہ سب مسلمہ واقعات ہیں۔ اودے پور کے بڑے راج کمار کا نام بھیم سنگھ تھا۔ پھر بھی، انگریز "تاریخ سازوں" کا ذکر نہیں، بابو جدو ناتھ سرکار تک آخر میں لکھتے ہیں کہ چند خاندانوں کے سوا، سب راج پوت عالمگیر سے برگشتہ ہو گئے تھے! خود اپنی تحریر کی اس طرح تردید کرنا تعصب نہیں ڈھٹائی ہے!

کے عہد و پیمان اور چند مغربی اضلاع لے کر جہانگیر نگر (ڈھاکہ) واپس آ رہا تھا کہ مہم کی ماندگی کے باعث جنگی کشتی ہی میں وفات پائی اور آخر دم تک سپاہیانہ خدمت گزاری اور قدرشناس آقا کی وفاداری کی مثال قائم کی[1] (۱۰۷۳ھ = ۱۶۶۳ء)۔

خان خاناں کے بعد امیر الامرا شائستہ خاں ولایات بنگالہ میں نائب شاہ بنا کر بھیجا گیا۔ وہ اسم بامسمّیٰ، تہذیب و شرافت کا پتلا تھا۔ اس کے طولانی دور میں صدہا مدارس و مساجد، پل سڑکیں اور سرائیں تعمیر ہوئیں مشرقی پاکستان کے گوشے گوشے میں مغل تہذیب کی روشنی پھیلی۔ انتظام کی خوبی اور حُسن نیّت کی بہ دولت ملک میں ایسی ارزانی ہوئی کہ ایک روپے میں کئی من چاول مل جاتا تھا۔ انگریزوں کی "نیم سرکاری جنگ" اسی کی صوبہ داری کا واقعہ ہے اور ہنٹر کی تاریخ "انڈیا" (ج ۲) میں امیر الامرا کا وہ پروانہ نقل کیا گیا ہے جس کی رو سے انگریز تاجروں کو معافی اور دوبارہ تجارت کی اجازت دی گئی تھی (۱۰۹۸ھ = ۱۶۸۷ء) لیکن یہاں اس کی اُن فتوحات کا مختصر ذکر کرنا ہے جن کے نتیجے میں موجودہ

---

[1] میر جملہ کو خان خاناں کا خطاب ملا آخر تک اعزاز و اکرام اور بادشاہی اعتماد سے نوازا جاتا رہا۔ مگر اسمتھ لکھتا ہے کہ اورنگ زیب میر جملہ کے مرنے کی خبر سن کر خوش ہوا کیوں کہ وہ بہت طاقت ور ہو گیا تھا اور بادشاہ اس کی وفاداری پر شک رکھتا تھا! (اوکس ہس ص۴۲۴) لائق انگریزوں نے ہندوستان کی تاریخ اس طرح تصنیف کی ہے! اصل میں خان خاناں نے ہگلی کے انگریز تاجروں کے کان کھینچے تھے اور نکال دینے کی دھمکی تھی۔ اُنھوں نے عاجزانہ معافی مانگی۔ تین ہزار روپیہ سالانہ دینے کا اقرار کیا۔ تب معافی اور تجارت کی اجازت ملی۔ دیکھو حاشیہ ریاض السلاطین (انگریزی) ص۲۲۶ بحوالہ "ارلی اینلز آف دی انگلش اِن بنگال" مؤلفہ ولسن ۔

پاکستان کے جنوب مشرقی قطعات اور چاٹ گام کی بندرگاہ مستقل طور پر ارکان سے توڑ کر بنگالے کا جزبنا دیے گئے۔ ان سواحل پر ماگ قوم فرنگی قزاقوں سے مل کر لوٹ مار کرتی رہتی تھی۔ عالمگیر نے امیرالامرا کو حکم دیا کہ ان غارت گروں کا پوری طرح استیصال کیا جائے۔ چنانچہ ۱۰۷۸ھ میں امیرالامرا کا فرزند بزرگ امید خاں باقاعدہ مہم لے کر گیا۔ پرتگیز حلیفوں نے تو ماگوں کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن ارکان کے رئیس و راجہ ان کے مددگار بن گئے اور کئی دریائی معرکے لڑے۔ چاٹ گام کے مضبوط قلعے کو مسلمانوں کی جاں بازی نے جیتا۔ اس کامیابی پر خود بادشاہ نے ان کی داد دی اور بہت کچھ انعام اکرام عطا کیے۔ امیرالامرا کو ہفت ہزاری منصب ملا۔ مفتوحہ شہر "اسلام آباد" کے نام سے مشرّف ہوا۔ گویا یہ مستقل اسلامی قبضے کی فال تھی ؛

اسی زمانے میں صوبہ دار کشمیر نے جانب مشرق فوج کشی کی اور لدّاخ و بلتستان کے سرحدی اقطاع فتح کیے جن سے وادیٔ کشمیر کی بیرونی حدود پہلے سے زیادہ محفوظ و مصئون ہو گئیں ؛

مرہٹوں کا فروغ دکن میں

مغل شہزادوں کی خانہ جنگی کے زمانے میں دکن کی "شاہیوں" کو خاصی فرصت مل گئی تھی۔ بیجاپور والوں نے اسے آپس کی لڑائی، رقابت و حسد کی مشق میں صرف کیا۔ گول کنڈے کے بادشاہ عیش کی شراب لنڈھاتے، گلاب کے حوضوں میں غوطے لگاتے رہے۔ البتہ دکن کے جنگل اور پہاڑوں کی ایک نئی قوم تاریخ کے میدان میں آ رہی تھی۔ یعنی مرہٹے، جن کی نسل دراوڑی، زبان آریائی اور وطن شمالی دکن

سے مغربی گھاٹ کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مہاراشٹریا مرہٹہ دیس کا بڑا حصہ بیجاپور و احمد نگر کی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ جب مغلوں کا سیلاب بندھیاچل سے نیچے اُمنڈا تو سب سے پہلے ملک عنبر نے اپنی مرہٹہ رعایا کو نظام شاہی فوجوں میں بھرتی کیا اور قزاقانہ جنگ کے گُر سکھائے جس کے لئے یہ چالاک اور گُھنّی قوم جسمًا و طبعًا بہت موزوں ثابت ہوئی۔ ملک عنبر کی وفات کے بعد اس کا فوجی نظام کافور ہوگیا تاہم بعض مرہٹہ سرداروں کو بیجاپور میں جاگیریں مل گئیں۔ ان میں سابق نظام شاہی امیر ساہوجی ممتاز تھا۔ اسے 'پونا' اور سوپا کے پرگنے اور جنگی خدمات کے صلے میں کرناٹک کا کچھ علاقہ عطا ہوا۔ اسی کا چھوٹا بیٹا سیواجی تھا (ولادت ۱۶۲۷ء) جس نے لڑکپن سے رہ زنی کی مشق بہم پہنچائی اور حکومتِ بیجاپور کی غفلت و بدنظمی میں نشوونما پائی عُمر کے ساتھ جب اس کی جمعیت بڑھی تو آس پاس کے قصبوں کو لوٹنے لگا پے در پے شکایتوں پر حکومت نے اُس کے باپ ساہو کو قید میں ڈال دیا کیوں کہ بیجاپور میں سب یہی سمجھتے تھے کہ سیواجی کی دست درازی باپ کے اشارے سے ہے۔ سیواجی نے مجبور ہوکر مغلیہ دربار میں عرضی گزرانی اور شاہ جہاں کے حکم سے دربار بیجاپور نے ساہو کو قید سے رہائی دی تاہم نگرانی قائم رکھی اور اُسی کے قتل کئے جانے کے خوف سے سیوا نے کئی سال تک کوئی تازہ فساد برپا نہیں کیا بلکہ اپنی جاگیر ہی میں فوجی قوت بڑھاتا اور قلعے بنواتا رہا، پھر مغل شہزادوں کی جنگ اور محمد عادل شاہ کی وفات نے شمال مغربی دکن اور بیجاپور میں ابتری ڈال دی۔ تب سیواجی نے دُور دُور چھاپے مارے۔ کئی پرگنوں پر قبضہ کرلیا۔

بیجاپور کے سپہ سالار افضل خاں کو دھوکے سے مار ڈالا۔ علی عادل شاہ نے فوج کشی کی تو پہاڑوں میں جا چھپا اور آخر باپ کی سعی سفارش سے اس شرط پر معافی حاصل کر لی کہ آئندہ بیجاپور کی مملکت میں غارت گری نہ کی جائے گی۔ (۱۰۷۱ھ م ۱۶۶۰ء) ممکن ہے یہ اسے مغلیہ علاقے پر لپکانے کی تدبیر ہو کیوں کہ اب اُس کے گرد پچاس ہزار سے زیادہ لٹیرے جمع ہو گئے تھے[۱] جنھیں کھلانے کے لئے پونا کی جاگیر کسی طرح کافی نہ تھی۔ چنانچہ یہ غارت گر آئندہ سال اورنگ آباد کے سرحدی پرگنوں میں نمودار ہوئے بیجاپور والوں نے اپنی ذمّہ داری سے تحاشی دی۔ مغل بادشاہ نے چند سال پہلے سیواجی کی عرضی پر ساہو کو قید سے چھڑوایا تھا۔ اب اگر وہ کافر نعمت اپنے سابقہ محسنوں پر پلٹ پڑا تو دربار بیجاپور کو کیا پڑی تھی کہ سدباب کرتا۔ غرض مغل صوبہ دار شائستہ خاں نے خود فوج کشی کی۔ حسب عادت سیوا سامنے آنے سے بھاگا۔ کوکن کے سب قلعے مغل فوج کے قبضے میں آ گئے۔ شائستہ خاں نے پونا فتح کر لیا اور خاص سیوا کی حویلی میں قیام کیا۔ سیوا ایک اندھیری رات میں چھپ کر آیا۔ چند خونی ساتھ لایا اور سوتے میں شائستہ خاں پر تلوار چلائی مگر اس کے جاگتے ہی چور قاتل فرار ہو گئے۔ پھر بھی امیر الامرا کو ایسی شرمندگی ہوئی کہ بادشاہ کو لکھ کر اپنا تبادلہ کرا لیا۔ نئے صوبہ دار شہزادہ معظم نے اسی قدر تادیب پر اکتفا کی۔ راجہ جے سنگھ کی سفارش سے سیواجی کو پھر معافی مل گئی (۱۰۷۳ھ م ۱۶۶۲ء) مگر جن ماولیوں اور مرہٹوں کو لوٹ کی چاٹ پڑ گئی تھی، انھیں ہل چلا کے موٹی جھوٹی روٹی کھانے میں مزا

---

[۱] دیکھو الفنسٹن بحوالہ گرانٹ ڈف۔ صفحہ ۶۰۸

نہ آتا تھا۔ کوئی دو سال بعد چھپ کر جمع ہوئے اور اچانک سورت کی بندرگاہ پر حملہ کیا۔ حاجیوں کی کشتیاں بظاہر مشرقی اور جنوبی سمت بغیر حفاظت کھڑی تھیں، انھیں لوٹ لیا اور اسی تیزی سے اپنے پہاڑوں میں جا چھپے؛ لیکن عالمگیر جیسے بادشاہ سے بھاگ کر نکل جانا سہل نہ تھا چند مہینے کے اندر دلیر خاں اور جے سنگھ شاہی فوج لے کر آ پہنچے۔ سارے کوکن کو پامال کر ڈالا اور ایسی ناکہ بندی کی کہ "موش کو بھی" کوسرک جانے کے لئے سوراخ نہ ملا۔ راجہ جے سنگھ نے اوّل اوّل اس کی منت سماجت پر توجّہ نہ کی مگر جب وہ امان مانگنے تنہا شاہی لشکر میں آیا تو مغلیہ روایات کے بموجب اطاعت قبول کرلی۔ اس کا سب سے بہتر علاقہ ضبط ہوا اور یہ ریاست، بیجاپور کی بجائے مغلوں کی باج گزار قرار دی گئی۔ سال آئندہ لشکر شاہی بیجاپور کی تادیب کے لئے چلا تو سیوا کا بیٹا اپنی جمعیت کے ساتھ مغل سپہ سالار کے ہم رکاب حاضر تھا۔ ان خدمات کے صلے میں بادشاہ کی خوشنودی کا پروانہ حاصل ہوا۔ جشن سالانہ میں شرکت کے لئے باپ بیٹے آگرے بلائے گئے دربار میں نذر گزرانی اور دونوں کو پنج ہزاری منصب عطا ہوا (۱۰۷۶ھ) پھر کچھ غلط فہمی، کچھ بدگمانی کی بنا پر سیواجی چھپ کر آگرے سے بھاگا اور غیر معروف راستوں سے بمشکل تمام نو مہینے میں پونا پہنچ گیا۔ تاہم سلطنت مغلیہ کی عظمت و قوت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ قزاقی کی بجائے اگر مستقل ریاست قائم کرنی ہو تو مغلوں سے مصالحت کے بغیر کام نہ چلے گا چنانچہ دکن کے نیک مزاج صوبہ دار (شہزادہ معظم) کی وساطت سے پھر بادشاہ سے معافی مانگ لی اور آئندہ کئی سال تک اپنی ریاست کو

مغلوں کے نظام حکومت کے مطابق منظم کرتا رہا[ا۵] البتہ ساہو کی وفات پر اپنی راجگی کا دھوم دھام سے اعلان کیا (۱۰۸۵ھ م ۷۴-۱۶۷۴ء) باپ کی جاگیر واقعہ کرناٹک بھی اپنے بھائی سے جبراً چھین لی۔ اسی طرف جاتے وقت وہ قطب شاہی کے نئے وارث ابوالحسن تاناشاہ سے گول کنڈے میں ملاقی ہوا۔ بہت سی توپیں اور غالباً روپیہ بھی تحفۃً اُسے ملا اور ایک دفعہ پھر بیجاپور اور گول کنڈے کی مدد اور شہ سے وہ مغلوں سے سرکشی پر آمادہ ہو گیا ہے[۵۲]

عالمگیر کا ورود دکن میں

سیواجی نے ممکن ہو دکنی سیاست دانوں سے لیے جوڑے وعدے کئے ہوں۔ اور جس طرح وہ اسے بے وقوف بناکر مغلوں سے لڑانا چاہتے تھے، یہ اُنھیں بے وقوف بناکر اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہو؟ بہرحال، انگریزوں کے خیالی افسانوں سے قطع نظر، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اُس نے مغلوں سے سرکشی ضرور کی لیکن زندگی کے ان آخری چھ سال میں بڑے

ا۵ یہ تمام بیان بیش تر خافی خاں سے ماخوذ ہے (ج ۲۔ ص۱۹۴ تا ۱۸۵) اس مورخ کا باپ دکن کے اکثر معرکوں میں موجود تھا اور وہ سیواجی کی شوکت نمائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اگرچہ اس کی ذات وصفات کی سخت مذمت کرتا جاتا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو مآثر عالمگیری۔ وغیرہ) انگریز تاریخ نویسوں نے ان واقعات کو سرتاپا مسخ کیا اور عجیب وغریب فرضی افسانہ بنا دیا ہے۔ مولوی شبلی مرحوم نے بعض نمایاں مفتریات کی اپنے رسالے میں مدلل تردید کی ہے۔ لیکن جب بیسیوں مصنف جھوٹ کے پہیے بجاتے رہے ہوں تو ان کے دفع کرنے کے لئے ایک مختصر رسالہ کب کافی ہو سکتا ہے؟

۵۲ دیکھو اوکس، ہسٹری۔ ص۲۶۹ بحوالہ گرانٹ ڈف وغیرہ۔

بیمانے پر لڑائی مول لینے سے پہلو بچایا۔ سرحدی پرگنوں میں لوٹ مار کی بھی، تو اسی کے ساتھ صوبہ دار اورنگ آباد کے پاس قاصد بھیج کر کبھی تاویل، کبھی استمالت اور کبھی جسونت سنگھ جیسے مغل عہدہ داروں کو نذرانے دے کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ البتہ اندرونی طور پر اپنی فوجی قوت بڑھائی اور مرنے سے پہلے ایک نئی مرہٹہ ریاست تیار کر گیا (۱۰۹۰ھ = ۱۶۸۰ء)

سیوا کے بعد بڑا بیٹا سنبھا، باپ کے قزاق لشکر کو نہ سنبھال سکا۔ یا اہل بیجاپور کے اشتعال سے خاندیس میں جا گھسا۔ برہان پور کے مضافات شہر کے باہر دور تک پھیل گئے تھے۔ انھیں لوٹ لیا۔ شہزادہ اکبر باپ سے باغی ہو کر فرار ہوا تو پونا میں اس کی مہمان داری کی۔ لیکن ان مخالفانہ حرکتوں سے قطع نظر، عالم گیر کی نگاہ تہ تک جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مرہٹوں کی بالیدگی کا بنیادی سبب بیجاپور کی بے چارگی اور قوت کا سوتا گول کنڈے کا سونا ہے۔ لہذا بڑے پیمانے پر لشکر آراستہ کیا اور طویل قیام و انتظام کے ارادے سے ۱۰۹۲ھ (م ۱۶۸۲ء) میں اورنگ آباد پہنچ گیا۔ یہ لشکر کیا تھا، شمالی ہند کا ایک سیلاب تھا جس نے دہلی، آگرہ، دوآب کے لاکھوں افراد کو بہا کر دکن میں پہنچا دیا۔ اگر جزیرہ نما کی سیاسی تنظیم کو عالم گیری سپاہ نے منقلب کیا تو اس بھیڑ و بنگاہ نے یہاں کی تہذیب و معاشرت کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ یہ گویا اس علاحدگی اور غیریت کا جبری علاج تھا جو دکن کے مسلمانوں نے، عہد تغلق کے بعد شمال والوں سے اختیار کی تھی۔

ایک اور بات خیال میں رہنی چاہیئے: عالم گیری لشکر کا مرکز شمالی ہند ہی میں تھا۔ یعنی دہلی تا اورنگ آباد مواصلات کا مضبوط زنجیرہ

بنانا پڑا کہ روز افزوں آمد رفت کا سلسلہ قائم رہے۔ پھر اس عظیم لشکر کی رسد رسانی اور سربراہی کا دائرہ گجرات و مالوے تک پھیلا۔ اسی کی رسد کے قافلے اور کارواں تھے جن پر بیجاپور و گول کنڈہ کے حلیف مرہٹے موقع پاکر چھاپے مار جاتے تھے۔ خافی خاں نے ان لشکری اطلاعات کو آج کل کے روزناموں کی طرح، چٹ پٹی خبریں بنا کے لکھا اور انگریزی تاریخ نویسوں کے لئے ہیجان انگیز مسالا فراہم کر دیا ہے۔ عالمگیر نے دکن آتے ہی پہلی ہی تادیبی مہم مرہٹوں کے خلاف بھیجی تھی۔ وہ حسب عادت میدان میں نہ آئے۔ چھپ چھپ کر قزاقی کرتے، رسد روکتے رہے۔ لیکن کوکن کی دھواں دھار بارش اور وبائی امراض نے لشکر شاہی کو پریشان کر دیا۔ شہزادہ محمد معظم ہٹ کر احمدنگر چلا آیا۔ مرہٹوں کی قوت کو صدمہ پہنچا اور فوجی تنظیم درہم برہم ہوئی مگر بالکل منتشر نہ ہو سکی۔ بادشاہ کو پہلے بیجاپور اور گول کنڈے کی خبر لینی پڑی۔

دکن کی "شاہیوں" کی تباہی

ایک مدت تک سفیروں کے قدم، منشیوں کے قلم گھستے رہے۔ دکن کے عیار ارباب سیاست قابو میں نہ آئے۔ وہ جس خودمختاری سے خودغرضی اور فساد پروری کا کام لیتے رہے تھے، اُسے ہاتھ سے دینا گوارا نہ کرتے تھے۔ تہدید و عتاب سے کام نہ چلا تو مغل بادشاہ نے فوج کشی کی۔ اہل بیجاپور میدان میں ڈٹ کے لڑے۔ پھر قلعہ بند ہو کے بہت دن تک اڑے رہے۔ مرہٹوں کو اکسایا۔ گول کنڈے کو مدد پر بلایا۔ مغل شہزادوں اور سپہ سالاروں کے اختلاف سے فائدہ اٹھایا لیکن رفتہ رفتہ عالمگیر کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ بیجاپور کو ہتھیار ڈالنے پڑے

عادل شاہی کا وارث مغل اُمرا میں منسلک اور اس کا ملک سلطنت مغلیہ کا جز بنا لیا گیا۔ (۱۰۹۷ھ م ۱۶۸۶ء)

ایک اور مغل لشکر قطب شاہی سے لڑنے بھیجا گیا تھا۔ بادشاہ کا بڑا فرزند محمد معظم (کہ آیندہ شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے لقب سے تخت نشین ہوا) جنگی معرکے میں فتح یاب اور شہر حیدر آباد میں داخل ہو گیا۔ تانا شاہ نے گول کنڈے کے قلعے میں پناہ لی۔ معظم کی مروّت سے صلح کی شرطیں بھی آسان قرار پا گئی تھیں لیکن شاہی فوج کے ہٹتے ہی انھیں التوا میں ڈالا اور ایک تازہ فوج مرتب کی جسے زعم تھا کہ خود عالم گیر کا سر اُتار لائے گی۔ یہ شیخی خورے مغلوں کی آمد آمد سن کر ہی مید ان سے بھاگ آے لیکن قلعہ بند ہو کر تانا شاہ نے کئی مہینے مقابلہ کیا۔ قلعے کی وسعت و سنگینی اور بعض سرداروں کی جان بازی کے علاوہ، خارجی اسباب سے بھی مدد ملی۔ شہزادہ معظم سے خفیہ نامہ و پیام جاری تھے۔ شاہی لشکر کے ہر منصوبے کی خبر پہلے سے محصورین کو پہنچ جاتی اور وہ ہوشیار و تیار ہو جاتے تھے۔ بارش کی غیر معمولی شدت، رسد رسانی کی دقت محاصرین کو الگ پریشان کیے ڈالتی تھی۔ بہ ایں ہمہ بادشاہ کا آہنی استقلال، اقبال کی دلیل، کام یابی کا کفیل تھا۔ تانا شاہ کے مایوس اُمرا مغلوں کی اطاعت قبول کرنے لگے۔ اور آخر کار خود پہرہ داروں نے قلعے کا پھاٹک کھول دیا۔ تانا شاہ کے ساتھ کروڑہا روپے نقد اور بیش بہا جواہرات فتح مندوں کے ہاتھ آئے یہ اُس خراج کی رقم سے کہیں زیادہ مالیت تھی، جسے ادا نہ کرنے کے باعث قطب شاہی پر حملے کی آفت آئی اور آزادی کا خاتمہ ہوا (۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۷ء)

ان عظیم فتوحات کے بعد مغلوں نے نیا انتظام جمانے اور مرہٹوں کا فساد مٹانے پر توجہ کی۔ بیجاپور کے جنوبی علاقے میں ادھونی کا مضبوط قلعہ سنبھاجی کا جنگی مرکز بن گیا تھا۔ یہیں سے مغل حملہ آوروں کے خلاف قزاقی دستے بھیجے جاتے اور عادل شاہیوں کو بالواسطہ کمک پہنچاتے تھے۔ نئے صوبے کا انتظام فیروز جنگ کے سپرد ہوا تھا جس نے یہاں کے معرکوں میں بڑی بہادری دکھائی اور قدر شناس بادشاہ سے " فرزند بے ریو ورنگ فیروز جنگ " کا جلیل القدر لقب حاصل کیا۔ اس کے بڑھتے ہی سنبھاجی بھاگ نکلا۔ ادھونی معمولی مزاحمت کے بعد فتح ہوگیا۔ فیروز جنگ نے خاص مرہٹوں کی راج دھانی (راج گڑھ) پر پیش قدمی کی۔ ایک حیدرآبادی سردار (مقرب خاں) نے قلعہ پرنالہ کا منہ بند کیا اور مرہٹہ فوج کو اندر گھیر رکھا تھا۔ خبر لگی کہ فراری سنبھا قریب ہی کھیلنا کے قلعے میں ہے۔ وہ مٹھی بھر جمعیت لے کے دوڑا اور مرہٹوں کے لشکر میں دڑانہ گھس گیا۔ ان کی تعداد بہت بڑی، مگر دل تھوڑے تھے۔ چوروں کی طرح مغل سپاہیوں کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ سنبھاجی کسی مندر میں جا چھپا اور ڈاڑھی موچھ منڈا کے بھیس بدلتے میں پکڑا گیا۔ یہ خبر بہت جلد ملک میں پھیل گئی اور جب مقرب خاں اسے باندھ کر لے چلا تو راستے میں جا بجا دیہات والوں نے خوشیاں منائیں۔ سنبھاجی کی سفاکی اور بدچلنی سے رعایا نالاں رہی تھی۔ خافی خاں جو اُن دنوں دکن میں موجود تھا لکھتا ہے کہ جس گاؤں سے قیدی سنبھا گزرتا، مرد و عورت باہر نکل آتے اور اس کی گرفتاری پر خدا کا شکر بجا لاتے تھے۔ دربار شاہی میں سنبھا نے بڑی بدزبانی کی اور ویسی ہی انتہائی سزا پائی (۱۰۹۹ھ)۔ لیکن اس کا

بیٹا ساہو امرائے شاہی میں داخل کیا گیا اور اس کی بادشاہ نے جس عنایت سے پرورش کی تھی اُسے عمر بھر دلی عقیدت سے یاد کرتا رہا؛

سنبھا کے رفیقوں نے اس کے بھائی رام راجا کو گدی پر بٹھایا اور کرناٹک میں جنجی کے مضبوط و بلند قلعے کو بہترین سامان وسپاہ سے "اجت" بنایا تھا۔ اُسے ذوالفقار خاں[۱] کی پے بہ ضربات نے ۱۱۰۸ھ میں ڈھا دیا۔ رام راجا کو کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ وہ چار سال تک اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد فوت ہو گیا؛ مرہٹہ قزاقوں کے گروہ شاہی علاقوں میں نہ ٹھیر سکے۔ جو گھر جانے سے بچے تھے وہ کوکن کے پہاڑی قلعوں میں چھپے۔ یا تلواریں کھول دیں اور پھر ہل سنبھال کر کھیتی کیاری کرنے لگے لیکن عالمگیری منصوبے کی تکمیل ابھی باقی تھی۔ اور مغل سردار کوکن کی تنگ و پرپیچ وادیوں میں لشکر کشی کرنے سے گھبراتے تھے جہاں بارش کی جھڑی سے راستے، ندی نالے بن جاتے تھے۔ ہر موڑ مرہٹوں کی کمین گاہ اور ہر چٹان، دیدبان کا کام دیتی تھی۔ امیروں کا تساہل دیکھ کر یہ مہم بادشاہ نے اپنے ذمے لی۔ ہر چند کہ عمر اسّی سال سے متجاوز ہو چکی تھی، ہمت و جفاکشی میں فرق نہ آیا تھا۔ ۱۱۰۹ھ م ۱۶۹۸ء میں اس فاتحانہ اقدام کا آغاز ہوا جس کے معرکے عزم و استقلال کی عجیب داستان ہیں کیوں کہ یہاں صرف مرہٹوں کی مایوسانہ جدوجہد سے مقابلہ نہ تھا بلکہ یہ

---

[۱] اسی عالمگیری سپہ سالار کی شان میں ناصر علی سرہندی نے یہ مطلع کہا تھا:

اے شانِ حیدری زجبینِ تو آشکار تیغ تو در نبرد کند کار ذوالفقار!

اس سجع شعر نے زیادہ شہرت صلے سے پائی کہ ممدوح نے سن کر شاعر کو تیس ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی انعام دیا اور فرمایا کہ اس کے آگے نہ پڑھو، مجھے صلہ دینے کی مقدرت نہیں!"

باد و باراں کے طوفان، دشوار گزار کوہستان، جنگل اور سیلابوں سے لڑائی تھی جسے جیتنے میں پانچ سال تک بوڑھے بادشاہ نے آرام و آسائش کو ذہن سے فراموش کر دیا۔ انسان کے فولادی ارادے کے آگے مرہٹوں کے بلند اور سنگین قلعوں کی کیا بساط ہے، پہاڑ نہیں ٹھیرتے۔ سب سے اول بسنت گڑھ تاراج ہوا۔ پھر ستارا، ڈوبا۔ تورنا، ٹوٹا۔ کھیلنا، کھیل کھیل ہو گیا۔ پرلی، پرنالا، بھوسان گڑھ میں خاک اڑنے لگی۔ یہ سب قلعے یا توڑ دئے گئے یا ان میں شاہی فوج تعینات ہوئی۔ رام راجا کی بیوہ تارا بائی کسی کونے میں جا چھپی تھی۔ وہ سیواجی کی وراثت کا دعویٰ ضرور رکھتی ہوگی لیکن عملاً دکن میں چند میل کا قطعہ بھی ایسا نہ رہا، جہاں مرہٹوں کی خود مختار حکومت باقی ہو۔[1]

عالمگیر کی وفات،

مرہٹوں کا قلع قمع کرنے کے بعد بادشاہ نے احمد نگر کی طرف مراجعت کی۔ راستے میں واکن کھیڑ کا دور دست قلعہ فتح کیا جہاں بے ذر قوم کے راجہ نے بہت سر اٹھایا تھا اور بار بار اطاعت قبول کر کے باغی ہو جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ منزلیں طے کرتا، نئے انتظامات کو دیکھتا بھالتا احمد نگر آ گیا۔ یہیں ایک سال سے زیادہ قیام رہا اور ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ (م فروری

---

[1] معلوم نہیں اِلفنسٹن نے عالمگیر کے آخری زمانے میں مرہٹوں کے "دندانہ حملہ" کرنے کے واقعات کہاں سے جمع کئے۔ ان کا خاص ماخذ خافی خاں ہے۔ وہ مرہٹوں کی شوکت نمائی اور بادشاہی لشکر کی مشکلات بیان کرنے میں کمی نہیں کرتا لیکن ان آخری سنین میں حملہ ایک طرف مرہٹوں کی کسی قزاقی کی اطلاع بھی اس کتاب میں مذکور نہیں؟

۱۷۰۷ء) میں خفیف علالت کے بعد عالمِ آخرت کی راہ لی۔ وفات سے چند گھنٹے پہلے جب کہ دمے کا دورہ تھا، ایک عرض داشت پر اپنے قلم سے وصیت لکھی کہ تجہیز تکفین میں خلافِ سنّت کوئی رسم نہ کی جائے۔ خواجہ برہان الدین غریبؒ کے پائین میں مجھے دفن کیا جائے اور کوئی پکّی قبر یا اوپر سقف و گنبد نہ بنایا جائے۔ جس وقت جنازہ احمد نگر سے خلد آباد لائے تو قریب قریب تمام راستے پر دو رویہ عام رعایا کے لوگ کھڑے آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتے تھے اور ہزار ہا اہلِ دربار و لشکر ماتم کناں ہم رکاب تھے۔ نصف صدی تک فرماں روائی کے بعد اُس کا دنیا سے اُٹھ جانا ایک بڑا انقلاب محسوس ہوتا تھا۔

عالمگیر کے ذاتی خصائل و فضائل پر لکھنا، سوانح نگار کا کام ہے۔ ایک عام اور مجمل تاریخ میں عہد بادشاہی کے بھی صرف چیدہ اہم واقعات لکھنے ممکن ہوئے۔ تاہم اہلِ نظر ان سے عالمگیر کی حکمتِ عملی اور مقاصدِ جہاں بانی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ مغلوں میں وہی ایسا فرماں روا ہوا جو اپنی زندگی اور حکومت کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ اُسی نے فہم و واقفیت کے ساتھ کوشش کی کہ ممالک ہند و پاکستان میں شعائرِ اسلامی کو رواج دے۔ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال پر احتساب قائم کرنے کا سبب اور مسدود کئے ہوئے جزیئے کے مکرر نفاذ کا محرک یہی تھا۔ ظلم و تعدّی کی روایتیں جہالت و وہم کی کارسازی یا محض تعصب و عناد کی فتنہ طرازی ہے ورنہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ "ذمیوں" سے بڑھ کر عنایت و رعایت کا برتاؤ کرتا تھا۔ انھیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ بھارت کے مندروں اور ہندو اوقاف میں آج بھی ایسے فرمان اور

سندیں مل جائیں گی جن میں جاگیر و معافی کے عطیئے اسی بدنام بادشاہ کے نام نامی سے مزیّن اور اسی کے قلم سے نافذ ہوئے۔ ایک فرمان کی عکسی تصویر (غالباً ۱۱۹ ۶ میں) اڈیٹر کامرنڈیر نے شائع کی تھی جس میں وہ حاکم بنارس کو تاکید کرتا ہے کہ وہاں کے مندروں اور برہمن خدّام کی مذہبی آزادی اور قدیم حقوق میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اسی فرمان کا اقتباس جدو ناتھ سرکار نے اپنی "تاریخ اورنگ زیب" میں درج کیا ہے[1]۔

طرز حکومت میں عالمگیر نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ جمہوریت اور قوم کی فرماں روائی کے تصوّرات، اس وقت تک مقبول عام اور عملی صورت میں دنیا کے سامنے نہیں آئے تھے۔ ملک شخص واحد ہی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر عالمگیر نے مقبوضہ سلطنت کو اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کردیا قوانین و احکام کے نفاذ میں وہ علمائے اسلام سے برابر مشورہ کرتا رہا لیکن ان کی کوئی باقاعدہ اور صاحب اختیار جماعت نہ تھی۔ کلّی اقتدار کا مالک بادشاہ وقت ہی مانا جاتا تھا۔ عوام اور علما کی قوّت و ہمّت بلکہ نیّت ہی نہ ہوئی تھی کہ اپنے حقوق منوائیں اور ملکی معاملات میں حصہ لینے کی کوشش کریں۔

---

[1] ج ۳۔ صفحہ ۳۱۹


نقشہ
سلطنت مغلیہ کی انتہائی وسعت
سنہ ۱۱۱۲ھ مطابق سنہ ۱۷۰۰ء
کشمیر
صوبہ کابل
پنجاب
لاہور
ملتان
دہلی
آگرہ
اجمیر
اودھ
الہ آباد
بہار
بنگالہ
احمد آباد
سورت
مالوہ
خاندیش
اڑیسہ
گونڈوانہ
حیدرآباد
بیجاپور
گولکنڈہ
کرناٹک

بابِ بست ویکم ۲۱

گیارھویں صدی ہجری پر ایک نظر

محی الدین عالمگیر کی آنکھ بند ہونے کے ساتھ بابِ کشورکشائی بند ہوا۔ مغلیہ سلطنت نقطۂ کمال کو پہنچی اور چند سال بعد رُو بہ زوال نظر آئی ہند و پاکستان میں ملّتِ اسلامی پر آئندہ جو گزری وہ ہم دوسری جلد میں مطالعہ کریں گے۔ اس بہار کی فصل کے خاتمے پر مناسب ہو کہ گزشتہ صدی کے عام حالات پر ایک نگاہ بازپسیں ڈال جائیں؛

اس تمام مدت میں طریقِ حکومت وہی شخصی، موروثی جاری رہا بلکہ تیموریوں کو ایسا راس آیا کہ ہندوستان میں بادشاہی بے کار و بے اختیار ہوگئی، پھر بھی زمانۂ دراز تک برائے نام وہی بادشاہ کہلاتے رہے۔ مانا کہ اہلِ ہند "شخص پرستی" کے پرانے مریض تھے لیکن حق یہ ہو کہ اس خاندان میں بابر سے عالمگیر تک ایسے افراد اورنگ نشین ہوئے جو اوصافِ جہاں بانی میں ایک سے ایک بڑھ کر نکلے۔ یہ بات کہ نالائق بادشاہوں کے آتے ہی سلطنت میں زوال آگیا، خود ایک دلیل ہو کہ ہمیشہ ہیرفن

کی "تخت پرستی" بھی اسی وقت تک سلامت رہی جب تک کہ تخت کے وارث، اطاعت گزاری کے سزاوار تھے ؛ بایں ہمہ ظاہر ہے کہ اچھی بادشاہی بھی لوگوں کو ملی مفاد اور اجتماعی عمل سے غافل کئے بغیر نہیں رہتی۔ پاکستان و ہند کے مسلمانوں میں اس آئینِ بد سے جو سیاسی خرابیاں اور اخلاقی بیماریاں پیدا ہوئیں، فطرت کی سخت جرّاحی اور تعزیر کے باوجود، اُن سے وہ ابھی تک شفا نہیں پا سکے ہیں ؛

طبقۂ اعلیٰ کے قواے جسم و اخلاق کو ضعیف کرنے کا ایک اور قوی سبب کثرتِ مال اور حاکمانہ جاہ و جلال کو سمجھنا چاہیئے۔ مغل سلاطین و امرا جنگ کے وقت جیسے من چلے سپاہی تھے، حالت امن و فراغ میں ویسے ہی عیش و طرب کے شیدائی رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی پنجاہ سالہ بادشاہی اس عیش پسندی کے خلاف اچھی خاصی لڑائی تھی اور کچھ شک نہیں کہ اس نے ذاتی مثال اور سخت نگرانی سے مغلیہ دربار کا رنگ بدل دیا۔ اکثر عمّال و امرا تقویٰ سے بہرہ مند، دین و دیانت کے پابند نظر آنے لگے لیکن یہ کامیابی عارضی اور ایک حد تک جبری تھی جس نے اکثر امیروں کو بادشاہ سے ناراض کر دیا۔ مُنہ سے تو کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ دل میں بہت جز بز تھے اور نمائش و اسراف کے نئے نئے پیرائے نکالتے رہتے تھے۔ عالمگیر کے متعدد مکتوبات میں شہزادوں کو مسرفانہ تقریبات اور بیہودہ مراسم پر ٹوکا گیا ہے لیکن بیسیوں ہندوانی رسمیں تھیں جو ہندی بیویوں کے ساتھ محلات شاہی میں داخل ہوئیں اور تھوڑی سی تہذیب و ترمیم کے بعد مسلمانوں میں پھیل گئیں۔ یہ اسلامی شریعت کے خلاف نہ تھیں لیکن سادہ زندگی اور سپاہیانہ جفاکشی کی بجائے

تزئین و آرائش، عیش و عشرت کا ضرور عادی بناتی تھیں ؛

فنون و صناعات

اس میں کلام نہیں کہ عیش دوستی کے ساتھ مغل بادشاہ اور اُمرا نہایت زندہ دل، خوش مذاق اور سلیقہ مند حاکم تھے۔ ڈیڑھ دو سو برس کی حکومت میں اُنھوں نے ممالک ہند و پاکستان کو گلزار بنا دیا۔ قصبات و بلاد کے حواشی، باغوں سے مشجّر کر دئے۔ یہ باغ اس شان اور اہتمام سے تیار کئے تھے کہ انگریز حاکموں سے آخر زمانے میں کوشش کے باوجود اُن کی نقل بھی نہ اُتاری گئی۔ پُرانے شہروں میں اب بھی کہیں کہیں مغل امیروں کے مساکن و محلّات کے نمونے باقی ہیں۔ ان کی تزئین تکمیل ہی پائیں باغ سے ہوتی تھی۔ عمارت عموماً اونچی کرسی دے کر شمال رویہ بناتے صدر میں بلند و وسیع دُہرے دالان، شہ نشین، کمان چے، صحن چیان سامنے چبوترہ، مہتابی۔ بازووں میں بیوت اور ان کے بیچ میں باغ، نہریں، حوض، فوّارے، یہ عام طرز تھی۔ جدید قسم کے کمروں کا رواج نہ تھا۔ پہلوؤں میں بڑے حجرے یا کوٹھریاں، جن میں کواڑ لگے ہوتے، فقط اسباب رکھنے کے کام آتی تھیں۔ سردی میں دالان، پردوں اور انگیٹھیوں سے گرم رکھے جاتے۔ گرمی میں دن کا وسطی حصّہ تہ خانوں، خس خانوں میں گزارتے تھے ؛

ہر قسم کے فنون و صناعات کو جو اس زمانے میں رائج تھے، مغلوں نے ترقّی دی۔ مصوّری، موسیقی، شعرگوئی، دین دار مسلمانوں میں لہو و لعب شمار ہوتے ہیں۔ آج کل "فنونِ لطیفہ" کے نام سے تہذیب کا معیار مانے جاتے ہیں۔ پیشِ نظر صدی میں انھیں بھی فروغ حاصل ہوا۔ صوفیہ اور

بعض علما سماع کے قائل اور موسیقی کے خاصے ماہر تھے۔ اسی کی لاگ سے شاعری میں غزل بہت مقبول ہوئی ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی ادبی زبان فارسی تھی اور ایران میں صفویوں کے زمانے سے فارسی شعر و ادب میں زوال آ رہا تھا۔ وہیں، عُرفی اور نظیری کے بعد ان کا نظیر نہ پیدا ہوا تو بیرونی ممالک سے کیا اُمید ہو سکتی تھی۔ تاہم جہانگیر و شاہ جہاں نے قدردانی میں کمی نہ کی۔ عالمگیر قصیدہ و غزل کی عام شاعری کو "ناپاک دفتر" سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے عہد میں چند بہت اچھے شاعر اُسی کی سلطنت میں پیدا ہوئے جن کا تذکرہ ہم آخری فصل میں پڑھیں گے مصوری کی شاہی سرپرستی اکبر و جہانگیر تک رہی اور اسی عہد کی بعض تصاویر آج بھی پسند کی جاتی ہیں۔ انگریزی سفیر طامس رو کی یہ دلچسپ شہادت محفوظ ہے کہ دوسرے تحائف کے ساتھ ایک بہت عُمدہ تصویر اس نے بادشاہ کی نذر کی۔ چند ہی روز میں شاہی مصوروں نے اس کی ایسی نقلیں تیار کر دیں کہ طامس رو کو اپنی اصلی تصویر پہچاننے میں دشواری پیش آئی ہے[1] شاہ جہاں کے زمانے میں مصوری سے بے اعتنائی کی تلافی، خطاطی، نگینہ کاری، سنگ تراشی اور فن تعمیر کی ترقی سے ہوئی۔ جمیس فرگسن جیسے نقاد مان گئے کہ اس فن کو مغل بادشاہوں کے ذوقِ جمیل نے فنون لطیفہ کے اونچے مرتبے تک پہنچا دیا۔ روضۂ ممتاز محل دنیا کے عجائبات میں

---

[1] اِل فنسٹن ص۵۴۶۔ انہی تحائف میں طامس رو نے ایک گھوڑا گاڑی (بگھی) بھی پیش کی تھی۔ شاہی کاریگروں نے اسی طرز پر کہیں بہتر گاڑیاں تیار کر دیں۔ انہی "فرنگی طرز" کی گاڑیوں کا فارسی تاریخوں میں کہیں کہیں ذکر آنے سے طامس رو کا دربار جہانگیری میں آنا ثابت ہوتا ہے۔ (دیکھو الیٹ ج ۶۔ حاشیہ ص۳۴۷)

شمار ہوتا ہے۔ جامع مسجد دہلی کے خالص عمارتی حُسن کی شان بہت کم کسی عمارت میں پائی گئی ہے ؛

اس دعوے کے بہت سے ثبوت مل سکتے ہیں کہ گیارھویں صدی ہجری (سترھویں عیسوی) میں ہندوستان باعتبار صنعت و حرفت سب سے ترقی یافتہ ممالک میں شامل تھا۔ مورلینڈ کے نظریات بیشتر فرنگی بیانات پر مبنی ہیں۔ وہ مغلیہ عہد کو انگریزی عہد کے مقابلے میں گھٹا کر دکھانے کے درپے ہے۔ بایں ہمہ، اسے اعتراف کرنا پڑا کہ "یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ صنعت و حرفت میں ہندوستان اُس وقت مغربی یورپ کی نسبت کہیں زیادہ بڑھا ہوا تھا۔"[1] نفیس ترین پارچہ اور زیورات سے لے کر بڑی بڑی توپیں اور جہاز تک ممالک ہند میں تیار ہوتے تھے۔ اگرچہ صنعت جہاز سازی میں یورپ بڑی تیزی سے ترقی کرتا رہا اور بہت جلد سبھی ایشیائی ممالک سے بازی لے گیا۔ لوہا، تانبہ، ہیرا وغیرہ اکثر معدنیات کافی مقدار میں کانوں سے نکالی جاتی تھیں۔ یہ درست ہے کہ استعمالی دھاتوں کی ایسی کثرت نہ تھی نہ ایسی اچھی اور سستی چیزیں تیار ہوتی تھیں، جیسی آج کل دست یاب ہوتی ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ توپ و تفنگ سے لے کر سوئی، انگشتانے تک ضرورت کی ہر چیز سلطنت مغلیہ کے اندر بنائی جاتی تھی اور اس کے متمدن باشندے اکثر اسباب معاشرت کے لئے کسی بیرونی ملک کے دست نگر نہ تھے۔[2] یہاں کی نہ صرف

---

[1] "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ اوف اکبر" صفحہ ۱۵۹۔

[2] دیکھو مورلینڈ کی کتاب "انڈیا۔۔۔ اکبر" صفحہ ۱۴۲ وغیرہ وغیرہ۔ بعض فرنگی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷۵ پر)

خام اجناس بلکہ مصنوعات بیرونی ملکوں میں دساور جاتی تھیں اور بڑی قدر و قیمت سے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھیں۔ اعلیٰ درجے کے زربفت، کارچوبی، ریشمی، شالی پارچے کے علاوہ سوتی کپڑا ایسا اچھا اور سستا مل جاتا تھا کہ فرنگی تاجر بڑے نفع سے بیرونی ممالک میں فروخت کرتے تھے؛

تجارت اور وسائل سفر

بعض قیمتی مصنوعات، جیسے ترکی قالین، قاقم و سنجاب، چینی، شیشے کے ظروف اور سونا، چاندی، ہاتھی دانت، بیرونی ممالک سے آتے تھے۔ لیکن دانت یا سیم و طلا کی مصنوعات میں اہل ہند کسی سے کم نہ تھے۔ ان صنعتوں کے بڑے بڑے کارخانے یہاں مختلف شہروں میں قائم تھے، جن کی مصنوعات باہر جاتی تھیں۔ مجموعی طور پر دیکھیے تو اُس زمانے کی مشکلاتِ سفر کے لحاظ سے تجارتِ برآمد کی مقدار خاصی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کا بڑا حصہ بحری تھا۔ مغربی اور مشرقی سواحل پر بہت سی بندرگاہیں تجارت کا مرکز تھیں اور فرنگی تاجروں کے روز افزوں تعداد میں آنے، تجارتی دکانیں یا کوٹھیاں کھولنے سے ان کی رونق بڑھ گئی تھی؛

دُخانی جہاز کا ابھی رواج نہ ہوا تھا، اس لئے تجارت درآمد زیادہ تر بری راستوں سے ہوتی تھی۔ ابتدائی ابواب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ عربوں کے سندھ میں آنے سے ہندی بری تجارت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ترک و مغل سلاطین کے زمانے میں اسے اور ترقی ہوئی۔ دُور دُور کی مصنوعات پاکستان اور بھارت کے بازاروں میں آنے لگیں۔ شیر شاہ سوری کے وقت

(بقیہ حاشیہ ۵۷۴) تاجروں کو اُس زمانے میں یہ رشک اور قلق ہوتا تھا کہ ہندوستان اپنے مال کے عوض میں کسی بیرونی ملک کا مال یا مصنوعات نہیں لیتا۔ زر نقد وصول کرتا ہے!

سے عہدِ عالمگیر تک راستوں کی درستی اور سفر میں سہولت پیدا کرنے کی برابر کوشش ہوتی رہی۔ آج کل ریل اور موٹر یا ہوائی جہاز سے قطعِ مسافت میں جو آسانی اور سرعت آگئی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا عشرِ عشیر بھی دنیا میں دو صدی پیشتر میسّر نہ تھا۔ البتہ اُس زمانے کے معیار کے مطابق ممالکِ ہند و پاکستان کے بڑے بڑے شہروں تک راستے صاف کر لئے گئے تھے۔ ہر منزل پر قیام، سواری اور باربرداری کا معقول انتظام تھا۔ اندرونی تجارت کے لئے صدہا بیلوں کے قافلے دُور دُور تک ہزاروں من مال لاتے لے جاتے تھے۔ اور مورلینڈ کے الفاظ میں "اہلِ ہندوستان نے اپنی بحری تجارت کی طرح بری تجارت و سفر کا بھی ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اُس عہد میں یقیناً ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے"۔ (ص ۲۴۳)

پکی سڑک اور لوہے کے پہیے کی گاڑی ابھی نہیں چلی تھی۔ لیکن سرعتِ سفر کے لئے تیز اور دُور دم گھوڑے، اونٹ، اونٹنیاں خاص طور پر سدھائے جاتے کہ ایک رات میں ستر اسی میل کی منزل مار لیتے۔ آرام اور تکلف کی سواریاں پالکی، سنگھاسن، ڈولیاں تھیں جنھیں کئی کئی کہار لے کر چلتے اور بارہ پندرہ میل روزانہ کے حساب سے بڑے بڑے فاصلے طے کرتے تھے۔ سفر کی عام سواری رتھ، منجھولی، چھکڑے تھے جو ابھی تک اُسی رفتار سے چلے جاتے ہیں۔ بڑے راستوں پر دو رویہ سایہ دار درخت لگاتے کہ گرمی میں مسافر کو تکلیف نہ ہو۔ ہر منزل پر بلکہ اکثر دو دو میل کے فاصلے پر وسیع، پختہ سرائیں بنی ہوئی تھیں جن میں صدہا مسافر بیک وقت ٹھیر سکتے تھے اور ان کے قیام و طعام کا انتظام ہوتا

تھا۔ اس قسم کی سرائیں خاص اہتمام سے سوری بادشاہوں نے بنوائیں۔ لیکن گیارھویں صدی ہجری میں اس نظام کی ایسی توسیع ہوئی کہ شاید دنیا کے کسی ملک میں غیر آباد، طولانی راستوں پر اتنی سرائیں کہیں نہ ہوں گی جتنی مغلیہ سلطنت میں تعمیر ہوئیں۔ عالمگیر اپنے بزرگوں کی طرح شاہی قصور والوان بنانا، محض اسراف سمجھتا تھا لہذا بادشاہ کی ذاتی آمدنی بیش تر خیر و رفاہ عام کے کاموں میں صرف کی جاتی اور ان میں مساجد، مدارس، سرا بنانے کی مد مقدّم تھی۔ تخت نشینی کے بعد ہی تاکیدی احکام جاری کئے تھے کہ" درجمیع طرق و شوارع ایں ممالک کثیر المسالک ہر جا کہ سراو رباط نہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ سرائے وسیع الفضا ...... مشتمل بر بازار و مسجد و چاہ پختہ و حمّام بسازند .... " چناں چہ اس کام پر بادشاہ کا بے حساب روپیہ خرچ ہوا اور ہوتا رہا۔[1]

---

[1] عالمگیر نامہ صـ۱۰۸۵ـ۔ مآثر عالمگیری صـ۵۲۹ـ وغیرہ۔ اسی طرح ہر بڑے قصبے میں مدارس بنائے گئے جن کے طلبہ اور معلّمین کا خرچ بادشاہ کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ یہ واقعہ بھی لکھنے کے لائق ہے کہ شاہ جہاں روضۂ ممتاز محل کے مقابل جمنا کے دوسری طرف اپنا مقبرہ سنگ موسیٰ سے بنوانا چاہتا تھا۔ مصالحہ جمع کیا جا رہا تھا اور دونوں مقبروں کو ملانے کے لئے ایک پل بنانے کی تجویز تھی جس کا کٹہرا چاندی کا بنایا جاتا۔ اس کٹہرے کی جالی اور گل بوٹے کے تختے ڈھالے جا رہے تھے جب کہ حکومت میں انقلاب آگیا۔ اور عالمگیر کے سامنے خزانے کی موجودات میں مجوزہ پل کے یہ تختے پیش ہوئے۔ حکم دیا کہ سب گلا کر روپے ڈھالے جائیں اور اس آرائشی پل کی بجائے، یہ سب روپیہ ان ندی نالوں کے پل بنانے میں صرف کیا جائے جہاں برسات میں پانی چڑھنے سے راستے رک جاتے ہیں۔ اسی حکم کے مطابق عمل ہوا (ایضاً۔ ایضاً)

ان سراؤں سے قطع مسافت اور ڈاک لانے لے جانے میں بہت آسانی ہوگئی۔ "ڈاک چوکی" کا مستقل انتظام عہد اکبری سے منسوب کرنے لگے ہیں۔ حال آں کہ شیر شاہ سوری نے جاری کیا۔ البتہ بعد میں اس کی توسیع اور اصلاح ہوتی رہی۔ صورت یہ تھی کہ ہر آٹھ دس میل کی منزل پہ چند سوار اور ہرکارے تعینات کیے جاتے کہ شاہی ڈاک کو پچھلی منزل والوں سے لیں اور فوراً اگلی چوکی تک پہنچا دیں۔ اس طرح، ہرکارے یا سوار بدلتے جاتے اور ڈاک آگے چلی جاتی تھی۔ اسی انتظام کی بدولت کابل و بنگال، کشمیر و دکن، غرض ہر حصۂ ملک سے دس گیارہ دن میں ڈاک پائے تخت اکبر آباد یا دہلی پہنچ جاتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے زیادہ ضروری احکام معمولی ہرکاروں کی بجائے "گرز برداروں" کے ہاتھ روانہ کیے جاتے جنھیں اس زمانے کی اصطلاح میں سارجنٹ کہنا غلط نہ ہوگا۔

ڈاک کے ہرکاروں کے ذریعے اور لوگ بھی ہر مقام پر اپنے اعزا اور احباب کو خط بھیج سکتے تھے۔ اُمرا، حکام اور بڑے تاجروں کے ہرکارے الگ دوڑتے تھے۔ سلطنت بھر میں رسل و رسائل کا سلسلہ اچھی طرح جاری تھا۔ کم سے کم پائے تخت، شاہی لشکرگاہ اور بڑے بڑے شہروں سے خطوط و اخبار بہت جلد ہر گوشۂ ملک میں پہنچ جاتے تھے۔

آبادی اور بڑے شہر

مغلیہ عہد کی تمدنی ترقی کا ایک اندازہ کثرتِ آبادی اور شہروں کے حالات پڑھنے سے ہو سکتا ہے۔ یہ بہت سی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں لیکن جمع کیے جائیں تو ایک ایک شہر کی گذشتہ خوش حالی پر خاصی ضخیم کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں (اور ہوئی ہیں) لیکن سرکاری مردم شماری

کا رواج نہ ہونے کے باعث آبادی کی صحیح تعداد نہیں ملتی۔ بیرونی سیاحوں کے اقوال اور بعض فارسی ماخذوں کو غور سے مطالعہ کرنے کے بعد مورلینڈ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے آخر میں کل ہندوستان کی آبادی تخمیناً دس کروڑ تھی[1]۔ گیارھویں صدی امن و آسودگی کا زمانہ تھا۔ اہل ہند، افزائش نسل کی صلاحیت میں مشہور بلکہ مطعون ہیں۔ غرض یہ کہنا کہ عالمگیر کے عہد میں سلطنت مغلیہ میں کم و بیش بیس کروڑ آدمی بستے تھے غلط نہ ہوگا؛ بڑے شہروں کی آبادی کا تخمینہ کسی گذشتہ باب میں زیر بحث آچکا ہے۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں جو شہر آزاد سلطنتوں کے پایہ تخت بنے تھے۔ بہت بارونق ہو گئے تھے ان سلطنتوں کی خود مختاری ختم ہوئی تو ان کے صدر مقامات میں زوال آ گیا۔ لیکن جہاں تجارت کی گرم بازاری تھی یا مغل صوبہ داروں کے مستقر بن گئے، ان کی رونق بدستور رہی بلکہ اور بڑھ گئی۔ مثلاً احمدآباد کہ نویں صدی میں نو لاکھ آبادی کا تخمینہ کیا جاتا تھا۔ عہد عالمگیر تک اس میں فرق نہیں پڑا۔ اکبرآباد و دہلی احمدآباد سے بھی بڑھ گئے۔ لاہور کو گیارھویں صدی ہجری میں ایسا عروج ہوا کہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا[2]؛ بندرگاہ سورت کی آبادی بارھویں صدی ہجری (یعنی اٹھارھویں عیسوی) میں گھٹتے گھٹتے انگریزوں کی نظر میں آٹھ لاکھ تھی[3]؛ تو بمبئی کی رقابت سے پہلے دس لاکھ سے کیا کم ہوگی۔ اسی طرح برہان پور، اورنگ آباد، بیجاپور، حیدرآباد، دکن میں۔ ڈھاکہ، سات گام، خواص پور

---

[1] "انڈیا .... اکبر" ص۱۳ تا ۲۲۔

[2] امپی ریئل گزی ٹیر۔ ۱۸ ص۷۱۔

[3] گزے ٹیر۔ ۲۳ ص۱۶۴

(ٹانڈہ) بنگالے میں لاکھوں کی آبادیاں تھیں اگرچہ مرشد آباد کا وہ عروج جسے دیکھ کر کلائو نے اسے لندن پر ترجیح دی تھی[۱]، عالمگیر کے بعد یعنی بارھویں صدی ہجری کے وسط کی بات ہے؛

ہمارے دوآب، مغربی پاکستان وکابل، وسط ہند و دکن میں ہم اور متعدد شہروں کا حال پڑھتے ہیں جن کی آبادی کا تخمینہ ایک لاکھ سے کم نہ تھا۔ لیکن تفصیلی بحث کو چھوڑ کر یہاں اجمالاً یہ بتانا کافی ہوگا کہ عالمگیر کے آخر زمانے میں سلطنت کے پچیس صوبے تھے۔ ہر صوبہ دار کے ساتھ فوج وبہیر کی تعداد ہی پچاس ہزار سے کم نہ ہوتی تھی۔ یہ آبادی اولتی بدلتی لیکن ہر صوبے کے صدر مقام میں اس قدر تعداد ضرور موجود رہتی تھی۔ اسی طرح ہر سرکار کے مستقر پر کم سے کم بیس پچیس ہزار باشندوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ جہاں کے وقت میں تحصیل یا پرگنوں کا شمار تقریباً ۴½ ہزار بتایا گیا ہے[۲]۔ تین صوبوں کے اضافے سے عالمگیر کے زمانے میں پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ یہ لازماً بڑے قصبے ہوتے تھے۔ اور ہر قصبے میں تخمیناً پانچ تا دس ہزار آبادی ضرور تھی؛ اکثر قصبات جہاں مسلمان شرفا کی برادریاں بسیں، علم وتہذیب کے مرکز بن گئے تھے۔ شرافت کی رسم وروایات جس طرح یہاں محفوظ رکھی جاتی تھیں، شہروں کی مخلوط وکثیر آبادی میں ممکن نہ تھا۔ زمانۂ حاضرہ میں یہ قصبات عموماً ویران وبے رونق ہوگئے۔ حویلیوں کے وسیع آثار، ان میں محلّے کے محلّے آباد دیکھ کر البتہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ پہلے کس شان اور مرتبے کے لوگ

---

[۱] گزیٹیر - ۱۸ ص۵۳

[۲] بادشاہ نامہ - ج ۲ ص۱۰

یہاں بستے تھے[1]۔

انہی قصبات سے اسلامی تہذیب اور شعائر کی شعاعیں دیہات میں پھیلتی تھیں۔ ممالکِ ہند کی معاش کا انحصار زیادہ تر زراعت پر رہا اور یہ برّ عظیم ابھی تک "گاؤں کا خطّہ" کہلاتا ہے۔ زیرِ نظر صدی میں دیہات کی آبادی اور خوش حالی میں یقیناً اضافہ ہوا ورنہ بیسیوں محاصل موقوف ہونے کے باوجود، عالمگیری خزانے کی آمدنی اکبری عہد کی نسبت سہ گنی نہ ہو سکتی تھی۔ آسودگی نے ضرور ہے کہ اُن کے تمدّن کا معیار کچھ نہ کچھ بلند کر دیا ہوگا۔ مسلمانوں سے میل جول کا اُن کی قدیم تہذیب ومعاشرت پر لازماً اثر پڑا لیکن یہ دیہاتی آبادی مدت سے جہل وجمود کی حالت میں تھی۔ مسلمانوں کی مستقل سکونت بیش تر شہر وقصبات میں رہی۔ یہ درست ہے کہ اب مسلمان عامل، تاجر، صوفی درویش ان دیہات میں زیادہ آنے جانے لگے تھے پھر بھی صحت اور تفصیل کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے کہ قدامت پرست ہندو دیہاتیوں کے طور طریق، رسم ورواج اور خیالات میں کیا کیا تغیرات، کس زمانے میں رونما ہوئے۔ البتہ اجمالی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رہنے سہنے، کھانے، پہننے کے جُزی فرق کے علاوہ ہندو شہریوں میں فارسی زبان کی تعلیم وترویج سے مقامی زبانوں کا رنگ بدلا اور تمام پاکستان وہند میں ایک مخلوط ومشترک

---

[1] ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں پچاس ہزار آبادی کے شہروں کی تعداد کل ہندوستان میں ۵۰ تھی۔ پانچ ہزار یا زیادہ آبادی کے قصبات پورے چھ سو بھی نہ تھے (دیکھو رپورٹ سن مذکور۔ صٓ) سنہ ۱۹۴۱ کی رپورٹ سے یہ مد خارج کر دی گئی اور قصبات کا الگ شمار ہی نہیں بتایا۔

زبان (یعنی اُردو) پھیل گئی جس کی یک جای تاریخ ہم دوسری جلد میں بیان کریں گے۔ اسی طرح کبیر داس، گرو نانک وغیرہ مذہبی مصلحین کے بیرو اسلام کے توحیدی عقائد کو ہندو آبادی میں مقبول بناتے رہے حکومت یا علمائے دین کی طرف سے اسلامی تبلیغ کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ تاہم مسلمانوں سے ارتباط ہی نے بہت سے ہندوؤں کو اسلام کے دائرے میں کھینچ لیا۔ دین کی یہ قدرتی اشاعت اکبر و جہاں گیر کے عہد کی نسبت ممکن ہے کہ شاہ جہاں اور عالم گیر کے زمانے میں وسیع تر ہو گئی ہو اگرچہ اس قیاس کی تحریری شہادتیں فراہم کرنا دشوار ہے[لہ]

مسلمانوں کی مذہبی تحریکات

نویں دسویں صدی ہجری میں سیاسی انتشار کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں انتشار ہوا اور دربار شاہی میں اسی نے دین الٰہی کی صورت اختیار کی تھی۔ گیارھویں صدی، حکومت میں استقلال اور عام سیاسی اطمینان کا زمانہ ہے اسی مناسبت سے ہم عقائد میں استحکام و استقامت کا رنگ دیکھتے ہیں اور اس دور کی اصلاحی تحریکات کا شاہی نمائندہ عالم گیر کو کہہ سکتے ہیں۔ اکبر کے اکثر مسلم آزار احکام کو جہاں گیر نے منسوخ کر دیا

لہ عالم گیر کے زمانے میں جبریہ مسلمان بنانے کے افسانے دروغ گوئی سے بڑھ کر جہالت پر مبنی ہیں۔ کوئی مذہب جبراً نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اسلام نے جبر و اکراہ کی قطعی ممانعت کی ہے۔ بخلاف عام انداز سے کے میرا گمان یہ ہے کہ سلاطین مغلیہ کے عہد میں دیہاتی ہندوؤں کی شاید سب سے بڑی تعداد جہاں گیر کے زمانے میں اسلام لائی جب کہ ایک خوفناک قحط کی وجہ سے گجرات اور وسط ہند میں صدہا گاؤں ویران ہو گئے۔ وہاں کی فاقہ زدہ آبادی شہروں میں آئی اور ہزاروں ماں باپ نے اپنے بچے آسودہ حال مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کئے۔

لیکن عقائد کی عام پراگندگی اور بے راہ روی کا سدباب زیادہ گہری اصلاح کا محتاج تھا۔ اس خدمت کا جن علمائے حق نے صدی کے آغاز میں بیڑا اٹھایا، ان میں شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نام نامی سب سے زیادہ روشن ہیں؛

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی

شیخ کا خاندان سلاطین خلجی کے عہد میں بخارا سے آیا اور پایۂ تخت دہلی میں بس گیا تھا۔ ان کے والد ماجد شیخ سیف الدین صاحب حال بزرگ تھے۔ شیخ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے علم کی تشنگی تھی علوم رسمی کی تکمیل کے بعد چند سال آگرے کی علمی صحبتیں دیکھیں بداونی نے علمائے عصر میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر حجاز گئے اور بڑے بڑے اساتذہ سے حدیث کی سند اور بزرگانِ صوفیہ سے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ واپس وطن آکر، درس تدریس کے ساتھ تصنیف تالیف کا مشغلہ اختیار کیا اور بچاس سال سے زیادہ دین کی آب یاری کی کہ ایسی توفیق الٰہی کم کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ ان خدمات عالیہ کا جیتے جی علمی دنیا میں اعتراف، شاہی درباروں میں اعزاز کیا گیا۔ قضا و قدر نے بھی عمر میں وسعت عطا کی ۹۴ سال کے سن میں انتقال ہوا۔ "فخر العالم" تاریخ وفات (۱۰۵۲) ہے؛

شیخ کی تصانیف کی کل تعداد سو سے زیادہ بتائی گئی ہے۔ ان میں مشکوۃ کی شرح (عربی پھر فارسی) تاریخ مدینہ (= جذب القلوب) مدارج النبوۃ، شرح سفرالسعادۃ، تکمیل الایمان، اخبار الاخیار آج تک نہایت مقبول و متداول ہیں۔ سلاطین اور علمائے دہلی کے حال میں

ایک مختصر تاریخ ذکر الملوک لکھی تھی۔ تصوّف اور عقائد میں بہت سے رسالے محفوظ ہیں مگر آپ کا اصلی کارنامہ حدیث کی تعلیم واشاعت سمجھا جاتا ہے۔ کلام یا فقہ کے نزاعی مسائل میں شیخ عموماً وسطی راہ اختیار کرتے ہیں اور سخت اختلاف کی صورت میں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ؛ علوم دین کی نشر و تدریس کا سلسلہ آپ کی اولاد نے ایک زمانے تک جاری رکھا اور اس خاندان کے شاگردوں نے اسے ہند و بیرون ہند میں دُور دُور تک توسیع دی ؛

حضرت مجدّد الف ثانی رح

حضرت محدث دہلوی نے اعلیٰ درجے کا تعلیمی کام کیا لیکن دماغوں میں فلسفۂ وحدت وجود کی حدت اور باطنی عقائد کی شرارہ انگیزی سے جو فساد پک رہے تھے ان کا علاج ٹھنڈی تدبیر اور ہلکی تبرید سے نہ ہو سکتا تھا۔ بہت تیز تنقیہ کی ضرورت تھی۔ اس عمل کے لئے حکیم مطلق نے ایک صوفی عالم کو پیدا کیا جو صدی کی بجائے ایک ہزار سال کی اصلاح وتجدید کا دعویٰ رکھتا ہے اور بڑے بڑے اہل علم وعرفان تامل و اختلاف کے بعد اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ بزرگ، شیخ احمد سرہندی رح تھے ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم دین کی تعلیم سیال کوٹ ولاہور میں پائی۔ چشتیہ سلوک کا راستہ والد نے (جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رح کے مرید تھے) طے کرایا۔ صدی کے آخری سنین میں آگرہ صاحبان علم وفضیلت کا بین الملی مرکز بن گیا تھا۔ کچھ زمانہ وہاں گزارا اور معتبر تذکروں میں لکھا ہے کہ ابوالفضل وفیضی نے آپ کی علمیت اور ذہانت کی داد دی بلکہ تفسیر (سواطع الالہام) کے لکھنے میں کہیں کہیں مدد لی۔ لیکن روحانی تو ارکا نشو ونما خواجہ باقی باللہ رح

کی توجہات سے نقش بندیہ طریق میں مقدر تھا۔ اسی نسبت نے آپ کو مدارجِ عالیہ تک پہنچایا اور تجدید ملت کا بزرگ منصب دلوایا؛

اکبری اور جہاں گیری دربار میں ایرانی اُمرا چھائے ہوئے تھے۔ ان کا سایہ شیعہ فلسفے کو پروان چڑھاتا، اندر ہی اندر دور تک جڑیں پھیلاتا تھا۔ موروثی بادشاہ یا روساء، سنّیوں کی خلافت میں انتخابی شرط سے طبعًا گھبراتے ہیں کہ اُن کے حق وراثت پر ضرب لگتی ہے۔ طریق امامیہ اور عقائد خواص کے مزاج اور عوام (اہل ہند) کے جذبات سے بظاہر موافقت رکھتے ہیں۔ لہذا ہر طبقے پر ان کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا تھا حضرت مجدّدؒ نے پہلے انہی کی رد میں ایک رسالہ تحریر کیا اور خاص خاص درباری امیروں کی دشمنی مول لی۔ کہتے ہیں آگے چل کر نور جہاں بیگم انہی دشمنوں میں شریک ہوگئی اور بالآخر اس گروہ نے بادشاہ کو حضرت مجدّد سے بدگمان کر دیا۔ جب دربار میں طلب ہوئے تو دوستوں کے کہنے سننے کے باوجود آپ نے "زمیں بوس" نہیں کی اور بادشاہ کے سوالات کا جواب بھی ایسے لہجے میں دیا کہ اُس نے بگڑ کر آپ کو قلعۂ گوالیار میں قید کیا، اور (تزک میں) ناروا الزام لگائے (۱۰۲۸ھ) دوسرے سال رہائی کے بعد آپ دو تین برس اور شاہی لشکر میں رہے اور معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ جہاں گیر آپ کی فضیلت و بزرگی کا معترف ہوگیا۔ عمر کے آخری ایام وطن مالوف میں گزارے۔ ۱۰۳۴ھ (= ۱۶۲۴ء) میں وہیں انتقال کیا؛

حضرت مجدّدؒ کی تصنیف سے دو تین رسالے، اور (پانسو سے زیادہ) مکتوبات کے تین دفتر مرتب ہوئے۔ ان میں سے کئی مکتوب مستقل مقالات

کی شان رکھتے ہیں۔ یہ دفتر بہت جلد اسلامی ممالک میں شائع ہو گئے تھے اور فارسی کی اُن گنی چُنی کتابوں میں ہیں جن کا عربی میں ترجمہ مقبول و مطبوع ہوا ؛

لیکن روحانیات کے باریک رموز اور بلند معارف سے قطع نظر، یہاں ہمارے مطلب کے مکتوبات وہ ہیں جن میں فاسد عقائد و بدعات کا اس قوت سے ابطلان کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی روح شاد ہو گئی ہو گی۔ ایسی جاندار انشا پردازی غالباً فارسی زبان کی کسی دینی تصنیف میں نہ ملے گی۔ بڑا کارنامہ یہ ہے کہ "وحدتِ وجود" کو طریقت کی محض وسطی منزل قرار دیا اور ثابت کیا کہ مسلمان صوفی کی منتہا "وحدت شہود" ہے جہاں عبد و معبود کا امتیاز، اور کفر و اسلام کا فرق بدیہی ، ہو جاتا ہے قرآن و سنّت کی پابندی لازمۂ حیات بن جاتی ہے۔ شریعت کا یہی اتباع ایمان و عرفان کی کسوٹی ہے۔ جو اس راستے سے ہٹا اُس کے کشف و کرامات، خرق عادت سب شعبدے ہیں۔ ضمناً مجدد صاحبؒ نے محی الدین ابن عربی اور وحدتِ وجود کے دوسرے داعیوں پر شدید تنقید کی اور بے باک صوفیوں کا مسکت دلائل سے ایسا مُنہ بند کیا کہ پھر کسی صاحب علم شخص کو تاویل و تحدید کے بغیر یہ فلسفہ پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تصوّف کا ایک نیا مشرب "مجددی نقش بندی" کے نام سے اکثر اسلامی ملکوں میں جاری ہو گیا۔ صدہا علمائے دین، آپ کے یا آپ کے خلفا کے حلقۂ ارشاد میں آئے اور علمی، عملی دونوں اعتبار سے یہ فرقہ ایسا چمکا کہ دوسرے ماند پڑ گئے ؛ حضرت مجدد کے خلف ارشد خواجہ محمد معصومؒ سے عالمگیر نے کسب فیض کیا اور اُن کے صاحب زادے اکثر آتے اور بادشاہ کے پاس نامہ بانہ قیام فرماتے رہے؛

دوسرے علمائے عصر

پچھلے انقلابات کی آندھیوں نے ہزاروں کتابیں ورق ورق برباد کردیں۔ پھر بھی گیارھویں صدی کی باقیات کا ایک بڑا ذخیرہ ممالک ہند و فرنگ میں پھیلا پڑا ہے۔ یہ علم کے عام شوق و اشاعت کی دلیل ہے۔ فارسی کے حیرت انگیز فروغ کا ثبوت ہے جو اُن دنوں مسلم و غیر مسلم سب کی تعلیمی اور تصنیفی زبان بن گئی تھی۔ فارسی تاریخوں اور تذکروں میں صدہا اہل قلم کے نام آتے ہیں اور زمانۂ قریب میں کئی اُردو رسائل و کتب میں اکثر مشاہیر کے حالات شایع ہوئے ہیں۔ ہم کتاب کی مناسبت سے معدودے چند چیدہ افراد کی صرف یاد تازہ کرنے پر قناعت کریں گے:

جہاں گیر و شاہجہاں کے عہد میں مُلّا عبدالحکیم سیال کوٹی نے بڑی ناموری پائی۔ عام انعام و معاش کے علاوہ، دو مرتبہ شاہ جہاں نے ہم وزن روپیہ علمی خدمات کا صلہ پیش کیا۔ سو برس بعد علامہ آزاد بلگرامی نے سفر حجاز سے واپس آکر گواہی دی تھی کہ مُلّا صاحب کی متعدد تصانیف بلاد عرب و عجم میں دائر و سائر ہیں[1] ہمارے زمانے میں حافظ عبدالرحمٰن صاحب امرتسری نے ممالک اسلامی کی سیر کی تو ڈھائی سو برس گزرنے پر بھی اُن کی افادیت و قبولیت میں فرق نہ آیا تھا[2]، ۱۰۶۷ھ میں انتقال ہوا!

انہی کے ہم عصر مُلّا محمود جون پوری گزرے ہیں، (وفات ۱۰۶۲ھ) کہ علم

---

[1] مآثر الکرام۔ ص۲۰۲ علامہ آزاد نے ان کتابوں کے نام کی صراحت کی ہے، حواشی (۱) تفسیر بیضاوی، (۲) مطوّل، (۳) شرح مواقف، (۴) تفتازانی، (۵) حاشیہ خیالی، (۶) شرح دوّانی وغیرہ وغیرہ۔

[2] رود کوثر ص۲۴۳ بحوالہ سفر نامہ حافظ عبدالرحمٰن صاحب۔

ہئیات میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان کی کتاب شمس بازغہ قدیم مدارس میں اب تک داخل نصاب تھی[1]۔ ایک صوفی مصنف شیخ محب اللہ الہ آبادی نے فصوص الحکم کی ضخیم شرحیں لکھیں لیکن زیادہ شہرت ایک مختصر رسالے تسویہ کی اشاعت سے ہوئی جس پر عالمگیر کے عہد میں دار وگیر کی گئی تھی۔ اُن کے بہاری ہم نام کا کچھ مدت بعد معقولات میں نام بلند ہوا۔ ان کی دو کتابیں سُلّم العلوم (منطق میں) اور مسلّم الثبوت (اصول فقہ میں) ایک زمانے تک درسیات میں شامل رہیں۔ اسی اواخر صدی کے میر محمد زاہد اور شیخ احمد عرف ملّا جیون لائق ذکر ہیں۔ میر زاہد، عالمگیر کے محکمۂ احتساب کے سب سے پہلے محتسب منتخب ہوئے۔ زہد و تدیّن کے ساتھ کئی علمی حواشی ان کی یادگار ہیں۔ ملّا جیون، تفسیر احمدی اور (اصول فقہ میں) نور الانوار کے مصنف تھے مگر علمی فضیلت اور اُستادی سے بڑھ کر ان کی سادہ لوحی اور گنوارپن کے قصے گھر گھر مشہور ہیں۔

فتاوی عالمگیری

زیرِ نظر صدی، بلکہ عہد مغلیہ کا ایک علمی ملّی کارنامہ "فتاوی عالمگیری" کی تدوین ہے کہ بیس اکیس ممتاز علما کی مشترکہ محنت سے عمل میں آئی۔ یہاں بھی اکبر و عالمگیر کی افتادِ طبع کا فرق نظر آتا ہے کہ وہ تاریخ الفی کی تالیف یا مہا بھارت وغیرہ سنسکرت کتابوں کے ترجمے کے لئے اہل علم کو جمع کرتا تھا اور پرپوتے نے فقہ اسلامی کی یہ مفید و جامع کتاب لکھنے کے لئے

---

[1] مآثر الکرام میں لکھا ہے (ص ۲۰۱) کہ ان کے استاد شیخ محمد افضل کو اپنے لائق شاگرد کے مرنے کا اتنا رنج ہوا کہ خود بھی چالیس دن کے اندر گھل گھل کے مرگئے۔ کسی نے اس مصرعے سے دونوں کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ ع: زمحمود و افضل بگو آہ آہ!

جماعت علما کی تنظیم کی۔ آٹھ سال تک مسلسل کام اور دو لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ تیاری اور نظرِ ثانی کے بعد خود عالمگیر کو مسودات سنائے جاتے تھے اور کئی مثالیں محفوظ ہیں کہ معمولی فروگذاشت بھی اس نقاد بادشاہ کی گرفت سے نہ چھوٹتی تھی[1]؛ جماعت کے صدر شیخ نظام برہان پوری تھے اور اُن کے ماتحت چند حصّوں میں الگ الگ ذیلی جماعتیں کام کرتی تھیں۔ فقہ کی حتی الامکان تمام معتبر کتابیں مہیا کی تھیں۔ ایک ایک مسئلے کی اچھی طرح چھان بین کر کے سابقہ فتوے ضروری توضیح و تشریح، اسناد کے حوالوں سے قلم بند کئے جاتے تھے۔ تدوین کرنے والوں میں اکثر حضرات بہار و اودھ کے مشہور فاضل تھے۔ تین چار نام دہلی، لاہور اور ٹھٹہ (سندھ) سے نسبت رکھتے ہیں؛

مورخ اور شعرا

فارسی کی بہت سی تاریخیں، انشا کی کتابیں، شعرا کے بیسیوں دیوان گیارہویں صدی کی پیداوار ہیں۔ ابوالقاسم فرشتہ کی خوش قسمتی، کہ شروع سے انگریز حاکموں میں مقبول ہو گیا تھا مگر تاریخ ہند کی بدنصیبی کہ اس کے غلط ترجموں نے کئی انگریز تاریخ نویسوں کو گمراہ کیا۔ فرشتہ کی قبولیت کی وجہ اس کی تحقیق سے بڑھ کر، انشا پردازی قرار دی گئی ہے؛ شمال میں جہاں گیر نے سنت بابری کی تجدید کی بعض مورخ ابوالفضل کے راستے پر چلتے رہے۔

---

[1] سنہ ۱۹۴۶ء، ۴۷ کے معارف (اعظم گڈھ) میں حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی نے فتاوی اور اس کے مولفین کے حالات پر ایک مفید سلسلۂ مضامین شایع کرایا ہے۔ ٹھٹہ (سندھ) کے سید نظام الدین اور قاضی ابوالخیر کا ذاتی اور خاندانی احوال ہمارے مکرم سید حسام الدین صاحب راشدی کے مضمون سے واضح ہوتا ہے؛

مگر دونوں کوششیں اصل و نقل کا فرق رکھتی ہیں۔ تاہم عبدالحمید لاہوری کا شاہ جہاں نامہ اور مُلا محمد صالح کی عمل صالح اس دور کی مشرح اور مسجع روداد ہیں جن کے مقابلے میں بعد کے سادہ نگار کچھ وزن نہیں رکھتے۔ انہی میں دو ہندو تاریخ نویس قابلِ ذکر ہیں: بندرابن داس صاحبِ "لُبّ التواریخ" اور سجان رائے صاحبِ "خلاصۃ التواریخ" جو بٹالے کا رہنے والا تھا۔ یہ دونو کتابیں عالمگیر کے آخری سنین میں خافی خاں کی تاریخ سے پہلے لکھی گئی تھیں ؛

شعرائے دربار میں جہانگیر نے طالب آملی کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ قلم کی تعریف میں اس کا ایک قصیدہ ملوک و امرا کی مدح سے زیادہ پسندیدہ ٹھیرا۔ تین شعر یہ ہیں:

گاہے دو نمیں سیف لسانُ الشعرای گاہے ششم انگشت کرام الوزرای

زیرِ قدمت فرش ورق ہائے زرافشاں از جنس سمرقندی واز قسم خطای

باآں کہ بریدہ است سرِ ہر دو زبانت صد نغمہ سرای ہمہ رمزی و ادای!

ایک مزے کا قطعہ وہ ہے جس میں بادشاہ کی ڈاڑھی منڈانے کی فرمائش پر عذر کیا تھا: ؎

سفری کنم صاحبا ورنہ من چہ سر بلکہ گردن تراشید مے

طالب جوانی میں انتقال کر گیا (۱۰۲۶ھ)۔ ایک اور شاعر حیاتی کاشی کی شہرت کا سبب یہ ہوا کہ امیر خسرو کی تاریخی مثنوی تغلق نامہ کے ابتدائی ورق مفقود ہو گئے تھے۔ جہانگیر کی فرمائش سے حیاتی نے حمد و نعت اور مدح بادشاہ سے آغاز کتاب کی رسمی تکمیل کر دی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر "زرِ سرخ و سپید" میں تلوایا اور چھ ہزار اشرفی اور روپیہ

صلہ دیا۔ سعیدائے گیلانی نے ایک قطعے میں یہ واقعہ نظم کیا اور "شاعر سنجیدہ شاہی" سے تاریخ نکالی ہے۔ کچھ مدت ہوئی مثنوی تعلق نامہ (حیاتی کے اشعار کے ساتھ) حیدرآباد دکن سے شایع کی جا چکی ہے۔

شاہ جہاں کے عہد میں قدسی اور اس کے انتقال کے بعد کلیم ملک الشعرا بنائے گئے۔ دونوں کو ہم وزن روپیہ انعام ملا بلکہ کلیم کو ایک بار دگنا یعنی دس ہزار صلہ عطا ہوا۔ یہ دونوں سخن ور ایران سے آئے تھے مگر ان کا ہم عصر شیدا اکبرآباد کے مضافات میں پیدا ہوا اور حق یہ ہے کہ کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے اس کا کلام ان دونوں سے کم تر نہ نکلے گا لیکن شیدا وارستہ مزاج سا آدمی تھا۔ قدسی پر اس کی خردہ گیری اور دوسرے شعرا سے مناظروں کا تذکرہ آتا ہے۔ ایک خمریہ قصیدے کا مطلع مشہور ہے جس پر علما نے کفر کا فتویٰ دے ڈالا تھا: ؎

چیست دانی بادۂ گل گوں : مصفّا جوہرے
حسن را پروردگارے، عشق را پیغمبرے!

شاہ جہاں خارج البلد کرنے پر تیار ہوگیا تھا۔ بارے شاعر نے ایک منظوم معذرت لکھ کر معافی حاصل کرلی۔ کہتے ہیں ایک لاکھ شعر لکھے مگر دیوان مرتب نہیں کیا۔ اس کے عذر میں بھی تعلّی کرتا ہے: ؎

شعر برجستۂ شیدا ہمہ جا مشہور است
نیست حاجت کہ بہ دیوانِ مرتب نگرید

اکبرآباد ہی کا ایک اور صاحب دیوان شاعر شیخ محمد علی ماہر تھا۔ اس کا نعتیہ کلام خاصا مقبول اور جہاں آرا بیگم کی مدح میں مثنوی کا یہ شعر زبان زد ہوگیا تھا:

بہ ذاتِ او صفاتِ کردگار است
کہ خود پنہاں و فیضش آشکار است

مست ہاتھی کے مقابلے میں شہزادہ اورنگ زیب (لڑکپن میں) ڈٹ گیا تھا۔ اس کی سلامتی کا بادشاہ نے جشن کیا۔ بہادر بیٹے کو سونے میں تلواکر پانچ ہزار اشرفیاں فقیروں میں تقسیم کرائیں۔ سعیدائے گیلانی نے ایک نفیس مثنوی لکھ کر سنائی اور حیاتی کاشی کی طرح (جس کے لئے قطعۂ تاریخ لکھا تھا) خود بھی ہم وزن روپیہ انعام پایا۔ اسی دور میں شہزادہ داراشکوہ کا میرمنشی چندر بھان برہمن فارسی کا بہت اچھا شاعر تھا اور حق یہ ہے کہ اس کے اشعار کی بے ساختگی اہلِ زبان سے آنکھ ملاتی تھی۔ دیوان کا قلمی نسخہ لاہور کے سرکاری کتب خانے میں محفوظ ہے[1]۔ علیٰ ہذا کشمیر کا صاحب فکر سخن ور غنی تمثیلی شاعری میں صائب کے مماثل اور حسن بیان کے اعتبار سے اور بھی بہتر کہا جاتا ہے۔ سرمد کی شاعری کا بھی یہی زمانہ قرار دے سکتے ہیں جس نے رباعیات میں چہار طرف نام پیدا کیا۔

عالمگیر اپنی مدح میں قصیدے لکھوانے، پڑھوانے پسند نہ کرتا تھا۔ درباری شاعروں کا شعبہ تخفیف میں آیا۔ لیکن اچھے کلام کی شاہانہ قدر و انعام کی کئی نظیریں ملتی ہیں۔ دوسرے، علامہ آزاد بلگرامی کے بقول، بادشاہ کی بے توجہی کے باوصف اس عہد میں شعرا ابل پڑا تھا

---

[1] "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ص۱۸۔ اس مقالے میں برہمن اور دوسرے ہندو اہلِ قلم کی فارسی تصانیف پر تفصیل و تحقیق سے بحث کی گئی ہے۔ مقالہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

اور ہر کونے سے شاعر نکل آئے تھے۔[1] مگر ان کثیر التعداد زمزمہ سنجوں میں بھی ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل سب سے بلند و ممتاز ہیں۔ ناصر علی کی جوانی رندی میں گزری۔ پھر خواجہ محمد معصومؒ کے ہاتھ پر بیعت اور توبہ انابت کی توفیق حاصل ہوئی۔ درگاہ خواجہ کا یہ شعر اسی سے منسوب ہے: ؎

در فیض است منشیں از کشائش ناامید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

ذوالفقار خاں فاتح جنجی کی تعریف میں وہ مطلع جس کے صلے میں ہاتھی اور تیس ہزار روپیہ ملا ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ شاعر زندگی ہی میں صاحب طرز اور مثنوی میں یگانۂ عصر تسلیم کیا گیا تھا۔ ۱۱۰۸ھ میں وفات پائی۔ مرزا عبدالقادر بیدل برلاس مغل ہیں۔ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور جوانی میں عالمگیر کے منجھلے بیٹے کی سرکار میں عہدہ دار تھے شہزادے نے شاعری کی تعریف سن کر اپنی مدح کی خواہش کی۔ مرزا نے نوکری سے استعفیٰ داخل کیا اور باقی عمر دہلی میں خانہ نشین رہے۔ رفعتِ افکار، کثرتِ اشعار، مترنم بحروں کے انتخاب میں مرزا کا مثل پیش کرنا دشوار ہے۔ اور فلسفیانہ دقت اور پیچ در پیچ مرکبات کی ایجاد کے باوجود حسنِ قبول کا عالم یہ کہ ابھی تک خراسان و کابل میں خواجہ حافظ کی بجائے ان کے دیوان سے لوگ تفاؤل کرتے ہیں۔ شاید کوئی محفل سماع ہوتی ہوگی جس میں وہ نادر روزگار غزل وہاں نہ گائی جاتی ہو جس کا مطلع ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ

---

[1] خزانۂ عامرہ - ص۱۱

تو ز غنچہ کم نہ دمیدئی درِ دل کشا بہ چمن در آ

مرزا نے بڑی عمر میں انتقال کیا (۱۱۳۰ھ) ایک زمانے تک عارف کامل کی حیثیت سے دہلی میں ان کا سالانہ عُرس ہوتا تھا۔

عالمگیری عہد کا ایک نثار و نظم نگار نعمت خان عالی تھا کہ ہزل و ہجو میں پایۂ بلند رکھتا ہے "وقائع" میں گول کنڈہ کے محاصرے کی خوب خوب تضحیک کرتا، اور بادشاہ کو پانی پی پی کے کوستا رہا۔ فتح کے بعد قطعۂ مبارک باد لکھ کر لایا جس میں "شہ فتح بجنگ حیدرآباد" تاریخ نکالی اور خلعت انعام لیا۔ عالمگیر کے ایک فاضل مدّاح میر عبدالجلیل بلگرامی تھے۔ ایک رباعی کے صلے میں جو عدلِ عالمگیری کی تعریف میں لکھی تھی، طلائی ہون کے چار خریطے بادشاہ نے عنایت کئے۔ (ہون یا ہن، دکن کا سکہ تھا، تقریباً ۳½ روپیہ رائجہ کے معادل) میر نے فتح ستارہ کی تاریخ بھی بڑی خوبی سے بہم پہنچائی ہے۔ قطعہ:

چو شہ ابہام زیر خنصر آورد — بورد اسمِ اعظم در شمارہ
قلاعِ کفر شد مفتوح فی الحال — ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ
ز انگشتانِ شہ بر مدِّ ابہام — برابر چار اَلِف کردم نظارہ
بعینہ بود شکلِ سالِ ہجری — پئے تاریخ تسخیرِ ستارہ!
(یعنی ۱۱۱۱ھ)

ختم شد